हिन्दुस्तानी एकेडेमी, पुस्तकालय
इलाहाबाद

वर्ग संख्या .....

पुस्तक संख्या .....

क्रम संख्या ८६६

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا

سلسلۂ دار المصنفین (۳۶) (۱۶ ج ع)

اجہاد فی الاسلام

یعنی

اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسلام کے قوانینِ جنگ وصلح، معترضین کے جوابات و شکوک وشبہات کا ازالہ، اسلامی قانون کا دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کے قوانینِ جنگ سے مقابلہ وموازنہ اور موجودہ یورپین قوانینِ جنگ پر مفصل تبصرہ، و ان پر اسلامی قانون کی برتری

از

مولوی ابوالاعلیٰ صاحب مودودی رئیسِ اعزازی دار المصنفین

باہتمام مولوی مسعود علی ندوی

مطبع معارف دار المصنفین اعظم گڑھ میں چھپی

سنہ ۱۹۳۰ء

بابِ اوّل،

اسلامی جہاد کی حقیقت

انسانی جان کا احترام، دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر، قتل بالحق قتل بالحق و بغیر حق کا فرق ناگزیر خونریزی اجتماعی فتنہ اور اس کا علاج جنگ یک اخلاقی فرض جنگ کی مصلحت جہاد فی سبیل اللہ کے معنی حق و باطل کی تحدید جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت فضیلتِ جہاد کی وجہ نظامِ تمدن میں جہاد کا درجہ، ۵ تا ۳۰ صفحہ

بابِ دوم،

مدافعانہ جنگ

دفاع کی ضرورت و اہمیت، دفاع ایک مذہبی فریضہ، مدافعانہ جنگ کی صورتیں، (۱) راہِ حق کی حفاظت، (۲) غدر و عہد شکنی کی سزا، (۳) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال، (۴) دارالاسلام کے امن کی حفاظت (۵) مظلوم مسلمانوں کی حمایت، دفاع کی اصلی غرض، استعداد و قوت کی دائمی تاکید، ۳ تا ۵۶ صفحہ

بابِ سوم

مصلحانہ جنگ

مسلمانوں کی زندگی کا اصلی مقصد، اجتماعی فرائض کا اخلاقی تصور، اجتماعی فرائض کا اسلامی تصور، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر حیاتِ اجتماعی میں اس کا درجہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق، نہی عن المنکر کا طریقہ، فتنہ و فساد کے خلاف جنگ، فتنہ کی تحقیق، فساد کی تحقیق، حکومتِ الٰہی کے قیام کی ضرورت، قتال کا حکم، قتال کی غرض و غایت، جزیہ کی حقیقت، قتال کی آخری حد، اعطاءِ جزیہ، استسلام اور جہانگیریت، اسلامی فتوحات کی توجیہ، حکومت صرف صالحین کا حق ہے، ۵۶ تا ۱۰۴ صفحہ

باب چہارم

اشاعتِ اسلام اور تلوار

قتال کی آخری حد، اکراہ فی الدین، دعوت و تبلیغ کا بنیادی اصول، ہدایت و ضلالت کا راز، اشاعتِ اسلام میں تلوار کا حصہ۔ ۱۱۴ تا ۱۴۴ صفحے۔

باب پنجم

قوانینِ جنگ

طریقِ جنگ و مقصدِ جنگ کا فرق، اسلام سے پہلے عرب کا طریقِ جنگ، نخوت اور ادب کی شہادت، جنگ کے محرکات، غنیمت کا شوق، تفاخر، خون کا انتقام، جنگ کے وحشیانہ طریقے، مثلہ اور لاشوں کی تحقیر، غیر مقاتلین کا قتل، دشمن کو زندہ جلانا، اسیرانِ جنگ سے بدسلوکی، عورتوں کی بے حرمتی، غفلت میں حملہ کرنا، دشمن کی کھوپڑی میں شراب پینا، دھوکہ سے قتل کرنا، غدر و بدعہدی، عرب کی وحشیانہ جنگ کے چند نمونے، حرب واحس، حرب بسوس، حرب فجار، اوس و خزرج کی لڑائیاں۔

اسلام سے پہلے روم و ایران کا طریقِ جنگ، مذہبی مظالم، سفراء پر تعدی، بدعہدی، جنگ میں وحشیانہ اعمال، اسیرانِ جنگ کی حالت۔

اسلام کی اصلاحات:۔ مقصدِ جنگ کی تطہیر، طریقِ جنگ کی تہذیب، وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات، غیر مقاتلین کے قتل کی ممانعت، مثلہ کی ممانعت، قتلِ جریح و اسیر کی ممانعت، تخریبِ بلاد و اشجار کی ممانعت، لوٹ مار کی ممانعت، مقصد [illegible] کی ممانعت، قتلِ سفیر کی ممانعت، بدعہدی کی ممانعت، غدر و دھوکہ دہی کی ممانعت، اسلامی حربِ جنگ کا مکمل نمونہ۔ فتح مکہ۔

جنگ کے مہذب قوانین:۔ اطاعتِ امام، وفائے عہد، عہد شکنی کے مقابلہ میں مسلمانوں کا طرزِ عمل، صلح و امان، اسیرانِ جنگ، غلامیت کا مسئلہ، مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ، معاہدین کے حقوق، غیر معاہدین کے حقوق، ذمیوں کے عام حقوق، ذمیوں کے لباس کا مسئلہ۔

چند مستثنیٰ واقعات:۔ بنو نضیر کا اخراج، بنو قریظہ کا معاملہ، کعب بن اشرف کا قتل، یہودِ خیبر کا اخراج،

اہل نجران کا اخراج

آخری تبصرہ، قوانینِ شریعت کے اصولِ استنباط، جدید قانونِ جنگ کی تدوین، ۱۳۵ تا ۲۶۰،

باب ششم

جنگ دوسرے مذاہب میں

تقابلِ ادیان کے اصول، تقابل کی ضرورت، دنیا کے چار بڑے مذاہب، وہ مذاہب جنمیں جنگ ہے، (ہندو مذہب، یہودی مذہب) وہ مذاہب جنمیں جنگ نہیں ہے (بودھ مذہب، مسیحیت)

(۱) ہندو مذہب، ہندو مذہب کے تین دور،

دورِ اول کی مذہبی کتابیں:۔ ویدوں کی جنگی تعلیم، رگ وید، یجروید، سام وید، اتھروید، ویدوں کی تعلیم کا خلاصہ اور اس سے اسلام کا مقابلہ، دورِ دوم کی مذہبی کتاب گیتا، گیتا کا فلسفۂ جنگ، گیتا کا مقصدِ جنگ، گیتائی تعلیم اور اسلامی تعلیم کا مقابلہ، دورِ سوم کی مذہبی کتاب منوسمرتی، منو کے قوانینِ جنگ، جنگ کے جائز مقاصد، جنگ میں آریہ وغیر آریہ کی تمیز، غیر آریہ مفتوحین کے ساتھ سلوک، ہندو قانون میں غیر آریوں کی حیثیت، فوجداری قوانین، دیوانی قانون، تاریخ کی شہادت،

(۲) یہودی مذہب، ماخذ کی تحقیق، جنگ کے جائز مقاصد، طریقِ جنگ، اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کا فرق، غیر اسرائیلی مفتوحین کے حقوق، اسلامی اور یہودی قوانین کا مقابلہ،

(۳) بودھ مذہب، ماخذ کی تحقیق، جنگ کی کلی ممانعت، اہنسا کی تعلیم، بودھ کا فلسفہ، بودھ کا اخلاقی قانون، بودھ مذہب کی اصلی کمزوری، پیروانِ بودھ کی زندگی پر اہنسا کا اثر،

(۴) مسیحیت، ماخذ کی تحقیق، جنگ کی کلی ممانعت، مسیحیت کا فلسفۂ اخلاق، مسیحی اخلاقیات کے نقائص، مسیح کی اصلی دعوت کیا تھی؟ مسیحیت کن حالات میں پیدا ہوئی؟ مسیح کی تعلیم میں جنگ نہ ہونے کی وجہ، تعلیمِ مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق، موسوی شریعت اور مسیحیت کی علیحدگی، مسیحی سیرت پر علیحدگی کا اثر،

مجموعی تبصرہ، دوسرے مذاہب میں افراط و تفریط، اسلام میں توسط و اعتدال،

۲۶۱ تا ۳۶۸ صفحے

باب ہفتم

جنگ اور تہذیب جدید

ماخذ کی تعیین بین الاسلامی قانون کی حقیقت، بین الاسلامی قانون کے ماخذ، بین الاسلامی قانون کا شعبہ جنگ، مغربی جنگ کا اصلی قانون، نظریات جنگ، قوانین جنگ کی پائیداری، فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف، مقصد جنگ کا سوال، جنگ عظیم کے اسباب وجوہ، دول کی جنگ بندیاں، شرکائے جنگ کے پوشیدہ مقاصد، دوران جنگ میں خفیہ معاہدات، جنگ کے بعد قوموں اور ملکوں کی تقسیم، مغرب کی حق پرستی کا معیار، قیام امن اور نزع سلاح کی تجویزیں، جمعیت اقوام، تحریم جنگ و نزع سلاح کی جدید تجاویز،

مغرب کے قوانین جنگ، قوانین جنگ کی تاریخ، ہیگ کے مجموعے اور ان کی قانونی حیثیت، اعلان جنگ، اہل قتال و غیر اہل قتال کا امتیاز، وجوہ امتیاز، امتیاز کا احساس کب پیدا ہوا، موجودہ جنگ میں امتیاز کا ممکن ہے، اہل قتال کے حقوق و فرائض، قواعد حرب کی پابندی، امان، اسیران جنگ، مجروحین و مرضیٰ مقتولین، تباہ کن اشیا کا استعمال جواسیس و عیون، خدع فی الحرب، انتقام، غیر اہل قتال کے حقوق و فرائض، غیر مقاتلین کا تعین، فرض غیر مقاتلین کی عصمت، غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری، عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کا حکم، حصار، محاصرہ کے قوانین، غارت گری و تباہ کاری، غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض، غیر جانبداری کی تاریخ، موجودہ زمانہ میں غیر جانبداروں کی حیثیت، محاربین کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق، غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق،

تحت ہی تبصرہ: مغربی قانون کے مقابلہ میں اسلامی قانون کے وجوہ ترجیح، ۳۶۹ تا ۴۹۲ صفحے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں۔ اُن میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے۔ اور اپنے پیروؤں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگرچہ کچھ حقیقت ہوتی۔ تو قدرتی طور پر اسوقت پیش ہونا چاہیے تھا۔ جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خارا شگاف نے کرۂ زمین میں ایک ہلچل برپا کر رکھا تھا۔ اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خونریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی۔ اور اس کے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی۔ جبکہ اسلام کی تلوار زنگ کھا چکی تھی۔ مگر بنو دے کے موجد یورپ کی تلوار ہنگامہ ہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی۔ تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں۔ جنھوں نے خون خون ہو ہو کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین و آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں۔ انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر دہشت انگیزی جس کی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہیے ہے یہ اس تلوار کی تعلیم ہے جو اس نے دنیا کی خدمت و اصلاح کے لیے اٹھائی تھی۔ اور جس کا یہ نشان تھا کہ دنیا کی اس خدمت و اصلاح سے سب کو بھلائی پہنچے۔ نہ صرف پیروؤں جس نے خود اس کی پیروی سے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ دوسروں نے بھی اس کی پیروی سے فائدہ اٹھایا ہے

جب سپاہی میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو وہ بستر میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے جس کی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور اسی لئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلوار والے فاتحوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یہ سچ کو پوشیدہ کرنے میں یہی ہوئی۔ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اس کے پیش کردہ نظریہ کو بغیر ادنیٰ تحقیق و تفحص اور بغیر ادنیٰ غور و خوض اس طرح قبول کر لیا کہ کسی آسمانی وحی کو بھی اس طرح قبول نہ کیا ہوگا۔

اس شبہ اور موجودہ صدی میں مسلمانوں کی طرف سے بارہا اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ اور اس کثرت کے ساتھ اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے کہ اب یہ ایک فرسودہ اور پامال سا مضمون معلوم ہوتا ہے مگر اس قسم کی جو بھی تحریرات میں نے کثرت سے دیکھا ہے کہ اسلام کے وکلاء مخالفین سے مرعوب ہو کر خود بچاؤ کے مجرموں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ اور مجرموں کی طرح صفائی پیش کرنے لگتے ہیں جس حسرت نے یہ ہیجان تک کیا ہے کہ مقدمہ کو مضبوط بنانے کے لئے سرے سے اسلام کی تعلیمات ہی سے انکار کر دیا ہے۔ اور شدت مرعوبیت میں جن جن چیزوں کو انہوں نے اپنے نزدیک خوفناک سمجھا۔ انہیں ریکارڈ پر سے بالکل غائب کر دیا۔ تاکہ مخالفین کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ لیکن جن لوگوں نے یہ کمزوری اختیار نہیں کیا۔ ان کے ہاں بھی کم از کم یہ نقص ضرور موجود ہے کہ وہ جہاد و قتال کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ اور بہت سے پہلوؤں کو تشنہ چھوڑ جاتے ہیں کہ ان میں شک و شبہ کی بہت کچھ گنجائش باقی رہتی ہے غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے اسی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ کہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال بغرض اعلائے کلمۃ الٰہی کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بے کم و کاست اسی طرح بیان کر دیا جائے جس طرح وہ قرآن مجید، احادیث نبوی اور کتب فقہیہ میں درج ہیں۔ ان میں سے کسی چیز کو نہ گھٹایا جائے، نہ بڑھایا جائے۔ اور نہ اسلام کے اصلی منشاء اور اس کی تعلیم کی روح کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ میں اس حقیقت سے بھی اختلاف رکھتا ہوں کہ ہم اپنے عقائد و اصول کو دوسروں کے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں۔ دنیا کا کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں تمام لوگ ایک نقطۂ نظر پر متفق ہوں۔ ہر جماعت یا ہر ملت کا ایک نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ اور اسی کو صحیح سمجھتی ہے۔ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۝

پس ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کی رعایت سے اپنے اصول و عقائد کو خواہ کتنا ہی رنگ کر پیش کریں مگر اس کے باوجود یہ ناممکن ہے کہ تمام مختلف الخیال گروہ ہم سے متفق ہو جائے اور سب کو ہمارا وہ رنگ پسند آجائے۔ اس سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے عقائد اپنے مسائل اپنی تعلیمات اور اپنے قوانین کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بہتر سے بہتر طریقہ سے دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کریں۔ اور پھر خود اس کی عقل پر چھوڑ دیں کہ خواہ اسے قبول کرے خواہ نہ کرے۔ اگر قبول کرے تو زہے نصیب۔ اور نہ قبول کرے تو ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ دعوت و تبلیغ کا صحیح اصول ہے جسے ہمیشہ سے ارباب عزم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ اور خود انبیاء علیہم السلام نے بھی اسی پر عمل کیا ہے۔

میں ایک عرصہ سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر احساس ضرورت سے بڑھکر عمل کی جانب کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کام کے لئے بڑی فرصت درکار تھی۔ اور فرصت ہی ایک ایسی چیز ہے جو کسی اخبار نویس کو میسر نہیں آتی۔

لیکن دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جس نے مجھے مشکلات سے قطع نظر کر کے اقدام عمل پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ شدھی کی تاریخ کے بانی سوامی شردھانند کے قتل کا واقعہ تھا۔ جس سے جہلا اور کم نظر لوگوں کو اسلامی جہاد کے متعلق غلط خیالات کی اشاعت کا ایک نیا موقع مل گیا۔ کیونکہ بدقسمتی سے ایک مسلمان اس فعل کے ارتکاب کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ و اخبارات میں اس کی جانب یہ خیالات منسوب کئے گئے۔ کہ اس نے اپنے مذہب کا دشمن سمجھکر سوامی کو قتل کیا ہے اور یہ کہ اس نیک کام کے کرنے سے وہ جنت کا امیدوار ہے حقیقت کو علم تو خدا کو ہے۔ مگر منتظر عام پر جو کچھ آیا وہ قریبی واقعات تھے۔ ان کی وجہ سے عام طور پر اسلام کے دشمنوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ انھوں نے علمائے اسلام کے اعلانات اور اسلامی جرائد و عمائد ملت کی متفقہ تصریحات کے باوجود اس واقعہ کو اس کی جملی حدود تک محدود رکھنے کے بجائے تمام امت اسلامیہ کو بحیثیت خود اسلامی تعلیمات کو ذمہ دار قرار دینا شروع کر دیا۔ اور قرآن کریم کے خلاف ہر قسم کے الزامات عائد کئے گئے۔ کہ اس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے۔ اس کی تعلیم من و امان اور مسالمت کے خلاف ہے۔ اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو ایسا متعصب بنا دیا ہے کہ وہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں

دوسرے قتل کرکے جنت میں جانے کی امید رکھتے ہیں جس دریدہ دہنوں نے تو یہاں تک کہدیا کہ دنیا میں جب تک قرآن کی تعلیم موجود ہے امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تمام عالم انسانی کو اس تعلیم کے مٹانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ان غلط خیالات کی نشر و اشاعت اس کثرت کے ساتھ کی گئی ہے کہ صحیح خیال لوگوں کی نگاہیں ہی چکر گئیں۔ اور گاندھی جیسے شخص نے جو ہندو قوم میں سب سے بڑے مصلح رائے آدمی ہیں اس سے متاثر ہو کر تکرار اس خیال کا اظہار کیا کہ۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

گرچہ یہ تمام خیالات کسی تحقیق اور علمی تفحص پر مبنی نہ تھے۔ بلکہ "طوطی" کی طرح وہی سبق دہرائے جا رہے تھے۔ جو استادوں نے رٹا رکھا تھا۔ مگر ایک غیر معمولی واقعہ نے ان اوہام میں حقیقت کا رنگ پیدا کر دیا تھا جس سے ناواقف لوگ آسانی کیساتھ دھوکہ کھا سکتے تھے۔ چونکہ ایسی عام بدگمانیاں اشاعت اسلام کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتی ہیں۔ اور ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جن میں اسلام کی صحیح تعلیم کو زیادہ صفائی کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ غبار چھٹ جائے۔ اور آفتاب حقیقت زیادہ روشنی کے ساتھ طلوع ہو۔ اس لئے میں نے فرصت کا انتظار چھوڑ کر اپنے اسی قلیل وقت میں جو ترتیب اخبار سے باقی بچتا تھا۔ پیش نظر مضمون کی تحریر و تسوید کا کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ خطبہ "حجۃ الوداع" کے کلموں میں اس کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ ابتداءً محض ایک مختصر مضمون لکھنے کا ارادہ تھا۔ مگر سلسلۂ کلام چھڑنے کے بعد بحث کے اس قدر گوشے سامنے آتے چلے گئے۔ کہ اخبار کے کالموں میں اُن کا سمانا مشکل ہو گیا۔ اس لئے مجبوراً ۳۰ قسطیں شائع کرنے کے بعد میں نے اخبار میں اس کی اشاعت بند کر دی، اور اب اس پورے مسئلہ کو مکمل کر کے کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ یہ مضمون مبحث کے اکثر نقاط اور دلائل پر حاوی ہے۔ لیکن یہ بھی مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی نے بہت سے مباحث کو تشنہ چھوڑنے پر مجبور کیا ہے۔ ان مضامین کی توضیح کے لئے ایک مستقل باب کی ضرورت تھی۔ انہیں ایک نئی زود و فقود میں دکھانا ہے۔ اس بارے میں میں نے خصوصیت کیساتھ اس امر کا التزام رکھا ہے کہ نہیں اپنے یا دوسرے لوگوں کے ذاتی خیالات کو دخل نہیں دیا بلکہ تمام کلی و جزئی

مسائل خود قرآن مجید سے اخذ کر کے پیش کئے ہیں۔ اور جہاں کہیں [illegible] کی ضرورت پیش آئی ہے۔ تو احادیث نبوی معتبر کتب فقہیہ، اور صحیح و مستند تفاسیر سے مدد لی ہے۔ تاکہ ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ آج دنیا کا رنگ دیکھ کر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ جو کچھ کہا گیا ہے سب اللہ اور اس کے رسول اور ائمۂ اسلام کے ارشادات پر مبنی ہے۔

میں تمام ان غیر مسلم حضرات سے، جو تعصب کی بنا پر اسلام سے اندھی دشمنی نہیں رکھتے، درخواست کرتا ہوں کہ اس رسالہ میں اسلام کی اصلی تعلیم جنگ کا مطالعہ کریں۔ اور اسکے بعد بتائیں کہ انہیں اس تعلیم پر کیا اعتراض ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کسی شخص کو کچھ شک باقی ہو۔ تو میں اسے رفع کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

ابوالاعلیٰ

۵ جون ۱۹۳۲ء

اسلامی جہاد کی حقیقت

انسانی جان کا احترام

انسانی تمدن کی بنیاد جس قانون پر قائم ہے۔ اسکی سب سے پہلی دفعہ یہ ہے کہ انسان کی جان اور اُسکا خون محترم ہے۔ انسان کے مدنی حقوق میں دین حق زندہ رہنے کا حق ہے، اور اُسکے مدنی فرائض میں اولین فرض زندہ رہنے دینے کا فرض ہے۔ دنیا کی جتنی شریعتیں اور مہذب قوانین ہیں۔ ان سب میں احترام نفس کا یہ اخلاقی مبدا نہ کہ موجود ہے، اور جس قانون اور مذہب میں اسے تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ وہ نہ تو مہذب انسانوں کا مذہب و قانون بن سکتا ہے۔ نہ اس کے ماتحت رہکر کوئی انسانی جماعت پر امن زندگی بسر کر سکتی ہے۔ و نہ اسے کوئی فروغ حاصل ہو سکتا ہے، ہر شخص کی عقل سمجھ سکتی ہے کہ جہاں انسان کی جان کی کوئی قیمت نہ ہو۔ اسکا کوئی احترام نہ ہو، اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ وہاں آدمی کیسے رہ سکتے ہیں۔ ان میں کسطرح کوئی کاروبار ہو سکتا ہے، انہیں وہ امن و اطمینان اور وہ بے خوفی و حمیت خطر ہو کر حاصل ہو سکتی ہے جس کی انسان کو تجارت صنعت زراعت کرنے، دولت کمانے، گھر بنانے، سیر و سفر کرنے اور متمدن زندگی بسر کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اگر ضروریات سے قطع نظر کر کے خالص انسانیت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس حیثیت سے بھی کسی ذاتی فائدہ کی خاطر، یا کسی ذاتی عداوت کی خاطر اپنے ایک بھائی کو قتل کرنا بدترین قساوت و بدترین سنگدلی ہے جسکا ارتکاب کر کے انسان میں کوئی خاص بلندی پیدا ہونا تو درکنار، اسکا درجۂ انسانیت پر قائم رہنا بھی محال ہے۔

دنیا کے سیاسی قوانین اس احترام حیات انسانی کو صرف سزا کے خوف اور قوت کے ذریعہ سے قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر ایک سچے مذہب کا کام دلوں میں اسکی صحیح قدر و قیمت پیدا کر دینا ہے۔ تاکہ جہاں انسانی تعزیر کا خوف نہ ہو، اور جہاں انسانی پولیس روکنے والی نہ ہو، وہاں بھی نجی

آدم ایک دوسرے کے خون ناحق سے محترز رہیں۔ اس نقطۂ نظر سے حرمتِ نفس کی جیسی صحیح اور مؤثر تعلیم اسلام میں دی گئی ہے۔ وہ کسی دوسرے مذہب میں ملنی مشکل ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف پیرایوں سے اس تعلیم کو دلنشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سورۂ مائدہ میں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بیان کرکے جن میں سے ایک نے ظلماً دوسرے کو قتل کیا تھا۔ فرمایا ہے کہ:-

مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ أَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَآ أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ إِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْأَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (۵:۵)

اسی بنا پر ہمنے بنی اسرائیل کے لئے یہ لکھدیا کہ جو کوئی کسی کی جان لے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو۔ یا زمین میں فساد کیا ہو۔ تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کیا۔ اور جو کوئی کسی جان کو بچائے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔ ان لوگوں کے پاس ہمارے رسول کھلی کھلی دلیلیں لیکر آئے۔ مگر اس کے بعد بھی ان میں سے ایسے ہیں۔ جو زمین میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں:-

ایک دوسری جگہ خدا اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۲۵:۶۸)

وہ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے بغیر حق کے ہلاک نہیں کرتے۔ اور نہ زنا کرتے ہیں۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ کئے کی سزا پائے گا:-

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا أَوْلَادَكُمْ مِّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ

اے محمد کہدو کہ آؤ میں تمکو پڑھ سناؤں کہ اللہ نے تمپر کیا کیا حرام کیا ہے۔ تمپر واجب ہے کہ اللہ کیساتھ کسیکو شریک نہ کرو۔ والدین سے نیک سلوک کرو۔ اپنی اولاد کو مفلسی و تنگدستی کے باعث قتل نہ کرو۔ ہم جہاں تمکو رزق دیتے ہیں۔ ان کو بھی دیں گے۔ بے حیائی کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ خواہ وہ کھلی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی ہو۔ کسی

وَحَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوقَ ... | ہوئی۔ اس جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے ہلاک نہ کرو۔ مگر یہ کہ حق کا تقاضا ہو۔ اللہ نے ان باتوں کی تمہیں تاکید کی۔ شاید کہ تمہیں کچھ عقل آئے۔

اس تعلیم کے اولین مخاطب وہ لوگ تھے جن کے نزدیک انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اور جو اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر اور معمولی چیز کو بھی قتل کر دیا کرتے تھے۔ اس لئے داعیٔ اسلام علیہ الف الف تحیہ وسلام ان کی جبلتوں کی اصلاح کے لئے خود بھی ہمیشہ احترامِ نفس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ اور یہ تلقین ہمیشہ نہایت موثر انداز میں ہوا کرتی تھی۔ احادیث میں کثرت سے اس قسم کے ارشادات پائے جاتے ہیں جن میں بے گناہ کے خون بہانے کو بدترین گناہ بتایا گیا ہے بطور مثال کے طور پر چند احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔

أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ وَقَوْلُ الزُّوْرِ۔ | بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے پھر قتلِ نفس۔ پھر والدین کی نافرمانی کرنا۔ پھر جھوٹ بولنا۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور نے فرمایا۔

لَا يَزَالُ الْمُؤْمِنُ فِي فُسْحَةٍ مِنْ دِينِهِ مَا لَمْ يُصِبْ دَمًا حَرَامًا | مومن اپنے دین کی وسعت میں اس وقت تک برابر رہتا ہے جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ۔

أَوَّلُ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ الصَّلَاةُ وَأَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ فِي الدِّمَاءِ | قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اور پہلی چیز جس کا فیصلہ لوگوں کے درمیان کیا جائے گا وہ خون کے دعوے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا ان تجعل للّٰہ ندا وھو خلقک۔ یہ تو کسی کو اللہ کا نظیر و مثیل قرار دے جس نے تجھے پیدا کیا۔ اس نے پوچھا کہ اس کے بعد کونسا بڑا گناہ ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ۔

أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ یہ کہ تو اپنے بچے کو قتل کر دے اس خیال سے کہ وہ تیرے کھانے میں شریک ہوگا، اس نے عرض کیا کہ اسکے بعد کونسا گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ أَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ یہ کہ تو اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔

دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر

حرمتِ نفس کی یہ تعلیم کسی فلسفی یا مصلح کا نتیجۂ فکر نہ تھی کہ اس کا اثر صرف کتابوں اور مدرسوں تک محدود رہتا۔ بلکہ درحقیقت وہ خدا اور اسکے رسول کی تعلیم تھی، جسکا لفظ لفظ ہر مسلمان کا جزوِ ایمان تھا، اور جس کی تعمیل، تلقین اور تنفیذ ہر اس شخص پر فرض تھی جو کلمۂ اسلام کا قائل ہو۔ پس ایک چوتھائی صدی کے قلیل عرصہ ہی میں اس کی بدولت عرب جیسی خونخوار قوم کے اندر احترامِ نفس اور امن پسندی کا ایک ایسا مادہ پیدا ہوگیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق قادسیہ سے صنعا تک ایک عورت تنہا سفر کرتی تھی، اور کوئی اس کے جان و مال پر حملہ نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ یہ وہی ملک تھا۔ جہاں پچیس سال پہلے بڑے بڑے قافلے بھی بے خوف نہیں گذر سکتے تھے۔ پھر جب مہذب دنیا کا آدھے سے زیادہ حصہ حکومت اسلامیہ کے ماتحت آگیا۔ اور اسلام کے اخلاقی اثرات چار دانگِ عالم میں پھیل گئے۔ تو اسلامی تعلیم نے انسان کی بہت سی غلط کاریوں اور گمراہیوں کی طرح انسانی جان کی اس بے قدری کا بھی استیصال کر دیا۔ جو دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج دنیا کے مہذب قوانین میں حرمتِ نفس کو جو درجہ حاصل ہوا ہے۔ وہ اسی انقلاب کے نتائج میں سے ایک شاندار نتیجہ ہے۔ جو اسلامی تعلیم نے دنیا کے اخلاق میں برپا کیا تھا۔ ورنہ جس دورِ تاریک میں یہ تعلیم اتری تھی اس میں انسانی جان کی فی الحقیقت کوئی قیمت نہ تھی۔ عرب کی خونریزیوں کا نام تو اس سلسلہ میں دنیا نے بہت سنا ہے۔ مگر ان ممالک کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی جو اس زمانہ میں دنیا کی تہذیب و مدنیت و علم و حکمت کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ روما کے کولوسیم (Colosseum) کے کھنڈر اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جہاں انسان شمشیر زنی (gladiatory) کے کمالات اور وحشی درندوں کے شوقِ تماشا کی نذر ہوگئے۔ انسانوں کی تفریح کے لئے یا دوستوں کی توسیع کے لئے غلاموں کو درندوں سے پھڑوانا یا جانوروں کی طرح ذبح کر دینا ان کے لئے تماشا دیکھنا۔ یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک

میں کوئی معیوب بات نہ تھی۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دیکر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا، جاہل وخونخوار امراء سے گذر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکما وفلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی وحشیانہ صورتیں جائز تھیں۔ ارسطو و افلاطون جیسے اساتذۂ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی خرابی نہ پاتے تھے۔ کہ اپنے جسم کے ایک حصہ (یعنی جنین) کو الگ کر دے۔ اور یونان و روما میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا۔ اور رومی مقننوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اسمیں اولاد پر باپ کے اختیارات اسقدر غیر محدود ہیں۔ حکماء و اقنین کے نزدیک خودکشی کوئی بُری چیز نہ تھی۔ بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلسے کرکے اُن میں خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا شوہر کے لئے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا۔ جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے اس لئے قانون یونان میں اسکی کوئی سزا نہ تھی۔ جیور کھشا کا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مرد کی لاش پر زندہ عورت کو جلا دینا ایک جائز فعل تھا۔ اور نہ صرف اس کی تاکید تھی۔ شودر کی جان کوئی قیمت نہ رکھتی تھی۔ اور صرف اس بنا پر کہ وہ غریب برہما کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے اسکا خون برہمن کے لئے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شودر کے لئے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اسکے کان میں پگھلا ہوا سیسا ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ "جل پرواہ" کی رسم عام تھی۔ جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے۔ اور اس قسم کو اپنے لئے موجب سعادت سمجھتے تھے۔

ایسے تاریک دور میں اسلام نے آواز بلند کی کہ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اسکو قتل نہ کرو۔ مگر اس وقت کہ حق اسکے قتل کا مطالبہ کرے اس آواز میں ایک قوت تھی۔ اور قوت کے ساتھ وہ "اہنسا پرمودھرما" کی آواز کی طرح عقل اور فطرت کی مطابقت سے محروم نہ تھی۔ اس لئے وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچی۔ اس نے انسان کو اپنی جان کی صحیح قیمت سے آگاہ کیا۔ اور خواہ کسی قوم یا کسی ملک نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار کی ہو۔ [illegible] اس آواز کا کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کئے بغیر نہ رہی۔ اجتماعی تاریخ کا

کوئی انصاف پسند عالم اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کے اخلاقی قوانین میں انسانی جان کی حرمت قائم کرنیکا فخر جتنا اس آواز کو حاصل ہے اتنا "پہاڑی کے وعظ" یا "ہنسا پرمو دہرما" کی آواز کو حاصل نہیں ہے۔

قتل بالحق

مگر ذرا غور سے دیکھو کہ فقط لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ ہی نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے ساتھ اِلَّا بِالْحَقِّ بھی کہا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا نہیں کہا۔ بلکہ اس کے ساتھ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ کا استثنا بھی کر دیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ کسی کی جان کو کسی حال میں قتل نہ کرو۔ ایسا کہا جاتا تو تعلیم کا نقص ہوتا۔ عدل نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقی مظلوم ہوتا۔ دنیا کو اصلی ضرورت اس بات کی نہ تھی کہ انسان کو قانون کی پکڑ سے آزاد کر دیا جاتا۔ اور اُسے حق دیدیا جاتا کہ جتنا چاہے فساد کرے جتنی چاہے بدامنی پھیلائے جس قدر چاہے ظلم و ستم کرے۔ بلکہ اصلی ضرورت یہ تھی کہ دنیا میں امن قائم کیا جائے فتنہ و فساد کا بیج مٹا دیا جائے اور ایسا قانون بنا دیا جائے جس کے ماتحت ہر شخص اپنے حدود میں آزاد ہو۔ اور کوئی شخص کسی مقرر حد سے تجاوز کر کے دوسروں کے مادی یا روحانی امن میں خلل ہرگز نہ کرے۔ پس اس کے لئے محض لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ کی حمایت ہی درکار نہ تھی بلکہ اِلَّا بِالْحَقِّ کی محافظ قوت بھی درکار تھی ورنہ امن کی بجائے بدامنی ہوتی۔

دنیا کا کوئی قانون جو مکافات عمل کے اصول سے خالی ہو کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا انسانی فطرت اتنی اطاعت شعار نہیں ہے کہ جس چیز کا حکم دیا جائے اسے خوشی سے قبول کرے اور جس چیز سے منع کیا جائے اسکو خوشی سے ترک کر دے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں فتنہ و فساد کبھی کا نہ ہوتا۔ اور نہ کبھی مقربین خدا سے نہ کہتے کہ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کیا تو زمین میں اس انسان کو اپنا خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزی کرے گا پس اس کی سرشت جبلت کو اطاعت امر پر مجبور کرنے کے لئے ایسے قانون کی ضرورت تھی جو حکم دینے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر تم اس کی تعمیل نہ کرو گے تو یہ نتیجہ ہوگا۔ منع کرنے کے ساتھ یہ بھی ہو کہ اگر فلاں ممنوع سے اجتناب نہ کیا جائے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا اس کی تعمیل کے بعد اس میں فرمایا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا

اللہ۔ جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو۔) کہنا کافی نہ ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے ساتھ یہ بھی نہ بتا دیا جائے کہ اگر اس گناہ عظیم سے کسی نے اجتناب نہیں کیا۔ اور فساد پھیلایا۔ اور قتل و خون کیا تو اسے یہ سزا دی جائے گی۔

انسانی تعلیم میں ایسا نقص رہ جانا ممکن ہے۔ مگر خدائی قانون اتنا ناقص نہیں ہو سکتا اس نے صاف طور پر بتلا دیا کہ انسانی خون کی حرمت صرف اسوقت تک ہے جب تک اسپر "حق" نہ قائم ہو جائے۔ اسے زندگی کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر دیا جا سکتا ہے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ و فساد پھیلائے۔ اور دوسرے کی جان پر ناحق حملہ کرے۔ تو وہ اپنے حق حیات کو خود بخود کھو دیتا ہے اس کے خون کی حرمت زائل ہو کر حلت سے بدل جاتی ہے۔ اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ قتل بڑی بری چیز ہے۔ مگر اس سے زیادہ بری چیز فتنہ و فساد ہے۔ اور جب کوئی شخص اس بڑے جرم کا مرتکب ہو تو اس کی بڑی برائی کا اس چھوٹی برائی سے خاتمہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ اسی طرح جو شخص کسی دوسرے کی ناحق جان لے۔ اس کے لئے حکم ہوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى (تم پر مقتولوں کے لئے قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے) اور اس کے ساتھ اس امتیاز کو بھی مٹا دیا گیا جسے گمراہ قوموں نے اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ فرمایا۔ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ یہ نہیں ہو سکتا کہ امیر غریب کو مار ڈالے یا آزاد خادم کو قتل کر دے۔ تو وہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بلکہ انسان ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ جان کے بدلے جان ہی لیجائے گی۔ خواہ امیر کی ہو یا غریب کی۔ پھر اس خیال سے کہ کسیکو اس ناگزیر خونریزی میں تامل نہ ہو۔ فرمایا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۔ اے عقلمندو! اس قصاص کو موت نہ سمجھو۔ بلکہ یہ تو فی الحقیقت سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو اس کے جسم سے ایک فاسد و مہلک پھوڑے کو کاٹ کر علیحدہ کی جا رہی ہے۔ حیات فی القصاص کے اس فلسفہ کو حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر خوب سمجھایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُومًا اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم سننے والے کو حیرت ہوئی کہ مظلوم کی حمایت تو برحق۔ مگر یہ ظالم کی اعانت کیسی؟ پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم مظلوم کی اعانت تو ضرور کرینگے

لیکن ظالم کی اعانت کس طرح کریں؟ آپ نے فرمایا تلخذ فوق یدیہ اس طرح کہ تو اسکا ہاتھ پکڑ لے۔ اور اُسے ظلم سے باز رکھے۔ پس درحقیقت ظالم کے ظلم کو روکنے میں اس کے ساتھ جو سختی بھی کی جائے۔ وہ سختی نہیں ہے۔ بلکہ عین نرمی اور خود اس کی مدد ہے۔ اسی لئے اسلام میں حدودِ الٰہی کو قائم کرنے کی سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے، اور اسے رحمت و برکت کا موجب بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اقامۃ حد من حدود اللہ خیر من مطر اربعین لیلۃ فی بلاد اللہ عزوجل اللہ کی حدود میں سے ایک حد قائم کرنے کی برکت ۴۰ دن کی بارش سے زیادہ ہے۔ بارش کی برکت یہ ہے کہ اس سے زمین سیراب ہوتی ہے فصلیں خوب تیار ہوتی ہیں۔ خوشحالی بڑھتی ہے۔ مگر اقامتِ حدود کی برکت اس سے بڑھکر ہے، کہ اس سے فتنہ و فساد اور ظلم و بدامنی کی جڑ کٹتی ہے۔ خدا کی مخلوق کو امن چین سے زندگی بسر کرنا نصیب ہوتا ہے۔ اور قیامِ امن سے وہ طمانیت میسر آتی ہے۔ جو تمدن کی جان اور ترقی کی روح ہے۔

قتل بالحق اور قتل بغیر حق کا فرق

قتل بغیر حق کی ایسی سخت ممانعت اور قتل بالحق کی ایسی سخت تاکید سے شریعت الٰہیہ نے افراط اور تفریط کی دونوں راہیں چھوڑ کر عدل و توسط کی سیدھی راہ کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ ایک طرف وہ مسرف اور حد سے تجاوز کرنیوالا گروہ ہے جو انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا۔ اور اپنی نفسانی خواہشات پر اسے قربان کر دینا جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف وہ غلط فہم اور غلط بین گروہ ہے جو خون کے تقدس اور بڑی حرمت کا قائل ہے۔ اور کسی حال میں بھی اسے بہانا جائز نہیں سمجھتا۔ اسلامی شریعت نے ان دونوں غلط خیالوں کی تردید کر دی۔ اور اس نے بتایا کہ نفس انسانی کی حرمت نہ تو کعبہ۔ یا ماں بہن کی حرمت کی طرح ابدی ہے کہ کسی طرح حلت سے بدل ہی نہ سکے۔ اور نہ اس کی قیمت اتنی کم ہے کہ نفسانی جذبات کی تسکین کی خاطر سے ہلاک کر دینا جائز ہو۔ اس نے ایک طرف یہ بتایا کہ انسان کی جان اس لئے نہیں ہے کہ تفریح طبع کے لئے اس کے بہنے اور تڑپنے کا تماشہ دیکھا جائے۔ اسکو جہاں کہیں عقوبتیں دیکر ہلاک کیا جائے۔ کسی شخص خواہشات کی راہ میں حائل دیکھکر فنائے گھاٹ اتار دیا جائے۔ یا بے اس توہمات اور غلط رسموں کی قربان گاہ پر اس کی بھینٹ چڑھائی جائے۔ ایسی ناپاک غرض کے لئے اس کا خون بہانا یقیناً حرام و سخت

معصیت ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی بتایا کہ ایک چیز انسان کی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اور وہ "حق" ہے، وہ جب اس کے خون کا مطالبہ کرے تو اسے بہانا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے، اور اسکو نہ بہانا اول درجہ کی معصیت۔ انسان جب تک حق کا احترام کرتا ہے اسکا خون واجب الاحترام رہتا ہے۔ مگر جب وہ سرکشی اختیار کرکے "حق" پر دست درازی کرتا ہے تو اپنے خون کی قیمت خود کھو دیتا ہے، اور پھر اس خون کی قیمت اتنی بھی نہیں رہتی جتنی پانی کی ہوتی ہے۔

ناگزیر خونریزی

یہ قتل بالحق اگرچہ صورت میں قتل بغیر حق کی طرح خونریزی ہی ہے۔ مگر یہ ناگزیر خونریزی ہے۔ جس کسی حال میں چھٹکارا نہیں، اس کے بغیر دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے نہ شرف و فضل کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ نہ نیکوں کو بدوں کی شرارت سے نجات ملسکتی ہے۔ نہ حقدار کو حق مسکتا ہے، نہ ایمانداروں کو ایمان اور ضمیر کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ سرکشوں کو ان کے جائز حدود میں محدود رکھا جا سکتا ہے۔ اور نہ اللہ کی مخلوق کو مادی و روحانی چین میسر آسکتا ہے۔ اگر اسلام پر ایسی خونریزی کا الزام ہے تو اسے اس الزام کے قبول کرنے میں ذرہ برابر بھی عار نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اور کون ہے جس کا دامن اس ناگزیر خونریزی کی چھینٹوں سے سرخ نہیں ہے؟ بودھ مذہب کی اہنسا اس کو ناجائز رکھتی ہے۔ مگر وہ بھی بھکشو اور گرہستی میں فرق کرنے پر مجبور ہوئی۔ اور آخر اس نے ایک قلیل جماعت کے لئے نجات (نروان) کو محفوظ رکھنے کے بعد باقی تمام دنیا کو چند اخلاقی ہدایات دیکر گرہست دھرم اختیار کرنے کے لئے چھوڑ دیا، جس میں سیاست، تعزیر، اور جنگ سب کچھ ہے۔ اسی طرح مسیحیت بھی جنگ کی کلی تحریم کے باوجود آخر کار جنگ پر مجبور ہوئی اور جب رومی سلطنت کے مظالم برداشت کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تو آخر کار رُس نے خود سلطنت پر قبضہ کرکے ایسی جنگ برپا کی جو ناگزیر خونریزی کی حد سے بھی آگے نکل گئی۔ جدید مذہب میں بھی متاخرین فلاسفہ نے "اہنسا پرمو دھرما" کا عقیدہ تجویز کیا۔ اور جیو ہتیا کو پاپ قرار دیا، مگر اسی عہد کے مقتن منو سے فتویٰ پوچھا گیا کہ "اگر کوئی شخص ہماری عورتوں پر دست درازی کرے، یا ہمارا مال چھینے، یا ہمارے دھرم کی بے آبروئی کرے تو ہم کیا کریں"؟ تو اس نے جواب دیا کہ "ایسے جفاکار انسان کو ضرور مار ڈالنا چاہیئے۔ خواہ اس سے کہ وہ گورو ہو، یا عالم برہمن، بوڑھا ہو، یا نوجوان"۔

یہاں مذاہب کا مقابلہ کرکے اس ناگزیر خونریزی کی ضرورت ثابت کرنے کا موقع نہیں ہے تقابلِ ادیان کی بحث ایک الگ چیز ہے، جو اپنے موقع پر آئے گی۔ اور اسوقت یہ ثابت ہو جائیگا کہ جو مذاہب جنگ کو بُرا سمجھتے ہیں وہ بھی عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اس ناگزیر چیز سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکے ہیں، سرِدست ہمارا مدعا صرف یہ دکھلانا ہے کہ نمائش اخلاق کے لئے کوئی جماعت خواہ کیسے ہی بلند پرواز خیالی فلسفوں تک پہنچ جائے لیکن عالم مادی میں آکر جو سراسر کشمکش گاہ عمل ہے اسے دنیا کے تمام مسائل کو عملی صورتوں سے ہی حل کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ دنیا خود اسکو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی حقیقتوں کا عملی تدابیر سے مقابلہ کرے۔ خدائے اسلام کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ حرمتِ نفس کے لئے ویسے ہی خیالی لذت بخشنے والے اصول پیش کرتا۔ جیسے کہ اہنسا کے عقیدہ میں پائے جاتے ہیں اور یقیناً وہ اپنے معجزانہ کلام میں ان کو پیش کرکے دنیا کی عقلوں کو دنگ کر سکتا تھا۔ مگر اس فاطرِ کائنات کو خطابت اور فلسفہ کی نمائش مقصود نہ تھی بلکہ وہ اپنے بندوں کے لئے ایک صحیح اور واضح دستورِ عمل پیش کرنا چاہتا تھا جس پر کاربند ہو کر ان کی دنیا اور دین درست ہو سکے۔ اس لئے جب اس نے دیکھا کہ الا بالحق کے استثنا کے بغیر محض لاتقتلوا النفس کا عام حکم مفید نہیں ہو سکتا تو یہ اس کی بے عیب ذات سے بعید تھا کہ دنیا والوں کو لم تقولون ما لا تفعلون، تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو کا طعنہ دینے کے باوجود انہیں زبان سے اہنسا پرمودھرم کی آواز بلند کرنے اور ہاتھ سے مواد چلانے کی تعلیم دیتا۔ پس یہ اللہ کی حکمت بالغہ ہی تھی کہ اس نے حرمتِ نفس کی تعلیم کے ساتھ قصاص کا قانون بھی مقرر کیا۔ اور اسطرح اس قوت کے استعمال کو ضروری قرار دیا جسکا استعمال حرمتِ نفس کی حفاظت کے لئے ناگزیر ہے۔

اجتماعی فتنہ

یہ قصاص کا قانون جسطرح افراد کے لئے ہے اسی طرح جماعتوں کے لئے بھی ہے جس طرح افراد سرکش ہوتے ہیں اسی طرح جماعتیں اور قومیں بھی سرکش ہوتی ہیں جس طرح فرد حرص و طمع سے مغلوب ہو کر اپنی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اسی طرح جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ خلقی مرض پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اور اسی جسطرح افراد کو قابو میں رکھنے اور حد سے باہر نکلنے کے لئے تلوار کی ناگزیر ہوتی ہے، اسی طرح بالکل

اور قوموں کی بڑھتی ہوئی حرص وطمع اور بڑھتی ہوئی بدکاری کو روکنے کے لئے بھی جنگ ناگزیر ہوجاتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے انفرادی اور اجتماعی فتنہ میں کوئی فرق نہیں ہے مگر کیفیت کے اعتبار سے عظیم الشان فرق ہے۔ افراد کا فتنہ ایک تنگ دائرے میں محدود ہوتا ہے انسانوں کی ایک قلیل جماعت کو اس سے آزار پہنچتا ہے۔ اور گز بھر زمین رنگین کرکے اسکا استیصال کیا جاسکتا ہے۔ مگر جماعتوں کا فتنہ ایک غیر محدود مصیبت ہوتا ہے جس سے بیشمار انسانوں کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔ پوری کی پوری قوموں پر عرصۂ حیات تنگ ہوجاتا ہے۔ تمدن کے سارے نظام میں ایک ہل چل برپا ہوجاتی ہے۔ اور اسکا استیصال خون کی ندیاں بہائے بغیر نہیں ہوسکتا جسے قرآن مجید میں اثخان فی الارض کے معنی خیز لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے'

جماعتیں جب سرکشی پر آتی ہیں تو کوئی ایک فتنہ نہیں ہوتا جو برپا کرتی ہوں، ان میں طرح طرح کے شیطان شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے طرح طرح کی شیطانی قوتیں ان کے طوفان میں اُبھر آتی ہیں، اور ہزاروں قسم کے فتنے ان کی بدولت اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں بعض ان میں دھن دولت کے لالچی ہوتے ہیں۔ تو وہ غریب قوموں پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ ان کی تجارت پر قبضہ کرتے ہیں۔ ان کی صنعتوں کو برباد کرتے ہیں۔ ان کی محنت سے کمائے ہوئے روپے کو قسم قسم کی چالاکیوں سے لوٹتے ہیں اور قوت کے حق کی بنا پر اس دولت سے اپنے خزانے بھرتے ہیں۔ جس کی جائز حد اور وہ فاقہ کش مظلوم قومیں ہوتی ہیں۔ بعض ان میں ہوائے نفسانی کے بندے ہوتے ہیں تو وہ اپنے جیسے انسانوں کے خدا بن بیٹھتے ہیں اپنی خواہشات پر کروڑوں کے حقوق قربان کرتے ہیں۔ عدل وانصاف کو مٹا کر ظلم وجفا کے علم بلند کرتے ہیں۔ شر پسندوں اور نیکوکاروں کو دبا کر سفیہوں اور کمینوں کو سربلند کرتے ہیں۔ ان کے ناپاک اثر سے قوموں کے اخلاق تباہ ہوجاتے ہیں۔ محاسن اور فضائل کے چشمے سوکھ جاتے ہیں، اور ان کی جگہ خیانت، بدکاری، بے حیائی، سنگدلی، بے انصافی اور بے شمار دوسرے اخلاقی مفاسد کی بدروئیں جاری ہوجاتی ہیں۔ پھر ان میں سے بعض وہ ہیں جن پر جہانگیری وکشورستانی کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ تو وہ بے بس اور کمزور قوموں کی آزادیاں سلب کرتے ہیں، خدا کے بیگناہ بندوں کے خون بہاتے ہیں، اپنی خواہش اقتدار کو پورا کرنے کے لئے زمین میں فساد

پھیلاتے ہیں۔ اور آزاد انسانوں کو اُس غلامی کا طوق پہناتے ہیں جو تمام خلقی مفاسد کی جڑ ہے۔ ان شیطانی صفات کے ساتھ جب اکراہ فی الدین بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اور ان ظالم جماعتوں میں سے کوئی جماعت اپنی اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کر کے بندگانِ خدا کو مذہبی آزادی سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ اور دوسرے مذہب والوں پر اس وجہ سے ظلم و ستم توڑتی ہے کہ وہ اس کے مذہب کے بجائے دوسرے مذہب کی پیروی کیوں کرتے ہیں تو یہ مصیبت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت مُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ (کمزور عورتیں مرد اور بچے) ظلم و ستم سے عاجز آ کر پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (اے خدا! تو ہمیں اس ملک سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ہی ظالم و جفاکار ہیں) اور وہ کلیپ کلیپ کر کسی ایسی طاقت کے بھیجنے کی خدا سے دعا کرتے ہیں جو ان کی مدد کرے۔ اور اس سے کہتے ہیں کہ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا تو اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست اور مددگار بنا کر بھیج۔

جنگ ایک اخلاقی فرض

ایسی حالت میں جنگ جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہو جاتی ہے، اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوتی ہے کہ ان ظالموں کے خون سے زمین کو سُرخ کر دیا جائے۔ اور ان مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے شر سے انسانیت کے مظلوم و بے بس بندوں کو نجات دلائی جائے جو شیطان کی امت بنکر اولاد آدم پر اخلاقی، روحانی اور مادی تباہی کی مصیبتیں نازل کرتے ہیں۔ وہ لوگ درحقیقت انسان نہیں ہوتے کہ انسانی ہمدردی کے مستحق ہوں بلکہ انسان کے لباس میں شیطان اور انسانیت کے حقیقی دشمن ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ اصلی ہمدردی یہی ہے۔ کہ انہیں اور ان کے شر کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے۔ وہ اپنے کرتوتوں سے اپنے حقِ حیات کو خود کھو دیتے ہیں۔ انہیں اور ان لوگوں کو جو ان کے شر کو باقی رکھنے کے لئے ان کی مدد کریں دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا اور وہ درحقیقت انسانیت کے جسم کا ایسا عضو ہوتے ہیں جس میں زہریلا اور فاسد مادہ بھر گیا ہو۔ اور جس کے باقی رکھنے سے تمام جسم کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس سے قطع و برید ہی کا معاملہ ہوتا ہے کہ اس فاسد و مفسد عضو کو کاٹ پھینکا جائے۔ بہت ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی شخص پسند خلقی معمر یا متعلم

ایسا بھی ہو جس کے نزدیک ایسے ظالموں کا قتل بھی ناجائز ہو۔ اور اس کی بزدل روح اس خون کے سیلاب کے تصور سے کانپ اٹھتی ہو۔ جو ان کا شر دفع کرنے میں بہتا ہے۔ مگر ایسا معلم دنیا کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ جنگلوں۔ اور پہاڑوں میں جا کر تقویٰ و ریاضت سے اپنی روح کو تو ضرور تسکین پہنچا سکتا ہے۔ مگر اس کی تعلیم دنیا کو بدی سے پاک کرنے اور ظلم و سرکشی سے محفوظ رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ وہ نفس کش انسانوں کی ایسی جماعت تو ضرور مہیا کر سکتا ہے۔ جو مظلوموں کے ساتھ ظلم سہنے میں خود بھی شریک ہو جائے۔ مگر بلند حوصلہ انسانوں کی ایسی جماعت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے جو ظلم کو مٹا کر عدل قائم کر دے۔ اور خلقِ خدا کے لئے امن و چین سے رہنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین تک پہنچنے کے وسائل مہیا کر دے۔

عملی اخلاق جس کا مقصد تمدن کا صحیح نظام قائم کرنا ہے۔ دراصل ایک دوسرا ہی فلسفہ ہے جس میں خیالی لذت کے سامان ڈھونڈنا بیکار ہے۔ جس طرح علم کا مقصد لذتِ کام و دہن نہیں بلکہ اصلاحِ بدن ہے۔ خواہ کڑوی دوا سے ہو یا میٹھی سے اسی طرح اخلاق کا مقصد بھی لذتِ ذوق و نظر نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کی اصلاح ہے خواہ سختی سے ہو۔ خواہ نرمی سے۔ کوئی سچا اخلاقی مصلح تلوار اور قلم میں سے ایک چیز کو اختیار کرنے اور ایک ہی ذریعہ فریضۂ اصلاح کو انجام دینے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کو اپنا کام پورا کرنے کے لئے دونوں چیزوں کی یکساں ضرورت ہے۔ جب تک زبانی تلقین و تبلیغ شوریدہ سر جماعتوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانے میں کارگر ہو سکتی ہو۔ تو ان کے خلاف تلوار استعمال کرنا ناجائز بلکہ حرام ہے۔ مگر جب کسی جماعت کی شرارت و بد باطنی اس حد سے گذر چکی ہو کہ اسے وعظ و تلقین سے راہِ راست پر لایا جا سکے اور اس کو دوسری جماعتوں اور قوموں پر دست درازی کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے۔ ان کی عزت و شرافت کو پامال کرنے اور ان کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے سے باز رکھنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو ہر سچے بہی خواہِ انسانیت کا یہ اولین فرض ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔ اور اسوقت تک آرام نہ لے جب تک خدا کی مخلوق کو اس کے کھوئے ہوئے حقوق واپس نہ مل جائیں۔

جنگ کی مصلحت

جنگ کی اسی مصلحت و ضرورت کو خدائے حکیم و خبیر نے اپنے حکیمانہ ارشاد میں ظاہر فرمایا ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۔ (۲۲ : ۶۰)

اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو صومعے اور گرجے اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے مسمار کر دی جاتیں

اس آیۂ مبارکہ میں صرف مسلمانوں کی مسجدوں ہی کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ تین اور چیزوں کا بھی ذکر فرمایا ہے، یعنی صوامع، بیع اور صلوات۔ صوامع سے مراد عیسائیوں کے راہب خانے، مجوسیوں کے معابد اور صابیوں کے عبادت خانے ہیں۔ اور بیع کے لفظ میں عیسائیوں کے گرجے۔ اور یہودیوں کے کنائس دونوں داخل ہیں، یہ جامع الفاظ استعمال کرنے کے بعد پھر صلوات کا ایک اور وسیع لفظ استعمال کیا جس کا اطلاق ہر موضع عبادت الٰہی پر ہوتا ہے۔ اور ان سب کے آخر میں مساجد کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اگر اللہ عادل انسانوں کے ذریعہ ظالم انسانوں کو دفع نہ کرتا رہتا تو اتنا فساد ہوتا کہ عبادتیں۔ ہیں تک بربادی سے نہ بچتیں۔ جن سے ضرر کا کسی کو اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ فساد کی سب سے زیادہ مکروہ صورت یہ ہے کہ ایک قوم عداوت کی راہ سے دوسری قوم کے معبدوں تک کو برباد کر دے۔ اور پھر نہایت بلیغ انداز میں اپنے اس منشا کا بھی اظہار کر دیا کہ جب کوئی قوم ایسا فساد برپا کرتی ہے تو ہم دوسری قوم کے ذریعہ اس کی شرارت کا استیصال کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

جنگ کی اسی مصلحت کو دوسری جگہ جالوت کی سرکشی اور حضرت داؤدؑ کے ہاتھ سے اس کے مارے جانے کا ذکر کرتے ہوئے یوں بیان فرمایا ہے۔ کہ:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِينَ (۲ : ۲۵۲)

اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی مگر اللہ تو دنیا پر بڑا فضل کرتا ہے۔

ایک اور جگہ قوموں کی باہمی عداوت و دشمنی کا ذکر کر کے اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ:۔

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۔ (۵ : ۶۴)

یہ جب کبھی جنگ کی آگ بھڑکانے کی تدبیر کرتے ہیں تو اللہ اس پر پانی ڈال دیتا ہے یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

جہاد فی سبیل اللہ

یہی فساد اور بدامنی اور طمع و ہوس، بغض و عداوت۔ تعصب و تنگ نظری کی جنگ ہے جس کی آگ کو فرو کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا، وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ:۔ (۲۲ : ۶)

جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے انہیں لڑنے کی اجازت دیجاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ انکی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے بے قصور نکالے گئے ہیں۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ یہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے،

یہ اسلام میں پہلی آیت ہے جو قتال کے بارے میں اتری ہے۔ اور اس میں جن لوگوں کے خلاف جنگ کا حکم دیا گیا ہے ان کا قصور یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس ایک زرخیز ملک ہے، یا وہ تجارت کی ایک بڑی منڈی کے مالک ہیں۔ یا وہ ایک دوسرے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ بلکہ ان کا جرم صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ظلم کرتے ہیں۔ لوگوں کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔ اور اس قدر متعصب ہیں کہ محض اللہ کو پروردگار کہنے پر تکلیفیں پہنچاتے ہیں اور مصیبتیں توڑتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف صرف اپنی مدافعت ہی میں جنگ کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ دوسرے مظلوموں کی اعانت و حمایت کا بھی حکم دیا گیا ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ کمزور و بے بس لوگوں کو ظالموں کے پنجہ سے چھڑاؤ:۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا۔

(۴ : ۱۰)

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے خدا ہمیں اس بستی سے نکال۔ جہاں کے لوگ بڑے ظالم و جفا کار ہیں۔ اور ہمارے لئے خاص اپنی طرف سے ایک محافظ و مددگار مقرر فرما۔

* * *

اس جنگ کو جو ظالموں اور مفسدوں کے مقابلہ پر کمزوروں بے بسوں اور مظلوموں کی اعانت کے لئے کی جائے اللہ نے خاص راہِ خدا کی جنگ قرار دیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ جنگ بندوں کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے۔ اور بندوں کی اغراض کے لئے نہیں۔ بلکہ خاص خدا کی خوشنودی کے لئے لڑی جاتی ہے۔ اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک خدا کے بیگناہ بندوں پر نفسانی اغراض کے لئے دست درازی اور جبر و ظلم کرنے کا سلسلہ بند نہ ہو جائے۔ جیسا کہ فرمایا قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ان سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتیار ڈال دے اور فساد کا نام و نشان اس طرح مٹ جائے کہ اس کے مقابلہ پر جنگ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس مبنی بر حق جنگ کو خونریزی سمجھ کر چھوڑ دینے یا اس میں جان و مال کا نقصان دیکھ کر تامل کرنے کا نتیجہ کس قدر خراب ہے۔

حق و باطل کی حد بندی

اس طرح خدا نے حمایتِ حق کی جنگ کی مصلحت و ضرورت ظاہر کرنے اور تاکید فرمانے ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ یہ تصریح بھی فرما دی ہے کہ:-

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ (۴ : ۱۰)

جو لوگ ایماندار ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور جو کافر و نافرمان ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں۔ پس شیطان کے دوستوں سے لڑو کہ شیطان کی جنگ کا پہلو کمزور ہے۔

یہ ایک قولِ فیصل ہے جس میں حق اور باطل کے درمیان پوری حد بندی کر دی گئی ہے جو لوگ ظلم و سرکشی کی راہ سے جنگ کریں وہ شیطان کے دوست ہیں اور جو ظلم نہیں بلکہ ظلم کو مٹانے کے لئے جنگ کریں وہ راہِ خدا کے مجاہد ہیں۔ ہر وہ جنگ جس کا مقصد حق و انصاف کے خلاف بندگانِ خدا کو تکلیف دینا ہو جس کا مقصد حق کو بے حق کرنا اور انہیں انکی جائز ملکیتوں سے بیدخل کرنا ہو جس کا مقصد اللہ کا نام لینے والے لوگوں کو بے قصور ستانا ہو وہ فی سبیل طاغوت کی جنگ ہے۔ اسے خدا سے کچھ واسطہ نہیں اور ایسی جنگ کرنا ایمانداروں کا کام نہیں ہے۔ اسی لئے جو لوگ ایسے ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کی حمایت و مدافعت کرتے ہیں جو فساد ظلم و طغیان کو مٹا کر عدل و انصاف قائم کرنا چاہتے ہیں جو سرکشوں اور فسادیوں کی جڑ کاٹنے کر

بندگان خدا کو امن و اطمینان سے زندگی بسر کرنے اور انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کی طرف ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ان کی جنگ راہِ خدا کی جنگ ہے، وہ مظلوموں کی کیا مدد کرتے ہیں گویا خود خدا کی مدد کرتے ہیں۔ اور اللہ کی نصرت کا وعدہ انہی کے لئے ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت

یہی وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جس کی فضیلت سے قرآن کے صفحے بھرے پڑے ہیں جس کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ؟ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۶۱:۲)

اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟ وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہترین کام ہے۔ اگر تم علم رکھتے ہو۔

* * *

جس کے لڑنے والوں کی تعریف میں فرمایا کہ:۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔

(۶۱:۴)

اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اسکی راہ میں اس طرح صف باندھ کے ہوئے جم کر لڑتے ہیں۔ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جس کی بلندی و عظمت کی گواہی اس شان سے دی ہے کہ:۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو ان لوگوں کے کام کے برابر ٹھہرایا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں لڑے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ جو لوگ ایمان لائے جنہوں نے حق کی خاطر گھر بار چھوڑا اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے لڑے اُنکا درجہ اللہ کے

نزدیک سب سے بڑا ہی، اور وہی لوگ ہیں جو حقیقت میں کامیاب ہیں۔

پھر یہی وہ حق پرستی کی جنگ ہے جس میں ایک رات کا جاگنا ہزار راتیں جاگ کر عبادت کرنے سے بڑھکر ہے جس کے میدان میں جم کر کھڑے ہونا۔ گھر بیٹھ کر ۶۰ برس تک نمازیں پڑھتے رہنے سے افضل بتایا گیا ہی جس میں جاگنے والی آنکھ پر دوزخ کی آگ حرام کردی ہے جس کی راہ میں غبار آلود ہونے والے قدموں سے وعدہ کیا گیا ہی کہ وہ کبھی آتشِ دوزخ کی طرف نہ گھسیٹے جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو اس سے بچکر گھر بیٹھ جائیں اور اس کی پکار سنکر کھسکنے لگیں ایسے غضبناک لہجہ میں تنبیہ کی گئی ہے کہ :-

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(۹ : ۳)

ان سے کہدو اگر تمہیں اپنے باپ بیٹے۔ بھائی بیویاں رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں۔ اور وہ تجارت جس کے مندے پڑجانے کا تمہیں ڈر لگا ہوا ہے اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو۔ تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ یہاں تک کہ خدا اپنا کام پورا کردے یقین رکھو کہ اللہ فاسقوں کو کبھی ہدایت نہیں بخشتا

فضیلتِ جہاد کی وجہ

غور کرو کہ جب فی سبیل اللہ کی اتنی فضیلت اور تعریف کس لئے ہے؟ جہاد کرنے والوں کو بار بار کیوں کہا جاتا ہے کہ وہی کامیاب ہیں اور انہی کا درجہ بلند ہے؟ اور اس سے بچکر گھر بیٹھنے والوں کو ایسی تنبیہیں کیوں کی جاتی ہیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لئے ذرا ان آیات پر پھر ایک نظر ڈال جاؤ جنہیں جہاد کا حکم اور اس کی فضیلت اور اس سے بھاگنے کی برائی لکھی ہے۔ ان آیات میں کامیابی اور عظمت و درجہ کے معنی کسی جگہ مال و دولت اور ملک و سلطنت کا حصول نہیں بتلائے گئے جس طرح کرشن جی نے جن سے کہا تھا کہ اگر تو اس جنگ (مہابھارت) میں کامیاب ہوا تو دیش کے راج کو بھوگے گا (گیتا ۲ : ۳۷) .... اس طرح قرآن میں کہیں یہ کہہ کر قتال فی سبیل اللہ کی جانب رغبت نہیں دلائی گئی کہ اس کے

عوض تمہیں دنیا کی دولت اور حکومت ملے گی۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے عوض صرف خدا کی خوشنودی اور صرف اللہ کے ہاں بڑا درجہ ملنے اور عذاب الیم سے محفوظ رہنے کی توقع دلائی گئی ہے۔ سقایۃ حاج اور عمارۃ مسجد حرام سے جو عرب میں بڑے رسوخ و اثر اور بڑی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ گھر بار چھوڑ کر نکلنے اور جہاد فی سبیل اللہ کرنے کو افضل بتایا۔ اور پھر اس کے عوض اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ (اللہ کے نزدیک بڑے درجے) کے سوا اور کسی کامیابی کی راہ بھی نہیں بتائی۔ دوسری جگہ ایک تجارت کا گر سکھایا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہاں کچھ دھن دولت کا ذکر ہوگا۔ مگر پڑھکر دیکھئے تو اس تجارت کی حقیقت یہ نکلتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان اور مال کھپاؤ۔ اور اس کے عوض عذاب سے نجات حاصل کرو۔ ایک اور جگہ لڑائی سے جی چرانے والوں کو ڈانٹا جا رہا ہے۔ وہ بیوی بچوں کی محبت کے علاوہ اپنے کمائے ہوئے مال اور اپنی تجارت کے کساد اور اپنے محبوب مکانوں کے چھٹنے کا خوف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں جنگ کر کے جو لوگ ملک فتح کرتے ہیں انہیں روپیہ بھی خوب ملتا ہے۔ ان کی تجارت بھی خوب چمکتی ہے۔ اور انہیں مفتوح قوم سے چھینی ہوئی قلعہ معلی جیسی عالیشان عمارتیں بھی رہنے کو ملتی ہیں۔

پھر جب اس جہاد سے دنیا کی دولت اور ملک گیری مقصود نہیں ہے۔ تو آخر اس خون بہانے سے اللہ کو کیا ملتا ہے۔ کہ وہ اس کے عوض اتنے بڑے بڑے درجے دے رہا ہے؟ آخر اس خونریزی کی تگ و دو میں کیا رکھا ہے کہ اس کی بھاگ دوڑ سے گرد آلود ہونے والے قدموں تک کو الطاف و عنایات کا مورد بنایا جاتا ہے؟ اور آخر اس میں وہ کونسی کامیابی مضمر ہے کہ اس خشک و بے مزہ جہاد کے لڑنے والوں کو بار بار اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ کہا جا رہا ہے؟ اس کا جواب اسی لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اور اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ میں پوشیدہ ہے۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کی زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا جائے۔ اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ اس کے بندوں کو بے قصور ستایا اور تباہ و برباد کیا جائے۔ اسے یہ پسند نہیں ہے کہ طاقتور کمزوروں کو کھا جائیں۔ ان کے امن و چین پر ڈاکے ڈالیں۔ ان کی اخلاقی روحانی اور مادی زندگی کو ہلاکت میں مبتلا کریں۔ اسے یہ منظور نہیں ہے کہ زمین میں سرکشی و بدامنی [illegible] قائم رہے وہ پسند نہیں

رتا کہ جو خاص اس کے غلام ہیں۔ ان کو مخلوق کا غلام بنا کر ان کی انسانی شرافت پر ذلت کا داغ لگایا
ہائے۔ پس جو گروہ بغیر کسی معاوضہ کی خواہش، بغیر کسی دھن دولت کے لالچ بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا
ے۔ محض خدا کی خوشنودی کے لئے دنیا کو اس فتنہ سے پاک کرے اور اس فساد کو دور کر کے اس کی جگہ
عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال اپنی تجارت کے فوائد
نے جورو بچوں اور باپ بھائیوں کی محبت۔ اور اپنے گھر بار کے عیش و آرام سب کو قربان کرے۔ اس سے
یادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ اور ایسے کامرانی کی آغوش
ں کے سوا اور کس کے لئے کھل سکتی ہے؟

جہاد فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے جس کی بنا پر اسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ
بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔ اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ درحقیقت یہی چیز تمام فضائل
مکارم اخلاق کی روح ہے۔ انسان کی یہ اسپرٹ کہ وہ بدی کو کسی حال میں برداشت نہ کرے
راسے دفع کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ انسانی شرافت کی سب سے
ی اسپرٹ ہے۔ اور عملی زندگی کی کامیابی کا راز اسی اسپرٹ میں مضمر ہے۔ جو شخص دوسروں کے
بدی کو برداشت کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی کمزوری اسے بہت جلدی اس پر بھی آمادہ کر دیتی ہے
وہ خود اپنے لئے بدی کو برداشت کرے اور جب اس میں برداشت کا یہ مادہ جی پیدا ہو جاتا ہے
تو اس پر ذلت کا وہ درجہ آتا ہے جسے خدا نے اپنے غضب سے تعبیر کیا ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ اور اس درجہ میں پہونچکر اس کے اندر شرافت و انسانیت کا
احساس باقی نہیں رہتا، وہ جسمانی و مادی غلامی ہی میں نہیں بلکہ ذہنی و روحانی غلامی میں
مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کمینگی کے ایسے گڑھے میں گرتا ہے۔ جہاں سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔
اس کے برخلاف جس شخص میں یہ اخلاقی قوت موجود ہو کہ وہ بدی کو محض بدی ہونے کے باعث
سمجھے۔ اور انسانی برادری کو اس سے نجات دلانے کے لئے ان تھک جدوجہد کرتا رہے وہ ایک
فوق العادی درجہ کا انسان ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود عالم انسانی کے لئے رحمت ہوتا ہے۔ ایسے
کو چاہے دنیا سے کسی معاوضہ کی خواہش نہ ہو۔ مگر دنیا ان تمام شکریوں کے باوجود جن کے
اس کی ہمیشانی پر موجود ہیں۔ اتنی احسان شناس نہیں ہے کہ وہ اس خادم انسانیت کو

اپنا سرتاج، اپنا امام اور اپنا سردار تسلیم نہ کرے جو بے لاگ، بے امید اجر و بے تمنائے مرد اسے بدی کے تسلط سے چھڑائے اور اسے اخلاقی، روحانی، و مادی، آزادی عطا کرنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہو۔ یہی معنی ہیں اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (زمین کے وارث میرے نیکو کار بندے ہوتے ہیں) کے اور یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ سے محض آخرت ہی کی کامیابی مراد نہیں ہے بلکہ دنیا کی کامیابی بھی حقیقتہً انہی لوگوں کے لئے ہے جو نفسانی اغراض سے پاک ہو کر خالصتہً اللہ کی خوشنودی اور اللہ کے بندوں کی بھلائی کے لئے جہاد کرتے ہیں۔

نظامِ تمدن میں جہاد کا درجہ

جہاد کی اس حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ قوموں کی زندگی میں اس روح کو کیا درجہ حاصل ہے اور نظامِ تمدن کو درست رکھنے کے لئے اس کی کس قدر ضرورت ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی قوت موجود ہو جو بدی کے خلاف پیہم جہاد کرتی رہے۔ اور تمام سرکش قوتوں کو اپنی اپنی حدود کی پابندی پر مجبور کرے۔ تو نظامِ تمدن میں یہ بے اعتدالی ہرگز نظر نہ آئے کہ آج سارا عالم انسانی ظالموں اور مظلوموں۔ آقاؤں اور غلاموں میں بٹا ہوا ہے۔ اور تمام دنیا کی اخلاقی و روحانی زندگی کہیں غلامی و مظلومی کے باعث اور کہیں غلام سازی و جفا پیشگی کے باعث تباہ و برباد ہو رہی ہے۔ بدی کو دوسروں سے دفع کرنا تو ایک بڑا درجہ ہے اگر اسے خود اپنے سے دفع کرنے کا احساس بھی ایک قوم میں موجود ہو اور اس کے مقابلہ میں وہ اپنی عیش و آرام۔ اپنی دولت و ثروت۔ اپنی نفسانی لذات اور اپنی جان کی محبت غرض کسی چیز کو عزیز نہ رکھے۔ تو وہ کبھی ذلیل و خوار ہو کر نہیں رہ سکتی اور اس کی عزت کو کوئی قوت پامال نہیں کر سکتی۔ حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق کے آگے جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہئے۔ اور اگر وہ اعلائے حق اور اعانتِ حق کی قوت نہ رکھتی ہو تو اسے کم از کم تحفظِ حق پر سختی کے ساتھ ضرور قائم رہنا چاہئے۔ یہ شرافت کا کم سے کم درجہ ہے۔ لیکن اس درجے سے گر کر جو قوم حق کی حفاظت بھی نہ کر سکے اس میں ایثار و قربانی کا فقدان اس قدر بڑھ جائے کہ بدی و شرارت جب اس پر چڑھ کر آئے تو وہ اسے مٹانے یا خود مٹ جانے کے بجائے اس کے ماتحت زندہ رہنے کو قبول کرلے

تو ایسی قوم کے لئے دنیا میں کوئی عزت نہیں ہے۔ اور اس کی زندگی یقیناً موت سے بدتر ہے۔ اسی رمز کو سمجھانے کے لئے خدا نے بار بار اپنی حکیمانہ کتاب میں ان قوموں کا ذکر کیا ہے۔ جنہوں نے بدی کے خلاف جہاد کرنے میں جان و مال اور لذات نفسانی کا ٹوٹا دیکھکر اس سے جی چرایا۔ اور بدی کا تسلط قبول کرکے اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے خسران و نامرادی کا داغ لگالیا۔ ایسی قوموں کو خدا ظالم قوم کہتا ہے یعنی انہوں نے اپنے اعمال سے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور حقیقتہً وہ اپنی ہی ظلم سے تباہ ہوئیں۔ چنانچہ ایک جگہ اس طرح انکی مثال دی ہے :-

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

(۹ : ۹)

کیا ان لوگوں کو ان قوموں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے ہو گذری ہیں۔ یعنی نوح کی قوم اور عاد ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحب مدین اور موتفکت ان کے پاس ان کے قومی پیغمبر کھلی کھلی دلیلیں لیکر آئے۔ مگر اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا جو ایماندار مرد۔ اور ایماندار عورتیں ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں وہ نیکی کا حکم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں :-

یہاں پچھلی قوموں کے ظلم بر نفس خود کا ذکر کرتے ہی جو ایماندروں کی یہ صفت بتائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں اور نیکی کو قائم کرتے اور بدی کو روکتے ہیں تو اس سے صاف یہی بتانا مقصود ہے کہ ان مٹنے والی قوموں نے نیکی کا حکم کرنا۔ اور بدی کو روکنا چھوڑ دیا۔ اور یہی ان کا وہ ظلم تھا جس نے آخر ان کو تباہ کیا۔

ایک اور جگہ بنی اسرائیل کی بزدلی اور جی چرانے کی نہایت عبرتناک انجام بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد دلا کر حکم دیا کہ تم ارض مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہاری میراث میں دیا ہے۔ اور ہرگز پیٹھ مت پھیرو کیونکہ پیٹھ پھیرنے والے ہمیشہ نامراد رہا کرتے ہیں۔ مگر بنی اسرائیل پر دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا۔

يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ	اے موسیٰ! اس زمین میں تو ایک قوی بازو قوم ہے، ہم اس میں ہرگز نہ داخل ہونگے۔ جب تک کہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ ہاں اگر وہ نکل گئے تو ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

قوم کے دو جوانمردوں نے جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا۔ قوم کو مشورہ دیا کہ تم بیخوف داخل ہو جاؤ، تم ہی غالب رہو گے۔ اور اگر تمہیں دولتِ ایمان حاصل ہے تو اللہ پر توکل کرنا چاہیے۔ مگر وہ ڈرپوک اور ذلت پر قانع رہنے والی قوم النسانوں کے خوف سے کانپتی ہی رہی اور اس نے صاف کہدیا کہ

يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ	اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم تو اس میں ہرگز داخل نہ ہونگے۔ پس تو اور تیرا خدا وہاں جائے اور تم دونوں لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

آخر اس بزدلی کی بدولت قدرت الٰہی نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ وہ چالیس برس تک دربدر کی خاک چھانتے پھریں اور کہیں ان کو ٹھکانا نصیب نہو:۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ (۵ : ۷)	اللہ نے کہا کہ جو زمین ان کے حق میں لکھی گئی تھی وہ اب چالیس سال کے لئے انپر حرام کردی گئی۔ اب وہ زمین میں بھٹکتے پھرینگے۔

ایک دوسری جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کی اس محبتِ نفس و مال اور بزدلی و خوفِ موت کا ذکر کیا ہے جس کے باعث انہوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو چھوڑ دیا۔ اور جس کی بدولت وہ آخر کار قومی ہلاکت میں مبتلا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو	کیا تم نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے نکلے اور باوجودیکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مگر ان پر موت کا خوف غالب تھا۔ اس لئے اللہ نے انپر موت ہی کا حکم صادر کیا اور پھر انہیں زندہ کردیا۔ اللہ

فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔

لوگوں پر بڑا فضل کرتا ہے۔ اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اس کے بعد ہی اس طرح مسلمانوں کو قتال کا حکم دیا ہے کہ۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے۔

اور اس کے بعد دوبارہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا ذکر کیا ہے کہ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۔

(۲ : ۲۴۶)

کیا تو نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کا حال نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے زمانہ کے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے ان سے کہا کہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اگر تم پر جنگ فرض کر دی گئی تو تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہم کیسے نہ لڑیں گے۔ جبکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور اپنی اولاد سے چھڑائے گئے ہیں۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا سب نے منہ پھیر لیا۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

* * *

یہ اور ایسی بہت سی مثالیں بار بار اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے دی گئی ہیں کہ زندگی کے قیام و بقا کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز اس کی حفاظت کرنیوالی سچی قربانی کی روح ہے اور جس قوم سے یہ روح نکل جاتی ہے وہ بہت جلدی بدی سے مغلوب ہو کر فنا ہو جاتی ہے۔

مدافعانہ جنگ

گذشتہ بحث سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ قرآن کی تعلیم اپنے پیروؤں میں ایسی جہاں فروشی اور حمایت حق کی ناقابلِ تسخیر روح پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنی عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظتِ حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ ضعف جو درحقیقت جسم و جان کا ضعف نہیں بلکہ قلب و ایمان کا ضعف ہے۔ جب کسی قوم میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے اندر سے عزت و شرافت کے تمام احساسات خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ اور اعلائے حق کی اعلیٰ خدمت کو انجام دینا تو درکنار وہ خود اپنے آپ کو بھی حق کے راستہ پر قائم نہ رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکتی جسم کی غلامی کو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کی بندشیں صرف اوپر ہی اوپر رہتی ہیں۔ اور قلب و روح تک ان کا اثر نہیں پہنچتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جسم کے غلام ہونے سے پہلے روح غلام ہو چکتی ہے۔ اور جسم غلامی کا غیرت شکن ذلت انگیز لباس پہنتا ہی اُس وقت ہے۔ جب روح غیرت و حمیت کے جوہر سے عاری ہو جاتی ہے۔ اور عزت و شرافت کا احساس اس سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ پس جو قوم اپنی کمزوری و بزدلی کے باعث اپنے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی برتتی ہے اور شرارت کو قوی بازو دیکھ کر اس کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ قوت کبھی باقی نہیں رہتی اور رہ نہیں سکتی کہ اپنے شعائر اپنے آداب اپنے قوانین اور اپنے دینی و اخلاقی اصولوں پر سختی سے قائم رہے۔ اور اپنے قومی نظام کو ٹوٹنے نہ دے۔ پھر جبکہ حق اور باطل دونوں باہم ضد ہیں۔ اور ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم باطل کی غلامی قبول کرنے کے بعد بھی حق کی بندگی پر قائم رہے اور ایک سے عبدیت کا رشتہ جوڑ کر دوسرے کے رشتۂ عبدیت

کو جس [illegible] فطرت تو یکتائی پسند ہے وہ باطل کو اپنا حصہ و شریک بنا کر کبھی ایسی تقسیم نہیں کر سکتا کہ آدھا میرا ہے۔ اور آدھا تیرا۔ اس لئے جس کسی کو اس کی بندگی کرنی ہو اسے باطل کی بندگی چھوڑنی پڑے گی۔ اور اپنی گردن کو دوسری تمام بندگیوں کے طوق و زنجیر سے خالی رکھنا پڑیگا۔

قرآن جو درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے۔ فطرت کے اس راز سے خوب واقف ہے اور اسی راز کو مدِنظر رکھ کر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت، یا شرف زندگی۔ شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ اگرچہ اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہے۔ وہ تو اس زندگی کو "ذلت" و "مسکنت" قرار دیتا ہے اور اللہ کے غضب سے تعبیر کرتا ہے۔ اسے ان قوموں کی خصوصیت بتاتا ہے۔ جو اپنی بزدلی اور خشیت ماسوائے اللہ کے باعث اپنے تئیں قہرِ الٰہی کا مستوجب بنا لیتی ہیں۔ اور اس کی زبان میں اس ذلیل زندگی کو اختیار کر لینا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے قرآن نے ایسے لوگوں کو جو اس زندگی پر راضی ہو جائیں خسران و نامرادی کی یہ وعید سنائی ہے:-

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ؟ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَٰسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ؟ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا (۴ : ۱۴)	جن لوگوں کی روح فرشتے اس حال میں قبض کریں کہ وہ خود اپنے نفس پر ظلم کر رہے ہوں تو ان سے وہ پوچھیں گے کہ تم یہ کس بلا میں گرفتار تھے؟ وہ کہیں گے کہ ہم زمین میں کمزور تھے۔ مگر فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم باطل کے گھر کو چھوڑ کر نکل جاتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

غور کرو کہ یہ غیرت ملی کی کیسی روشن تعلیم ہے۔ اپنے آپ کو کمزور سمجھ کر اے اسلام کی غلامی قبول کرنے والوں کو اپنے اوپر آپ ظلم کرنے والا کہا ہے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ ذلت کیوں قبول کی؟ وہ کمزوری و ضعف کا عذر پیش کرتے ہیں تو قبول نہیں ہوتا۔ جواب ملتا ہے کہ اگر تم کمزور و ناتواں تھے تو اس ذلت کے قبول کرنے سے بہتر تھا کہ گھر چھوڑ کر نکل جاتے۔ ان کے آرام و آسائش کی خاطر ہندگی باطل کی ذلت کیوں گوارا کر لی؟ آخر اسی جرم کی پاداش میں نہیں ذلت و نامرادی کے اس گڑھے

کی طرف پھینک دیا جاتا ہے جس کا نام جہنم ہے۔ اور یقیناً اس سے زیادہ بری جائے بازگشت اور کوئی نہیں ہے:۔

فریضۂ دفاع

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل و برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے کسی حملہ کی برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے یا مسلمانوں کے حقوق اور ان کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس معاملہ میں تو اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے۔ تم پر ظلم و ستم ڈھائے تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے۔ تمہارے دین اور تمہاری قومی طاقت کو مٹانے کی خفیہ یا علانیہ تدبیریں کرے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم مسلمان ہو تو اس کے فتنہ سے ہرگز تغافل اور تسامح نہ برتو بلکہ اسے ایسی سخت سزا دو کہ یا تو راہِ راست پر آجائے یا پیوندِ خاک ہو جائے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ

جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے خدا کی راہ میں جنگ کرو مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو (یعنی ظلم پر نہ اتر آؤ) کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ان ظالموں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے وہاں سے انہیں نکال باہر کرو۔ کیونکہ یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔ پھر جب تک وہ تم سے مسجد حرام میں قتال نہ کریں تم بھی اس کے پاس ان سے قتال نہ کرو۔ لیکن اگر وہ تم سے وہاں جنگ کریں تو تم بھی انہیں مارو اور کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تم ان سے برابر جنگ کیے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پس اگر وہ (فتنہ برپا کرنے اور دین کے معاملہ میں زیادتی کرنے سے) باز آجائیں تو جان لو

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۲ : ۱۹۴

کہ سوائے حرام امور کے سوا اور کسی کے لئے نہیں ہے۔ ماہ حرام کا عوض ماہ حرام ہے۔ اور تمام آداب اور حرمتوں کے بدلے ہیں۔ پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو۔ مگر اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور جان لو کہ اللہ صرف متقیوں کے ساتھ ہی حد سے تجاوز نہیں کرتا

یہ حفاظتِ دین اور مدافعتِ دیارِ اسلام کا حکم ایسا سخت ہے کہ جب کوئی قوت اسلام کو مٹانے اور اور اسلامی قومیت کو فنا کرنے کے لئے حملہ آور ہو تو تمام مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اُسکے مقابلہ پر نکل آئیں۔ اور جب تک اسلام اور اسلامی قومیت کو اس خطرہ سے محفوظ نہ کریں اسوقت تک چین نہ لیں چنانچہ فقہ کی تمام کتابوں میں یہ حکم موجود ہے کہ جب دشمن دارالاسلام پر چڑھ کر آئے تو ہر مسلمان پر فرداً فرداً دفاع کا فرض اسی تعمیت کے ساتھ عائد ہو جاتا ہے کہ جیسے نماز اور روزہ۔ فقہ کی مشہور کتاب بدائع الصنائع میں لکھا ہے۔

اما اذا عم النفیر بان هجم العدو علی بلد فهو فرض عین یفترض علی کل واحد من احاد المسلمین ممن هو قادر علیه فاذا عم النفیر لا یتحقق الغناء به الا بالکل فبقی فرضا علی الکل عینا بمنزلة الصلوٰة والصوم ثم یخرج العبد بغیر اذن مولاه والمرأة بغیر اذن زوجها لان منافع العبد والمرأة فی حق العبادات المفروضة عینا مستثناة عن ملک المولی والزوج شرعا کما فی الصوم والصلوٰة ولان الجهاد یحتاج الی الکر والفر وهو لا یتمکن من ذلک فی حالة الرق والمرأة تستحیی مخالطة الرجال وتستهتر بالخروج بین الناس فیظهر فی فروض الاعیان کالصوم والصلوٰة

مگر جب الحرب عام ہو جائے کہ دشمن نے ایک اسلامی ملک پر حملہ کیا ہے تو پھر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان پر جو جہاد کی قدرت رکھتا ہو فرض ہو جاتا ہے اس کی فرضیت عائد ہو جاتی ہے ..... نفیر عام ہونے کے بعد تو ادائے فرض کا حق بغیر اسکے پورا ہو ہی نہیں سکتا کہ سب کے سب جہاد کرنے کے لئے کھڑے ہو جائیں اسوقت وہ سب مسلمانوں پر اسطرح فرض عین ہو جاتا ہے جیسے روزہ نماز پس غلام کو بغیر آقا کی اجازت کے اور عورت کو بغیر اپنے شوہر کی اجازت کے نکلنا چاہیئے کیونکہ ان حالات میں جو فرض عین ہیں غلام و بیوی کی خدمت آقا و شوہر کی ملک سے مستثنیٰ ہو جیسے نماز روزہ۔ اسی طرح جینے کے لئے مباح ہو جاتا ہے کہ وہ بغیر والدین کی اجازت کے نکل کھڑا ہو

(جلد ۲ صفحہ ۹۸)

کیونکہ روزہ نماز جیسے فرض اعیان ہیں والدین کا حق اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

بیان مجمع العدو علی بلد کے الفاظ صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ یہ فرضیت عینیہ صرف اسی صورت پر موقوف نہیں ہے کہ خاص مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر کوئی قوم اسلام کو مٹا دینے پر آمادہ ہو جائے۔ بلکہ حکومت اسلامیہ اور دیار اسلام پر ہر غاصبانہ حملہ کے مقابلہ میں مدافعت اسی قطعیت کے ساتھ فرض ہے اسلام میں مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے حریت و استقلال سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ اپنی آزادی کو کھو دینے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں میں انسانیت کی اس اعلیٰ خدمت کو ادا کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی جسے ادا کرنے کے لیے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ بلکہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم رکھنے کے قابل بھی نہیں رہتے جس پر ان کی مذہبی زندگی کا دار و مدار ہے اس لئے اسلامی حکومت اور اسلامی قومیت پر حملہ کرنا دراصل عین اسلام پر حملہ کرنا ہے۔ اور خواہ کسی دشمن کا مقصد اسلام کا مٹانا نہ ہو بلکہ محض مسلمانوں کی سیاسی قوت ہی کو مٹانا ہو۔ تب بھی اس سے جنگ کرنا مسلمانوں کے لئے ویسا ہی فرض ہوگا جیسا اسلام کو مٹانے والے سے جنگ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صرف اس شہر یا اس ملک ہی کے مسلمانوں پر دفاع کا فرض عائد نہیں کیا گیا جس پر حملہ کیا گیا ہو۔ بلکہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کے لئے لازم کر دیا گیا ہے کہ وہ اس ملک یا شہر کے مسلمانوں کو غلبۂ اعداء سے بچائیں۔ جیسا کہ صاحب بدائع کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یفترض علی کل واحد من احاد المسلمین اور لا یتحقق القیام بہ الا بالکل۔

صاحب نہایہ نے ذخیرہ سے اس اجمال کی تفصیل اسطرح نقل کی ہے کہ۔

ان الجہاد اذا جاء النفیر عاما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو فلما من وراءہم بعد من العدو وھو فرض کفایۃ علیہم حتی یسعہم ترکہ اذا لم یحتج الیہم فان احتیج الیہم بان عجز من کان یقرب من العدو عن المقاومۃ مع العدو ولم یعجزوا عنہا	جہاد کی جب نفیر عام ہو تو جو کوئی دشمن سے قریب ہو اس پر وہ فرض عین ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ دشمن سے دور ہوں ان پر فرض کفایہ رہتا ہے یعنی اگر ان کی مدد کی ضرورت نہ ہو تو وہ شرکت جہاد سے باز بھی رہ سکتے ہیں لیکن اگر ان کی مدد کی ضرورت ہو جائے اس طرح کہ جو لوگ دشمن سے قریب ہوں وہ مقابلہ سے عاجز ہو جائیں یا عاجز تو نہ ہوں،

لکنهم تکاسلوا ولم یجاهدوا فانه
یفترض علی من یلیهم فرض عین
کالصلوٰة والصوم لایسعهم ترکه
لشروعهم الی ان یفترض علی جمیع
اهل الاسلام شرقا وغربا علی هذا
التدریج نظیر الصلوٰة علی المیت
..... ان کان الذی بعد من المیت
جاهلا ان اهل محلته یضیعون
حقوقه اویعجزون عنه کان علیه
ان یقوم بحقوقه کذا هنا۔

(شامی ج ۳ ص ۲۴۰)

مگر سستی کریں۔ اور پوری کوشش سے مقابلہ نہ کریں تو ان سے قریب کے لوگوں پر فرض عین ہوجاتا ہے۔ جیسے نماز اور روزہ کہ اسے چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔ پھر ان لوگوں پر جو ان سے قریب ہوں پھر ان پر جو ان سے قریب ہوں۔ یہانتک کہ از شرق تا غرب تمام اہل اسلام پر اسی تدریج کیساتھ فرض ہوجاتا ہے۔ اس کی نظیر نماز جنازہ ہے کہ جو شخص میت سے دور ہو اگر اسے معلوم ہو کہ اس کے اہل محلہ اس کے حقوق ادا نہیں کرتے یا ادا کرنے سے عاجز ہیں تو اس کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ خود اس کے حقوق ادا کرے (یعنی اس کی تجہیز و تکفین کرے)۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔

اسلام میں دفاع کے اس فریضہ عظیمہ کی جو کچھ اہمیت ہے۔ اسکا اندازہ صرف اسی سے نہیں ہوتا کہ اسے ایک عبادت اور فرض عین کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور اس کی فضیلت نماز روزہ سے بھی زیادہ بتائی گئی ہے۔ بلکہ سورہ توبہ کی ان آیات سے جو غزوۂ تبوک کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی قوت اسلام اور مسلمانوں کے استقلال قومی کو مٹانے کے لئے حملہ آور ہو اور نفیر عام ہوجائے تو اسوقت یہ ایمان کے صدق و کذب کی کسوٹی بن جاتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے متعلق جنھوں نے رومیوں کی زبردست طاقتور سلطنت کے مقابلہ پر حفاظت اسلام کے لئے جنگ میں جانے سے جی چرایا تھا۔ اور جن کی ایمانی کمزوری کو دیکھکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گھر میں رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ یہ الفاظ فرمائے گئے ہیں کہ۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ
لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

اے محمد خدا تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دیدی تمہیں چاہیئے تھا کہ اجازت نہ دیتے تاکہ تمپر وہ لوگ بھی ظاہر ہوجاتے جو سچے ہیں اور ان کا حال بھی معلوم ہوجاتا جو جھوٹے ہیں وہ لوگ

عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ إِنَّمَا
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ
قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُونَ (۹:۴۵)

جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جنھیں یوم قیامت کے آنیکا یقین ہے۔ تم سے ہرگز یہ رخصت نہ مانگیں گے۔ کہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں، اللہ ان متقیوں کو خوب واقف ہے، یہ رخصت تو تم سے وہی لوگ طلب کریں گے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ یوم قیامت کے آنے کا یقین، ان کے دلوں میں شک پڑ گیا ہے۔ اسلئے وہ اپنے شک ہی میں ڈگمگا رہے ہیں

زمانہ جنگ کی صورتیں

دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فریضوں میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے قومی استقلال کی سختی کیساتھ حفاظت کریں اور قومی و دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اسکے لئے اسلام نے اپنے کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی، بلکہ تاکید کی ہے، اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلانِ جنگ کرکے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کرکے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے، یا مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن و اطمینان اور اس کی دینی و سیاسی زندگی کو خطرہ میں مبتلا کیا جا سکتا ہے۔ پس اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ صورتیں کیا ہیں، اور ان کے متعلق قرآن مجید کا حکم کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہم ان تمام آیات کو جمع کریں گے جن میں مدافعانہ جنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے حل طلب مسائل کو بھی قرآن سے یا اسکے بعد حدیث سے حل کرینگے تاکہ کسی غلط فہمی کے دخل سے شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔

مدافعانہ جنگ کا جواب

بقول اکابر مفسرین اسلام میں پہلی آیت جو قتال کے متعلق اتری وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا

جن لوگوں سے جنگ کیجاتی ہے، انہیں جنگ کی

إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ (۲۲:۴۰)	اجازت دی گئی ہے۔ اور اللہ ان کی مدد پر یقیناً قدرت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے ہیں۔ صرف اس تصور پر کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار کہتے تھے۔

دوسری آیت جسکو علامہ ابن جریر اور بعض دوسرے مفسرین جنگ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے۔

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۴۴)	اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے نہ بڑھ جاؤ کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو مارو جہاں پاؤ۔ اور ان کو نکالو جہاں سے انھوں نے تم کو نکالا ہے۔ کیونکہ فتنہ زیادہ بری چیز ہے قتل سے۔

ان دونوں آیات سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

۱) جب مسلمانوں سے جنگ کی جائے اور ان پر ظلم و ستم کیا جائے۔ تو ان کے لئے مدافعت میں جنگ کرنا جائز ہے۔

۲) جو لوگ مسلمانوں کے گھر بار چھینیں، ان کے جائز حقوق سلب کریں، اور انہیں ان کی میراث سے بیدخل کریں، ان کے ساتھ مسلمانوں کو جنگ کرنی چاہیے۔

۳) جب مسلمانوں پر ان کے مذہبی عقائد کے باعث تشدد کیا جائے۔ اور انہیں محض اس لئے ستایا جائے کہ وہ مسلمان ہیں۔ تو ان کے لئے اپنی مذہبی آزادی کی خاطر جنگ کرنا جائز ہے،

۴) دشمن غلبہ حاصل کر کے جس سرزمین سے مسلمانوں کو نکال دیں یا مسلمانوں کے قبضہ کو وہاں سے مٹادیں اسی دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور جب بھی مسلمانوں کو موقع حاصل ہو تو انہیں ان تمام مقامات سے دشمن کو نکال دینا چاہیئے جہاں سے اس نے مسلمانوں کو نکالا ہے۔

راہِ حق کی حفاظت

سورۂ انفال میں جن کافروں کے خلاف جنگ کرنے اور ان کی جڑ کاٹ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کا ایک قصور یہ بتایا گیا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ (۸:۳۶)

جو لوگ کافر ہیں وہ اپنی مالی و اقتصادی قوت اللہ کے راستہ سے روکنے میں صرف کرتے ہیں اور صرف کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر حسرت ہوگی۔ اور وہ مغلوب کئے جائیں گے۔

آگے چلکر قریش کی اس فوج کا جو بدر میں مسلمانوں سے لڑنے نکلی تھی۔ اور جس کے مقابلہ میں اللہ نے حق کو حق اور باطل کو باطل کر کے دکھانے کے لئے خاص اپنی فوج بھیجی تھی اس طرح ذکر کیا ہے:۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔ (۸:۴۷)

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے تفاخر کے طور پر دنیا کو دکھانے کے لئے لڑنے کو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ اللہ کے راستہ سے روک رہے ہیں۔

سورہ توبہ میں پھر ان مشرکین کا جرم جن سے قتال کا حکم دیا گیا تھا یہ بتایا ہے کہ۔

اشْتَرَوْا بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَصَدُّوا عَن سَبِيلِهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۹:۲)

ان لوگوں نے آیات الٰہی کا سودا بڑی ہی کم قیمت پر کیا اور وہ اس کی راہ سے روکنے لگے۔ یہ بہت برا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

آگے چلکر اہل کتاب سے لڑنے کا حکم دیا ہے کہ وَقَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ (۹:۲۹) اور پھر ان کے جرائم کی تفصیل اس طرح دی ہے کہ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ (۹:۳۴)

اے ایمان والو! (اہل کتاب کے) بہت سے احبار اور رہبان لوگوں کے مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

سورہ محمد میں زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ۔

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کی راہ سے روکنے لگے

اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۔۔۔۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۴۷:۱)	ان کے اعمال اللہ نے ضائع کر دئے ۔۔۔ پس جب تمہاری ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارو یہانتک کہ ان کی طاقت کو کچل ڈالو۔ اس کے بعد قید کی گرفت کو مضبوط کرو۔ اور انہیں گرفتار کر لو۔ پھر تمہیں اختیار ہے کہ خواہ احسان کے طور پر چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے لو یہ عمل اسوقت تک جاری رکھو جب تک جنگ اپنے ہتھیار ڈال نہ دے اور اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ صد عن سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ سے روکنا بھی ایک ایسا جرم ہے جسکے خلاف جنگ ضروری ہے۔ اللہ کی راہ سے مراد وہی دین حق ہے جسکو قرآن مجید میں صراط مستقیم بھی کہا گیا ہے۔ اور یہ قرآن مجید کا انداز بیان کی انتہائی خوبی ہے کہ اسنے دین کو راستہ سے تعبیر کیا۔ گویا وہ ایک طریق ہے جو سیدھا منزل تک لیجاتا ہے۔ اور جس پر شیطان و اولیائے شیطان رہزنی کرتے ہیں بعض لوگوں نے سبیل کے معنی یہی معمولی چلنے پھرنے کی سڑک کے لئے ہیں اور صد عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا مطلب قطاع الطریقی قرار دیا ہے۔ مگر قرآن مجید میں سَبِيْلِ اللّٰهِ اور سَبِيْلِ رَبِّ کے الفاظ ایسے نہیں ہیں جسکا مفہوم سمجھنے میں ذرا بھی دقت ہو۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اور اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۵ یہ موٹروں اور بائسکلوں کی سڑک مراد نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہی سڑک مراد ہے جو خدا تک لیجاتی ہے وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ میں بھی سیدھی راہ سے مراد وہی ایمان کی راہ ہے اور اس کی ضد کفر کی راہ قرار دی گئی ہے۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ میں بھی ان مارے جانے والوں کو زندہ نہیں کہا گیا ہے جو مٹی اور پتھروں کی سڑکوں پر جان دیتے ہیں۔ بلکہ یہ شرف ان لوگوں کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ جو اللہ کے دین تک پہنچانے والی راہ میں جان دیں پس اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سبیل اللہ سے روکنا اصل اسلام سے روکنا ہے

اب غور کیجئے کہ اسلام سے روکنے کا کیا مطلب ہے؟ اسلام کو جب راستہ کہا گیا۔ تو ضرور

ہے کہ اس سے روکنے کی بھی وہی صورت ہوں جو ایک رہگذر سے روکنے کی ہوتی ہے کسی راستہ کو روکنے کی قدرۃً تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ دوسرے راستہ پر چل رہے ہیں۔ انہیں اس راستہ پر نہ آنے دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جو اسپر چل رہے ہیں انہیں اس سے ہٹا دیا جائے۔ اور تیسرے یہ کہ اسپر چلنے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھا دئے جائیں اور رہزنی وقطع طریق سے انہیں اسطرح دق کیا جائے کہ وہ چلنے سے عاجز آجائیں۔ کتاب مبین کا کمال بیان یہ ہے کہ اس میں یہ تینوں صورتیں پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اور صد عن سبیل اللہ ان تینوں معنوں میں بولا گیا ہے۔ اسلئے ہمیں اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے کسی اور کتاب کیطرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۱) سورہ منافقون میں راہ الٰہی کے رہزنوں کا ذکر اسطرح فرمایا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ (۶۳:۵)	جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول تمہارے لئے بخشش کی دعا کریگا تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تو نے دیکھا کہ وہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور وہ بڑے متکبر ہیں'

ہدہد سبا کے لوگوں کی خبر جب دربار سلیمانی میں لاتا ہے تو کہتا ہے۔

وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (۲۷:۲)	میں نے ملکہ اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔ اور شیطان نے ان کے اعمال بد کو ان کے سامنے اسطرح زینت دیکر پیش کیا ہے کہ انہیں راہ راست پر آنے سے روک دیا اور اب وہ سیدھی راہ اختیار نہیں کرتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں۔ جو زمین و آسمان کی چھپی ہوئی چیزوں کو نکالتا ہے۔

سورہ عنکبوت میں عاد و ثمود کی تباہی کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ (۲۹:۳۸)	شیطان نے ان کے اعمال بد کو ان کے سامنے اسطرح زینت دیکر پیش کیا ہے کہ انہیں سیدھے راستہ پر آنے سے روک دیا۔ حالانکہ وہ راستہ دیکھ چکے تھے۔

سورہ زخرف میں فرمایا۔

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۴۳:۶۱)

یہ سیدھا راستہ ہے سو کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس پر آنے سے روک دے۔ کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

دوسری جگہ پر فرمایا۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝ وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۴۳:۳۶)

جو کوئی ذکر رحمن سے اعراض کرتا ہے اس پر ہم ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ جو اس کا ساتھی ہو جاتا ہے یہ شیاطین ان لوگوں کو راہِ حق پر آنے سے روکتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں۔

ان تمام آیات میں اللہ کے راستہ سے روکنا یا راہِ حق سے روکنا اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ لوگوں کو اس پر آنے سے باز رکھا جائے۔ اور اس کو اختیار کرنے سے منع کیا جائے

(۲) اب صد عن سبیل اللہ کی دوسری صورت کے متعلق قرآن سے استفسار کیجئے۔

مدین والوں سے حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں

وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (۷:۸۶)

اور تم اللہ کے راستہ سے ان لوگوں کو روکتے ہو۔ جو اس پر ایمان لائے ہیں۔ اور اس راہ کو ان کے لئے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔

سورۂ ہود میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا (۱۱:۱۸)

ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو جو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ آل عمران میں سب پردے اٹھا دیئے ہیں۔ اور صاف صاف حکم ہوتا ہے کہ۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا

اے محمد ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم کیوں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اللہ کے راستہ سے روکتے ہو جبکہ تم اسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔ حالانکہ اس کے

تَعْمَلُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ (۳:۹۹-۱۰۰)

سید ہے ہونے پر تم خود گواہ ہو۔ (کہ تمہاری کتابوں میں پیش گوئیاں موجود ہیں۔) یہ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔ اے ایمان والو اگر تم ان اہل کتاب کے کسی فریق کی اطاعت کرو گے۔ تو یہ تمہیں ایمان سے پھیر کر دوبارہ کافر بنالیں گے۔

یاد کیجئے کہ یہ وہی اہل کتاب ہیں جن کے متعلق اس سے پہلے سورہ بقرہ میں ارشاد ہو چکا ہے کہ

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۲:۱۰۹)

اہل کتاب میں سے بہتوں نے چاہا کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ تمہیں کافر بنالیں، اپنے اس حسد کی بنا پر جو ان کے دلوں میں ہے اور ان کی یہ کوشش اس کے بعد ہے کہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ پس اس وقت تک کیلئے انہیں معاف کرو۔ اور ان سے درگذر و جب تک اللہ اپنا حکم نازل کرے۔ (جو بعد میں حکم قتال کی صورت میں نازل ہوا) اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

اسی طرح جن اہل قریش کے متعلق تم ابھی سن چکے ہو۔ کہ وہ اللہ کی راہ سے روکنے کے لئے نکلے تھے۔ ان کی جنگ کا مدعا دوسری جگہ اسطرح بیان کیا ہے۔ کہ۔

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲:۲۱۷)

وہ برابر تم سے لڑتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔

اور دوسری جگہ ان تمام کفار محاربین کا جن سے ترک موالات کا حکم دیا گیا۔ منشائے عناد یہ بیان کیا ہے کہ۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَاۗءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْۗءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (۶۰:۲)

اگر وہ تمہیں پالیں تو تمہارے ساتھ دشمنی کریں۔ اور تم پر اپنے ہاتھ چھوڑیں۔ اور اپنی زبانیں بدگوئی کے لئے کھول دیں وہ تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم کافر ہو جاؤ۔

یہ تمام آیات نصاحت بتلا رہی ہیں۔ کہ اللہ کے راہ سے روکنے کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ

جو مسلمان اسلام پر قائم ہیں انہیں مرتد کیا جائے۔ اور راہ راست سے ہٹا کر ٹیڑھے رستہ پر ڈالنے کی کوشش کی جائے۔

(۳) اب رہی تیسری صورت سو اسکے متعلق سورۂ بقرہ کی یہ آیت پڑھو کہ۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲:۲۱۷)	تجھ سے ماہ حرام کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس میں جنگ کرنا کیسا ہے۔ کہہ کہ اسمیں جنگ کرنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔ اور اس کے ساتھ کفر کرنا۔ اور مسجد حرام کی حق تلفی کرنا ہے۔

اور اسکے بعد سورہ حج کی اس آیت پر غور کرو کہ۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ (۲۲:۲۵)	جو لوگ کافر ہیں اور اللہ کے راستہ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں جسکو ہمنے سب لوگوں کے واسطے یکساں بنایا ہے۔ خواہ وہ وہیں رہتے ہوں۔ یا باہر سے آتے ہوں الخ

ان آیات میں اسلام کے ایک رکن یعنی حج سے روکنے کو صد عن سبیل اللہ کہا گیا اور جب کہ اسلام کے سب ارکان و فرائض یکساں ہیں۔ اور سب کی تعمیل مسلمانوں کے لئے ضروری ہے تو اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جسطرح ایک فریضہ کو ادا کرنے سے روکنے کو خدا کی راہ سے روکنا کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام فرائض سے روکنا بھی اللہ کی راہ سے روکنا ہے۔ اور اس لحاظ سے ہر وہ رکاوٹ جو مسلمانوں کے راستہ میں ان کے مذہبی احکام کی تعمیل سے باز رکھنے کے لئے ڈالی جائے۔ وہ قرآن کے اس فیصلہ کے مطابق صد عن سبیل اللہ کی تعریف میں آتی ہے

پس دوسری صورت جس میں مسلمانوں کو جنگ کا حکم دیا گیا ہے، یہ نکلی کہ۔

۱۔ یا تو اسلام کی ترقی کو تلوار یا اقتصادی و سیاسی قوت یا اور کسی شیطانی طاقت سے روکا جائے۔

۲۔ یا مسلمانوں کو مرتد بننے کے لئے مجبور کیا جائے۔

۳۔ یا ان کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے اور مذہبی احکام کی تعمیل کرنے سے روکا جائے

دغابازی و عہد شکنی کی سزا

سورہ انفال میں ایک اور جرم جس کے خلاف جنگ کرنے کا حکم ہے یہ بتایا گیا ہے کہ

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (۸:۷۱)

اللہ کے نزدیک زمین پر چلنے والے جانداروں میں بدترین وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا ہے۔ اور ایمان نہیں لاتے، جسے تو نے معاہدہ کیا تھا۔ مگر وہ بار بار اپنے عہد کو توڑتے ہیں اور (بدعہدی سے پرہیز نہیں کرتے پس اگر تو جنگ میں ان کو پالے۔ تو انہیں سخت سزا دے کر ان لوگوں کو خوف زدہ و پراگندہ کر دے۔ جو ان کے پیچھے ہیں (یعنی انہیں ایسی سزا دے جو ان کے بعد والوں کے لئے موجب عبرت ہو) شاید کہ وہ کچھ سبق حاصل کریں۔ اور اگر تجھے کسی قوم سے دغا کا خوف ہو تو برابری کو ملحوظ رکھکر علی الاعلان ان کا عہد ان کی طرف پھینک دے۔ اللہ یقیناً دغابازوں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورہ توبہ میں زیادہ سختی کے ساتھ ان کافروں کے متعلق جنہوں نے مسلمانوں سے بار بار عہد کیے تھے۔ فرمایا ہے کہ۔

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللَّهِ وَأَنَّ اللَّهَ مُخْزِي الْكَافِرِينَ

اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے اعلان برأۃ ہے ان مشرکوں کی طرف جن سے تو نے معاہدہ کیا تھا (اور جنھوں نے بار بار اس کی خلاف ورزی کی) پس چار مہینے اور زمین میں چل پھر لو۔ اس کے بعد خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ مگر اللہ کافروں کو رسوا کرنیوالا ضرور ہے۔

اسکے بعد ان مشرکوں کے متعلق جنھوں نے عہد نہیں توڑا تھا حکم دیا کہ فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ان کے معاہدہ کی مدت مقررہ تک عہد کی پابندی کرو۔ اور پھر دوبارہ نقض عہد

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ
فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ
وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ
وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ
كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ

جب وہ چار حرمت والے مہینے (جن کی نہایت اوپر دی گئی ہے) گذر جائیں تو ان کو قتل کرو جہاں پاؤ۔ اور انہیں گرفتار کرو۔ اور انہیں گھیر کر محصور کرلو۔ (تاکہ بلاد مسلمین میں نہ آسکیں) اور ان کے لئے ہر کمین گاہ میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کریں نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو (یعنی پھر ان سے تعرض نہ کرو) کیونکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

آگے چلکر پھر انہی بدعہد اور دغاباز مشرکوں کے متعلق فرمایا ہے کہ۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ
عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ
إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ عِنْدَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُوا
لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ
يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا
عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً
يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى
قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ (۹:۲)

ان مشرکوں کے اللہ اور اس کے رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا۔ سو وہ جب تک عہد پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ مگر (ان بدعہدوں سے کیونکر عہد ہو سکتا ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ جب تم پر غلبہ و فتح حاصل کرلیں تو نہ تم سے قرابت کا لحاظ رکھیں اور نہ عہد و اقرار کا۔ وہ (عدم حضور کی حالت میں) تم کو زبان سے خوش کرتے ہیں۔ مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں (یعنی وہ دل میں تمہیں نقصان پہنچانے کی فکر رکھتے ہیں) اور ان میں اکثر بدکردار و سرکش ہیں۔

اسکے بعد پھر انہی بدعہدوں کے متعلق فرمایا ہے۔

لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ فَإِنْ
تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا
الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ
وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ
وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ

(یہ دغاباز مشرکین) کسی مومن کے ساتھ قرابت یا عہد و اقرار کا لحاظ نہیں کرتے۔ اور وہی ہیں جو تجاوز و زیادتی کرتے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کریں۔ نماز ادا کریں۔ اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور یہ آیات ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو کچھ سمجھ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنی قسموں کو توڑ دیں عہد کرنے کے بعد اور تمہارے دین میں طعن کریں۔

وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ - أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ

تو کفر کے لیڈروں کے ساتھ جنگ کرو کیونکہ (اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ ان کی قسم کا کچھ اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اپنی حرکات سے باز آئیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا۔ اور رسول کو نکال دینے کا اہتمام کیا۔ اور انہوں نے ہی اول مرتبہ تم پر پیش دستی کی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو۔ بشرطیکہ تم ایماندار ہو۔ ان سے تم ضرور جنگ کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دیگا۔ اور انہیں رسوا کرے گا۔ اور تم کو ان پر نصرت بخشیگا۔ اور مومنوں کے قلوب کو شفا بخشیگا۔

ان تمام آیات اور ان کی شان نزول پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ۔

(۱) جو لوگ مسلمانوں سے عہد کر کے توڑیں۔ ان سے جنگ کرنی چاہیئے۔ اس حکم میں وہ کفار بھی آجاتے ہیں جو مسلمانوں سے اطاعت کا معاہدہ کر کے پھر حکومت اسلامیہ کے خلاف بغاوت کریں۔

(۲) جن سے معاہدہ تو ہو مگر ان کا رویہ ایسا مخالفانہ و معاندانہ ہو کہ اسلام اور مسلمانوں کو ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہے تو انہیں علی الاعلان فسخ معاہدہ کا نوٹس دیدینا چاہیئے اور ان کی دشمنی کا منہ توڑ جواب دینا چاہیئے۔

(۳) جو لوگ بار بار بدعہدی و دغابازی کریں۔ اور جن کے عہد و اقرار کا کوئی اعتبار نہ رہے اور جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں اخلاق و انسانیت کے کسی آئین کا لحاظ نہ رکھیں ان سے دائمی جنگ کا حکم ہے۔ اور صرف اسی صورت سے ان کے ساتھ صلح ہو سکتی ہے کہ وہ توبہ کریں۔ اور اسلام لے آئیں۔ ورنہ ان کے اثر سے اسلام اور دارالاسلام کو محفوظ رکھنے کے لئے قتل، گرفتاری، محاصرہ اور ایسی ہی دوسری جنگی تدابیر اختیار کرتے رہنا ضروری ہے۔

(۴) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال

ان بیرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ اندرونی

دشمن بھی ہیں۔ جو ظاہر میں دوست مگر باطن میں اسلام کی جڑ کاٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ اس جماعت میں داخل ہیں جس کے لئے قرآن حکیم نے منافق کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ اور ان کے باب میں یہ حکم دیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ ۹:۷۳

اے نبی منافقوں اور کافروں سے جہاد کرو۔ اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور وہ بہت ہی بری جائے قرار ہے۔

لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا۔ مَلْعُونِينَ أَيْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِيلًا۔ ۳۳:۶۰

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور مدینہ میں بری خبریں اڑانے والے اپنی معاندانہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم تجھے ان پر مسلط کر دینگے۔ اور پھر وہ اس شہر میں تیرے ہمسایہ نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن۔ ان پر پھٹکار پڑے گی۔ جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے۔ اور خوب قتل کیے جائیں گے

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا۔

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح کافر ہو جاؤ جس طرح یہ خود کافر ہوئے۔ تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں پس تم ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ اللہ کی راہ میں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر وہ انحراف کریں (اور اظہار عداوت کفر سے باز نہ آئیں) تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ مارو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست و مددگار نہ بناؤ۔

سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا

کچھ دوسرے لوگ ایسے پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم کے کافروں سے بھی۔ (اس سے جب تب) تمہارے پاس آتے ہیں تو قرار اسلام کرتے ہیں اور

فِيهَا فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَ
يُلْقُوا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوا
أَيْدِيَهُمْ فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ
ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأُولَٰئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ
عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا۔ ۴:۹۱

جب فتنہ کیطرف لوٹائے جاتے ہیں تو اسمیں اوندھے گر پڑتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ میں شامل ہوجاتے ہیں) پس اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے صلح کی طرح ڈالیں۔ اور نہ تمہارے ساتھ جنگ و دشمنی سے ہاتھ روکیں۔ تو انہیں پکڑو۔ اور جہاں پاؤ قتل کرو۔ ان لوگوں پر ہم نے تمہیں یہ واضح دلیل دیدی ہے

ان آیات میں منافقین کی اس جماعت کا جرم بھی بیان کر دیا گیا ہے جسکے باعث وہ واجب القتل ہوئے ہیں لیکن مزید وضاحت کے لئے ہم قرآن مجید ہی کی چند آیات پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ سورہ نساء میں فرمایا ہے کہ۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا
مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ
مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ
يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ۔ ۴:۱۱

وہ تجھ سے تو کہتے ہیں کہ تابعدار ہیں۔ مگر جب تیرے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ جو کچھ تو کہتا ہے اس کے خلاف رات کو منصوبے گانٹھتا ہے۔ اور جو کچھ یہ لوگ راتوں کو منصوبے گانٹھا کرتے ہیں۔ اللہ ان سے خبردار ہے۔

سورہ توبہ میں فرمایا۔

وَلَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا
خَبَالًا وَّلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ
يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ
لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ۔ لَقَدِ
ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَقَلَّبُوا
لَكَ الْأُمُورَ حَتَّىٰ جَاءَ الْحَقُّ
وَظَهَرَ أَمْرُ اللَّهِ وَهُمْ
كَارِهُونَ۔

اگر وہ تمہارے ساتھ ملکر لڑنے کو نکلتے تو تمہارے اندر فساد کے سوا اور کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ اور تمہارے درمیان (جھوٹی خبریں) پھیلا کر اور چغلخوریاں کر کے فتنہ برپا کرنے کی کوشش کرتے۔ اور تم میں ان کی باتیں سننے والے بھی ہیں۔ اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی (غزوۂ احد میں) فتنہ برپا کرنا چاہا تھا۔ اور تجھے مکائد و حیل سے دھوکہ دینے کی تدبیریں کی تھیں یہانتک کہ حق کی نصرت آگئی۔ اور اللہ کا حکم ہوا۔ اگرچہ وہ انہیں بہت ہی ناگوار تھا۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ

اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم ہی میں سے ہیں۔ حالانکہ

وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ۝

(۹ : ۷)

وہ ہرگز تم میں سے نہیں ہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو ڈر رہے ہیں (کہ ہمارا حشر بھی مشرکین کا سا نہ ہو) اگر انہیں کوئی جائے پناہ، یا غار، یا گھس بیٹھنے کا مقام مل جائے تو فوراً اس کی طرف پھر جائیں اور دوڑ کر جا گھسیں۔

اَلْمُنٰفِقُونَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ هُمُ الْفٰسِقُونَ (۹ : ۹)

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک ہی سانچے کے بنے ہیں، بری باتوں کا حکم کرتے ہیں، اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور اپنے ہاتھوں کو نیک کاموں سے روکتے ہیں، وہ اللہ کو بھول گئے ہیں، اسلئے اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا ہے، بیشک منافق بڑے ہی بدکار اور نافرمان ہیں۔

سورہ احزاب میں فرمایا:-

وَإِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۔ وَإِذْ قَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۔ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَآ إِلَّا يَسِيرًا

(۳۳ : ۱۲)

اور جب جنگ احزاب کے موقع پر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدہ ہم سے کیا تھا۔ وہ دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جب ان میں سے ایک گروہ بولا کہ اے اہل یثرب اب تمہارے ٹھیرنے کا موقع نہیں ہے، یہاں سے بھاگ نکلو، اور ان میں سے ایک فریق نبی سے اجازت لینے لگا یہ کہکر کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے ہوئے (غیر محفوظ) نہ تھے۔ اور ان کا مقصد بھاگ جانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اگر مدینہ کے اطراف سے دشمن گھس پڑتے اور ان سے درخواست کی جاتی کہ تم بھی مسلمانوں کو قتل و غارت کرنے کے فتنہ میں شریک ہو جاؤ تو وہ ضرور شریک ہوتے اور اس میں ذرا تامل نہ کرتے

سورہ منافقون میں فرمایا:-

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۶۳: ۱)	جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً خدا کا رسول ہے۔ ہاں اللہ بھی جانتا ہے کہ تو ضرور اسکا رسول ہے۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو (اپنی دشمنی کے لئے) ڈھال بنایا ہے۔ اور یہ اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور یہ بہت ہی بُرا کام ہے جو وہ کرتے ہیں۔

یہ آیات بتلاتی ہیں کہ منافقین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے ساتھ ظاہر میں مسلمانوں کا سا معاملہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس گروہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یا تو وہ اسلام قبول کرنے کے بعد علانیہ اظہارِ کفر کرتا ہے، یا زبان سے بدستور اسلام کا اقرار کرتا ہے، مگر اس کی حرکات یہ ہوتی ہیں کہ ہر وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہتا ہے، انہیں نقصان پہونچانے کی تدبیریں کرتا ہے ان کے دشمنوں سے سازباز رکھتا ہے، ان کی خفیہ خبریں دشمنوں کو پہونچایا کرتا ہے۔ انکا ایمان بگاڑنے اور انہیں گمراہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے، ان کی جماعت میں ریشہ دوانیاں کرکے تفرقہ برپا کرتا ہے ان کے دشمنوں کو اخلاقی و عملی مدد پہنچاتا ہے، اور اسلام پر جب مصیبت کا وقت آئے تو اس کی حفاظت کی بجائے اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گروہ اسلام کے لئے اسکے بیرونی دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے جو لوگ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، خواہ وہ ہر وقت کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے رہیں، اور خواہ ظاہری حیثیت سے ان کے اسلام میں کسی شک کی گنجائش نہ ہو، مگر ان کیساتھ قطعاً کوئی رعایت نہ کرنی چاہیئے اور جب ان سے ان جرائم کا صدور ہو تو جسم اسلام کے ان پھوڑوں پر سختی کے ساتھ اصلاح کا نشتر استعمال کرنا چاہیئے۔

حفاظتِ امن

دشمنوں کی ایک اور قسم وہ ہے جو دارالاسلام کے اندر رہکر یا باہر سے آکر اس میں فساد پھیلاتی ہے، ڈاکے ڈالتی اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتی ہے اور امن و امان میں خلل برپا کرتی ہے۔ ان کے متعلق قرآن مجید میں یہ حکم یا گیا ہے کہ:-

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور زمین میں

فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۔ (۵ : ۵)

(لوٹ مار سے) فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا صلیب پر چڑھا دئے جائیں، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دئے جائیں، یا وہ زمین سے نکال دئے جائیں (خواہ قید کی صورت میں خواہ اخراج کی صورت میں)، یہ رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے۔ اور (اس کے علاوہ) آخرت میں بھی انکے لئے بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قدرت پاؤ۔ (یعنی گرفتار کرو) توبہ کرلیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت میں یحاربون اللہ ورسولہ کے الفاظ سے جہاں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن سے مسلمانوں کی قاعدہ لڑائی ہو لیکن دراصل خدا اور رسول کے ساتھ محاربہ کرنے سے مراد وہی سعی فساد فی الارض ہے جسکا ذکر تشریح کے طور پر اس فقرہ کے بعد ہی کیا گیا ہے۔ یہ آیت جس موقع پر اتری تھی اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسکا حکم فسادیوں اور امن وآئین کے خلاف ہنگامہ کرنے والوں کے لئے ہے چنانچہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عُرَینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہوکر مدینہ میں رہنے لگے۔ مگر وہاں کی آب وہوا انہیں موافق نہ آئی، اور وہ بیمار پڑ گئے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے رنگ زرد پڑ گئے۔ اور پیٹ بڑھ گئے تھے) اسلئے آنحضرت صلعم نے ان سے فرمایا۔ لو خرجتم الی ذود لنا فشربتم من البانہا وابوالہا۔ اگر تم ہمارے اونٹوں میں جاکر رہو۔ اور ان کے دودھ اور دوا کے طور پر انکے پیشاب پیو تو تمہاری صحت درست ہوجائے گی۔ چنانچہ وہ مدینہ سے باہر اونٹوں کی چراگاہ میں پہنچے۔ اور جب آرام پا گئے تو رسول اللہ کے چرواہوں کو قتل کرکے اونٹوں کو ہانک لے گئے۔ آپ کو اس حرکت کی جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو بھیجا انہیں پکڑ منگایا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کٹوائے۔ ان کی آنکھیں نکلوائیں۔ اور انہیں دھوپ میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ صحیح بخاری میں بھی مختلف

البخاری، باب یحاربون اللہ ورسولہ وسعیہم فی الارض فسادا۔

فریقین سے اسی مضمون کی روایتیں درج ہیں۔ اور امام علیہ الرحمہ نے ان کو قولہ اللہ عزوجل انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ الآیہ کے زیر عنوان درج کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کے حوالہ سے انہیں اندھی کرانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کے چرواہوں کی آنکھیں سلائی پھیر کر پھوڑ دی تھیں۔ اس لئے آپ نے ان سے آنکھوں کا قصاص لیا تھا۔ ابوداؤد اور نسائی میں ابوالزناد کے طریقہ سے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ آیت انہیں عرینیوں کے باب میں نازل ہوئی تھی۔ اور حضرت ابوہریرہؓ کا بھی یہی بیان ہے اگرچہ علمائے مجتہدین کی ایک جماعت اسطرف بھی گئی ہے کہ یہ آیت ان عرینہ والوں کے حق میں نہیں اتری لیکن یہ امر متفق علیہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ عبرتناک سزائیں جو تجویز کی گئی ہیں۔ یہ انہیں لوگوں کے لئے ہیں، جو دارالاسلام کے امن میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے خلل برپا کریں۔ اور سزاؤں کے مختلف مدارج نوعیت جرم کے مختلف مدارج سے تعلق رکھتے ہیں جس کی تفصیل فقہائے اعلام نے بوضاحت بیان فرمائی ہے۔

مظلوم مسلمانوں کی حمایت

مدافعانہ جنگ کی ایک اور صورت جس میں مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے یہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اپنی کمزوری و بیچارگی کے باعث دشمنوں کے پنجہ میں گرفتار ہو جائے۔ اور اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اپنے آپ کو چھڑا سکے۔ ایسی حالت میں دوسرے مسلمانوں پر جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوت رکھتے ہوں یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسے اس ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (۴: ۷۵)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے جنگ نہیں کرتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نکال جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی طرف سے کسی کو دلی اور اپنی ہی طرف سے کسی کو مددگار بنا۔

دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کی ضرورت بیان کی ہے اور مستقبل کی تاکید فرمائی ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (۸:۷۲)	جو لوگ ایمان تو لائے ہیں مگر وطن اور گھر بچھوڑ کر ہجرت کر کے نہیں آئے ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ البتہ اگر وہ دین کے بارے میں تم سے مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ سوائے اس صورت کے جبکہ وہ ایسی قوم کے خلاف مدد مانگیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔ اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے ولی و مددگار ہیں پس اگر تم (مسلمانوں کی مدد نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔

اس آیت مبارکہ میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت کیساتھ بیان کر دیا ہے پہلے وما لکم من ولایتھم من شئی سے یہ بتایا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہتے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تعلقات نہیں رہ سکتے یعنی نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں نہ انہیں ایک دوسرے کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے۔ نہ فے اور غنیمت سے ان کو کوئی حصہ پہونچتا ہے۔ ورنہ صدقات کے مصارف میں وہ داخل ہو سکتے ہیں لیکن ولایت کے یہ تمام تعلقات منقطع کر دینے کے باوجود ایک تعلق یعنی نصرت و مددگاری کا تعلق پھر بھی منقطع نہیں کیا اور ان استنصروکم فی الدین سے صاف طور پر بتلا دیا کہ یہ نصرت کا تعلق دین کے ساتھ قائم ہے جب تک کوئی شخص مسلمان بن کر وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو اس سے مسلمانوں کا تعلق نصرت و مددگاری کی حد میں منقطع نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کے دیکھنے کوئی فساد ہوا یا سیر ظلم ہوا اور وہ دینی رشتہ کا واسطہ دیکر مدد مانگے تو مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ اس کی مدد کریں بشرطیکہ جس کے خلاف مدد مانگی گئی ہو اس سے مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو۔ کیونکہ معاہدہ ہونے کی حالت

میں مسلمانوں کے لئے عہد کی پابندی اپنے مسلمان بھائی کی مدد سے زیادہ ضروری ہے اور ان کیلئے جائز نہیں ہے کہ معاہدہ کی مدت منقضی ہونے سے پہلے اس کی مدد کریں۔ یہ حکم بیان کرنے کے بعد اس نصرت و اعانت کی ضرورت جتائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ دیکھو یہ کفار اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے کی کیسے مدد کرتے ہیں۔ اور اپنی آپس کی مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں کس طرح ایک ہو جاتے ہیں پس اگر تم بھی دینی رشتہ کو ملحوظ رکھکر آپس میں ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو تو زمین میں کیسا فتنہ و فساد عظیم برپا ہو۔ فتنہ کا لفظ جیسا کہ آگے چلکر ہم تبشریح بیان کرینگے، قرآنی اصطلاح میں غلبۂ کفر اور پیروان دین حق کے مبتلائے مصیبت و ذلت ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی طرح فساد بھی ہدایت پر ضلالت کے غالب ہونے اور نیکی و صلاح کار کے مٹ جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پس اللہ تعالے مسلمانوں کی کسی جماعت کے مٹائے جانے یا اسکے راہِ حق سے پھیر دئے جانے کو فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کو مسلمانوں کا فرض قرار دیتا ہے۔

دفاع کی غرض و غایت

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں۔ ایک غائر نظر ڈالو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی و شرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں، اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے۔ خواہ باہر سے خواہ اندر سے، اسکا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اسکے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور خرخشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی دینی و سیاسی طاقت کا مضبوط رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان قومی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنھوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت و مسکنۃ اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے، بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو بھی انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے۔ جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور

یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔ پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالمگیر اصلاح کے کام میں روک پیدا کرنے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اسکے لئے صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جبکہ بدی اپنا سر نکالے۔ اور فتنہ پردازی شروع کر دے، بلکہ اسکے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ و مستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ رہے۔ اور اسیر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اسکا دف اندر ہی اندر مر جائے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ

(۸:۸)

اور ان کے مقابلہ کے لئے جسقدر تمہارے امکان میں ہو۔ سامان جنگ اور ہمیشہ محافظت کرنیوالے گھوڑے یعنی سوار مستعد رکھو اس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن اور انکے سوا دوسرے اعدا کو جنہیں تم نہیں جانتے۔ مگر اللہ نہیں جانتا ہے۔ مرعوب و خوفزدہ کروگے۔ اس کام میں جو کچھ تم فی سبیل اللہ خرچ کروگے وہ تمہیں دنیا میں امن و امان اور ترقی اسلام کی صورت میں اور آخرت میں خوشنودی الٰہی کی صورت میں پورا کا پورا واپس کیا جائیگا۔ اور تمپر ہرگز ظلم نہیں کیا جائیگا۔

یہ آیت بتلاتی ہے کہ مسلمانوں کی جنگی ضروریات کے لئے اس قسم کی عارضی فوج یا ضعیف [illegible] کافی نہیں ہوسکتی جو خاص ضرورت کے موقع پر جمع کی جائے اور ضرورت رفع ہونیکے بعد منتشر کر دیجائے بلکہ انہیں مستقل فوج مرابط [illegible] رکھنی چاہیے جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔ اس کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب عجیب معانی ظاہر ہوتے ہیں۔ سامان جنگ کی نوعیت کو صرف لفظ قوۃ سے بیان کیا جو پہلی صدی ہجری کے تیروں اور دبابوں پر چودھویں صدی کی توپوں، ہوائی جہازوں، اور آبدوز کشتیوں پر اور اسکے بعد آنے والی صدیوں کی بہترین حربی اختراعات پر یکساں حاوی ہے۔ ما استطعتم کے لفظ نے قوۃ کی کمیت کو مسلمانوں کی قدرت و استطاعت پر موقوف کر دیا یعنی اگر وہ ایک فوج گراں مہیب

کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو ان کو وہی کرنی چاہیئے لیکن اگر ان میں اتنی قوت نہ ہو۔ اور وہ بڑی بڑی توپیں، بڑے بڑے جنگی جہاز، بڑے بڑے مہلک آلات جنگ حاصل نہ کر سکیں تو ان سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ بلکہ انہیں ہر اس وسیلۂ جنگ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ جو دشمنان حق سے مقابلہ کرنے میں کام آ سکے، اور جسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ممکن ہو پھر "رباط الخیل" کے مستعد رکھنے کی مصلحت بتلاتے ہوئے ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم کے بعد واخرین من دونہم لا تعلمونہم اللہ یعلمہم کے الفاظ جو فرمائے۔ ان میں سیاست کا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی فوجی طاقت کو مضبوط کیئے ہے تو اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ جو طاقتیں اس کی علانیہ دشمن ہوں وہ اس سے مرعوب و خوف زدہ رہتی ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ لوگوں پر اس کی ایسی دھاک جم جاتی ہے کہ اس کے ساتھ دشمنی کرنے کا خیال بھی دلوں میں نہیں آتا! اور وہ سرکش قوتیں جو اسے کمزور اور غافل دیکھکر حملہ کر دینے میں ذرا تامل نہ کریں، اس کی اسطرح مطیع اور دوست بنی رہتی ہیں کہ اسے ان کی طبیعت میں چھپی ہوئی سرکشی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اسکے بعد علم الاقتصاد کی اس حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے۔ کہ اس حفظ ماتقدم کی تیاری میں جو روپیہ صرف ہوتا ہے اسے یہ نہ سمجھو کہ وہ تم سے ہمیشہ کے لئے ضایع ہو گیا اور اسکے فوائد سے تم محروم ہو گئے۔ بلکہ درحقیقت وہ تمہیں واپس ملتا ہے اور اس صورت میں واپس ملتا ہے کہ تم پر ظلم نہیں ہو سکتا۔ اور ظلم سے محفوظ رہنے کی صورت میں تمہیں پر امن زندگی کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ یوف الیکم وانتم لا تظلمون میں دنیا و آخرت دونوں میں فوائد حاصل ہونے اور دونوں میں ظلم سے بچے رہنے کا وعدہ مضمر ہے۔ اور درحقیقت اس جملہ سے دونوں مقصود ہیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے دین کی بہتری وہی ہے جو دنیا کی بہتری ہے، اور ان کی دنیا کی بدتری وہی ہے جسکا نتیجہ دین کی بدتری ہے۔

مصلحانہ جنگ اور اسکی حقیقت

اب غور کرنا چاہیئے کہ مدافعانہ جنگ کے ان احکام سے مسلمانوں کی جس قومی قوت کو مٹنے اور تباہ ہونے سے بچایا گیا ہے اس کا مصرف کیا ہے؟ آیا اس قوت کو بچانا ہی نفسِ مقصود ہے؟ یا درحقیقت اس سے کچھ اور کام لینا ہے جس کے لئے اس کا فتنوں سے محفوظ رہنا ضروری ہے؟ گذشتہ بحثوں میں جو ہم بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اپنی قومی طاقت کو کھو کر اس "اصلی خدمت" کو بجا لانے کے قابل نہیں رہ سکتے جس کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، تو اس سے ہمارا مقصد دراصل اسی سوال کا جواب دینا تھا۔ وہ مواقع کسی تفصیلی گفتگو کے متحمل نہ تھے اسلئے صرف اشارت پر کفایت کی گئی۔ مگر اب ہم بحث کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں اس گرہ کو کھولنے سے سوءِ فہم کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن مجید، جو کتاب مجمل ہونے کے باوجود اسلامی تعلیم کے ایک ایک پہلو کی تفصیل کا حامل ہے، وہ مقصد بھی بیان کرتا ہے جسکے لئے مسلمان پیدا کئے گئے ہیں اور وہ "اصلی خدمت" بھی بیان کرتا ہے جسکو انجام دینے کے لئے ان کی قوت کے تحفظ میں یہ سارا اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (۳:۱۲)	تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کی خدمت و ہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو و بدی کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس ارشاد میں اخرجت للعرب یا اخرجت للعجم یا اخرجت للشرق نہیں کہا گیا ہے بلکہ اخرجت للناس کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کیلئے پیدا کئے گئے ہیں اور وہ بنی نوع انسان کی خدمت یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم کریں اور بدی سے روکیں۔

ایک قوم کی زندگی کا مقصد تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرنا یہ ایک ایسی [illegible] ان کے تخیل سے قومیت و وطنیت کی فضا میں پرورش پانے والے تمام [illegible] وہ قوم پرور

یا "وطن پروری" کو تو خوب جانتے ہیں۔ اور "قوم پرستی" تو گویا ان کے تخیل کی معراج ہے، مگر جغرافی و نسلی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر سارے عالم انسانی کی عملی خدمت انجام دینا اور اسی کو پوری قوم کا مقصدِ حیات قرار دینا اس کی رسائی سے بہت دور ہے، اس لئے سب سے پہلے ہمیں اس کی تشریح کرنی چاہئے کہ یہ اخوجت للناس کیا چیز ہے۔

اجتماعی فرائض کا اخلاقی تخیل

اگر انسان کی جبلی خواہشات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ صلاحیت کے اعتبار سے اس کی کوئی خواہش ایسی نہیں ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کے حیوانات میں بھی موجود نہ ہو جسطرح ایک انسان اچھی اچھی خوش ذائقہ غذائیں کھانے کی خواہش رکھتا ہے اسی طرح ایک گھوڑے کی بھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے خوب ہری ہری گھاس کھانے کو ملے جس طرح ایک انسان اپنے ابنائے جنس پر غلبہ و قوت حاصل کرنے سے خوش ہوتا ہے اسی طرح ایک مینڈھے کے لئے بھی اس سے زیادہ خوشی کا موقع اور کوئی نہیں ہوتا کہ کوئی مینڈھا اس کی ٹکر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ جس طرح ایک انسان اپنی جان کی حفاظت کے لئے مدافعت اور بچاؤ کی تدبیریں کرتا ہے۔ اسی طرح ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ پس مجرد خواہشات کے اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ البتہ جو چیز اسے ادنیٰ درجہ کے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ حیوانات کی زندگی کا منتہائے مقصود ان خواہشات کا پورا کر لینا ہے۔ مگر انسان کی زندگی کا مقصد اُن خواہشات کا حصول نہیں ہے بلکہ وہ ایک بلند تر نصب العین کے لئے ایک لازمی وسیلے کے طور پر انکو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر انسان کے سامنے فی الحقیقت حیوانی مقاصد سے بلند کوئی انسانی نصب العین نہ ہو اور وہ اپنی ذہانت اور اُس عقل کو جو خدا نے اسے عطا کی ہے۔ صرف ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرنے میں صرف کرے جن سے وہ زیادہ اچھی طرح اپنی حیوانی خواہشات کو پورا کر سکتا ہو۔ تو وہ ایک اعلیٰ درجہ کا حیوان تو ضرور بن سکتا ہے۔ مگر ایک اعلیٰ درجہ کا انسان نہیں بن سکتا۔

انسان اپنے بقائے حیات کے لئے روزی کمانے پر مجبور ہے کہ نہ کمائیگا تو بھوکوں مر جائے گا، عوارض طبعی سے محفوظ رہنے کے لئے مکان بنانے کپڑے پہننے، اور دیگر وسائل حفاظت مہیا کرنے پر مجبور ہے کہ نہ کرے گا تو ہلاک ہو جائے گا۔ اور اسی طرح وہ اپنے دشمنوں سے اپنے آپ کو بچانے پر بھی مجبور ہے کہ اس کوشش میں دریغ کرے گا تو ذلت و مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ لیکن محض ان ضروریات

کو پورا کرلینا فی نفسہ کوئی مقصود نہیں ہے بلکہ وہ ذریعہ ہے اس بلند مقصد کے حصول کا جس تک پہنچنا انسانی زندگی کا اصلی مطمحِ نظر ہے۔ پس سچا انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے حقوق صرف اس لئے ادا کرتا ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنے شہر، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہو جائے، اور اپنے ان فرائض کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکے جو کائنات اور خالقِ کائنات کی طرف سے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ انسانیت کا اصلی معیار انہی حقوق اور فرائض کو سمجھنا اور پوری طرح ادا کرنا ہے۔ اور انسان پر اپنی ذات کے حقوق ادا کرنا اسی لئے فرض کیا گیا ہے کہ اسکے ذمہ صرف اسکے اپنے ہی حقوق نہیں ہیں۔ بلکہ دوسروں کے حقوق بھی ہیں اور اگر وہ اپنا حق ادا نہ کرے گا تو دوسروں کے حقوق بھی ادا کرنے سے قاصر رہیگا۔

جب افراد کے لئے انسانیت کا یہ معیار صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ کہ مجموعۂ افراد کے لئے بھی یہی معیار صحیح نہ ہو۔ جماعت بنجانے سے آدمیت میں کوئی کمی بیشی زیادتی نہیں ہوتی اس لئے بنی آدم کی اجتماعی شرافت کا معیار بھی وہی ہونا چاہیے جو انفرادی شرافت کا ہے۔ اگر ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا نصب العین اپنی زن پروری اور اپنی خدمتِ نفس کے سوا کچھ نہ ہو۔ ہماری نظروں میں ایک ذی عقل حیوان سے زیادہ وقعت نہیں پاسکتا۔ تو یقیناً ایک ایسی انسانی جماعت بھی متمدن جانوروں سے زیادہ وقعت کی مستحق نہیں ہے جس کی کوششوں کا دائرہ صرف اپنی صلاح وفلاح، اپنی ترقی وبہبود، اور اپنے امن وچین تک محدود ہو اور عام انسانی فلاح سے اسکو کچھ مطلب نہ ہو۔ اگر ایک ایسے آدمی کو جو اپنے گھر کی آگ بجھانے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے، اور اپنی جان ومال اور عزت وآبرو کی مدافعت کرنے میں تو خوب مستعد ہو۔ لیکن دوسرے کا گھر جلتا دیکھ کر، دوسرے کے حقوق پامال ہوتے اور دوسرے کی جان ومال اور عزت وآبرو مٹتے دیکھکر جس سے مس نہ ہوتا ہو۔ ہم ایک بہترین آدمی کہنا تو درکنار ایک اچھا آدمی، بلکہ "آدمی" کہنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ تو ایک ایسی قوم یا ایسی جماعت کو ہم بہترین یا کم از کم شریف قوم کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ جو اپنا گھر بچانے، اپنی حفاظت کرنے اور اپنے سے بدی وشرارت کو دفع کرنے کے لئے تو سب کچھ کرنے پر تیار ہو۔ مگر جب دوسری قوموں پر بدی کا غلبہ ہو۔ دوسری قومیں شیطانی قوتوں کی سرکشی سے تباہ ہو رہی ہوں اور دوسری قوموں کی اخلاقی، مادی، اور روحانی زندگی برباد ہو رہی ہو۔ تو وہ ان کی نجات، ان کی آبادی اور ان کی صلاح وفلاح کے لئے کوشش کرنے سے انکار کر دے جس طرح افراد پر اپنے نفس ہی

کے نہیں بلکہ اپنے ابنائے نوع اور اپنے خدا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جنھیں ادا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم پر بھی اپنے خالق اور اپنی وسیع انسانی برادری کی طرف سے کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور وہ ہرگز ایک شریف قوم کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ ان حقوق کو ادا کرنے میں اپنی جان و مال اور زبان و دل سے جہاد نہ کرے۔ اپنی آزادی کو محفوظ رکھنا، اپنے استقلال کی حمایت کرنا، اور اپنے آپکو شرارت کے تسلط سے بچانا یقیناً ایک قوم کا پہلا فرض ہے لیکن صرف یہی ایک فرض نہیں ہے جس کو ادا کر کے اسے مطمئن ہو جانا چاہئے بلکہ اسکا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حاصل کردہ قوت سے تمام نوع بشری کی نجات کے لئے کوشش کرے۔ انسانیت کی راہ سے ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو اسکی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی میں حائل ہیں، اور ظلم۔ طغیان بدی و شرارت۔ اور فتنہ و فساد کے خلاف اس وقت تک برابر جنگ کرتی رہے جب تک یہ شیطانی قوتیں دنیا میں باقی ہیں۔

اجتماعی فرائض کے متعلق اسلام کی اعلیٰ تعلیم

افسوس ہے کہ دنیا کے کم نظر گیانیوں نے اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار اور اجتماعی زندگی کے اس اعلیٰ نصب العین کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اگر کسی نے کوشش کی بھی تو اس کی نظر کچھ زیادہ دور تک نہیں جا سکی۔ یہ لوگ افراد کے اخلاقی فرائض پر جب بحث کرتے ہیں تو انسانیت ہی کے نہیں بلکہ عالم مادی کے ذرہ ذرہ کے حقوق بھی گنا جاتے ہیں۔ مگر جب اجتماعی زندگی کا سوال ان کے سامنے آتا ہے تو انسانیت کے وسیع تخیل کے لئے انکے دماغ تنگ ہو جاتے ہیں اور اجتماعی فرائض کو قومیت یا وطنیت کے ایک محدود دائرے میں سمیٹ کر وہ اس قوم پرستی یا وطن پرستی کی بنیاد ڈالدیتے ہیں جو تھوڑے سے تغیر کے بعد آسانی کے ساتھ قومی و وطنی عصبیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ تنگ نظری ہی دراصل انسانیت کی اس غیر طبعی تقسیم کی ذمہ دار ہے جس کی بدولت ایک نسل یا ایک زبان یا ایک قومیت رکھنے والے انسان اپنے دوسرے ابنائے نوع کو دائرہ انسانیت سے خارج سمجھتے ہیں، اور انکے حقوق کو سمجھنا اور ادا کرنا تو درکنار، انہیں انکے پامال کرنے میں بھی اخلاق و شرافت کا کچھ ٹوٹا نظر نہیں آتا۔

قرآن مجید نے اپنے ارشاد اخرجت للناس سے دراصل اسی انسانیت کی غیر طبعی تقسیم کو منسوخ کیا ہے اور اجتماعی شرافت کے اس بلند معیار کو پیش کر کے عالمگیر خدمت انسانی کے اس اعلیٰ نصب العین کی طرف امت مسلمہ کی رہنمائی کی ہے جو ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک حق پرست قوم کی فرض

شناسی کے لئے قومیت کا میدان بہت تنگ ہے، وہ ایک نسل یا ایک زبان یا ایک ملک کی قید بھی برداشت نہیں کر سکتی اسکے لئے خشکی و تری کی حد بندیاں، ستاروں اور جہتوں کی تقسیمیں بھی بے معنی ہیں کہ ایشیا اور یورپ یا شرق و غرب کا امتیاز اس کے ادائے فرض میں حائل ہو سکے اس کے نزدیک تو تمام انسان اور آدم کے تمام بیٹے بیٹیاں برابر ہیں اس لئے ان سب کی خدمت کرنا یعنی ان سب کو نیکی کا حکم کرنا اور سب کو بدی سے روکنا اور شر سے بچانا اسکا فرض ہے۔ اس اعلیٰ تعلیم کو اس نے مختلف مؤثر پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھولدی ہیں۔

چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲:۱۴۳)

اس طرح ہم نے تم کو ایک بہترین عادل امت بنایا تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر نگراں رہو اور رسول تم پر نگراں رہے۔

اور اسی مضمون کی تشریح سورۂ حج میں اس طرح کی گئی ہے کہ:۔

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ (۲۲:۷۸)

اور اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو جو جہاد کرنے کا حق ہے اس نے تم کو اسی کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے اور تم پر دین کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور یہ وہی ملت ہے جو تمہارے باپ ابراہیم کی تھی اللہ نے تمہارا نام اس سے پہلے بھی اور اس کتاب میں بھی مسلم (اطاعت گذار) رکھا ہے تاکہ رسول تم پر نگراں رہے اور تم دنیا کے لوگوں پر نگراں رہو پس نماز کو قائم کرو زکوٰۃ دو اور اللہ کے دین پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔

ان دونوں آیات کو جو ایک دوسری کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔ ملا کر پڑھو۔ تو حقیقت واضح ہو جائے گی یہاں بھی مسلمانوں کی زندگی کا مقصد اسی عام گیر خدمت انسانی کو بتایا ہے۔ فرمایا کہ تم ایک ایسی گروہ ہو جسے افراط و تفریط سے ہٹا کر عدل و توسط کی راہ حق پر قائم کیا گیا ہے یعنی اللہ نے تم کو اس کام کے لئے منتخب فرمایا ہے کہ اس کی خاطر حق کی حفاظت حق کی اعانت اور حق کی بلند سازی کے لئے کوشش کرنے میں اپنی ساری قوتیں وقف کر دو۔ اور یہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لو۔ تمہارے دین کو تنگ نہیں کیا۔ بلکہ اس میں احکام کے انتخاب سے آسانیاں اور سہولتوں کے متعدد راستے نکالے ہیں

پھر اسکا دائرہ اتنا وسیع رکھا ہے کہ نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کی قیود اس کی برکتوں کو عام ہونے سے باز نہیں رکھ سکتیں۔ اور اس میں کوئی چھوت چھات یا درن آشرم کی قید نہیں رکھی گئی۔ اور نہ اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں یا اسرائیل کے بھٹکے ہوئے اونٹوں کی کوئی تخصیص کی گئی ہے۔ کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کا حق ادا کرنے سے روک سکے۔ پس اب تمہارا کام یہ ہے کہ تمام دنیا والوں کی دیکھ بھال کرو ان کے اعمال کی نگرانی رکھو اور ان پر اللہ کے گواہ اس کے محتسب اور اس کے دیدبان بنے رہو۔ کیونکہ تمہیں اسی عام نگرانی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

پھر ایک دوسرے طریقہ سے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲:۶)	اگر ہم ان کو زمین میں طاقت بخشیں گے۔ تو وہ نماز قائم کرینگے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے۔ اور بدی کو روکیں گے۔

یہاں الناس کی بجائے الارض کا لفظ استعمال کیا۔ اور مسلمانوں کی طاقت و قوت کا فائدہ یہ بتایا کہ وہ زمین میں نیکی کو قائم کریں گے۔ اور بدی کو مٹائیں گے۔ سو اس سے بھی یہی بتانا مقصود ہے۔ کہ مسلمانوں کا کام صرف عرب، یا صرف عجم، یا صرف ایشیا، یا صرف مشرق ہی میں اقامت صلوۃ، ایتائے زکوۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا نہیں ہے بلکہ کرۂ زمین کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں ان کو پہنچنا چاہئے معمورۂ ارضی کے ہر دشت و جبل اور بحر و بر میں نیکی کا جھنڈا لئے ہوئے بدی کے لشکروں کا تعاقب کرنا چاہئے۔ اور اگر دنیا کا کوئی ایک کونہ بھی ایسا باقی رہ گیا ہو جہاں منکر (یعنی برائی) موجود ہو تو وہاں پہنچکر اسکو مٹانا۔ اور معروف (نیکی) کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہئے۔ اللہ کو کسی خاص ملک یا خاص نسل سے واسطہ نہیں ہے وہ اپنی تمام مخلوق کا یکساں خالق اور رب ہے یکساں خالقیت کا تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ کسی خاص ملک میں فتنہ و فساد پھیلنے کو برا نہیں سمجھتا۔ بلکہ زمین میں خواہ کسی جگہ بھی فساد ہو اس کے لئے یکساں ناراضی کا موجب ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں فساد فی العرب یا فتنہ فی العجم کہیں نہیں آیا بلکہ ہر جگہ ارض کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا۔ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ پس وہ اپنے لشکر حق یعنی امت مسلمہ کی خدمت کو قومیت و نسل کی حدود میں مقید نہیں کرتا۔ بلکہ اس جمعیت کو تمام روئے زمین کے بسنے والوں کے لئے عام کرتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی المنکر کی حقیقت

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خیر امت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنی ذات کی خدمت کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کی زندگی کا لب العین "اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" میں پوشیدہ ہے۔ یعنی جس طرح ان کے سردار نے زبان وحی سے اعلان کیا تھا کہ یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ اے لوگو! میں موسیٰ و عیسیٰ اور ہود و صالح وغیرہم کی طرح صرف اپنی قوم کے لئے نہیں بلکہ تم سب کے لئے اللہ کا پیغام لیکر آیا ہوں" اسی طرح مسلمان بھی آسمانی ہدایت کے مطابق اعلان کرتے ہیں کہ ہم قوم پروری یا وطن پرستی کے لئے پیدا نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ہماری زندگی کا مقصد تمام عالم انسانی کی خدمت ہے۔ اور ہماری خدمت گذاری کا دائرہ تمام کرۂ زمین کو محیط ہے۔

اب دیکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کی اصلی خدمت جس کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ کس قسم کی خدمت ہے۔ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

معروف لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی ہو۔ اور اصطلاحاً اس سے مراد ہر وہ فعل لیا جاتا ہے جس سے عقل صحیح آشنا ہو اور جس کی خوبی کو فطرت سلیمہ جانتی اور سمجھتی ہو۔ اسی طرح منکر لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو معروف کی ضد یعنی جانی پہچانی نہ ہو۔ اور اصطلاحاً اسکا اطلاق اس فعل پر ہوتا ہے جسکو فطرت سلیمہ پسند نہ کرتی ہو۔ اور عقل صحیح جس کی برائی کا حکم لگا دے۔ پس معروف تمام نیکیوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ نیکی اسی چیز کا نام ہے جسے فطرت سلیمہ پسند کرتی ہو۔ اور منکر تمام برائیوں پر حاوی ہے۔ کیونکہ برائی نام ہی اس چیز کا ہے جو فطرت سلیمہ کے خلاف ہو۔ ایمانداری۔ راستبازی۔ پرہیزگاری۔ فرض شناسی۔ ضعیفوں کی حمایت۔ مظلوموں کی مدد۔ محتاجوں کی اعانت۔ عدل و انصاف کا قیام۔ خدا اور بندوں کے اور خود اپنے حقوق کو سمجھنا اور انہیں ادا کرنا۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے اخلاقی فضائل معروف ہیں اور ان پر خود عمل کرنے اور دوسروں کو آمادہ کرنے کا نام امر بالمعروف ہے۔ اسی طرح خیانت، بدکاری، دروغ بافی، فتنہ پردازی، فساد انگیزی، اپنے حدود سے تجاوز کرنا۔ دوسروں کے حقوق کو پھینا۔ بس کی حمایت کرنا حق و صداقت کو دبانا۔ کمزوروں اور ضعیفوں کو ستانا یہ اور ایسے ہی دوسرے تمام خلاف عقل اور خلاف فطرت اعمال منکر ہیں۔ ان سے خود احتراز کرنا اور دوسروں کو باز رکھنا ہی عن المنکر ہے۔

اس میں خود نیک بننا اور بدی سے پرہیز کرنا مقدم رکھا گیا اور نیک بنانا اور بدی سے روکنا موخر جیسا کہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے پہلے اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ کا ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نیک بننا ضروری ہے لیکن جس طرح اپنا پیٹ بھرنے سے دوسرے کا پیٹ بھرنا زیادہ افضل ہے۔ اسی طرح فضیلت کے اعتبار سے نیکی کو پھیلانے اور بدی کو روکنے کا درجہ بھی نیک بننے اور بدی کو ترک کرنے سے زیادہ ہے، کیونکہ ایک اپنے نفس کی خدمت ہے اور دوسری اپنے ابنائے نوع کی خدمت ایک محض انسانیت کے درجہ میں ہے اور دوسری انسانیت کاملہ کے درجہ میں نیکی پر خود عمل کرنا اور بدی سے خود پرہیز کرنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے اور ایک شریف آدمی کا شیوہ۔ مگر شرافت کا کمال اور بزرگی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک کسی انسان کو نصیب نہیں ہو سکتا جب تک دوسرے لوگوں کو بھی نیکو کار بنانے اور بدکاری سے روکنے کی کوشش نہ کرے انسان کی فطرت ہے کہ اگر اسے کوئی چیز ناپسند ہوتی ہے تو چھوڑ دیتا ہے اگر ناپسندی سے ایک درجہ بڑھ کر نفرت ہوتی ہے تو اسے دیکھنا یا سننا بھی برداشت نہیں کر سکتا اگر نفرت سے ایک درجہ بڑھ کر دشمنی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مٹانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر دشمنی سے بھی بڑھ کر اس کے دل میں بغض و عناد کے شدید جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اس کے مٹانے کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا ہے، اور اس طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ جب تک اسے صفحہ ہستی سے محو نہ کر دے چین نہیں لیتا۔ اسی طرح جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو خود اختیار کر لیتا ہے جب محبت کرتا ہے تو آنکھوں میں اسکا نظارہ اور کانوں میں اسکا ذکر سننے اور دیکھنے سے خوشی ہوتی ہے جب محبت سے بڑھ کر عشق کا درجہ آتا ہے تو چاہتا ہے کہ دنیا کے ذرہ ذرہ میں اسی کا جمال ہو اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے غیر کو دیکھنے اور غیر کا ذکر سننے اور غیر کا تصور کرنے میں ضائع نہ ہو۔ پھر اگر یہ عشق فدائیت کی حد تک بڑھ جائے تو وہ اپنی زندگی کو اسی کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اور اپنی جان و مال، عیش و آرام، عزت و آبرو، غرض سب کچھ اس پر نثار کر دیتا ہے۔ پس امر بالمعروف جس چیز کا نام ہے وہ دراصل نیکی سے انتہائی شیفتگی اور والہانہ عشق ہے اور نہی عن المنکر سے جس چیز کو تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل بدی سے انتہائی بغض و عناد ہے۔ آمر بالمعروف صرف نیک ہی نہیں ہوتا بلکہ نیکی کا عاشق اور فدائی ہوتا ہے اور ناہی عن المنکر صرف بدی سے محترز ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا دشمن اور اس کے خون کا پیاسا ہوتا ہے۔

ایک دوسرا خطبہ جس پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیاد قائم ہے حب انسانیت اور ہمدردی بنی نوع کا جذبہ ہے۔ خود غرض آدمی کو اللہ جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ منفرد رہنا چاہتا ہے اور دوسرے کو شریک

نہیں کرتا۔ اسی طرح اس کی ذات پر کوئی مصیبت آئے تو اس کے دفع کرنے میں تو پوری کوشش کرتا ہے مگر دوسروں کو مصیبت میں دیکھکر اُن کی مدد نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو شخص ہمدرد اور محب انسانیت ہو۔ وہ اپنی راحت میں سب کو شریک کرتا ہے اپنی نعمتیں سب پر بانٹتا ہے اور دوسرے کو درد و مصیبت میں دیکھکر اسی طرح بیتاب ہو جاتا ہے۔ جس طرح خود اپنے لئے ہو سکتا ہے۔ اس خود غرضی و ہمدردی کو ہم عموماً محسوسات اور مادیات کے عالم تک محدود سمجھتے ہیں لیکن اخلاق و روحانیت کے عالم میں ان صفات کا مقابلہ زیادہ سختی کے ساتھ ہوتا ہے اور چونکہ انسان کی مادی بھلائی اور برائی اس کی اخلاقی و روحانی زندگی کے تابع ہوتی ہے اسلئے ان صفات کا اصلی مقابلہ حقیقۃً اسی عالم میں ہوتا ہے۔

ایک سچا ہمدرد بنی نوع اور محب انسانیت خود نیک بنجانے پر قانع نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی انسانی برادری کے دوسرے افراد کو بھی بدی کے پنجے سے چھڑا کر نیکی کا رستہ نہ دکھا دے اُسی اطمینان نصیب نہیں ہوتا اس کی روح اپنے دوسرے بھائی کو بدی میں مبتلا دیکھکر بے چین ہو جاتی ہے۔ وہ دوسرے انسان کو نیکی کے لباس سے عاری دیکھکر اسی طرح بیقرار ہو جاتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سردی میں سکڑتے دیکھکر بیقرار ہو جایا کرتی ہے۔ اسکو جب کسی چیز کی اچھائی معلوم ہو جاتی ہے تو اسکا جی چاہتا ہے کہ اسکے چنگل میں ایک شخص بھی گرفتار نہ رہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک چیز اگر اچھی ہے تو وہ صرف میرے ہی لئے اچھی نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لئے اچھی ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کو آدم کے ہر بیٹے اور بیٹی تک پہنچاؤں۔ اگر ایک چیز فی الحقیقت بُری ہے تو وہ صرف میرے ہی لئے بری نہیں ہے۔ بلکہ سب کے لئے اس کی بُرائی یکساں ہے۔ اور لوگوں کو اس سے بچانا میرا فرض ہے۔ اپنی بھلائی پر قناعت کر کے دوسروں کی بھلائی نہ چاہنا اور اپنے سے بدی کو دور کر کے مطمئن ہو جانا اور دوسروں کو اس سے بچانے کی کوشش نہ کرنا سب سے بڑی خود غرضی اور سب سے بڑی انانیت ہے

لیکن یہ صرف خود غرضی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ہے انسان ایک متمدن حیوان ہے وہ جماعت سے الگ ہو کر زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اجتماعی ہے جماعت بری ہو گی تو اسکی برائی سے وہ بھی نہ بچ سکے گا۔ اگر ایک شہر میں عام طور پر غلاظت پھیلی ہوئی ہو اور اس سے وبا پھیل جائے تو ہوا کی خرابی صرف اسی شخص کو ہلاک نہیں کرے گی جس کے گھر میں غلاظت موجود ہو۔ بلکہ وہ صاف ستھرا روز نہانے والا، روز گھر کو صاف رکھنے والا۔ اور حفظان صحت کا پورا لحاظ رکھنے والا آدمی بھی

اس سے متاثر ہوگا۔ جو اس شہر میں رہتا ہو۔ اسی طرح اگر کسی بستی کا عام اخلاق بگڑا ہوا ہو اور وہاں کے لوگ عموماً بدکار ہوں تو اس پر جو تباہی نازل ہوگی وہ صرف بدکاروں ہی تک محدود نہ ہوگی۔ بلکہ ان چند نیکوکاروں کی عزت و شرافت پر بھی اس کی زد پہنچے گی جو اس بستی میں مقیم ہوں۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً (۸:۳۵) کے یہی معنی ہیں کہ کسی بستی کی عام تباہی سے صرف بدکار ہی تباہ نہیں ہوتے۔ بلکہ نیکوکار بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مضمون کو ایک حدیث میں نہایت وضاحت کیساتھ بیان فرمایا ہے۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وہم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ فاذا فعلوا ذلک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ (رواہ امام احمد)	اللہ عام لوگوں پر خاص لوگوں کے عمل کے باعث اسوقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک ان میں یہ عیب پیدا نہ ہو جائے کہ اپنے سامنے برے اعمال ہوتے دیکھیں اور انہیں روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں جب وہ ایسا کرنے لگتے ہیں تو پھر اللہ عام اور خاص سب پر عذاب نازل کرتا ہے

پس امر بالمعروف ونہی عن المنکر صرف دوسروں ہی کی خدمت نہیں بلکہ اپنی خدمت بھی ہے اور درحقیقت مجموعی بہتری میں اپنی بہتری چاہنے کی دانشمندانہ حکمت عملی کا دوسرا نام ہے۔

حیات اجتماعی میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا درجہ

پھر یہی وہ چیز ہے جس پر اجتماعی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے، جو ایک قوم اور ایک جماعت کو ہلاکت میں مبتلا ہونے سے بچاتی ہے، جس کے بغیر انسانیت کی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔ جب تک ایک قوم میں یہ اسپرٹ موجود رہتی ہے۔ کہ اس کے افراد ایک دوسرے کو نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے کا اہتمام کریں یا کم از کم اس قوم میں ایک جماعت ہی ایسی موجود رہے، جو اس فرض کو مستعدی کیساتھ انجام دیتی رہے تو وہ قوم کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اس میں سے نکل جائے اور اس میں کوئی جماعت بھی ایسی نہ رہے، جو اس فرض کو انجام دینے والی ہو تو رفتہ رفتہ بدی کا شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور آخر وہ اخلاقی و روحانی اور مادی تباہی کے گڑھے میں ایسی گرتی ہے کہ ابھر نہیں سکتی، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے :-

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا أُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّأَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (۱۱:۱۱۷)

تم سے پہلے زمانہ کی قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ایسے نیکوکار لوگ نہیں تھے جو انہیں زمین میں فساد پھیلانے سے روکتے سوائے ان تھوڑے آدمیوں کے جنہیں ہم نے ان میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو ان لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں عطا کئے گئے تھے اور وہ بڑے خطاکار تھے سو تیرا رب ظالم نہیں ہے کہ بستیوں کو یونہی ہلاک کر دے۔ حالانکہ ان کے باشندے نیکوکار ہوں۔

ایک دوسری جگہ بنی اسرائیل کے مبتلائے لعنت ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (۵:۱۱)

بنی اسرائیل میں کفر کرنیوالے لوگوں پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جاتے تھے وہ ایک دوسرے کو ان بری باتوں سے نہ روکتے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور یہ بہت بری بات تھی جو وہ کرتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر میں امام احمد، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ رضی اللہ عنہم نے جو احادیث نقل کی ہیں ان سب میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ بد نقص جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ان کے دلوں سے برائی کی نفرت دور ہو گئی تھی۔ اور وہ جھوٹی رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ جو برائی کو برداشت کرتے کرتے خود برائی میں مبتلا ہو جانے پر انسان کو آمادہ کر دیتی ہے۔ کان الرجل یلقی الرجل فیقول یا ھذا اتق اللہ ودع ما تصنع فانہ لا یحل لک ثم یلقاہ من الغد فلا یمنعہ ذلک ان یکون اکیلہ وشریبہ وقعیدہ۔ جب ان میں کا ایک آدمی دوسرے سے ملتا تو کہتا کہ اے شخص اللہ سے ڈر۔ اور یہ فعل چھوڑ دے جو تو کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تیرے لئے جائز نہیں ہے مگر دوسرے دن جب اس سے ملتا تو اسی کا ہم پیالہ و ہم نوالہ و ہم مین بننے سے کوئی چیز اسے باز نہ رکھتی۔ آخر انہیں ایک دوسرے کی برائی کا اثر پڑ گیا۔ ان کے

ضمیر مردہ ہو گئے ضرب اللہ قلوب بعضہم ببعض جبوقت حضورؐ یہ فرما رہے تھے تو دفعتہً لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھے اور جوش میں آکر فرمایا۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنہن عن المنکر ولتاخذن علی ید المسیٔ ولتطرنہ علی الحق اطرا او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعنکم کما لعنہم	اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تمہیں لازم ہے کہ نیکی کا حکم کرو۔ اور برائی سے روکو۔ اور بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اسے حق کی طرف موڑ دو۔ ورنہ اللہ تمہارے دلوں پر بھی ایک دوسرے کا اثر ڈال دے گا۔ یا تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان لوگوں پر کی تھی۔

اسی مثال پر تمام دنیا کو بھی قیاس کر لینا چاہئے جس طرح ایک قوم کی فلاح و بہبود اور نجات کا انحصار امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی روح پر ہے۔ اسی طرح تمام عالم انسانی کی نجات و فلاح بھی اسی چیز پر منحصر ہے دنیا میں کم از کم ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے۔ جو بدکاروں کا ہاتھ پکڑنے والا، بدی کو روکنے والا، اور نیکوکاری کا حکم دینے والا ہو۔ اللہ کی طرف سے اس کی زمین پر شہید ہو۔ لوگوں کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ شرارت کے عناصر کو قابو میں رکھے۔ عدل و انصاف کو قائم کرے اور بدی کو کبھی سر نکالنے کا موقع نہ دے۔ اللہ کی مخلوق کو عام تباہی سے بچانے اور اسکی زمین کو شر و فساد اور سفک دما سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے گروہ کا وجود نہایت ضروری ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۱۰۴)	اور تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف بلائے۔ نیکوکاری کا حکم دے اور بدکاری سے روکے،

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی حقیقت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ فی نفسہ ایک اچھی چیز ہے، اور ہمدردی بنی نوع کا ایک بہترین جذبہ ہے بلکہ درحقیقت وہ نظام تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے کی ایک بہترین اور ناگزیر تدبیر ہے اور وہ ایک خدمت ہے جو دنیا میں امن قائم کرنے بدنیا کو شریف انسانوں کی بستی کے قابل بنانے اور دنیا والوں کو حیوانیت کے درجہ سے انسانیت کامل کے درجہ تک پہنچانے کے لئے اللہ نے ایک بہترین گروہ کے سپرد کی ہے اور یقیناً انسانیت کی اس سے بڑی

خدمت اور کوئی نہیں ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق

یہ عالم گیر انسانی خدمت جو مسلمانوں کے سپرد کی گئی ہے دو اجزا پر مشتمل ہے ایک امر بالمعروف اور دوسرے نہی عن المنکر ان دونوں کا مقصود و مدعا اگرچہ ایک ہے یعنی آدمی کو انسان بنانا لیکن دونوں کے مدارج مختلف ہیں۔ اور اس لئے دونوں کے طریقوں میں بھی اختلاف ہے۔ آیندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس اختلاف کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

علم الاخلاق میں انسان کے فرایض کو دو حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے ایک وہ فرایض جن کے کرنیکا اس سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ فرائض جنکا کرنا نہ کرنا خود اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ سوسائٹی کا ایک اچھا رکن بننے کے لئے انسان کا کم سے کم فرض یہ ہے۔ کہ وہ بُرے کاموں سے بچے۔ دوسروں کے حقوق نہ چھینے۔ دوسروں پر ظلم نہ کرے۔ دوسروں کے امن و اطمینان میں خلل نہ ڈالے۔ اور ایسے اعمال سے پرہیز کرے جو اس کے وجود کو سوسائٹی کے لئے نقصان دہ یا غیر مفید بناتے ہوں۔ ان فرائض کے ادا کرنے کا ہر سوسائٹی اپنے ہر رکن سے مطالبہ کرتی ہے۔ اور اگر وہ انہیں ادا نہ کرے تو اسکے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان کے ادا کرنے پر اسے مجبور کرے۔ فرائض کی دوسری قسم وہ ہے جو فضائل اخلاق سے تعلق رکھتی ہے اور جنہیں ادا کرنے سے انسان سوسائٹی کا ایک معزز اور اعلےٰ درجہ کا رکن بن سکتا ہے۔ مثلاً خدا اور بندوں کے حقوق پہچاننا، اور انہیں ادا کرنا، خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا اپنے خاندان اور اپنی قوم اور اپنے ابنائے نوع کی خدمت کرنا اور حق کی حمایت و حفاظت کرنا وغیر ذالک۔ اس دوسری قسم کے فرائض کو انجام دینے کے لئے انسانی شعور کی تکمیل ضروری ہے۔ اور کوئی شخص انہیں اسوقت تک ادا نہیں کر سکتا جب تک ان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ نہ لے اور اس کے نفس میں اتنی پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے کہ وہ انہیں ادا کرنے پر آمادہ ہو۔ اس لئے یہ فرائض اجباری نہیں بلکہ اختیاری ہیں، اور انسان کی مرضی پر منحصر ہے کہ خواہ معزز اور اعلیٰ درجہ کا انسان بنے یا نہ بنے۔ اگرچہ ایک سوسائٹی کا اخلاقی نظام ایسا ہی ہونا چاہئے کہ اس کے افراد میں اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کی خواہش طبعاً پیدا ہو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرق بھی تقریباً اسی تقسیم پر مبنی ہے آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکالکر انسانیت کی سطح پر لانا اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک غیر مفید اور نقصان دہ رکن بننے سے روکنا نہی عن المنکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور پھر اسکو انسانیت کی سطح سے اٹھاکر انسانیت کاملہ کے درجہ میں لیجانا۔ اور اسے انسانی سوسائٹی کا ایک مفید اور معزز رکن بنانا امر بالمعروف سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر سے افضل ہے لیکن ترتیب کے اعتبار سے نہی عن المنکر پہلے ہے اور امر بالمعروف بعد میں، جس طرح ایک کسان کا اصل مقصد اناج پیدا کرنا ہے۔ لیکن اس کے لئے بیج ڈالنے سے پہلے ہل چلاکر زمین کو نرم کر دینا ضروری ہے اسی طرح اسلام کا اصل مقصد تو انسان کو انسان اعلیٰ بنانا ہے مگر معروف کا بیج ڈالنے سے پہلے اس کی فطرت کو منکر سے پاک کرکے ہموار کر دینا ضروری ہے۔ اسلام ہر شخص کو معروف کی طرف دعوت دیتا ہے اور انسان کو اس کی خوبیاں دکھاکر اسے اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ لیکن منکر ایک پردہ ہے جو اس کی آنکھ کو معروف کا جمال دیکھنے سے باز رکھتا ہے۔ اور ایک زنگ ہے جو اسکے آئینہ قلب کو معروف کا پرتو قبول کرنے کے قابل نہیں رہنے دیتا۔ اس لئے منکر کے پردہ کو ہر ممکن طریقہ سے چاک کرنا اور اسکے زنگ کو ہر ممکن طریقہ سے کھرچ دینا سب سے پہلی اور ضروری تدبیر ہے۔ اسکے بعد اگر کوئی شخص معروف کی دعوت کو قبول کرلے تو اسکے لئے فضائل اخلاق کا ایک بڑا حصہ اختیاری نہیں رہتا۔ بلکہ اجباری ہوجاتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کاملہ کے درجہ میں پہنچکر اس کے لئے وہ آسانیاں باقی نہیں رہ سکتیں جو انسانیت محضہ کے درجہ میں اسے حاصل تھیں۔ لیکن اگر یہ زنگ چھوٹ جانے کے بعد اور یہ پردہ اٹھ جانے کے بعد بھی کوئی آنکھ معروف کا جمال نہ دیکھے اور کوئی قلب اسکا پرتو قبول نہ کرے تو اسلام اسے صرف منکر سے روکنے پر اکتفا کرتا ہے اور آگے اسکا معاملہ خدا پر چھوڑ دیتا ہے کہ چاہے اسے بصیرت عطا کرے چاہے نہ کرے۔ مَنْ يَّشَاْ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ایک دوسری حیثیت سے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرق اُس فرق پر مبنی ہے جو خود اسلام کی دو مختلف حیثیتوں کے درمیان ہے۔ اسلام ایک حیثیت میں تو محض دعوت ہے نیکی اور تقوی کی جانب اور دوسری حیثیت میں وہ اللہ کا قانون ہے تمام دنیا کے لئے جب کوئی شخص اسلام قبول کرلیتا ہے تو اسکے لئے یہ دونوں حیثیتیں جمع ہوجاتی ہیں اور دعوت کی دفعات بھی اسکے حق میں قانون کی دفعات

بنجاتی ہیں۔ مگر اسلام نہ قبول کرنے کی صورت میں دعوت الگ رہتی ہے۔ اور قانون الگ۔ دعوت کا منشا یہ ہے کہ انسان اس منصب خلافت کا اہل بنجائے۔ جو اللہ نے اسے زمین پر بھیجتے وقت سپرد کیا تھا اور ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ قانون کا منشا یہ ہے کہ انسان اگر منصب خلافت کی خدمات کو انجام نہ دے تو کم از کم فساد و خونریزی تو نہ کرے جس کا طعنہ فرشتوں نے اسکو دیا تھا۔ اگر وہ اشرف المخلوقات نہ بنے تو کم از کم ارذل المخلوقات تو نہ بن جائے۔ اگر وہ دنیا کو نیکی و تقوی سے روشن نہ کرے تو کم از کم بدی و شرارت سے اسکے امن و سکون کو تو غارت نہ کرے۔ پہلی چیز باطن کی روشنی اور طبیعت کی صلاحیت پر منحصر ہے جو ظاہر ہے کہ مارے کوڑے سے پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز حدود کی تعیین اور نگہداشت سے تعلق رکھتی ہے جسکا پاس و لحاظ کرنے پر اس کی سرکش طبیعت کو صرف وعظ و تلقین ہی سے آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسے مجبور کرنے کے لئے قوت کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔

نہی عن المنکر کا طریقہ

اس مضمون کے بعض پہلو مزید روشنی کے محتاج ہیں جنھیں آگے چلکر ہم ایک دوسرے موقع پر بوضاحت بیان کریں گے۔ یہاں صرف اسقدر بتلانا مقصود ہے کہ اسلام نے غیر مسلم دنیا کو معروف کا حکم کرنے کے لئے تو صرف دعوت و تبلیغ کا طریقہ بتلایا ہے۔ لیکن منکر سے روکنے کے لئے اس کی قید نہیں رکھی۔ بلکہ اس کی مختلف انواع کے لئے مختلف طریقے تجویز کئے ہیں قلب و ذہن کی گندگی اور خیال و رائے کی ناپاکی کو وعظ و تلقین کے ذریعہ سے دور کرنے کی ہدایت کی چنانچہ فرمایا۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۶:۱۲۵)	اللہ کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ بلا۔ اور ان سے ایسے طریقہ پر بحث و مناظرہ کر جو بہترین ہو یعنی سختی و بدکلامی اس میں نہ ہو۔
وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (۲۹:۵)	اور اہل کتاب سے بحث و مناظرہ نہ کر۔ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں ظالم و بدکار ہیں۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ (۲۰: ۲)	پس اس سرکش سے نرم گفتگو کرو شاید کہ وہ نصیحت پکڑے اور اللہ سے ڈرے۔

فعل وعمل کی برائی کو طاقت وقوت کے زور سے روکنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ولتأخذن علی ید المسیٔ ولتطرنہ علی الحق اطرا۔ تم پر لازم ہے کہ بدکار کا ہاتھ پکڑ لو۔ اور اس کو حق کی طرف موڑ دو۔ اسکے علاوہ اور بہت سی احادیث ہیں جن میں منکر کو روکنے کیلئے قوت کے استعمال کا حکم ہے ایک موقع پر حضور نے فرمایا ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان (رواہ مسلم)	تم میں سے جو کوئی بدی کو دیکھے تو اسکو ہاتھ سے درست کردے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو۔ تو زبان سے۔ اور اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھتا ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے

ان احادیث میں ید کا لفظ جسمانی ہاتھ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ مجازاً قوت کے معنی میں بولا گیا ہے۔ بدکار کا ہاتھ پکڑنے سے مراد دراصل یہ ہے کہ اسکو اسطرح مجبور کر دیا جائے کہ وہ بدی و شرارت کا ارتکاب کر ہی نہ سکے۔ اسی طرح تغییر بالید سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی قوت وطاقت کو منکر کے مٹانے اور روکنے میں استعمال کرو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ حتی یروا المنکر بین ظہرانیہم وہم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ (رواہ احمد)	اللہ عام لوگوں کو خاص لوگوں کے عمل کی سزا اسوقت تک نہیں دے گا جب تک ان میں یہ رواداری پیدا نہ ہو جائے کہ بدی کو اپنے سامنے ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اور اسکو روکنے کی قدرت رکھتے ہوں مگر نہ روکیں۔

رسول اللہ کا ارشاد اللہ کے ارشاد کی تفسیر کرتا ہے۔ پس ان احادیث سے قرآن پاک کے حکم نہی عن المنکر کے معنی صاف معلوم ہوتے ہیں کہ اس سے مراد صرف زبان ہی سے منکر کو روکنا اور اسکی برائی بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ حسب ضرورت بزور وقوت اسکو روک دینا اور دنیا کو اسکے وجود سے پاک کر دینا بھی ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی قدرت واستطاعت پر موقوف ہے۔ اگر مسلمانوں میں اتنی قوت

ہو کہ تمام دنیا کو منکر سے روک کر اسے قانونِ عدل کا مطیع بنا لیں تو ان کا فرض ہے کہ اس قوت کو استعمال کریں اور جب تک اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا نہ دیں چین نہ لیں لیکن اگر اتنی قوت نہ رکھتے ہوں تو جس حد تک ممکن ہو انہیں اس خدمت کو انجام دینا چاہیے۔ اور جس حد تک کے لئے مزید قوت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے

فتنہ و فساد کے خلاف جنگ

منکر کی اس دوسری قسم کو جس کے خلاف اسلام میں قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے پہلی قسم سے ممتاز کرنے اور اسکی نوعیت کو زیادہ واضح کر دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور فساد سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ ان تمام آیات میں جنہیں منکر کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی ہے یا اس کی ضرورت ظاہر فرمائی گئی ہے یا اسے بزورِ شمشیر مٹانے کا حکم دیا گیا ہے تم کو منکر کے بجائے یہی فتنہ اور فساد کے الفاظ ملیں گے۔

قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔	ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔	اللہ اگر لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔
اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ۔	اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔	اور فتنہ قتل سے زیادہ بُری چیز ہے۔
مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا	جو کوئی کسی شخص کو بغیر اس قصور کے قتل کرے کہ اسنے کسی کی جان لی ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ۔	انھوں نے فتنہ پھیلانا چاہا۔
كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا	جب فتنہ کیطرف واپس جاتے ہیں تو اس میں خود بھی شامل ہو جاتے ہیں

ان تمام آیات میں اسی منکر کو فتنہ اور فساد کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے درحقیقت یہ ہے کہ تمام منکرات میں یہ فتنہ و فساد ہی ایک چیز ہے جس کا استیصال بغیر تلوار کے نہیں ہو سکتا۔

فتنہ کی تحقیق

عام طور پر فتنہ و فساد کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ کسی بات پر دو جماعتوں میں جھگڑا ہو جائے، پہلے گالم گلوچ ہو پھر فریقین کے مستعد آدمی اینٹ پتھر یا لاٹھی یا تلوار بندوق سے مسلح ہو کر میدان میں کود پڑیں۔ ایک دوسرے کے سر پھوڑیں اور خوب قتل و غارت کر کے آتش غضب کو ٹھنڈا کر لیں۔ اگرچہ فتنہ و فساد کا اطلاق اس مشغلہ پر بھی ہوتا ہے لیکن قرآنی اصطلاح میں ان الفاظ کا مفہوم اسقدر تنگ نہیں ہے بلکہ اور بہت سے اخلاقی جرائم بھی ان کے تحت آتے ہیں جن کی تفصیل دوسری کتابوں میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود قرآن ہی کو بتائیگا کہ اس کی مراد فتنہ و فساد سے کیا ہے۔

لغت میں فتن کہتے ہیں سونے کو تپا کر اسکا میل چھانٹ دینے کو اسی لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ انسان کے آگ میں ڈالے جانے پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے یَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ (جس روز وہ آگ پر بھونے جائینگے) اور پھر مجازاً اس سے ہر وہ چیز مراد لی گئی ہے جو انسان کو دکھ اور مصیبت اور آزمائش میں ڈالنے والی ہو۔ چنانچہ مال و دولت اور اہل و عیال کو بھی فتنہ کہا کہ وہ انسان کو حق سے غافل کر کے غلط کاریوں میں مبتلا کر دیتی ہے وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ اور راحت و مصیبت کو بھی جو اللہ کی طرف سے ہے فتنہ کہا کہ وہ آزمائش ہے انسان کے لئے۔ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ قدرتی حالات کے تغیر اور انسان پر ان کے اثرات کو بھی فتنہ کہا کہ ان کے مصائب سے آدمی کو عبرت حاصل ہوتی ہے أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ (کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں) کسی کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالنے کو بھی فتنہ کہتے ہیں کہ وہ اسکے لئے تکلیف کا موجب ہوتا ہے وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي (اور کوئی ان میں سے کہتا ہے کہ مجھے قیام کی اجازت دیدے اور تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ کر) خالص کفر کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ وہ انجام کار انسان کو دکھ اور مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ۔ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ هَٰذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ۔ (جس دن وہ آگ پر بھونے جائینگے اور ان سے کہا جائے گا۔ کہ اپنے کفر کا مزہ چکھو۔ یہ وہی چیز ہے جسکے لئے تم جلدی کر رہے تھے) لیکن قوت کے زور سے جس فتنہ کو مٹانے کا حکم دیا گیا ہے اس سے یہ وسیع المعنی

فتنہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ وہ فتنہ ہے جو اپنی حدود سے تجاوز کرنے والوں کی سرکشی سے بندگان خدا کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی پر تباہی لاتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں۔

(۱) کمزوروں پر ظلم و ستم کرنا، ان کے جائز حقوق سلب کرنا، ان کے گھر بار چھین لینا، اور انہیں تکلیفیں پہنچانا، چنانچہ فرمایا:۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا (۱۶:۱۴)

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لئے جو بہت دکھ دئے جانے کے بعد گھر بار چھوڑ کر نکل گئے۔ اور جنھوں نے حق کی خاطر سخت جد و جہد کی۔ اور راہ حق میں ثابت قدم رہے (مغفرت کرنیوالا ہے)

وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۷)

(حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا یقیناً مسجد حرام کی حق تلفی ہے) لیکن اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے زیادہ برا ہے اور یہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ (۸۵:۱۰)

جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم کئے اور اس گناہ سے توبہ نہ کی ان کے لئے دوزخ اور آتش دوزخ میں جلائے جانے کی سزا ہے۔

أَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (۲:۲۴)

انہیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا ہے۔ کیونکہ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔

(۲) جبر و استبداد کی بناء پر حق کو دبانا، اور قبول حق سے لوگوں کو روکنا۔ چنانچہ سورہ یونس میں فرمایا ہے کہ:۔

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِنْ قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِمْ أَنْ يَفْتِنَهُمْ (۱۰:۹)

پس موسیٰ پر ان کی قوم میں سے کوئی ایمان نہ لایا۔ سوائے ایک قلیل جماعت کے کیونکہ انہیں فرعون اور اپنے سرداروں سے جو فرعون کے خوشامدی تھے، خوف تھا کہ انہیں عذاب میں مبتلا کر دیں گے۔

(۳) صد عن سبیل اللہ جس کی تشریح گذشتہ باب میں کی جا چکی ہے۔ چنانچہ سورہ انفال میں پہلے تو کافروں کا یہ جرم بتایا ہے کہ وہ صد عن سبیل اللہ کی کوشش کرتے ہیں (اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ) پھر ان کے مغلوب ہونے کی پیش گوئی کی ہے (ثم یغلبون) اور اسکے بعد انکے اسی فعل کو فتنہ قرار دیکر جنگ کا حکم دیا ہے (وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

(۴) لوگوں کو گمراہ کرنا اور حق کے خلاف خدع و فریب اور طمع و اکراہ کی کوششیں کرنا چنانچہ فرمایا

وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْکَ خَلِیْلًا (۱۷:۸)

اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ تجھے طمع و اکراہ کے ذریعہ اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے۔ تاکہ تو اسے چھوڑ کر ہم پر افترا باندھنے لگے (اگر تو ایسا کرتا) تو اسوقت وہ تجھے دوست بنا لیتے

فَاِنَّکُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ بِفٰتِنِیْنَ۔ اِلَّا مَنْ ھُوَ صَالِ الْجَحِیْمِ (۳۷:۵)

یقین رکھو کہ تم اور تمہارے معبود ان باطل جنہیں تم پوجتے ہو کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس شخص کے جو خود ہی دوزخ کی طرف جانے والا ہے۔

وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّصِیْبَھُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِھِمْ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ (۵:۴۹)

اور ان سے بچ کر رہو کہیں تجھے ان احکام میں سے کسی سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تیری طرف اتارے ہیں کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں

(۵) غیر حق کے لئے جنگ کرنا۔ اور ناجائز اغراض کے لئے قتل و خون اور جتھ بندی کرنا چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَیْھِمْ مِّنْ اَقْطَارِھَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَۃَ لَاٰتَوْھَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِھَآ اِلَّا یَسِیْرًا (۳۳:۱۴)

اور جنگ احزاب میں اگر دشمن مدینہ کے اندر گھس آتے اور ان (منافقین) سے قتل و غارت کے فتنہ میں شریک ہونے کی درخواست کی جاتی تو یہ ضرور اسمیں جا ملتے اور ذرا تامل نہ کرتے

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَھُمْ کُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَی الْفِتْنَۃِ اُرْکِسُوْا فِیْھَا (۴:۹۱)

تم (دونوں فریقوں میں سے) کچھ دوسرے لوگ پاؤ گے جو تم سے بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم سے بھی مگر جب فتنہ کی طرف واپس جاتے ہیں تو اسمیں اوندھے گر جاتے ہیں (یعنی خود بھی فتنہ برپا کرنیوالوں کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں)

(۹) پیروان حق پر باطل پرستوں کا غلبہ

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ (۸:۷۳)

اگر تم پیروان حق کی مدد نہ کروگے۔ تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا۔ (یعنی غلبہ باطل سے حق پرستوں پر زمین تنگ ہو جائے گی۔)

فساد کی تحقیق

اب دیکھئے کہ قرآن مجید میں فساد کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

لغت میں فساد کہتے ہیں کسی چیز کے حد اعتدال سے نکل جانے کو اور صلاح اس کی ضد ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے تو ہر وہ فعل جو عدل و صلح کے خلاف ہے۔ فساد ہے لیکن عموماً اسکا اطلاق بدکاری کی شدت و کثرت پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو بزور مٹانے کا حکم دیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ خاص طور پر فرعون، عاد اور ثمود کے متعلق استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ (۸۹:۱)

کیا نہیں دیکھا تو نے کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کے مثل ملکوں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر تراشے اور لشکر والے فرعون کے ساتھ۔ ان لوگوں نے ملکوں میں سرکشی کی اور ان میں بہت فساد پھیلایا۔

قرآن مجید میں فرعون، عاد اور ثمود کے ان تمام اعمال کی تشریح ملتی ہے جنھیں فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) فرعون کے متعلق فرمایا کہ وہ متکبر تھا۔ اپنی رعیت کے درمیان نسلی امتیاز قائم کرتا اور ان میں پھوٹ ڈالکر اپنی حکومت کرتا تھا۔ اور کمزوروں کو ناحق قتل و غارت کرتا تھا۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ

فرعون نے زمین میں تکبر کیا اور شہریوں کو مختلف قوموں میں تقسیم کر دیا۔ اور ایک جماعت کو کمزور کر کے ان کے لڑکوں کو ذبح کرنے لگا۔ اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا بیشک

مُفْسِدِیْن (۲۸:۱) | وہ مفسدوں میں سے تھا۔

وہ قبول حق سے لوگوں کو جبراً باز رکھتا تھا۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھکر جادوگر ایمان لے آئے تو اس نے کہا:۔

اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى (۲۰:۷۱)

تم اسپر ایمان لے آئے قبل اسکے کہ میں تمہیں اجازت دیتا؟ یقیناً وہ تمہارا سردار ہے اور اسی نے تمہیں یہ جادو سکھایا ہے پس اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤنگا اور تمہیں کھجور کے تنوں پر صلیب دوں گا۔ اور تم دیکھلوگے کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دینے والا ہے۔

اس نے ایک قوم کو کمزور پاکر اپنا غلام بنالیا تھا۔ چنانچہ جب اسنے حضرت موسیٰؑ پر احسان جتایا تو آپ نے جواب دیا کہ:۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ (۲۶:۲۲)

اور تیری وہ نعمت جسکا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے یہ ہے کہ تو نے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے۔

وہ اپنی قوت کے نشہ میں اپنے جیسے انسانوں کا خدا بنتا تھا اور محض طاقت کے حق کی بنا پر حکومت و بادشاہی کرتا تھا۔ حالانکہ اصلی حق عدل و انصاف اور خداترسی کا حق ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ..... وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (۲۸:۳۸)

اس نے کہا کہ اے لوگو میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا ..... اس نے اور اسکے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے بڑائی کی اور سمجھ بیٹھے کہ گویا انہیں کبھی ہمارے پاس واپس آنا ہی نہیں ہے۔

اس نے اپنی رعایا کی اخلاقی حالت کو بگاڑ کر اتنا ذلیل کر دیا تھا کہ وہ اسکی غلامانہ اطاعت پر راضی ہوگئی:۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۴۳:۵۴)

اس نے اپنی قوم میں جہالت و کمینگی پیدا کی جس کے باعث انہوں نے اس کی اطاعت اختیار کی۔ یقیناً وہ بدکار قوم تھی۔

اس کی حکومت کی بنیاد ناحائز اور غلط قوانین پر قائم تھی

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۱۱:۹۷)	ان لوگوں نے فرعون کے احکام کی تعمیل کی۔ حالانکہ فرعون کا حکم راستی پر نہ تھا۔

(۲) اسی طرح عاد کا جرم یہ بتایا گیا کہ وہ جابر و سرکش حاکموں کی پیروی کرتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱:۹۹)	انہوں نے ہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی۔

وہ جابر و ظالم تھے۔ اور عدل و انصاف سے انہیں واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ حضرت ہودؑ انہیں ملامت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۲۶:۱۳۰)	جب تم کسی کی گرفت کرتے ہو تو جبر کے ساتھ کرتے ہو۔ (یعنی حق و انصاف کے ساتھ نہیں کرتے)

وہ اپنی قوت کے گھمنڈ میں بغیر کسی حق کے کمزور قوموں پر حکومت قائم کرتے تھے۔

فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (۴۱:۱۵)	انہوں نے زمین میں حق کے خلاف تکبر کیا۔ اور کہا کہ ہم سے زیادہ طاقت والا کون ہو سکتا ہے۔

(۳) ثمود کے مفسدانہ اعمال کی تشریح قرآن مجید میں یہ ملتی ہے کہ ان کے حاکم اور سردار ظالم و بدکار تھے۔ اور وہ لوگ انہی سرداروں کی اطاعت کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالحؑ ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۲۶:۱۵۱)	تم ان حد سے گذر جانے والوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو۔ جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

وہ ایسے سرکش تھے کہ ایک حق گو انسان کو بے قصور قتل کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے اور اس ظالمانہ فعل کے ارتکاب کے لئے کذب و فریب کے بدترین حیلے اختیار کرنے میں بھی انہیں باک نہ تھا۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (۲۷:۴۸)	اور اس شہر میں ۹ آدمی (جتھوں کے سردار) تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح نہ کرتے تھے انہوں نے کہا۔ یار قسم کھالو کہ رات صالحؑ اور اسکے گھر والوں پر چھاپہ ماریں گے اور پھر اسکے ولی سے کہدیں گے کہ ہمکو اس کی اور اسکے گھر والوں کی ہلاکت کا کچھ حال معلوم نہیں اور ہم بالکل سچ بولتے ہیں۔

۴۔ قرآن مجید میں قوم لوط کو بھی مفسد کہا گیا ہے اور اسکے فساد کی تشریح اس طرح کی ہے۔

أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ (۲۹:۲۸)	تم وہ بدکاری کرتے ہو جو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کی۔ کیا تم مردوں کے پاس جاتے ہو، رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بُرے کام کرتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت لوط کی قوم مردوں سے وہ فعل کرتی تھی جو وضع فطرت کے خلاف تھا اور راستوں میں ڈاکے ڈالتی تھی۔ اس وجہ سے عوام میں اسقدر بے حیائی بڑھ گئی تھی کہ مجلسوں میں علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور یہی ان کے وہ اعمال تھے جنہیں فساد سے تعبیر کیا گیا۔

۵۔ مدین کے لوگ بھی مفسد کہے گئے ہیں۔ اور حضرت شعیبؑ کی زبان سے انہیں اسطرح نصیحت کی جاتی ہے:۔

فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا (۷:۱۱)	پس ناپ تول کو پورا کرو۔ ترازو میں ٹھیک تولو۔ لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دو۔ اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ اگر تم ایماندار ہو۔ اور راستوں پر بیٹھکر لوگوں کو نہ ڈراؤ۔ یعنی رہزنی نہ کرو۔ تم اللہ کے راستہ سے ان لوگوں کو روکتے ہو۔ جو ایمان لائے ہیں۔ اور اُسے ٹیڑھا کرنا چاہتے ہو۔

پھر جب حضرت شعیبؑ نے انہیں نیکوکاری کی ہدایت کی تو انہوں نے کہا کہ:۔

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ (۱۱:۸)	اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے پتھراؤ کرکے مار ڈالتے۔ تو ہم پر غالب نہیں ہو سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدین والوں کا فساد یہ تھا کہ وہ عام طور پر خائن تھے۔ ان کے تجارتی کاروبار میں بے ایمانی بہت بڑھ گئی تھی۔ راستوں پر ڈاکے ڈالتے تھے۔ ایمان داروں کو راہ الٰہی سے روکتے اور انہیں گمراہ کرتے تھے اور انہیں حق سے اسقدر دشمنی تھی کہ ایک نیکوکاری کی طرف بلانے والے آدمی کو سنگسار کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔

اسکے علاوہ چوری کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں پر جب گدا

چرانے کا الزام رکھا گیا تو انھوں نے کہا کہ تَاللّٰہِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا کُنَّا سَارِقِیْنَ (۱۲:۷۳) خدا کی قسم تم جانتے ہو کہ ہم زمین میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور نہ چور ہیں ہیں۔

(۷) بادشاہوں کی ملک گیری ہے جو تباہی پھیلتی ہے اور اسکے اثر سے مفتوح قوموں کے اخلاق میں جو دنائت پیدا ہو جاتی ہے اسکو فساد کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت سلیمانؑ کا خط دصول ہونے پر ملکہ سبا اپنے درباریوں سے کہتی ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۷:۳۴) بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے فساد سے بھر دیتے ہیں اسکے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور وہ ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔

(۸) بدعہدی و غداری اور انسانیت، تعلقاتِ اخوت و ہمدردی و محبت کو قطع کرنا بھی فساد سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳:۳۰)	جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور ان تعلقات کو قطع کرتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں انہی پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور وہی ہیں جنکے لئے برا ٹھکانا ہے۔

یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل کے معنی عام مفسرین نے بہت محدود دیئے ہیں۔ وہ اسکو صرف قطعِ رحم کے معنی میں لیتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے وہ تمام جائز تعلقات مراد ہیں۔ جو مختلف تمدنی اور عمرانی حیثیات سے بنی نوعِ انسانی کے افراد اور جماعتوں میں قائم ہوتے ہیں۔ مثلاً عزیزوں اور رشتہ داروں کے تعلقات، میاں اور بیوی کے تعلقات۔ دوستوں اور ہمسایوں کے تعلقات، مختلف قوموں اور جماعتوں کے تعلقات، مختلف ملکوں اور حکومتوں کے تعلقات۔ چونکہ یہی روابط انسانی تمدن کی بنیاد ہیں انہی کے بہترین طریقے سے قائم رہنے پر دنیا کے امن و خوشحالی کا انحصار ہے اور انہی کو منافرت اور عداوت پھیلا کر قطع کرنے سے دنیا میں لڑائی جھگڑے پھیلتے ہیں۔ اور خاندانوں بستیوں اور ملکوں پر تباہیاں نازل ہوتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے قطع کرنے کو فساد سے تعبیر کیا اور اس پر لعنت کی وعید فرمائی۔

(۹) اُس طرزِ حکومت کو بھی فساد سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے ماتحت رعایا کی اصلاح اور رفاہِ حال ہونے کے بجائے تباہی و بربادی ہو۔ اس کے وسائلِ ثروت مٹائے جائیں۔ اور اس کو بے گناہ قتل و غارت کیا جائے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (۲: ۲۵) اور جب وہ حاکم بنتا ہے تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتا ہے اور کھیتیوں اور نسلوں کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(۱۰) صدعن سبیل اللہ کے لئے بھی جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے۔ فساد کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ فرمایا اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ (۱۶: ۱۲) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔ اُنپر ہم اس فساد کے باعث جو وہ کرتے تھے عذاب پر عذاب نازل کریں گے۔

(۱۱) سورۂ مائدہ میں جن لوگوں کی طرف فساد کو نسبت دی گئی ہے کہ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا وہ زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا ان کی خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

وَتَرٰی كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ (۵: ۹)	اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور حد سے تجاوز کرنے میں اور حرام کا مال کھانے میں جلدی کرتے ہیں اور ہم نے ان کے درمیان بغض و عداوت کا بیج قیامت تک کے لئے ڈال دیا۔ اور جب کبھی انہوں نے جنگ کیلئے آگ بھڑکائی ہم نے اسے بجھا دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اثم یعنی وہ گناہ جو آدمی کے ذاتی اخلاق کو غارت کرتے ہیں اور عدوان یعنی وہ گناہ جن کا بُرا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے اور اکل سحت یعنی رشوت اور سود خواری جیسے ناجائز طریقوں سے لوگوں کے مال کھانا اور نفسانی اغراض کے لئے باہم بغض و عداوت رکھنا اور ان کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانا یہ سب اعمالِ فساد ہیں۔

فتنہ وفساد کو مٹانیکے لئے حکومت الٰہی کی ضرورت

اس تشریح سے اچھی طرح معلوم ہوگیا کہ قرآن مجید کی زبان میں فتنہ اور فساد کے کیا معنی ہیں۔ اب اگر ان تمام برائیوں پر دوبارہ ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔ کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور ظالم وجابر حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا یقیناً اسی کے باطل پرور اثرات کار ہین منت ہوتا ہے۔ اول تو ایسی حکومت فی نفسہٖ ایک فتنہ ہے۔ کیونکہ وہ حکومت کے منشاے اصلی کے خلاف ہوتی ہے۔ مگر اس کی برائی کسی ایک دائرہ تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ وہ تمام برائیوں کا سرچشمہ اور فتنہ وفساد کے تمام اصول وفروع کا منبع بن جاتی ہے۔ اسی سے صد عن سبیل اللہ ہوتا ہے اسی سے حق والصاف کا سر کچلا جاتا ہے۔ اسی سے بدکاروں اور ظالموں کو اپنے برے اعمال کی قوت حاصل ہوتی ہے اسی سے اخلاق کو تباہ کرنے والے اور نظام عدل کو غارت کرنے والے قوانین نافذ ہوتے ہیں۔ اسی کی خاطر بنی آدم کی جمعیت میں نفاق وشقاق کی تخم ریزی کی جاتی ہے۔ اسی کی بدولت جنگ وخونریزی کی آگ بھڑکتی ہے، اسی سے قوموں اور ملکوں پر بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اور خلاصۂ کلام یہ کہ یہی وہ چیز ہے جس کی قوت کسی نہ کسی حیثیت سے ہر بدی وبدکاری کا وسیلہ یا اسکے باقی رہنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ پس اسلام نے بدی کے استیصال اور بدکاری کے دفع والسداد کے لئے یہ کارگر تدبیر بتلائی کہ تلوار کے زور سے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے اور ان کی جگہ وہ عادلانہ ومنصفانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جس کی بنیاد الٰہی قوانین پر ہو، جو غلو وفساد فی الارض اور جبر واستکبار کے ناپاک عناصر سے پاک ہو، جس کا اساس تقویٰ وپرہیزگاری اور حق پرستی وحق شناسی پر ہو۔ جس کے قیام کا مقصد ہر نیکی کو باقی رکھنا اور ہر بدی کو مٹانا ہو اور جس کے کارکن وہی لوگ ہوں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین سمجھتے ہوں۔

قرآن مجید کو اٹھا کر دیکھو۔ جگہ جگہ تمہیں یہی نظر آئیگا کہ ظالم وجابر حکومتوں کی اطاعت سے روکا گیا ہے۔ اور انسان کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ باطل کے اتباع اور جبر واستکبار کی اطاعت سے

اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرے۔ کہیں حکم ہوتا ہے کہ:۔

لَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶: ۱۵۱)	ان حد سے گذر جانے والے لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اور اصلاح نہیں کرتے۔

کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

لَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸: ۴)	اس کی اطاعت نہ کر جس کے قلب کو ہمنے اپنے ذکر سے غافل رکھا ہے، جو اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ اور جس کا حکم زیادتی پر مبنی ہے۔

کہیں ایک قوم کی بربادی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ:۔

اتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ فَأُتْبِعُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ (۱۱: ۵)	انہوں نے ہر جبار دشمن حق کی پیروی کی پس ان پر اس دنیا میں بھی لعنت پڑی اور یوم قیامت کو بھی پڑے گی۔

کہیں صاف طور پر بتلا دیا کہ ایک ملک ہلاک ہی اس وقت ہوتا ہے جب اسکی دولت اور حکومت کی باگیں بدکار لوگوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہیں:۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (۱۷: ۲)	جب ہم کسی بستی کو برباد کرنیکا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے دولت و حکومت والے لوگوں کو (طاعتہ و خیر کا) حکم بھیجتے ہیں مگر وہ نافرمانی کرکے بدکاریاں کرتے ہیں۔ پس وہ بستی حکم سزا کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اور ہم اسکو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ اجتماعی زندگی میں جتنے عوامل انسان کے اخلاق و تمدن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قوی اور مؤثر عامل حکومت ہے۔ حکومت کا نظام اگر غلط ہو اور اس کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو حاکمانہ طاقت کو اصلاح اور خدمت الناس کے بجائے افساد اور خدمت نفس کے لئے استعمال کرتے ہوں تو ایسی

حالت میں کسی نیکی کا سرچشمہ ہونا کسی اصلاحی تحریک کا بارآور ہونا اور کسی قسم کے اخلاقی محاسن کا پھلنا پھولنا محال ہے کیونکہ وہ حکومت طبعاً بدی و شرارت کی سرپرست ہوگی اور نہ صرف خود بدکار ہوگی۔ بلکہ اس کی قوت تمام اخلاقی مفاسد کی آبیاری کریگی۔ بخلاف اس کے اگر حکومت ایک صحیح اور عادلانہ دستور و آئین پر قائم ہو اس کا مقصد حیات نظام عدل کا قیام ہو، اس کے عمال نیکوکار و پرہیزگار ہوں اور وہ اپنی قوت کو اپنی ذاتی خواہشات کے حصول کے لئے نہیں بلکہ جماعت کی صلاح و فلاح کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ تو اس کی اصلاحی قوت کا اثر صرف اسی دائرہ تک محدود نہ رہیگا جو حکومت سے بلاواسطہ تعلق رکھتا ہے، بلکہ اجتماعی و انفرادی زندگی کے تمام شعبے اس کے نیک اثرات کو قبول کریں گے۔ مذہب، معیشت، معاشرت، اخلاق، تہذیب، علوم و افکار غرض ہر شعبہ میں اصلاح کی تحریک بارور ہوگی اور صرف بدکاری کی روک تھام ہی نہ ہوگی بلکہ خود بدی کے چشمے بھی سوکھ جائیں گے۔ پس درحقیقت فتنہ و فساد کو مٹانے اور انسانی زندگی کو منکر سے پاک کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اور مفید تدبیر یہی ہے کہ تمام جابر و بدکار حکومتوں کا استیصال کر دیا جائے اور ان کی جگہ ایسی حکومت قائم کی جائے جو اصول اور عمل دونوں کے لحاظ سے نیکی اور نیکوکاری پر مبنی ہو۔

حکم قتال

یہ وہ دوسرا مقصد عظیم و جلیل ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے نیک بندوں کو تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ خود اپنی قوت کو بدی سے محفوظ رکھو، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اس محفوظ شدہ طاقت کو تم دنیا سے فتنہ و فساد کے مٹانے اور مفسدوں سے فساد کی قوت چھین کر انہیں نیکی کا تابع بنانے میں استعمال کرو۔ چنانچہ یہ حکم نہایت مختصر الفاظ میں اس طرح دیا گیا ہے کہ:-

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ اللہ پر ایمان لاتے
وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ	ہیں، نہ یوم آخر پر، ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو
مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا	اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھیرائی ہیں، اور نہ دین
يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ	حق کو اختیار کرتے ہیں ان سے لڑو یہاں تک کہ

اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ - (۹:۲۹)	وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اس حال میں کہ وہ عاجزی و محکومی پر راضی ہوں۔

اس آیۃ میں قتال کا حکم جن لوگوں کے خلاف دیا گیا ہے ان کی خصوصیات یہ بتائی ہیں کہ وہ اہل کتاب ہیں، اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں لاتے، جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے۔ اور دین حق کو قبول نہیں کرتے۔ ان کے جرائم کی یہ ترتیب بے معنی نہیں ہے بلکہ اس پر غور کرنے سے حکم قتال کی وجہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ فرمایا کہ ہمنے ان کی طرف کتابیں بھیجیں جن میں انہیں عقائد اور معاملات کی صحیح صحیح تعلیم دی گئی تھی اور ان کے لئے ایک صحیح اور مکمل قانون وضع کر دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ان کتابوں کو چھوڑ دیا۔ اپنی آراء و اہواء اور اپنے ظنوں و اوہام کے مطابق خود اپنے لئے الگ الگ مذاہب اور قوانین گھڑ لئے جو حق کے خلاف اور جادۂ استقامت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس انحراف کی بدولت ایک طرف ان کے عقائد بگڑ گئے کہ اللہ اور جزاء و سزاء کے دن پر ان کا ایمان نہ رہا اور دوسری طرف انکے اعمال بھی بگڑ گئے کہ حلال و حرام کی تمیز انہیں باقی نہ رہی اور فتنہ و فساد برپا کرنے لگے جس سے اللہ نے اور ان رسولوں نے جو ان کی طرف بھیجے گئے تھے انہیں منع کیا تھا، پھر جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے دین حق بھیجا تو اسے بھی انہوں نے اختیار نہ کیا اور اپنی پچھلی غلط کاریوں اور غلط فہمیوں پر اڑے رہے۔ حالانکہ اگر وہ اسے اختیار کر لیتے تو پھر ایک کتاب محکم ایک مذہب صحیح اور ایک قانون عدل کے پابند ہو جاتے۔ جس سے ان کے عقائد اور اعمال دونوں کی اصلاح ہو جاتی اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹ جاتا۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ انہوں نے دین حق قبول نہیں کیا ہے اور ایک غلط اور خود ساختہ مذہب و قانون کی پابندی کر رہے ہیں۔ تو انہیں اس امر کی آزادی تو دی جا سکتی ہے کہ جزیہ دیکر اپنے عقائد باطلہ پر قائم رہیں۔ لیکن اس امر کی آزادی نہیں دی جا سکتی کہ اپنے باطل قوانین کی تنفیذ سے اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کریں۔

قتال کی غرض و غایت

حتیٰ یعطوا الجزیۃ میں اس قتال کی غایت کو صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔ اگر حتیٰ یسلموا کہا جاتا

تو غایت قتال یہ ہو سکتی تھی کہ انہیں تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔ یہ حتی یعطوا الجزیۃ نے بتلا دیا کہ ان کا اعطائے جزیہ پر راضی ہو جانا قتال کی آخری حد ہے۔ اور اس کے بعد پھر ان کی جان و مال پر کوئی حملہ نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں جیسا کہ صاحب بدائع نے لکھا ہے۔

نھی سبحانہ وتعالیٰ اباحۃ القتال الی غایۃ قبول الجزیۃ واذا انتھت الاباحۃ تثبت العصمۃ ضرورۃ (ج ۷، ص ۱۱)	اللہ تعالیٰ نے قبول جزیہ کو اباحت قتال کی حد مقرر کیا ہے۔ پس جب اس غایت کے حصول پر اباحت ختم ہو گئی تو لازمی طور پر ذمیوں کے اعراض و اموال کا تحفظ بھی ثابت ہو گیا۔

اسی بنا پر ذمیوں کے متعلق سختی کے ساتھ تاکید ہے کہ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی تمام حملوں سے حفاظت کی جائے۔ ان کے بچاؤ کے لئے جنگ کرنا اور اپنا خون بہانا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ

انما قبلوا عقد الذمۃ لتکون اموالھم کاموالنا ودماؤھم کدمائنا۔	انہوں نے عقد ذمہ اسی لئے قبول کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح محترم ہو جائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم وان یقاتل من ورائھم ولا یکلفوا الا طاقتھم	میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کا لحاظ رکھا جائے۔ اس طرح کہ ذمیوں کے ساتھ عہد کو پورا کیا جائے۔ ان کی حفاظت کے لئے جنگ کیجائے اور ان کی طاقت سے زیادہ ٹیکس کا بار نہ ڈالا جائے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جان کے احترام کی تاکید سخت سے سخت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ

من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ الجنۃ وان ریحھا توجد من	جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا اسے جنت کی خوشبو تک نصیب نہ ہوگی حالانکہ اس کی خوشبو ۷۰ سال کی

مسیرۃ اربعین عاماً۔ مسافت تک پہونچتی ہے۔

اس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ یہ احترام جان و مال محض احترام عہد و پیمان کی بنا پر ہے۔ کیونکہ یہ حکم تمام ذمیوں کے لئے عام ہے اور عقد ذمہ کی صرف یہی صورت نہیں ہے کہ حکومت اسلامیہ کے ساتھ باقاعدہ صلح و معاہدہ ہو بلکہ نص کے علاوہ دلالت بھی ایک رکن عقد ہے۔ اگر مسلمان کسی ملک کو بزور شمشیر فتح کریں اور اس کے باشندوں سے ان کا کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو تب بھی مفتوح غیر مسلموں کو ذمی ہی قرار دیا جائیگا۔ اور مسلمانوں کا امام ان پر جزیہ عائد کرکے ان کو اللہ اور رسول کے ذمہ میں لے لے گا۔ (دیکھو بدائع الصنائع ج ۷ ص ۱۱۰ و ۱۱۲)

اس سے ظاہر ہے کہ قتال کا یہ حکم کسی مذہبی عداوت کی بنا پر نہیں ہے ورنہ یہ نہ ہوتا کہ اطاعت کرنے سے پہلے جن کے ساتھ جنگ کرنا ضروری ہے انہی کی جان و مال اطاعت قبول کرنے کے بعد اس طرح قابل احترام ہو جائے۔ حالانکہ اطاعت کرنے والوں کے ساتھ مذہبی عداوت کی بھڑاس نکالنا زیادہ آسان ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بات بھی بعید از عقل ہے کہ اس حکم قتال کا مقصد محض جزیہ حاصل کرنا ہو۔ کیونکہ چند درہم سالانہ کے عوض اتنی بڑی ذمہ داری اپنے اوپر لے لینا کہ ان کی حفاظت کے لئے ہر دشمن کے سامنے اپنا سینہ سپر کردیا جائے کسی طمع پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک کافر تو جزیہ دیکر اطمینان کے ساتھ اپنی تجارت اپنے کاروبار اپنے عیش و آرام اور اپنے اہل و عیال کی معیت سے مستفید ہو اور مسلمان ملک کی حفاظت کے لئے میدان جنگ کی مصیبتیں اٹھائے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈالدے درآنحالیکہ اس کو یہ قدرت حاصل ہو کہ اس کافر کو ادائے جزیہ کے باوجود جنگی خدمت پر مجبور کرے۔ اور خود لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے۔ پس اعطاے جزیہ پر قتال کی اباحت ختم کردیئے اور قبول جزیہ کے بعد قیام عدل و امن کی تمام ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کا مقصد ان کو فتنہ و فساد سے روکنا اور امن و آئین کا پابند بنانا ہے۔ اور اس کے لئے ان پر جزیہ کے نام سے ٹیکس عائد کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ اس حفاظت و صیانت کے مصارف میں شرکت کریں۔ جو انہیں بہم پہنچائی جاتی ہے۔ اور اطاعت و انقیاد پر قائم رہیں۔

جزیہ کی حقیقت

علامہ ابن تیمیہ نے حتی یعطوا الجزیہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ والمراد باعطائھا التزامھا بالعقد اس سے مراد یہ ہے کہ وہ عقد معاہدہ پر قائم رہیں جس طرح تمام حکومتوں کے قوانین میں ٹیکس دیتے رہنا وفاداری و پابندی قانون کی دلیل ہے اور نہ ادا کرنا بیوفائی و غداری کی اسی طرح جزیہ دیتے رہنا بھی پابندی عہد کی دلیل ہے۔ اور اس کا نہ ادا کرنا نقض عہد کا ہم معنی۔ یہی وجہ ہے کہ جزیہ صرف اہل قتال پر عائد کیا گیا ہے۔ اور عورتیں نابالغ بچے مجانین۔ ازکار رفتہ بوڑھے اندھے اور اپاہج وغیرہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ بدائع الصنائع میں ہے کہ

لان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اوجب الجزیۃ علی من ھو من اھل القتال لقولہ تعالیٰ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیہ والمقاتلۃ مفاعلۃ من القتال فتستدعی اھلیۃ القتال من الجانبین فلا تجب علی من لیس من اھل القتال (ج ۷، ص ۱۱۱)

اللہ تعالےٰ نے جزیہ صرف ان لوگوں پر مقرر کیا ہے جو اہل قتال ہیں۔ جیسا کہ آیہ قاتلوا الذین میں لفظ قاتلوا سے معلوم ہوتا ہے۔ مقاتلہ کے لئے جانبین سے قتال کی اہلیت شرط ہے۔ پس جن لوگوں میں یہ اہلیت نہیں ہے وہ قتال اور جزیہ دونوں سے مستثنیٰ ہیں۔

* * *

عن ید کا لفظ اس مضمون کی تشریح کرتا ہے ید سے مراد یہاں ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ دراصل یہ کنایہ ہے اطاعت وانقیاد سے چنانچہ کہتے ہیں اعطی فلان بیدہ اذا سلم وانقاد پس حتی یعطوا الجزیۃ عن ید کے معنی یہ ہیں کہ وہ خوب نفس و انقیاد کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔ بغیر اس کے کہ ان کو اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے۔ اگر [illegible] میں اس قدر پابندی آئین اور اتنی امن پسندی موجود نہ ہو کہ اپنے واجب الوصول ٹیکس کو رضامندی کے ساتھ ادا کریں۔ بلکہ اسے انہیں مجبور کرنے کے لئے ہمیشہ فوج کی قوت مستعمل رکھنے کی ضرورت ہے۔ تو پھر نہ اعطاء جزیہ کا اصلی منشا یعنی نظم و آئین کا قیام پورا ہو سکتا [illegible]

نہ عقد ذمہ باقی رہ سکتا ہے جس کے لئے اطاعت و انقیاد لازمی شرط ہے۔

اسی لئے جزیہ کی رقم ایسی قلیل مقرر کی گئی ہے کہ اس کا دینا بار نہ ہو اس کے وصول کرنے کے طریقوں میں نرمی و رفق کی تاکید کی گئی ہے حبس و تعذیب وغیرہ سے انہیں تکلیف دینا۔ اور اپنے ناقابل برداشت بوجھ ڈالنا جائز نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے متعلق کثرت سے تاکیدی احکام اور روایات موجود ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ ایک بڑی رقم لائی گئی۔ آپ نے اسے غیر معمولی دیکھکر فرمایا "مجھے گمان ہے کہ تم نے لوگوں کو برباد کر دیا" مخصلین نے جواب دیا کہ خدا کی قسم ہم نے بہت نرمی سے وصول کیا ہے" آپ نے پھر پوچھا "بلا سوط ولا نوط؟ بغیر مارے باندھے"؟ انہوں نے عرض کی کہ بغیر مارے باندھے تب آپ نے اس مال کو خزانہ میں داخل کرنے کی اجازت دی۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک شخص کو عکبری پر عامل مقرر کرتے ہوئے ہدایت فرمائی تھی کہ خراج کی تحصیل میں ان پر ایسی سختی نہ کرنا کہ وہ اپنے گدھے یا اپنی گائیں یا اپنے کپڑے یا دوسری چیزیں بیچنے پر مجبور ہو جائیں۔ بلکہ ان کے ساتھ نرمی کرنا۔ حضرت ابن حکیمؓ نے فلسطین کے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ تحصیل جزیہ میں سختی کرتے ہیں تو انہوں نے اس سے منع کیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان اللہ یعذب یوم القیمۃ الذین یعذبون الناس فی الدنیا (جو لوگ دنیا میں لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں انہیں اللہ قیامت کے دن تکلیف دیگا)

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں پر جو جزیہ عائد کیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی سزا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ امن و آئین کے پابند ہوں۔ رضا و رغبت کے ساتھ قانون عدل کی اطاعت کریں۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اس حکومت کے مصارف ادا کریں۔ جو انہیں پر امن زندگی بسر کرنے کا موقع دیتی ہے ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتی ہے۔ انصاف کے ساتھ حقوق تقسیم کرتی ہے۔ قوت والوں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکتی ہے، کمزوروں کو قوت والوں کا غلام بننے سے بچاتی ہے۔ اور تمام سرکش عناصر کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بناتی ہے۔

وھم صاغرون کے الفاظ اس مطلب کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے تصریح کی ہے:۔

الصغار ھو التزامھم بجریان احکام اللہ تعالیٰ علیھم واعطاء الجزیۃ ھو الصغار۔	اس آیت میں صغار سے مراد ان کا قانون الٰہی کے احکام کی تنفیذ پر راضی ہونا۔ آئین عدل کی پابندی کرنا اور اس اطاعت وانقیاد کی علامت کے طور پر جزیہ ادا کرتے رہنا ہے۔

خود قرآن مجید میں مختلف مواقع پر جنگ کے مقصد اور اس کے مفید نتیجہ کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے صاغرون کا مطلب صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کا اپنے قوانین باطلہ کی تنفیذ سے فتنہ وفساد برپا نہ کرسکنا۔ اور ان کا بدکاری وشرارت سے عاجز ہوجانا۔ اور قانون الٰہی کے عادلانہ احکام کا پابند رہنا ہی ان کا صغار ہے۔ قٰتلوھم حتی لاتکون فتنۃ میں قتال کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ فتنہ باقی نہ رہے حتی تضع الحرب اوزارھا میں اسی مقصد کو اس طرح بیان کیا ہے کہ دنیا سے جنگ وفساد کا نام ونشان مٹ جائے۔ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں وہی مفہوم ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ قریب ہے کہ اللہ کافروں کی قوتِ جنگ وجدال کو توڑ دے جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا میں اسی جنگ کا نتیجہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ کافروں کا بول نیچا ہوا۔ اور اللہ کا کلمہ سربلند ہوگیا۔ پس درحقیقت فتنہ کا باقی نہ رہنا فساد کا مٹ جانا۔ ہوائے نفس کے لئے قتل وغارت اور جنگ وپیکار کا بند ہوجانا۔ کفر کی شیطانی قوت کا اس حد تک ٹوٹ جانا کہ وہ دنیا کے امن وسکون کو برباد نہ کرسکے اور دنیا کی اخلاقی وروحانی اور مادی ترقی میں رکاوٹیں نہ ڈال سکے۔ نیز کافروں کے خودساختہ قوانین کا منسوخ ہوجانا اور ان کی جگہ اللہ کے اس قانون عدل کا بول بالا ہونا جو تمام بنی نوع انسان میں ہر قسم کے شیطانی امتیازات کو مٹا کر صرف حق وباطل اور بدی وتقوی کا امتیاز قائم کرتا ہے اور ظالموں کے سوا ہر شخص کو امن وآزادی کی خوشخبری دیتا ہے۔ یہی کافروں کا فیصلہ ہے اور آیت قتال میں حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون سے یہی صغار مراد ہے

پس معلوم ہوا کہ اس آیت میں حکم قتال کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دنیا سے فتنہ و فساد کی آزادی چھین لی جائے۔ اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کو حقیقی اور انسانیت پرور آزادی عطا کی جائے۔ ایسی آزادی جو اخلاقی حدود کی پابندی پر مبنی ہو۔ اور نا روا قیود اور نا روا بے قیدی دونوں سے پاک ہو۔ اسلام کی تلوار صرف ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد کے خلاف اٹھتی ہے خواہ اس شیطانی قوت کے شکار مسلمان ہوں یا غیر مسلم۔ جب تک کوئی جماعت اس قوت کا استعمال ترک نہیں کرتی اس کے ساتھ اسلام کی جنگ برابر جاری رہتی ہے۔ مگر جس لمحہ وہ اس گناہ عظیم کو ترک کر کے حق و انصاف کے قانون کی پابندی اختیار کر لیتی ہے۔ ٹھیک اسی لمحہ اس کا خون حرم ہو جاتا ہے۔ اس کے مال اور اس کے اغراض کی حفاظت مسلمانوں پر لازم ہو جاتی ہے۔ اور اسلام کی پر امن حکومت میں اس کو پوری آزادی دیدی جاتی ہے کہ تمام جائز طریقوں سے اپنی دولت۔ اپنی صنعت و تجارت اپنے علوم و آداب۔ اپنے تہذیب و تمدن غرض اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کرے۔ اور انسانیت کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچنے کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت ہو انہیں آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ اس بارے میں اسلام کا قانون اہل ذمہ کو جو وسیع آزادی عطا کرتا ہے۔ وہ دنیا کے قوانین میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور قدرتی طور پر اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ اسلام کے اور ان دنیاوی قوانین کے نقطۂ نظر میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ قوانین جہانگیری کے اصول پر قائم ہیں۔ ان کے مطابق محکوم قوم حاکم جماعت کی ملکیت ہوتی ہے اور حاکم کے لئے محکوم کے وسائل حیات ایک جائداد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسے اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنا اور محکوم کو اس کے فائدے محروم رکھنا۔ اس کا قدرتی حق ہوتا ہے۔ اس لئے ان قوانین کی تنفیذ خواہ کتنی ہی فیاضی و فراخدلی کے ساتھ ہو لیکن حاکم جماعت کا مفاد محکوم جماعت کے حقیقی مفاد سے کبھی متحد نہیں ہو سکتا۔ اور لازمی طور پر کمزور کا مفاد طاقتور کے مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلامی قانون کی بنیاد خدمت نوع انسان کے اعلیٰ اور شریف مقصد پر رکھی گئی ہے۔ اس میں حاکم و محکوم کا تعلق صحیح معنوں میں خادم و مخدوم کا سا تعلق ہوتا ہے۔ حاکم کا مفاد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کہ محکوم کے اصلی و حقیقی مفاد کی ترقی کیلئے

کوشش کرے۔ اس کو حکومت کا اختیار دے جانے کی غرض و غایت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی و روحانی اور مادی زندگی کو تباہ کرنے والی برائیوں کے استیصال اور اسے انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے والی اچھائیوں کے عام کرنے میں اپنی تمام قوتوں کو استعمال کرے۔ پس اسلام کا حاکم اپنے محکوم کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کے بعد اسے ہر قسم کی کامل آزادی عطا کرتا ہے وہ اس کے راستے میں اپنی یا اپنی جماعت کی اغراض کے لئے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرتا۔ بلکہ اسے ایک بلند درجہ کا انسان بننے میں پوری مدد دیتا ہے۔

اسلام اور جہانگیریت

بدقسمتی سے اس زمانہ میں مغرب کی بعض جہانگیر قوموں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب و انسانیت کی ترقی درماندہ قوموں کی اصلاح اور امن و امان کے قیام کی خاطر جنگ کرتی ہیں۔ مگر اس زبانی دعوے کے برعکس ان کا عمل یہ ہے کہ کمزور قوموں کی آزادی پر ڈاکے ڈالتی ہیں اور تہذیب و انسانیت کی ترقی کے بجائے، دنیا سے انسانیت اور انسانی شرافت کی تمام خصوصیات کو ایک ایک کر کے مٹا رہی ہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ کہیں اسلام کا دعویٰ بھی ایسا ہی نہ ہو کہ زبان پر اصلاح کا وظیفہ ہو، اور ہاتھ میں فتنہ و فساد کی تلوار ہو۔ اس شبہ کو مغربی استعمار اور اسلامی جہاد اصلاح کی یہ ظاہری مماثلت اور بھی زیادہ تقویت پہنچاتی ہے کہ جس طرح اسلام میں عالمگیر اصلاح کا جہاد صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے۔ اسی طرح مغربی مستعمرین بھی تہذیب و تمدن کی عالمگیر اشاعت کے مشن کو صرف اپنی قوم ہی کا ورثہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ پچھلے مباحث کو بنظر غور مطالعہ کرنے سے یہ بدگمانی پیدا ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہتی ہے۔ لیکن جسقدر بھی باقی رہتی ہے۔ بہتر ہے کہ اس کو سوچنے کے لئے خالی چھوڑنے کے بجائے حقیقت کے علم و یقین سے پر کر دیا جائے۔

جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، جہانگیریت (امپیریلزم) کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص قوم اور ملک کے افراد کی حکومت کا نام ہے۔ انگریزی جہانگیریت جزیرہ انگلستان کے باشندوں سے مخصوص ہے۔ جرمن جہانگیریت میں جرمن قوم کے سوا کسی کا حصہ نہیں ہے، اطالوی جہانگیریت میں جو کچھ ہے سب اٹلی کے باشندوں کا ہے جس طرح

دنیا کی دوسری قوموں کا انگریز، جرمن، یا طلیانی ہو جانا محال ہے، اسی طرح ان قوموں کی جہانگیریت میں بھی دوسروں کا حصہ دار ہونا محال ہے۔ انگریز "اشاعت تہذیب و تمدن" کے نام سے جہاں کہیں جائینگے، انگریزی قومیت ساتھ ساتھ جائیگی۔ حکومت کے اور نگ نشین ہونگے تو انگریز ہونگے، سیاست کے صدر انجمن ہونگے، تو انگریز ہونگے۔ اختیار و اقتدار کے مالک ہوں گے، تو انگریز ہوں گے۔ دوسری نسل اور قوم کے لوگ خواہ انگریزی تہذیب میں کتنی ہی ترقی کریں، مگر انگریزی تہذیب ان کو قدرت و اختیار حاصل ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ یہی حال دوسری قوموں کی جہانگیریت کا بھی ہے۔ اس قسم کے نظام میں لازمی طور پر حکومت و فرمانروائی کا حق ایک ملک کے باشندوں اور ایک نسل کے افراد سے مخصوص ہو جاتا ہے اور چونکہ نسل و وطنیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کوئی شخص خود اختیار کر سکتا ہو کیونکہ اس کا دائرہ بہر حال انہی لوگوں تک محدود رہتا ہے جنہیں قدرت کسی خاص نسل اور خاص ملک میں پیدا کرنا پسند کرتی ہے۔ اس لیے جہانگیریت کے اس نظام کا دروازہ غیر نسل و وطن کے لوگوں کے لئے ہمیشہ بند رہتا ہے اور جب کبھی کوئی قوم دوسری قوم کو مغلوب کرتی ہے۔ تو اس کو حکومت و سلطنت میں صرف اس لیے کوئی حصہ نہیں ملسکتا کہ وہ حکمران قوم کی نسل سے نہیں ہے۔ پھر اسی چیز سے دوسری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ محکوم قوم من حیث القوم ذلیل ہو جاتی ہے۔ اس میں خود داری و غیرت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اور اگر اس کے حکمران ظلم و ستم اور جور و استبداد کے ساتھ حکمرانی نہ کریں تب بھی اس میں دنائت و پستی کے وہ خصائل قدرتی طور پر پیدا ہوتے ہیں، جو ایک عرصہ تک حکومت خود اختیاری کی محرومی رہنے کا لازمی نتیجہ ہیں اور روح ترقی کے لئے مہلک جراثیم کا حکم رکھتے ہیں۔

بخلاف اس کے "اسلام" کسی نسل یا قوم یا وطن کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک قانون اور ایک نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ عربی، عجمی، حبشی، چینی، ہندی، فرنگی، سب اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اور وہ ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کرتا۔ اس کو انسان کی نسل یا رنگ، یا وطنیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے وہ انسان کو بہ حیثیت انسان ہونے کے خطاب کرتا ہے۔ اور اس کے سامنے زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ، اور تنظیم شئون انسانی کا ایک قانون پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین ہے۔ اس طریقہ و قانون کو

جو کوئی اختیار کرے وہ اسلامی حکومت میں برابر کا شریک ہے۔ اور اس کی شخصی قابلیت سے خلیفہ و امام کے درجہ تک پہنچا سکتی ہے جس طرح دنیا کی حکومتوں میں فرمانروائی کی قابلیت کا معیار سول سروس یا اسی قسم کا کوئی اور امتحان پاس کرنا ہے، اسی طرح اسلام کی حکومت میں فرمانروائی اور منصب اصلاح و ہدایت کی اہلیت کا معمولی معیار اسلام کے نظام حیات کو اختیار کرنا اور اس کے قانون حق کی پابندی کرنا ہے۔ جو کوئی اس معیار پر پورا اترتا ہے وہ بلا لحاظ نسل و رنگ اس منصب پر فائز ہو جاتا ہے جب کہ ہم آگے چل کر بتائینگے۔ اسلام میں نہ تو "حکومت قوم بر قوم دیگر" کا کوئی سوال ہے اور نہ "حکومت قوم بر قوم خود" کا وہ "حکومت صالح بر غیر صالح" کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے نزدیک "صالح" اگر ایک حبشی غلام ہو تو کوئی چیز اسے شرفاے عرب پر حکومت کرنے سے نہیں روک سکتی۔ شارع اسلامؐ کا صریح فتویٰ ہے کہ:۔

اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی کان رأسہ زبیبۃ	سنو اور اطاعت کرو۔ خواہ تمہارے اوپر ایک گنجی حبشی غلام ہی حاکم بنا دیا جاے۔

اسلام عرب میں پیدا ہوا، عرب ہی کو اس کا علم بلند کرنے کا شرف حاصل ہے۔ مگر اس نے کبھی حکومت و فرمانروائی کو عرب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ جب تک عرب صالح رہے انہوں نے تو ہی دنیا پر حکومت کی۔ جب ان میں صلاحیت باقی نہ رہی تو جن عجمی قوموں کو عربوں نے فتح کیا تھا، وہ اسلامی حکومت کی مسند نشین بن گئیں اور انہوں نے خود عرب پر حکومت کی۔ ترک اسلام کے شدید دشمن تھے، مگر جب وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے تو دنیاے اسلام کے آدھے سے زیادہ حصہ نے انہیں اپنا حکمران تسلیم کیا۔ چاٹگام سے لیکر قرطاجنہ تک ان کی فرمانروائی کے جھنڈے اڑتے رہے اور خود رسول اللہؐ کی خلافت کے منصب پر بھی ان کا ایک خاندان سرفراز ہوا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمان قوموں میں قومیت اور نسل کا امتیاز بالکل مفقود نہیں ہوا۔ اس کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام نے ترکی خلفا کی امامت کو بھی اسی طرح جائز سمجھا جس طرح عباسی خلفاء کو سمجھا تھا۔ اور آج اگر انگریزی قوم مسلمان ہو جائے اور اپنی صحیح کا ثبوت پیش کرے تو یقیناً اسلام کو فرمانروائے انگلستان کی امامت تسلیم کرنے میں بھی تامل نہ ہوگا۔

یہ تو اسلام اور جہانگیریت کا ظاہری فرق تھا۔ معنوی فرق اس سے بھی زیادہ بیّن ہے

بلکہ بتاین کلی کا حکم رکھتا ہے۔ جہانگیریت در اصل ایک قوم کی خواہش توسیع مملکت و حصول مال و زر کا نام ہے۔ جب کوئی قوم اس دولت اور حکومت پر قانع نہیں ہوتی جو اس کو خود اپنے ملک میں حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسرے ملکوں پر حملہ کرکے انکی دولت پر قبضہ کرلیتی ہے۔ ان کے باشندوں کو اپنا محکوم اور غلام بنالیتی ہے۔ اور اپنی صنعت و تجارت کو ان کے خرچ پر فروغ دیتی ہے۔ یہ کام پہلے بھی ہوتا تھا اور ہمیشہ سے سرکش قومیں یہی کرتی آئی ہیں مگر اب مغربی قوموں نے اس ملک گیری اور لوٹ مار کا نام "تہذیب و تمدن کی اشاعت" اور "نوع بشری کی خدمت" رکھا ہے۔ ان کے آئین "تہذیب و تمدن" کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "قوت حق ہے" اور کمزور کو دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کمزور قوموں میں "تہذیب" کی اشاعت کا جو طریقہ انہوں نے ایجاد کیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کو جہالت، افلاس، غلامانہ کمینگی، اور بے دینی و ضمیر فروشی کے "جواہر" سے مالا مال کردیتی ہیں۔ اور "نوع بشری" کی خدمت کے لئے ان کی بہترین کوششوں کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے۔ جب ان کی یہی قومیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر دنیا کے امن و امان کو غارت کردیتی ہیں۔

اسلام کی مقدس تعلیم اس جہانگیری کے عیب سے پاک ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ عالم انسانی کو اس قسم کی سرکش قوتوں کے استیصال اور انکی جگہ ایک عادلانہ نظام حکومت کے قیام کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ حکومت و بادشاہی صرف اللہ کے لئے ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ بندوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اللہ کے غلاموں کو اپنا غلام بنائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس کے نائب یا "خلیفہ" کی حیثیت سے اس کے بندوں کی خدمت و اصلاح کریں اور جو قوت انہیں حاصل ہو۔ اسے اپنی نفس پروری کے بجائے خلق اللہ کی فلاح و بہبود میں استعمال کریں۔ اس "خلافت" یا "وراثت ارضی" کی اہلیت کے لئے اولین شرط عمل صالح ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴:۷)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو بنایا تھا۔

اور

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ - إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ (۲۱:۱۰۵-۱۰۷)

ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھدیا کہ زمین کے وارث میرے نیکوکار بندے ہی ہونگے۔ اس میں عبادت گذار قوموں کے لیے ایک پیغام عمل ہے۔

یہ "خلافت" و "وراثت ارضی" جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے انہیں تاکید کے ساتھ جتا دیا جاتا ہے کہ بندگان خدا پر جو قدرت عطا کی گئی ہے وہ اللہ کی امانت ہے۔ اسکو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر نفسانی لذتوں کے حصول میں خرچ نکرنا۔ حضرت داؤدؑ کو سلطنت عطا ہوتی ہے تو فرمان آتا ہے کہ:-

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ - إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ (۳۸:۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین پر اپنا نائب بنایا ہے۔ پس لوگوں میں راستی و صداقت کے ساتھ فیصلے کرو اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔ ورنہ وہ تمہیں خدا کی راستہ سے بھٹکا دیگی۔ جو لوگ خدا کے رستہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے لئے سخت عذاب ہے کیونکہ وہ اس بات کو بھول گئے کہ ان کے اعمال کا ایک دن حساب بھی ہوگا۔

حکومت حاصل ہونے کے بعد انسان میں سب سے بڑا عیب یہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خود آپ کو عام انسانوں سے ایک بلند تر ہستی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی حقیقت کو بھول کر اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو لوگ اس کے زیر حکم ہیں وہ گویا اس کی بندگی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام اس عیب سے بچنے کی سخت تاکید کرتا ہے، اور حصول نجات کو اس سے پرہیز کرنے پر منحصر قرار دیتا ہے:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا - وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ - (۲۸:۸۳)

اس دار الآخرۃ کی نعمتوں کو ہم ان ہی لوگوں کو لئے مخصوص کردیں گے جو نہ میں تکبر و رفعت نہیں کرتے آخرت کی کامیابیاں صرف پرہیزگاروں کے لئے ہیں۔

حکومت کے قیام کا اولین مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ انصاف صرف دو متخاصم فریقوں کے درمیان صحیح فیصلہ کرنے ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انصاف یہ ہے کہ حاکم اپنے محکوم کے ساتھ برتاؤ کرنے میں حق کو ملحوظ رکھے اور جہاں خود اسکی ذاتی منفعت اور حاکمانہ وقار کا سوال ہو وہاں بھی قدرت و اختیار رکھنے کے باوجود وہی فیصلہ کرے جو حق ہو خواہ اس سے اس کی ذات کو نقصان پہنچے یا اس کے دوستوں کو یا عزیزوں کو۔ اسلام اس انصاف کی بہترین تعلیم دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔

(۴: ۱۳۵)

اے ایمان والو! انصاف پر سختی کے ساتھ قائم رہو اور خاص اللہ کے لئے گواہی دو۔ خواہ وہ خود تمہاری ذات یا تمہارے والدین یا عزیزوں ہی کے خلاف کیوں نہ ہو دولت مند کی رضاجوئی یا فقیر پر رحم کھانے کا جذبہ تمہیں حق و انصاف سے نہ پھیرے۔ کیونکہ اللہ کی خوشنودی انکی خوشنودی سے زیادہ اہم ہے تم اپنی خواہشات کی پیروی میں عدل و انصاف سے نہ پھر جاؤ۔ اگر تم نے ایچ پیچ کی بات کی یا حق سے اعراض کیا تو سمجھ لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ اچھی طرح باخبر ہے۔

اس سے بھی بڑھکر وہ حکم دیتا ہے کہ جن قوموں کے ساتھ تمہاری دشمنی ہو انسے بھی انصاف کرو۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ

(۵: ۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو۔ کیونکہ یہی پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

قوت و طاقت حاصل کرنے کے بعد ایک قوم میں لازمی طور پر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے

کہ اپنی مملکت کے حدود بڑھانے اور کمزور قوموں کے ملک چھیننے۔ یہی ملک و مال کا لالچ ظلم و سرکشی کی اصلی بنیاد ہے، اور اسی کی خاطر قومیں رزم آرائیاں کیا کرتی ہیں۔ مگر اسلام اس کی سختی کے ساتھ مذمت کرتا ہے اور صرف اس سے پرہیز ہی کرنے کی تاکید نہیں کرتا۔ بلکہ ان لوگوں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسا کہ فتنہ و فساد کی تحقیق میں تشریح بیان ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی نہایت صاف اور واضح ہیں۔ حدیث صحیح ہے کہ

من اقتطع شبرا من ارض ظلما طوقه الله اياه يوم القيمة من سبع ارضين (رواہ مسلم)	جس کسی نے ایک بالشت بھر زمین بھی ظلم سے حاصل کی اس کو اللہ قیامت کے دن سات زمینوں کی طوق کا عذاب دے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:-

ان هذا المال حلوة من اخذه بحقه ووضعه فی حقه فنعم المؤنة هو ومن اخذه بغير حقه كان كالذی ياكل ولا يشبع	یہ مال و دولت ایک مزیدار چیز ہے۔ جس کسی نے اسے حق کے ساتھ حاصل کیا اور حق کی جگہ خرچ کیا اس کے لئے تو وہ بہترین توشہ ہے۔ مگر جس نے اسے بغیر حق کے حاصل کیا تو وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھائے مگر سیر نہ ہو سکے۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں اسلام کے سیاسی اخلاق کی نہایت جزوی تفصیلات تک موجود ہیں۔ مگر یہ موقع اس قانون کی تفصیل کا نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اسلام نے حکومت و اقتدار کی ان تمام لذتوں کو حرام قرار دیا ہے جن کے لالچ میں انسان اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام کا حکمران نہ تو رعیت کے عام افراد سے ممتاز کوئی بالاتر ہستی ہے۔ نہ وہ عظمت و رفعت کے تخت پر بیٹھ سکتا ہے، نہ وہ اپنے کسی سے گردن جھکوا سکتا ہے، نہ قانون حق کے خلاف ایک پتہ ہلا سکتا ہے۔ نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے کسی عزیز و دوست یا خود اپنی ذات کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے جائز حقوق سے بچا سکے۔ نہ وہ حق کے خلاف ایک جبہ لے سکتا ہے اور نہ ایک چپہ بھر زمین پر قبضہ کر سکتا ہے [illegible]

غالب رہتا ہے کہ اس کے اعمال کا سخت حساب لیا جائیگا۔ اور اگر حرام کا ایک پیسہ، جبر سے لی ہوئی زمین کا ایک چپہ، تکبر و فرعونیت کا ایک شمہ، ظلم و بے انصافی کا ایک ذرہ، اور ہوائے نفسانی کی بندگی کا ایک شائبہ بھی اس کے حساب میں نکل آیا تو اسے اسکی سزا بھگتنی پڑیگی۔

اسلام میں حاکم یا فرمانروا کی اصلی حیثیت اور اس کی منصبی ذمہ داریوں کی صحیح کیفیت حضرت ابوبکرؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے خطبہ میں بیان کی تھی انہوں نے فرمایا:۔

یا ایہا الناس! قد ولیت امرکم ولست بخیرکم۔ وان اقوٰیکم عندی الضعیف حتی آخذ لہ بحقہ وان اضعفکم عندی القوی حتی آخذ منہ ایہا الناس ما انا الا کاحدکم فاذا رأیتمونی قد استقمت فاتبعونی وان زغت فقوموني

لے لوگو! مجھے تمہاری حکومت کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ مگر میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ میرے نزدیک ضعیف آدمی تم میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ جبتک کہ اس کا حق اسے نہ دلوا دوں۔ اور قوی آدمی تم میں سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ جبتک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں۔ لوگو میری حیثیت تمہارے ایک معمولی فرد سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر تم مجھے سیدھی راہ پر چلتے دیکھو تو میری پیروی کرو۔ اور اگر دیکھو کہ ٹیڑھا ہوگیا ہوں تو مجھے سیدھا کردو۔

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں اسی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

انما انا ومالکم کولی الیتیم ان استغنیت استعففت وان افتقرت اکلت بالمعروف لکم علی ایہا الناس خصال فخذونی بہا لکم علی ان لا اجتبی شیئاً من خراجکم ولا مما افاء اللہ علیکم۔ الا

تمہارے مال سے میرا تعلق وہی ہے جو یتیم کے ولی کو اس کے مال سے ہوتا ہے۔ اگر میں خوش حال ہوں گا تو کچھ نہ لونگا اور اگر تنگ دست ہونگا تو جو میرا جائز حق ہوگا وہ لے لونگا۔ تمہارے میرے اوپر حقوق ہیں اور تم ان کا مجھ سے مطالبہ کرسکتے ہو۔ مجھ پر فرض ہے کہ تمہارے خراج میں سے اور اس مال سے جو اللہ نے تمہیں غنیمت میں عطا فرمایا ہے۔ کوئی چیز بیجا وصول نہ کروں۔ اور تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جو کچھ میرے ہاتھ میں آئے

من وجہ، ولکم علی اذا وقع فی یدی ان لا یخرج منی الا فی حقہ

وہ جائز مصرف کے سوا کسی صورت سے نہ نکلے۔

اس طرح ہر قسم کی شاہانہ طمطراق، حاکمانہ مطلق العنانی، مال و دولت کی فراوانی، اور نفس کی تمام لذتوں اور راحتوں کو نکال دینے کے بعد حکومت کی ذمہ داریوں کا جو خشک اور بے مزہ حصہ باقی رہ جاتا ہے وہ خود اسلام ہی کی زبان میں یہ ہے کہ:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (۲۲:۶)

ان کو اگر ہم زمین میں قدرت و اختیار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

یہ اسلام کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے، بلکہ داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کے خلفاء راشدین رضؓ نے اس کا پورا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع قانون کی تشریح ہے، تاریخ کا استقصا نہیں ہے، تاہم جب ذکر چھڑ گیا ہے۔ تو ہم چند مثالیں پیش کر کے یہ بتائیں گے کہ اسلامی حکومت کا معیار کیا ہے۔

بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر آتی ہے۔ قریش کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں آپ عام لوگوں کی طرح اس کا بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیدیں۔ سفارش کے لئے آپ کے سب سے زیادہ عزیز و محبوب شخص (اسامہ بن زیدؓ) کو بھیجتے ہیں۔ مگر آپ ان کی سفارش کو یہ کہکر رد کر دیتے ہیں کہ تم سے پہلے کے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ کم حیثیت لوگوں پر تو تعزیر کا حکم جاری کرتے تھے اور شریف و معزز لوگوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ پھر جوش میں آکر فرماتے ہیں کہ

والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا

(بخاری و ابن ماجہ)

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

جنگ بدر میں قریش کے دو مہ سے سرداروں کے ساتھ خود رسول اللہؐ کے داماد (ابوالعاص)
گرفتار ہو کر آتے ہیں۔ عام قیدیوں کی طرح انہیں بھی بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کے پاس فدیہ ادا
کرنے کے لئے مال نہیں ہوتا تو حکم دیتے ہیں کہ گھر سے منگا کر دو، ورنہ قید رہو۔ وہ خود رسول اللہؐ
کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو پیغام بھیجتے ہیں۔ اور ان کے پاس سے شوہر کے فدیہ میں ایک
قیمتی ہار آتا ہے جو حضرت خدیجہؓ نے رسول اللہؐ کے جہیز میں دیا تھا۔ ہار کو دیکھ کر
رسول اللہؐ کو اپنی رفیقۂ حیات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔
تاہم خود اپنے اختیار سے فدیہ معاف نہیں کرتے عام مسلمانوں سے اجازت مانگتے ہیں
کہ اگر تم پسند کرو تو بیٹی کو اس کی ماں کی یادگار واپس کر دی جائے، اور جب عام مسلمان
اس کی اجازت دیدیتے ہیں۔ اس وقت رسولؐ کے داماد کو بغیر فدیہ کے رہائی نصیب ہوتی
ہے۔ (طبری۔ ابوداؤد)

حدیبیہ کے مقام پر رسول خداؐ اور کفار قریش کا معاہدہ ہوتا ہے۔ صلح کی شرائط
طے ہو چکی ہیں اور معاہدہ کی کتابت ہو رہی ہے۔ عین اس حالت میں ایک مسلمان (ابوجندل
بن سہیل) کفار کی قید سے بھاگ کر آتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ بدن پر
مار کے اتنے زخم ہیں کہ چور چور ہو رہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے آگے گر پڑتے ہیں۔ اور کہتے ہیں
کہ خدارا مجھے ان کی قید سے نکالو۔ رسول اللہؐ کی رکاب میں ۱۴ سو تلوار بند مسلمان ہیں اور
آپ کے ایک اشارہ میں ابوجندل کو رہائی مل سکتی ہے، مگر کفار سے شرط ہو چکی ہے کہ "قریش
والوں میں سے جو شخص مسلمانوں کے پاس جائے گا وہ واپس کر دیا جائے گا۔
اور مسلمانوں میں سے جو شخص کہ جائے گا۔ وہ واپس نہ کیا جائے گا۔
اس لئے رسول اللہؐ انہیں اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔
وہ اپنے زخم دکھا کر فریاد کرتے ہیں کہ کیا آپ مجھے پھر اسی ظلم کا تختۂ مشق بننے کے لئے واپس
کرتے ہیں۔ پھر پکار اٹھتے ہیں:۔

یا ابا جندل! اصبر واحتسب	ابوجندل! صبر کر اور ضبط سے کام لے۔ ہم
فانا لا نغدر! ان اللہ جاعل لک	بدعہدی نہیں کر سکتے اللہ تیرے لئے رہائی کی کوئی

فرجًا ومخرجًا۔ (فتح الباری ج ۵ باب الشروط فی الجہاد) | صورت نکالے گا۔

جنگ یرموک کے موقع پر قیصر روم لاکھوں کی فوج مسلمانوں کے مقابلہ پر جمع کرتا ہے۔ اور شام و فلسطین سے مسلمانوں کو نکالدینے، بلکہ ان کی قوت کو کچل دینے کا عزم کرلیتا ہے۔ اس فیصلے کی گھڑی میں اپنی قوت کے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو ایک ایک پیسہ کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ حمص کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور جو خراج ان سے وصول کیا تھا اسے یہ کہہ کر واپس کر دیتے ہیں کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں۔ اس لئے اب تم اپنا انتظام خود کرو۔ اس پر اہل حمص کہتے ہیں کہ "تمہارا عدل و انصاف ہم کو اس ظلم و جور سے زیادہ عزیز ہے جس میں ہم پہلے مبتلا تھے۔ ہم ہرقل کی فوج سے تمہارے عامل کی قیادت میں مقابلہ کرینگے۔" (فتوح البلدان للبلاذری) یہ بات یاد رہے کہ ہرقل ایک عیسائی بادشاہ تھا، اور یہ لوگ بھی جو اپنے مسلمان حکمرانوں کی طرف سے اس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے، عیسائی تھے اور صدیوں سے رومی سلطنت کے زیر حکومت تھے۔

جنگ صفین میں جاتے وقت خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کی زرہ کھوئی جاتی ہے۔ جنگ سے واپس آتے ہیں تو وہی زرہ دارالخلافہ کے ایک یہودی کے پاس پائی جاتی ہے۔ آپ اس سے زرہ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ یہ تو میری ملک ہے اور ہمیشہ سے میرے ہی قبضہ میں ہے۔ خلیفہ وقت کو یقین ہے کہ یہودی جھوٹ بول رہا ہے اور یہ وہی زرہ ہے جو کھوئی گئی تھی۔ مگر باوجود اس کے وہ اپنے شاہانہ اختیارات سے کام نہیں لیتے بلکہ ایک بے بس مدعی کی طرح قاضی شریح کی عدالت میں جاکر استغاثہ کرتے ہیں۔ قاضی ان کی جلیل القدر شخصیت سے قطع نظر کرکے محض ان کے دعوے پر فیصلہ نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ آپ زرہ کی ملکیت کا ثبوت پیش کیجئے۔ وہ اپنے غلام قنبر اور اپنے بیٹے اور رسول اللہ کے نواسے امام حسنؓ کو شہادت میں پیش کرتے ہیں تو قاضی کہتا ہے کہ امام حسنؓ کی شہادت معتبر نہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے دعوی پر بیٹے کی شہادت تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ یہ حال دیکھ کر یہودی بآواز بلند کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ جس دین میں یہ انصاف ہے

وہ ضرور سچا دین ہے۔ (سیوطی)

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے پاس ان کا ایک عامل جزیہ کی کثیر رقم لیکر حاضر ہوتا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "جزیہ ہے جو ذمیوں سے وصول کیا گیا ہے" مال کی کثرت کو دیکھ کر آپ کو گمان ہوتا ہے کہ جبراً وصول کیا گیا ہوگا۔ فرماتے ہیں کہ کہیں تم نے لوگوں کو تباہ تو نہیں کر دیا" وہ کہتا ہے کہ "خدا کی قسم ہم نے نہایت نرمی سے وصول کیا ہے" پوچھتے ہیں کہ "بغیر مارے باندھے؟" وہ پھر عرض کرتا ہے کہ "واللہ بغیر مارے باندھے" تب کہیں وہ رقم بیت المال میں داخل کی جاتی ہے (فتح البیان) امام ابو یوسفؒ اپنی کتاب الخراج میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے پاس جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ذمہ دار افسر کوفہ سے اور دس بصرہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور چار مرتبہ شرعی قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتے تھے کہ یہ رقم حلال ہے۔ اور کسی مسلمان یا ذمی معاہد سے ظلم کے ساتھ وصول نہیں کی گئی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے ابو شحمہؓ شراب پیتے ہیں تو ایک معمولی مجرم کی طرح گرفتار کر لئے جاتے ہیں، خود حضرت عمرؓ اپنے ہاتھ سے انہیں ۸۰ کوڑے لگاتے ہیں۔ اور ان کوڑوں کے صدمہ سے ان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ عمرو ابن عاصؓ گورنر مصر کے بیٹے، عبداللہؓ ایک شخص کو مارتے ہیں۔ وہ دربار خلافت میں استغاثہ کرتا ہے، اور حضرت عمرؓ خود اسی شخص کے ہاتھ سے عبداللہؓ کو کوڑے لگوا دیتے ہیں۔ خود عمرو بن عاصؓ کے متعلق خبر آتی ہے کہ ان کے پاس بہت دولت اکٹھی ہو گئی ہے۔ انہیں لکھتے ہیں کہ "گورنر ہونے سے پہلے تمہارے پاس اتنا ساز و سامان نہ تھا اب یہ کہاں سے آگیا" وہ جواب دیتے ہیں کہ "میرا صوبہ ایک زرخیز علاقہ ہے۔ اس لئے میرے پاس میرے خرچ سے بہت کچھ مال بچ رہتا ہے" یہ جواب حضرت عمرؓ کو مطمئن نہیں کرتا۔ آپ محمد ابن مسلمہؓ کو پورے اختیارات دیکر بھیجتے ہیں۔ وہ مصر پہنچکر ان کے مال کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ ان کے پچھلے اثاثہ کا حساب کرتے ہیں۔ گورنری کے زمانہ میں اس مالی پر جو معقول اضافہ ہو سکتا تھا اس کا اندازہ لگاتے ہیں، اس کے بعد جو زائد مال بچتا ہے اسے ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں۔ مصر کا با اختیار گورنر

جس کی حدود مملکت طرابلس تک پہنچی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھتا ہے : دم نہیں مار سکتا
(بلاذری)

مغیرہ بن شعبہؓ والی بصرہ کی شکایت آتی ہے کہ اُنسے ایک عورت کا ناجائز تعلق ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ ابوموسیٰ اشعری کو حکم دیتے ہیں کہ بصرہ میں شیطان ذاتشیانہ بنا لیا ہے۔ تم وہاں گورنری کا جائزہ لے لو اور مغیرہ کو گواہوں سمیت مدینہ بھیجو۔ حکم کے مطابق مغیرہ مدینہ بھیجے جاتے ہیں۔ خود حضرت عمرؓ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ جرح میں گواہ ٹوٹ جاتے ہیں۔ شہادتوں میں شدید اختلاف واقع ہوتا ہے۔ جرم ثابت نہیں ہوتا اس لئے مغیرہؓ کو رہائی دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ "اگر شہادت پوری ہو جاتی تو میں یقیناً تم کو سنگسار کر دیتا۔ یہ مغیرہؓ رسول اللہ کے جلیل القدر صحابی تھے۔ عرب کے چند مشہور ترین مدبروں میں سے ایک تھے، اسلام کی بڑی بڑی سیاسی و جنگی خدمات انجام دی تھیں مگر انکی عظمت شان بیش قیمت خدمات گورنری اعلیٰ پوزیشن عرب میں ان کی شہرت و عزت غرض کوئی چیز انکے کام نہ آئی اور ایک معمولی مجرم کی طرح انہیں پیش ہونا پڑا۔ دنیاوی حکومتوں میں کسی افسر کا بدکاری کرنا اس کا شخصی معاملہ ہے۔ بلکہ آجکل کی مہذب ترین حکومتوں کے قوانین میں بھی زنا اگر طرفین کی رضامندی سے ہو تو کوئی قابل سزا جرم نہیں ہے۔ لیکن جس حکومت کا اعلیٰ مقصد انسانیت کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا۔ اس میں کسی ایسے شخص کے لئے گنجایش نہ تھی جسکا ذاتی عمل درست نہ ہو۔

فارس کے علاقہ میں مسلمان ایک شہر (شہر بابج) کا محاصرہ کرتے ہیں۔ اور محصورین کی مزاحمت اس حد تک کمزور ہو جاتی ہے کہ شہر کا فتح ہونا بالکل یقینی ہو جاتا ہے۔ عین اس حالت میں اسلامی فوج کا ایک غلام شہر والوں کے نام امان نامہ لکھتا ہے اور اسے تیر میں باندھ کر شہر میں پھینک دیتا ہے۔ دوسرے دن جب اسلامی فوج شہر پر حملہ کرتی ہے تو اہل شہر دروازہ کھول کر باہر آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک مسلمان ہم کو امان دے چکا ہے۔

لہ یہ واقعہ طبری اور ابن اثیر میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ بلاذری نے بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

اب تم کیوں برسرپیکار ہو؟ امان نامہ دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلام کی تحریر ہے۔ اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے استصواب کیا جاتا ہے کہ اس امان نامہ کی کیا وقعت ہے؟ جواب میں آپ لکھتے ہیں "مسلمان غلام بھی عام مسلمانوں کی طرح ہے۔ اس کے ذمہ کی وہی قیمت ہے جو عام مسلمانوں کے ذمہ کی ہے۔ لہٰذا اسکی دی ہوئی امان نافذ کیجائے"

(بلاذری ذکر کور فارس)

حضرت ابوبکر صدیقؓ رسول اللہ کے انتقال کے بعد ملک عرب کی سلطنت کے باختیار حاکم یا بادشاہ منتخب کئے جاتے ہیں اور انتخاب کے دوسرے دن حضرت عمرؓ انہیں دیکھتے ہیں کہ سر پر کپڑوں کے تھان لادے ہوئے بازار جا رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ "اب آپ مسلمانوں کے امیر ہیں آپ کو یہ کام زیبا نہیں ہے" وہ جواب دیتے ہیں کہ "پھر میں اپنا اور اپنے اہل وعیال کا پیٹ کیونکر پالوں؟" حضرت عمرؓ تجویز کرتے ہیں کہ "یہ کام آپ کے لئے ابوعبیدہؓ کر دیا کریں گے" چنانچہ ان سے خلیفۂ اسلام کا یہ معاملہ طے ہوتا ہے کہ وہ ان کی تجارت کا کام سنبھالیں اور ان کے اہل وعیال کے لئے ایک متوسط درجہ کے مہاجر کی خوراک اور گرمی جاڑے کا کپڑا مہیا کر دیا کریں۔ پھر بیت المال سے ان کے لئے ۵۰۰ درہم (آجکل کے حساب سے سو روپے سے کچھ زائد) ماہانہ تنخواہ مقرر ہو جاتی ہے۔ جب انتقال کا وقت قریب آتا ہے تو لوگوں سے کہتے ہیں کہ خلیفہ ہونے کے بعد سے میرے مال میں جو کچھ اضافہ ہو اس کا حساب کرنا اور وہ سب نئے خلیفہ کے سپرد کر دینا۔ چنانچہ انتقال کے بعد جب حساب کیا جاتا ہے تو ایک اونٹنی، ایک زنگی غلام، اور ایک پرانی چادر کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

(فتح الباری ج ۵۔ کتاب البیوع)

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سیلاب ایران سے لیکر شمالی افریقہ تک پھیل گیا تھا۔ غنائم اور اموال خراج کی اس قدر کثرت تھی کہ کروروں درہم سالانہ خزانہ میں داخل ہوتے تھے۔ قیصر وکسریٰ کے سارے خزانے مسلمانوں کے قبضہ میں آگئے تھے۔ مگر خود اس سلطنت کے بادشاہ کا یہ حال تھا کہ بدن پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوئے کپڑے ہوتے تھے۔ پاؤں میں پھٹی ہوئی چپلی۔ اور سر پر لوسیدہ عمامہ پہنے ہوئے یتیموں، بیواؤں اور

ضرورتمندوں کی خبر گیری کرتے پھرتے تھے۔ روم و عجم کے لوگ آتے تو انہیں عام مسلمانوں میں "شہنشاہ" عرب کو پہچاننا مشکل ہوتا تھا، شام کا سفر کیا تو اس شان سے کہ لوگ خلیفۂ اسلام اور اس کے غلام میں تمیز نہ کر سکے۔ فتح بیت المقدس کے موقع پر شہر میں داخل ہوئے تو پیادہ پا تھے۔ اور ایسے موٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عیسائیوں کے خیال سے شرم آنے لگی۔ اونٹ کا دودھ، زیتون کا تیل، سرکہ اور گیہوں کی روٹی، یہ بہتر سے بہتر غذائیں تھیں جو انہیں نصیب ہوتی تھیں۔ جب انتقال ہوا تو گھر میں اتنا اثاثہ نہ تھا کہ قرضے ادا کئے جاتے اس لئے رہنے کا مکان بیچا گیا اور اس سے قرضے ادا کئے گئے۔

یہ واقعات، قصہ و افسانہ نہیں، تاریخ کے مستند حقائق ہیں۔ انہیں دیکھ کر بتاؤ کہ دنیا میں اس سے بہتر حکومت کا کوئی اور بھی نمونہ موجود ہے؟ جن لوگوں کا آئین مکہ کی اس تقویٰ و طہارت خشیۃ الٰہی، اس بے نفسی و بے غرضی، اس حریت و مساوات، اس عدل و وفا شعاری، اس دیانت و امانت پر قائم ہو، کیا ان کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنا بالفاظ صحیح دنیا کی خدمت کرنا صرف انہی کا حق ہے؟ اگر انہوں نے عجم کے عیش پرست اور ظالم حکمرانوں سے عجم کا تخت خالی کرا لیا، اگر انہوں نے روم کے سیہ کار و جفا پیشہ فرمانرواؤں کو روم کی حکومت سے بیدخل کر دیا، اگر انہوں نے تمام شیعت فی حکومتوں کے تختے الٹ کر اور ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی تو بتاؤ کہ یہ انسانیت پر ظلم تھا یا اسکی خدمت تھی؟ ان کے مقابلہ میں مغرب کے ان جھوٹے مدعیوں کی کیا وقعت ہے جن کو تقویٰ و پرہیزگاری سے واسطہ نہیں، وفائے عہد کی ہوا تک نہیں لگی، عدل و انصاف اور دیانت و امانت سے جن کا دامن تہی ہے، اور بجز ملک گیری کی ہوس، مال و زر کی حرص، اور حصول اقتدار کی خواہش کے کسی اور جذبہ سے آشنا نہیں ہیں؟

ہم کو تسلیم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکومتوں کا عمل اس نمونہ تک کے مطابق نہیں ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، مگر یہ نقص اسلام کا نہیں، اس کے پیروؤں کا ہے۔ اسلام تو ایک قانون ہے جو قرآن، سنت رسول اور سنت خلفائے راشدین سے ماخوذ ہے۔ جو حکومت اس قانون کے مطابق عمل کرتی ہے وہ اسلامی حکومت ہے اور جس کا عمل اس کے

خلاف ہے وہ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ ہمارے لئے مسلمان بادشاہوں کا عمل حجت نہیں ہے، بلکہ اسلام کا قانون حجت ہے؛ اس میں اگر کوئی نقص ہو تو اسے پیش کیا جائے۔

اسلامی فتوحات کی توجیہ

آئندہ مباحث کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہاں ایک اور مسئلہ کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس کتاب میں بار بار یہ بیان کیا گیا ہے۔ اور آئندہ بھی اس حقیقت کا جگہ جگہ ذکر آئیگا کہ اسلامی شریعت میں ملک گیری کی غرض سے تلوار اٹھانا قطعاً حرام ہے۔ اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ فعل حرام ہے تو آخر صحابۂ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے ان حملوں کی کیا توجیہ کی جائیگی جو انہوں نے عراق، شام، ایران، ارمینیا، مصر اور شمالی افریقہ وغیرہ ممالک پر کئے؟ یہ اعتراض مخالفین اسلام نے بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے، اور مسلمان مورخین و مصنفین نے اس کے نہایت مفصل جوابات دئے ہیں لیکن ان میں کسی نے غور نہیں کیا کہ اس معاملہ میں اسلام اور غیر مسلموں کے نقطۂ نظر میں شدید اختلاف ہے۔ اسی لئے جن لوگوں نے غیر مسلموں کے نقطۂ نظر کی رعایت کرکے جواب دیا ہے انہوں نے اسلام کی غلط ترجمانی کی ہے، اور جنہوں نے اس سے بالکل بے پروا ہو کر جواب دیا ہے وہ مزید شکوک پیدا ہونے کے موجب ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام حکومت کے معاملہ میں "قومی" اور "اجنبی" کی کوئی تمیز نہیں کرتا، بلکہ "عدل" اور "ظلم" کو وجہ امتیاز قرار دیتا ہے۔ اگر ایک ملک کی حکومت خود اس کے اپنے باشندوں کے ہاتھ میں ہو لیکن اس کے حکمران بدکار، ظالم، نفس پرست، اور ناخدا ترس ہوں۔ تو اسلام کی نگاہ میں وہ اسی قدر نفرت کے قابل ہیں جس قدر ایک اجنبی حکومت کے ایسے ہی بدکردار عمال ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایک عجمی عرب پر حکومت کرتا ہے اور تمام امور میں عدل، انصاف دیانت، اور خشیۃ الٰہی کو ملحوظ رکھتا ہے، مظلوموں کی دادرسی کرتا ہے، حق والوں کے حق دلواتا ہے، تکبر و تعلی نہیں کرتا، نفس پروری و غرض پرستی سے احتراز کرتا ہے، اور رعیت کی اصلاح حال کے سوا کسی اور ذاتی غرض کے لئے اپنی قوتوں کو استعمال نہیں

کرتا، تو اسلام کے نزدیک عرب کے لئے وہ عجمی اس عربی حکمران سے بہتر ہے جو ان صفات سے عاری ہو۔ یہ خیال کہ ظالم عرب عربوں کے لئے عادل عجمی سے بہتر ہے، اور ترکی خواہ کتنا ہی نیک اور صالح ہو، مگر صرف اس لئے کہ وہ ترکی ہے عراقی اسے قبول نہیں کر سکتے، ایک ایسا خیال ہے جسے اسلام اصلاً غلط اور کلیتہً باطل سمجھتا ہے۔ اس معاملہ کو وہ "وطنیت" کی نظر سے نہیں بلکہ خالص "انسانیت" کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا عقیدہ یہ ہے کہ "صالح" انسان بہرحال "غیر صالح" کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے، اور صلاحیت میں اپنے اور پرائے، وطنی اور اجنبی، ہندی و عراقی، زنگی و فرنگی، کالے اور گورے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

اسلام کے اس عقیدہ کے مطابق حکومت کی اچھائی کا معیار نہ اس کا خود اختیاری یا وطنی ہونا ہے اور نہ اس کی برائی کا معیار اجنبی یا غیر خود اختیاری ہونا۔ یہ سب اعراض ہیں۔ جوہر میں سوال صرف یہ ہے کہ حکومت کا نظام عادلانہ اور حق پرستانہ ہے یا نہیں ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو اسلام اس کے مٹانے کی کوشش تو درکنار ایسے ارادہ کو بھی گناہ اور ظلم عظیم سمجھتا ہے لیکن دوسری صورت میں وہ ایک ظالمانہ نظام حکومت کو مٹا کر ایک سچا عادلانہ نظام حکومت قائم کرنا اولین فرض قرار دیتا ہے۔ "وطنیت" اور "اجنبیت" کے سوال سے اس نے نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے نزدیک حکومت کے اچھے یا برے ہونے کے سوال پر اس کے قومی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ غیر قومی حکومت عموماً ظالم و جابر ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک قوم دوسری قوم پر حکومت قائم ہی اس لئے کرتی ہے کہ اسے غلام بنا کر اپنی مصلحت کیلئے استعمال کرے۔ اور اس کے برعکس قومی حکومت میں اصلاح پذیری کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے یہ ضروری نہیں ہے کہ قومی حکومت ہر حال میں بہتر ہو۔ اور غیر قومی حکومت کسی حال میں عادل نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک قوم پر خود اس کے اپنے سرکش افراد شیطان کی طرح مسلط ہو جائیں اور اسے اپنی شخصی اغراض کا غلام بنا کر تباہ و برباد کر دیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک قوم کو غیر قوم کے نیک نفس اور بے غرض مصلحین ظلم و استبداد کے پنجہ سے رہائی دلائیں اور اس کے لئے مادی و اخلاقی ترقی کی راہیں کھولدیں۔ پس حکومت کی

خوبی کا اہلی معیار اس کا عادل وصالح ہونا ہے اور اس کی برائی کا اہلی معیار غیر عادل اور غیر صالح ہونا۔

اس سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اسلام قومی حکومت کا دشمن ہے۔ وہ ہر قوم کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے احوال کی اصلاح خود کرے۔ مگر جب کسی قوم کے اعمال بگڑ جائیں اسکی اخلاقی حالت خراب ہوجائے اور وہ اپنے شریر ومفسد لوگوں کی پیروی واطاعت اختیار کرکے ذلت ومسکنت کی پستیوں میں گر جائے، تو اسلام کے نزدیک اس قوم کو حکومت خود اختیاری کا حق باقی نہیں رہتا اور دوسرے لوگوں کو جو اس کے مقابلہ میں اصلح ہوں، اس پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ قرآن حکیم میں نافرمان اور بدکار قوموں کو جگہ جگہ یہ دھمکی دی گئی ہے کہ:-

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (۴۷:۳۸)	اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کرے گا۔ اور وہ لوگ تم جیسے نہیں ہونگے۔

اور

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا (۹:۶)	اگر تم راہِ الٰہی میں جہاد کے لئے نہ نکلوگے تو اللہ تمہیں دردناک مصائب میں مبتلا کرے گا۔ اور تمہارے بدلے دوسری قوم کو کھڑا کردے گا۔ اور تم اسکا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔

اور

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ (۴:۱۹)	اگر خدا چاہے تو اے لوگو! تمہیں لیجائے اور دوسرے لوگوں کو تمہاری جگہ لے آئے۔

اس معنی کی آیات قرآن میں بکثرت آئی ہیں، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ حکومت اور بادشاہی کا حق صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، جو قوم صلاحیت کو کھو دیتی ہے وہ اس حق کو بھی کھو دیتی ہے۔ اور جو صلاحیت اپنے اندر پیدا کرلیتی ہے۔ وہ اس حق کو بھی حاصل کرلیتی ہے۔ اس صلاحیت کو محض قوت وطاقت کا ہم معنی نہ سمجھو، بلکہ یہ جوہر خاص ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو ایک خدا کی بندگی کرتے ہیں، برے اعمال سے روکتے ہیں۔ اچھے اعمال کا حکم دیتے ہیں۔

ہر عمل خیر کے انجام دینے پر مستعد رہتے ہیں، اور یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے اعمال کا پورا پورا حساب دینا پڑے گا۔ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۳: ۱۱۴)

یہ صالح لوگ کسی ایک قوم یا ایک ملک کی جائداد نہیں ہیں بلکہ تمام نوع بشری اور کائنات انسانی کی مشترکہ جائداد ہیں۔ آدم کی ساری اولاد کو ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنی خدمات کو بلا ضرورت کسی محدود جماعت یا رقبہ کے لیے مخصوص کر دیں، تو یقیناً یہ انسانیت پر ان کا ظلم ہو۔ اسلام نے ان کے لئے رنگ یا نسل یا جغرافی تقسیم کے قبیل سے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے، بلکہ بلا قید تمام روئے زمین کے لئے ان کی قابلیتوں کے فوائد کو عام کر دیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں متصریح ارشاد ہوتا ہے کہ

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱: ۱۰۵)	ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

یہ حکومت و سلطنت کے متعلق اسلامی تعلیم کی اصلی روح ہے۔ اس کو سمجھ لینے کے بعد صحابۂ کرامؓ کے ان فاتحانہ اقدامات کی علت بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی بادشاہی کے تخت الٹ دیے اور باطل کی فرمانروائی کے سارے قصر کو درہم برہم کر دیا۔ انہوں نے اپنے ملک کی اصلاح سے فارغ ہو کر جب باہر کی دنیا پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام ہمسایہ ممالک پر ظالم بادشاہ اور جابر امراء مسلط ہیں۔ قوت والوں نے کمزوروں کو غلام بنا لیا ہے۔ دولت والوں نے غریبوں کو خرید رکھا ہے۔ انسان، انسان کا خدا بنا ہوا ہے۔ عدل و انصاف، قانون، کوئی چیز نہیں ہے۔ بادشاہوں اور حاکموں کی چشم و ابرو کے اشارے سے لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں، عزتیں لٹتی ہیں، گھر برباد ہوتے ہیں، اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ غریب محنتی لوگ پیداوار یا کمائی کے جو دولت کماتے ہیں وہ حرص حرص کی زیادتیوں سے لوٹی جاتی ہے اور مزارع کی عیش پسندیوں میں اڑا دی جاتی ہے۔ حاکم لوگ خود پرلے درجے کے سیاہ کار، بدعمل اور ہوس پرست ہیں، اس لئے رعیت بھی ہر قسم کی

معصیتوں میں مبتلا ہے۔ شراب، زنا اور قمار کی عام اجازت ہے، رشوت اور خیانت کا بازار گرم ہے، نفس انسانی کی شرارتوں نے اخلاق و انسانیت کی تمام قیود کو توڑ دیا ہے۔ بہیمی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے انسان کسی قید سے آشنا نہیں رہا۔ اور اس کے اخلاق کی دنائت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ اگر تمدن کی اوپری شان و شوکت کے پردے اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو حیوانوں کو بھی اس کی حیوانیت پر شرم آنے لگے۔[1]

انسانی برادری کو اس ذلیل حالت میں مبتلا دیکھ کر صالحین کی وہ سرفروش جماعت اصلاح کے لئے کمربستہ ہوگئی پہلے اس نے وعظ و تذکیر سے کام لیا اور کسریٰ عجم، قیصر روم، اور مُقَوقِس مصر کو دعوت دی کہ اسلام کے قانون عدل و حق پرستی کو اختیار کریں جب انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا تو پھر مطالبہ کیا کہ حکومت و فرمانروائی کی مسندکو ان لوگوں کے لئے خالی کر دیں جو اس کے اہل ہیں۔ مگر جب اس مطالبہ کو بھی رد کر دیا گیا اور اس کے جواب میں تلوار پیش کی گئی تو مٹھی بھر انسانوں کی اس بے سر و سامان جماعت نے بیک وقت دو عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے اور سرحد ہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ تک جو لوگ ان کے ظلم سے پامال ہو رہے تھے ان سب کو یک لخت آزاد کر دیا۔

تمہیں اختیار ہے کہ ان کے اس فعل کو جہانگیری سے تعبیر کر دیا زیادتی اور تعدی قرار دو مگر تاریخ کے اس

---

[1] ایران، روم اور مصر وغیرہ ممالک اس وقت سیاسی، اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے جس پستی کی حالت میں تھے۔ اس کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حرام کاری میں باپ بیٹی اور بھائی بہن تک کی تمیز نہ تھی۔ مذہبی پیشوا تک بدترین اخلاقی جرائم کے ارتکاب کرتے تھے، ایران میں مزدک کی مذہبی سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم و برہم کر دیا تھا۔ روم میں امرا اور قیاصرہ کی نفس پرستیوں نے اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچا دیا تھا۔ مصر و افریقہ کو رومیوں کی غلامی نے بدترین خصائل کا مجموعہ بنا دیا تھا، اور خود عرب سے متصل شام و اعراق میں ان دونوں سلطنتوں کے اثرات نے مفاسد اخلاقی کا ایک طوفان برپا کر رکھا تھا۔ ان حالات کی تفصیل کے لئے میں اسلامی تاریخوں کی بجائے سرجان میلکم اور ایڈورڈ گبن وغیرہ یورپین محققین کی تصانیف پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ لیکی کی "ہسٹری آف یورپین مارلس" خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے رومیوں کی اخلاقی حالت ظاہر کرتی ہے۔

بیان کو تم نہیں جھٹلا سکتے کہ انکی حکومت نے ان قوموں کو اس پستی سے نکالا جس میں
وہ گری ہوئی تھیں، انہیں مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کی معراج پر پہنچایا، اور جو ملک
تہذیب و تمدن کے لئے بالکل بنجر ہو گئے تھے ان میں نئے سرے سے
نمو اور روئیدگی کی وہ قوتیں پیدا کیں کہ آجتک عالم انسانی میں انکے
گلزار کی مہک باقی ہے۔ قوم پرستی کا مذہب تو شاید یہی فیصلہ
کرتا کہ ایران و روم چاہے مٹ جاتے مگر عرب کو ان پر حملہ کرنے کا
حق نہیں تھا۔ لیکن صداقت کا مذہب یہ کہتا ہے کہ انہوں
نے اس طرح انسانیت کی سب سے بڑی خدمت انجام
دی۔ اور درحقیقت یہ دنیا کی بدقسمتی تھی کہ اسکا
ایک بڑا حصہ اس جماعت کی خدمت سے
محروم رہ گیا جس سے زیادہ مفید
جماعت سوچ کی آنکھ نے
زمین کی پیٹھ پر کبھی
نہیں دیکھی

اشاعتِ اسلام اور تلوار

اسلامی جنگ کے مقاصد کی اس توضیح میں جو سراسر قرآن مجید احادیث نبوی اور معتبر کتب دینیہ کی تصریحات پر مبنی تھی۔ قارئین کرام نے دیکھ لیا کہ کسی جگہ بھی غیر مسلموں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کا حکم موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی حکم میں یہ معنی نکالنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لئے زور سے لوگوں کو اپنی حقانیت کا اقرار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسلام کے احکام جنگ میں بلکہ کسی حکم کا موجود ہونا بجائے خود اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ جو مخالفین نے اس پر لگایا ہے۔ لیکن متعصب مؤرخین اور ان کے جاہل و کوتہ نظر مقلدوں نے اس معاملہ میں دنیا کو جسقدر دھوکہ دیا ہے۔ اور جس کثرت کے ساتھ غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق بھی اسلام کے اصول و احکام کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے۔

قرآن مجید کی جن آیات میں احکام جنگ کی تشریح کی گئی ہے ان میں جنگ و خونریزی کی غرض و غایت بتلانے کے ساتھ اس کی ایک حد بھی مقرر کر دی گئی ہے۔ اور اس سے آگے بڑھنے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ حد ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر نہایت روشن طریقہ سے کھینچی گئی ہے۔ چنانچہ سورہ بقر میں مسلمانوں کو قتال کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ:-

قَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ (۱۹۳)	ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔

یہاں حتیٰ کے لفظ نے ایک حد کھینچ دی ہے کہ جب تک فتنہ باقی رہے اور ترقی دین کے راستہ میں رکاوٹیں موجود رہیں اس وقت تک جنگ کی جائے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں دور ہو جائیں تو پھر ضرب و قتال کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا کہ:-

فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (۲:۱۹۲)	اگر وہ فتنہ برپا کرنے سے باز آجائیں تو جان لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی کے لئے سزا نہیں ہے۔

سورہ مائدہ میں اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتلایا ہے کہ انسانی جان کس صورت میں حرام ہے اور کس صورت میں حلال۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۵:۵)	جو کوئی کسی جان کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس نے کسی کی جان لی ہو۔ یا زمین میں فساد برپا کیا ہو۔ تو گویا اس نے تمام انسانوں کا خون کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو صرف دو حالتوں میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کو ناحق قتل کیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ اس نے زمین میں فساد پھیلایا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کسی تیسری صورت میں اسے قتل کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ رب العالمین اسے تمام دنیا کے قتل کر دینے کے برابر سمجھتا ہے۔

سورہ توبہ میں جنگ و قتال کی آخری حد ادائے جزیہ کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (۹:۲۹)	ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور اطاعت قبول کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کفار جزیہ ادا کر کے احکام اسلامی کے اجرا پر رضامند ہو جائیں تو ان سے جنگ نہیں کی جا سکتی۔ اور اجازت قتال کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

سورہ شوریٰ میں ایک جامع اصول بیان فرمایا ہے۔ جو بات لوگوں کے خلاف جنگ و قتال کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتا۔ جو بندگان خدا ظلم نہیں کرتے اور زمین میں ناحق سرکشی نہیں کرتے۔

لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ ۔ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ	اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے اس پر کوئی راہ نہیں ہے۔ راہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۴۲: ۴)

سورۂ ممتحنہ میں اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی صرف انہی کفار کے ساتھ ہے جو دین حق اور پیروانِ دین حق کے دشمن ہیں۔ اور جو لوگ ایسے نہیں ہیں ان سے نیکی و احسان کرنے اور ان کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے سے کوئی چیز مسلمانوں کو نہیں روکتی۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۶۰: ۲)

اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی۔ اور تمہیں تمہارے وطن سے نہیں نکالا، کہ تم ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرو۔ کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے۔ اور تمہیں تمہارے وطن سے نکالا ہے۔ اور تمہیں نکالنے میں دشمنوں کی مدد کی ہے۔ انہیں جو کوئی دوست بنائے وہ ظالم ہے۔

ان احکام کا مطلب اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی جنگ کا اصلی مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے بلکہ انہیں ظلم و سرکشی اور فتنہ و فساد سے روک کر قانون عدل کا تابع بنا دینا ہے۔

اسلام کی تلوار ایسے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کے لیے تو ضرور تیز ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا اللہ کی زمین میں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس تیزی میں وہ حق بجانب نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ

ظالم نہیں ہیں جو بدکار نہیں ہیں۔ جو صد عن سبیل اللہ نہیں کرتے جو دین حق کو نہیں مٹاتے۔ جو خلق خدا کے امن و اطمینان کو غارت نہیں کرتے۔ جو قانونِ عدل کی پابندی اختیار کرتے ہیں اور اخلاق و انسانیت کے حدود سے تجاوز نہیں کرتے وہ خواہ کسی دین و ملت سے تعلق رکھتے ہوں اور ان کے دینی عقائد خواہ کتنے ہی باطل ہوں۔ اسلام ان کی جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کرتا ان کے لئے اس کی تلوار کند ہے۔ اور اس کی نظروں میں ان کا خون حرام ہے۔

لا اکراہ فی الدین

حدودِ جنگ کی یہ تعیین بجائے خود فیصلہ کن ہے۔ لیکن کتاب الٰہی کا کمال و صراحت یہ ہے کہ اس نے صرف دلالتہً ہی اس مسئلہ میں ہماری ہدایت کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ صراحتہً بھی ہم کو بتا دیا کہ اسلام کی تبلیغ میں جبر و اکراہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ چنانچہ سورہ بقر میں صاف فرمایا ہے کہ :-

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲/۲۵۶)

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے سیدھی راہ غلط راستے سے ممتاز کر کے دکھائی جا چکی ہے۔ پس اب جو کوئی معبودان باطل کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے۔ تو وہ ایک ایسے مضبوط رشتہ سے تعلق جوڑتا ہے۔ جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس حکم کے الفاظ بالکل صاف ہیں۔ لیکن یہ جس موقع پر اترا ہے اسے پیش نظر رکھنے کے بعد اس کا مدعا اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔ اہل یثرب کا قاعدہ تھا کہ جب ان میں سے کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ منت مانتی کہ اگر میرا کوئی بچہ زندہ رہے گا۔ تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ مدینہ میں اس طریقہ سے انصار کے بہت سے بچے یہودی بنا دیئے گئے تھے۔ جب ۴ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو ان کی حرکات

پیرو تھے انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے ان کو اس وقت یہودی بنایا تھا۔ جب ہم ان کے دین کو اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر اب جبکہ اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور تمام ادیان سے افضل دین ہمارے پاس ہے تو ہم اپنے بچوں کو یہودی نہ رہنے دیں گے اور انہیں اسلام پر مجبور کریں گے اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ لا اکراہ فی الدین انہیں جبراً مسلمان نہ کرو۔ کیونکہ دین میں اکراہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کو الفاظ و مضمون کے جزوی اختلاف کے ساتھ ابو داؤد اور نسائی نے اور ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے نقل کیا ہے۔ اور مجاہد سعید بن جبیر شعبی۔ اور حسن بصری نے بالاتفاق کہا ہے کہ اس آیت کی شان نزول یہی ہے۔ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اسے بیان کیا ہے۔ اور ابن کثیر نے اسی شان نزول پر اعتماد کیا ہے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے ایک دوسری روایت بیان کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ انصار میں سے ایک شخص کے دو بیٹے نصرانی تھے۔ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میرے بیٹے نصرانیت کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے کیا میں انہیں مجبور کر سکتا ہوں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی لا اکراہ فی الدین یہ واقعہ اگرچہ پہلے واقعہ سے مختلف ہے۔ لیکن مدعا دونوں کا ایک ہی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے اپنی مشہور و مستند تفسیر میں لکھا ہے۔ اس شان نزول کی روشنی میں۔ اسلام کی تعلیم صاف یہ معلوم ہوتی ہے کہ:۔

لا تکرھوا احداً علی الدخول فی دین الاسلام فانہ بین واضح جلی دلائلہ وبراھینہ لا یحتاج الی ان یکرہ احد علی الدخول فیہ بل من ھداہ اللہ للاسلام وشرح صدرہ ونور	کسی شخص کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو۔ کیونکہ وہ اس قدر بین و واضح ہے اور اس کے دلائل و براہین اس قدر روشن ہیں کہ کسی شخص کو اس میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اللہ نے جس شخص کو ہدایت دی ہو اور جس کا سینہ قبول حق کے لئے کھول دیا ہو۔ اور جس کو بصیرت کا نور

لو رأى بصيرته دخل فيه على بينة ومن اعمى الله قلبه وختم على سمعه وبصره فانه لا يفيده الدخول فى الدين مكرها ومقسورا۔

عطا کیا ہو وہ دلیل واضح کی بنا پر اسے خود اختیار کرے گا۔ اور جس کی سماعت و بینائی پر مہر کر دی ہو اس کا مارے باندھے سے دین میں داخل ہونا بیکار ہے۔

* * *

زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں بھی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس قول کی تائید کی ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ :-

لم يجر الله امر الايمان على الاجبار والقسر ولكن على التمكن والاختيار ونحوه قوله ولو شاء ربك لآمن من فى الارض كلهم جميعا افانت تكره الناس حتى يكونوا مؤمنين اى لو شاء لقسرهم على الايمان ولكن لم يفعل وبنى الامر على الاختيار۔

اللہ نے ایمان کے معاملہ میں جبر و زبردستی کو دخل نہیں دیا ہے۔ بلکہ اسے تمکن و اختیار پر چھوڑ دیا ہے اسی مضمون کو یہ ارشاد بھی واضح کرتا ہے کہ ولو شاء ربك لآمن الخ یعنی اگر تیرا خدا چاہتا تو تمام روئے زمین کے باشندے ایمان لے آتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ وہ ایمان لائیں ؟

اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ چاہتا ہے تو سب لوگوں کو ایمان پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور اس معاملہ کو انسان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

امام رازی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے متعلق ابو مسلم اصفہانی اور قفال کا یہ قول نقل کرتے ہیں :-

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دین کا معاملہ جبر اور سختی پر نہیں رکھا بلکہ تمکن و اختیار پر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب توحید کے دلائل ایسے شافی اور قاطع طریقہ سے بیان کر دیے کہ عذر کی گنجائش نہ رہی تو اس نے فرمایا کہ ان دلائل کی توضیح کے بعد کسی کافر کے لیے کفر پر قائم رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی اور اب بھی اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قابل کرنے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اسے بزور اس پر مجبور کیا جائے۔ مگر یہ اس دنیا میں کہ

ابتلاء و آزمائش کا گھر ہے، جائز نہیں ہے۔ کیونکہ قہر و اکراہ سے دین پر مجبور کرنا ابتلاء و امتحان کے مقصد کو باطل کر دیتا ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر پر قائم رہے) اور ایک دوسری سورہ میں فرمایا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (اگر تیرا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ مومن بن جائیں؟) اور سورہ شعراء میں فرمایا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دیدیگا کہ وہ ایمان نہیں لائے۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک ایسی نشانی اتار دیں کہ اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں (مگر ہم ایسا نہیں کرتے)"

یہ ابو مسلم اصفہانی وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق امام رازی نے لکھا ہے کہ وابو مسلم حسن الکلام فی التفسیر کثیر الغوص علی الدقائق واللطائف یعنی تفسیر میں ان کا کلام خوب ہوتا ہے اور وہ تہ سے دقائق اور لطائف کے موتی نکال کر لاتے ہیں۔

خود امام رازی اس قول کی تائید میں لکھتے ہیں:۔

وما یؤکد هذا القول انه تعالیٰ قال بعد هذه الآیة قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یعنی ظهرت الدلائل ووضحت البینات ولم یبق بعدها الا طریق القسر والالجاء والاکراه وذلک غیر جائز لانه ینافی التکلیف	اس قول کو یہ بات اور بھی زیادہ مضبوط کر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد فرمایا کہ "ہدایت، گمراہی سے ممتاز کر کے دکھائی جا چکی ہے" یعنی دلیلیں ظاہر کر دی گئیں، حجتیں کھول کھول کر بیان کر دی گئیں اور اب صرف جبر و زور اور اکراہ کا طریقہ باقی رہ گیا ہے سو وہ جائز نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تکلیف کے منافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس آیت کے مفہوم میں بہت کچھ کلام بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً بعض لوگ اس کو منسوخ کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کا حکم صرف اہل کتاب کے لئے ہے۔ بعض

کہتے ہیں کہ وہ صرف انصار کے حق میں ہے اور بعض نے اس سے گذر کر کلام الٰہی کے ساتھ یہ مذاق بھی کیا ہے کہ دین میں کوئی زبردستی ہی نہیں ہے۔ یعنی تلوار کے نیچے جو بھی کسی نے اسلام قبول کیا ہو تو یہ نہ کہو کہ اس نے باکراہ قبول کیا۔ لیکن یہ اقوال صرف کتابوں تک محدود ہیں عمل کی دنیا میں انہوں نے ۱۳ سو برس کی طویل مدت کے اندر کبھی قدم نہیں رکھا۔ الا ایک دو شاذ واقعات کے جن سے کوئی اصول نہیں بنتا۔ اگر حقیقت میں اسلام کی تعلیم یہی ہوتی کہ قبول اسلام پر لوگوں کو بزور شمشیر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تو گذشتہ ۱۳ صدیوں میں کم از کم ایک ہی مرتبہ ملت اسلامیہ اس تعلیم کے مطابق لوگوں کو جبراً مسلمان بناتی۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں بھی جبکہ اسلام اپنی اصلی شان میں جلوہ گر تھا اور خود سرکار رسالت مآب کے مقدس عہد حکومت میں بھی۔ جو قرآن اور اس کی تعلیم کی عملی تفسیر تھا۔ کبھی ایسا عمل نہیں کیا گیا۔ آنحضرت صلعم کو بارہا کفار پر قدرت حاصل ہوئی۔ اور ان کی بڑی بڑی جماعتیں۔ آپ کے قبضہ میں آئیں۔ لیکن آپ نے ان کی گردنوں میں اسلام کا پھندا کبھی نہیں ڈالا۔ بلکہ اپنی پاک تعلیم سے صرف ان کے دلوں کی گندگی ہی دور کرنے پر قناعت کی۔ دعوت اسلام کے جو سرایا آپ بھیجتے تو ان کو تاکید کرتے کہ لوگوں پر سختی نہ کرنا۔ ابو موسیٰ اشعری۔ اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو یمن بھیجا تو فرمایا یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا (نرمی کرنا سختی نہ کرنا خوش کرنا نفرت نہ دلانا) مکہ معظمہ میں جب فاتحانہ داخلہ ہوا تو آپ نے ان کافروں کو جو آپ کے خون کے پیاسے تھے لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ کہکر آزاد چھوڑ دیا۔ اور کسی کو قبول اسلام پر مجبور نہ کیا (ان طلقاء میں سے دو ہزار آدمی آپ کے ساتھ غزوۂ حنین میں بھی شریک تھے) نواح مکہ میں جو جماعتیں دعوت اسلام کے لئے بھیجیں انہیں آپ نے قتال سے منع فرما دیا۔ چنانچہ علامہ ابن جریر لکھتے ہیں کہ بعث النبی صلعم فیما حول المکۃ السرایا تدعوھم الی اللہ عزوجل ولم یامرھم بالقتال قبیلہ بنی جذیمہ میں حضرت خالدؓ نے جب رسول اللہ صلعم کی اجازت کے بغیر کشت وخون کیا تو آپ نے علانیہ اظہار برأت کیا اور اس قبیلہ کے مقتولوں کی دیت دی یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ ورنہ رسول اکرمؐ کی ساری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ آپ

کسی شخص کو قتل کی دھمکی دیکر قبول اسلام پر مجبور کیا ہو، اور یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے وہی معنی ہیں جو ظاہر الفاظ سے بصراحت معلوم ہوتے ہیں ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس پر عمل کرکے آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ایک مثال قائم نہ کردی ہو۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک شخص سے فرمایا۔ اسلم اسلام قبول کرے۔ اس نے عرض کی کہ انی اجدنی کارھا میں اپنے اندر کچھ کراہت محسوس کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا وان کنت کارھا قال اللہ سیرزقک حسن النیۃ والاخلاص "اس کراہت کے باوجود تو قبول کرلے پھر اللہ تجھے حسن نیت اور اخلاص بھی بخشدیگا"۔ تعجب ہے کہ اس حدیث کو اکراہ کے ثبوت میں کیونکر پیش کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ اس میں مکرھا کا لفظ نہیں بلکہ کارھا کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اس سے وہ کراہت نفس مراد لی گئی ہے جو عدم اخلاص کی ہم معنی ہے۔ اس سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے اس شخص کو باکراہ اسلام کا حلقہ بگوش بنایا؟

قائلین نسخ کے پاس اپنے دعوے کے لئے اس کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے کہ وہ اس آیت کو احکام قتال کی آیات سے تطبیق نہیں دے سکتے ورنہ کوئی صحیح روایت اس کے نسخ کی تائید نہیں کرتی۔ قطع نظر اس بحث کے کہ کسی آیت قرآنی کے نسخ کا دعوی کرنے کے لئے کن دلائل کی ضرورت ہے۔ ہم صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت کا نسخ عہد رسالت کے بعد کی ایجاد ہے۔ عہد رسالت کے اکابر صحابہؓ اس سے واقف نہ تھے۔ ورنہ اگر اس زمانہ میں بھی لوگوں کو اس کا علم ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے احکام شریعت کو نکتہ دان اپنے مملوک اسبق کو قبول اسلام سے انکار کرنے کی آزادی ہرگز نہ دیتے۔

ابن ابی حاتم کی یہ روایت دعوائے نسخ کے حق میں فیصلہ کن ہے:-

عن اسبق قال کنت فی دینھم مملوکا لنصرانیا لعمر	اسبق نے بیان کیا۔ میں حضرت عمر ابن خطاب کا نصرانی غلام تھا آپ مجھے اسلام کی دعوت دیتے

ابن الخطاب فكان يعرض على الاسلام فأبى فيقول لا اكراه في الدين ويقول يا اسبق لو اسلمت لاستعنا بك على بعض امور المسلمين

تھے مگر میں انکار کر دیتا تھا اس پر آپ فرماتے کہ لا اکراہ فی الدین پھر آپ کہتے کہ اے اسبق اگر تو اسلام قبول کر لیتا تو ہم تجھ سے مسلمانوں کے بعض معاملات میں مدد لیتے۔

امام ابن جریر طبری کا قول اس معاملہ میں امام رازی اور ابن کثیر وغیرہ سے ذرا مختلف ہے، مگر وہ تمام آثار و اقوال سلف کو نقل کرنے کے بعد نسخ کے بارے میں یہ فیصلہ دیتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لا اکراہ فی الدین کے معنی یہ ہیں کہ جس سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے وہ اگر جزیہ ادا کرے اور حکومت اسلام کی اطاعت پر راضی ہو جائے تو اس کے لئے دین میں جبر و اکراہ نہیں ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ آیت جازت جنگ سے منسوخ الحکم ہو گئی ہے۔ اس کا قول بے معنی ہے۔ اگر کہنے والا یہ کہے کہ پھر ابن عباسؓ نے جو یہ روایت کی ہے کہ "یہ آیت ان انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو اسلام پر مجبور کرنا چاہا تھا" اس کے متعلق تم کیا کہو گے؟ تو ہم کہیں گے کہ اس روایت کی صحت سے کسی کو انکار نہیں۔ یقیناً یہ آیت ایک خاص معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ مگر اس کا حکم ان تمام صورتوں میں عام ہے جن کی نوعیت اس کی شان نزول سے مشابہ ہے۔ ابن عباسؓ وغیرہ کی روایت کے مطابق جن لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، انہوں نے اسلام کا حکم جاری ہونے سے پہلے اہل توراۃ کا دین اختیار کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین اسلام پر مجبور کرنے سے منع فرمایا۔ مگر ممانعت ایسے الفاظ میں فرمائی جن کا حکم ان تمام ادیان پر حاوی ہے جن کے پیروؤں سے جزیہ قبول کیا جا سکتا ہے۔

جو لوگ اس حکم کو اہل کتاب کے لئے مخصوص کرتے ہیں ان کے پاس بھی اپنی دعوی کے لئے کتاب و سنت کی تصریحات میں سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ لا اکراہ کا حکم بالکل عام ہے۔ محض شان نزول کی خصوصیت اس کو خاص نہیں کرتی ورنہ قرآن مجید کا کوئی حکم بھی ایسا نہ ملے گا جس کی کوئی خاص شان نزول نہ ہو اور پھر ہر حکم کو اسی طرح خاص کرنا پڑیگا۔ رہا یہ خیال کہ حکم جزیہ کی آیت نے اسے خاص کیا ہے سو اس کے متعلق یہ امر قابل لحاظ ہے کہ خود آیۃ

جزیہ کے حکم کو بھی اوتوا الکتب کی تخصیص کے باوجود آئمہ مجتہدین نے تمام کفار و مشرکین کے لئے عام قرار دیا ہے۔ اگرچہ جمہور احناف اس عام حکم سے مشرکین عرب کو (جنکا وجود آیت جزیہ کے اترنے سے پہلے ہی ناپید ہو چکا تھا) مستثنیٰ کرتے ہیں، لیکن امام مالکؒ ابو یوسفؒ۔ اور امام اوزاعی وغیرہ نے عرب کے صنم پرستوں تک کو اس دائرۂ رحمت میں شامل کر دیا ہے اور اسی خیال کی بنا پر صدر اولیٰ سے لیکر ابتک مسلمانوں کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ انہوں نے کفار کی تمام اقسام سے جزیہ قبول کر کے انہیں خدا اور رسولؐ کے ذمہ میں داخل کر لیا ہے۔

پھر جب خود آیت جزیہ کا حکم الفاظ کی تخصیص کے باوجود عام قرار دیا گیا ہے تو یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دوسری آیت کو جس میں الفاظ کی تعمیم بھی موجود ہے۔ بغیر کسی شرعی دلیل کے خاص کر دے۔ تمام اقسام کفرہ سے جزیہ قبول کرنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ کسی شخص پر خواہ وہ اہل کتاب سے ہو یا نہ ہو قبول اسلام کے لئے جبر و اکراہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اعطائے جزیہ کے بعد عدم اکراہ فی الدین تو شرعاً ثابت ہے۔

دعوت و تبلیغ کا اصل الاصول

حقیقت یہ ہے کہ آیت قتال یا آیت جزیہ کا مضمون لا اکراہ فی الدین کی مذہبی آزادی کے معارض نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ وہ صرف اس آزادی کو جو ابتداءً بلا شرط عطا کی گئی تھی۔ ایک ضابطہ اور ایک اصول کے ماتحت لے آتا ہے۔ اول اول جبکہ مسلمان ضعیف تھے اور ان میں وہ خدمت انجام دینے کی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی جو امۃ وسطا اور خیر امۃ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالےٰ ان سے لینا چاہتا تھا تو مسلمان صرف لکم دینکم ولی دین ہی نہیں کہتے تھے۔ بلکہ لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ بھی کہتے تھے ان میں اتنی قوت نہ تھی کہ دنیا کو مفاسد اخلاقی سے بجبر پاک کر دیں اور فتنہ و فساد کا نام و نشان مٹا دیں۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں ایک ہی طریقہ پر ہوتے رہے، یعنی جس طرح رسول کریم اور آپ کے پیرو لوگوں کو توحید کے اقرار، رسالت کے اقرار۔ یوم آخر کے اعتقاد۔ اور نماز کی اقامت کی دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح زنا۔ چوری۔ قتل اولاد۔ قول زور۔ قطع طریق اور صد عن سبیل اللہ وغیرہ سے بھی صرف نفرت دلانے اور زبان سے روکنے

ہی پر اکتفا کرتے تھے لیکن جب مسلمان کمزوری و بے بسی کی حالت سے نکل گئے اور ان میں اپنے مشن کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت آگئی تو وہ مذہبی آزادی کا اصول تو اپنی جگہ بدستور قائم رہا کہ کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جائیگا۔ لیکن یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ لوگوں کو ہر شرارت، فتنہ و فساد اور اعمال منکرہ کے ارتکاب کی آزادی ہرگز نہ دی جائے گی۔ اب اسوقت امر بالمعروف کا دائرہ نہی عن المنکر سے الگ ہوگیا۔ نہی عن منکر میں تو دعوت و تبلیغ کے ساتھ تلوار بھی شامل ہوگئی اور اس نے تمام دنیا کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ خواہ دنیا اس پر راضی ہو یا نہ ہو لیکن امر بالمعروف کے دائرہ میں وہی لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ اور مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ کا اصول برقرار رہا۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں وہ دنیا کو لئے اللہ کا قانون ہے۔ اور دوسری حیثیت میں وہ نیکی و تقویٰ کی جانب ایک دعوت اور پکار ہے۔ پہلی حیثیت کا منشا دنیا میں امن قائم کرنا اس کو ظلم و سرکشی اور فتنوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے روکنا اور دنیا والوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانا ہے جس کے لئے قوت و طاقت کے استعمال کی ضرورت مسلّم ہے لیکن دوسری حیثیت میں وہ قلوب کا تزکیہ کرنے والا، ارواح کو پاک و صاف کرنے والا، حیوانی کثافتوں کو دور کر کے ہی آدمی کو اعلیٰ انسان بنانے والا ہے۔ جس کے لئے تلوار کی دھار نہیں بلکہ ہدایت کا نور درکار ہے۔ دست و پا کا القیاد نہیں۔ بلکہ دلوں کا جھکاؤ۔ اور جسموں کی پابندی نہیں بلکہ روحوں کی سپردگی درکار ہے۔ اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہدے۔ مگر اس کا دل بدستور ماسوی اللہ کا بتکدہ بنا رہے تو یہ تصدیق بالقلب کے بغیر اقرار باللسان اس کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہے۔ اور اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے۔ ایک دین تو خیر بڑی چیز ہے۔ دنیا کی معمولی تحریکیں بھی جن کا منشا محض دنیوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے اپنی کامیابی کے لئے ایسے پیروؤں پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکتیں جو صرف زبان سے انکے ساتھ ہمدردی کرتے ہوں۔ مگر دل سے ان کے مؤید نہ ہوں۔ ہیں۔ غیر مخلص اور جھوٹے پیروؤں کو لیکر آج تک کسی تحریک نے کامیابی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ اور یقیناً ایسے گروہ

پوست کے لوتھڑوں کو لیکر جو صداقت کی روح سے بالکل خالی ہوں کوئی شخص دنیا کے میدان مسابقت میں قدم رکھنے کی جرأت اور فوز و فلاح تک پہنچنے کی اُمید نہیں کر سکتا۔ پھر بھلا غور کرو کہ جس دین کے پیش نظر دنیا کی کامیابی نہیں بلکہ آخرت کی فوز و فلاح ہو۔ جو دین نیت اور اعتقاد کو عمل کی بنیاد قرار دیتا ہو۔ جو دین خلوص و صداقت کی روح کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہ سمجھتا ہو۔ جو دین تمام عالم بشری کی اصلاح کی عظیم الشان تحریک لیکر اٹھا ہو۔ اور جس کی تحریک نے دنیا میں وہ کامیابی حاصل کی ہو جو آج تک کسی تحریک کو حاصل نہیں ہوئی۔ کیا ممکن تھا کہ وہ اپنی دعوت کا کام تلوار کی گونگی زبان کے سپرد کرتا؟ کیا یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خلوص و صداقت کو چھوڑ کر مجبورانہ اطاعت اور بیچارگی کے اقرار پر قناعت کرتا؟ کیا وہ ایسے پیرو حاصل کر کے مطمئن ہو سکتا تھا جن کے دل خدا کے خوف سے خالی مگر تلوار کی ہیبت سے معمور ہوں؟ کیا ایسے بزدل اور بودے آدمیوں کو وہ کوئی وزن دے سکتا تھا جو محض جان بچانے کے لئے کسی عقیدے کو جس کی صداقت کے وہ قائل نہوں قبول کر لیں؟ اور اگر وہ ایسا ہوتا تو کیا اسے وہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ جو اس نے فی الحقیقت حاصل کی؟

انسان کی فطرت کو خود اس کے فاطر سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ اس نے اپنے حکیمانہ کلام میں جگہ جگہ اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اپنے رسولؐ کو طریقہ طریقہ سے بتلایا ہے کہ اقلیم دل کو فتح کرنے کا صحیح اور موثر طریقہ کونسا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۴۱:۵)	اے پیغمبر! نیکی اور بدی برابر نہیں ہیں تو بدی کو اس طریقہ سے دور کر جو بہت اچھا ہے پھر دیکھ کہ جس کے ساتھ تیری دشمنی ہے وہ تیرا گرم جوش دوست بن جائے گا۔

دوسری جگہ فرمایا:-

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ	یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تو ان کے لئے نرم دل بنا یا

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۔ (۳: ۱۷۴)	گیا ہے۔ ورنہ اگر تو درشت کلام اور سنگدل ہوتا تو وہ تجھے چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔

ایک اور جگہ دعوتِ اسلام کا یہ طریقہ بتلایا کہ :۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۱۶: ۱۲۵)	انہیں اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ وعظ و پند کے ساتھ بلا۔ اور اگر جدال و مناظرہ کی ضرورت ہو تو حسن کلام کے ساتھ مجادلہ کر۔

اس نرمی و رفق اور حسن کلام کی یہاں تک تاکید کی کہ کفار کے معبودوں اور پیشواؤں کو بُرا کہنے سے بھی روک دیا۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶: ۱۳)	تم ان کے معبودان باطل کو جنہیں یہ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں گالیاں نہ دو ورنہ وہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دیں گے۔

ہدایت و ضلالت کا راز

پھر مختلف مواقع پر یہ باریک نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر خدا چاہے تو وہ اپنے بندوں کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اسے ایسا مجبورانہ ایمان درکار نہیں ہے جو تبعی خواہشات و جذبات کی طرح انسان کی جبلت میں داخل ہو۔ ایسی ایمان لانے والی اور اطاعت و عبادت کرنے والی مخلوق تو اس کے پاس پہلے سے موجود تھی جس کی فطرت ہی یہ ہے کہ یفعلون ما یؤمرون مگر وہ معبودیت کا اصلی لطف اٹھانے کے لئے ایسی مخلوق چاہتا تھا جسے کوئی قوت اللہ کی معرفت اس کی اطاعت و بندگی اور اس پر ایمان لانے پر مجبور کرنے والی نہ ہو۔ بلکہ وہ خود اپنی عقل سے خدا کو پہچانے خود اپنی جستجو سے اس کو پائے خود اپنی آزاد خواہش سے اس کی بندگی و عبادت کرے۔ اور اس کے احکام کی (نہ کہ مشیت کی) خلاف ورزی کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ اسی لطف کے لئے اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ ایک اجل مسمّی ایک مدت مقررہ تک تو عقل کی روشنی میں آزاد چھوڑ دیا اس کو اختیار دیا کہ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

ہے ایمان لائے۔ اور جو چاہے کفر کرے) اس کی حرف بہ حرف درست ہادی دہنمائی
اس کے ہم جنس اسے حق کا راستہ گمراہی کے راستہ سے ممتاز کر کے دکھا دین اور اس
اسطے اس عذر کی گنجائش باقی نہ رہے کہ ہم بالکل تاریکی میں تھے اور پھر اس کے
لئے ایک یوم حساب مقرر کیا۔ تاکہ اس دن ان لوگوں پر بے اندازہ الطاف وعنایات
بخشش کرے جنہوں نے اپنی عقل سے اس کو پہچانا۔ اور اپنی مرضی سے اس کی بتلائی
ہوئی سیدھی راہ کو اختیار کیا۔ اور کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر اپنی بندگی کا
عذر سمجھ کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کی۔ اور اسی طرح ان لوگوں کو دردناک عذاب
دے جنہوں نے کھلی ہوئی نشانیوں کے باوجود اسے نہ پہچانا۔ گمراہی و ہدایت کے ممتاز
ہونے کے باوجود گمراہی کو اختیار کیا۔ اس کے بھیجے ہوئے پیغام کو قبول کرنے سے
انکار کیا اور اپنی فریضہ عبودیت سے منہ موڑ کر اس کے احکام کی نافرمانی کی۔

دیکھو اس راز حقیقت کو کیسے حکیمانہ انداز سے کھولا ہے۔

ولو شاء ربك لجعل الناس أمة واحدة ولا يزالون مختلفين إلا من رحم ربك ولذلك خلقهم وتمت كلمة ربك لأملأن جهنم من الجنة والناس أجمعين (۱۱:۱۱۸)	اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ اختلاف کرتے ہی رہیں گے سوائے ان لوگوں کے جنپر اللہ نے رحم کیا ہے اور اسی کے لئے اس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس طرح تیرے رب کی وہ بات پوری ہو گی جو اس نے کہی تھی کہ میں دوزخ کو جنوں اور انسانوں سے بھر دونگا۔

دوسرے مقامات پر بھی اس راز کی پردہ دری مختلف طریقوں سے کی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ

ولو شاء ربك لآمن من في الأرض كلهم جميعا (۱۰:۹۹)	اگر خدا چاہتا تو زمین کے جتنے رہنے والے ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔

کہیں فرمایا کہ

ولو شاء الله ما أشركوا (۶:۱۰۷)	اگر خدا چاہتا تو وہ ہرگز شرک نہ کرتے۔

کہیں فرمایا:-

إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ (۲۶: ۴)

اگر ہم چاہتے تو ان پر آسمان سے ایسی نشانی اتار دیتے جسے دیکھ کر ان کی گردنیں مجبوراً جھک جاتیں۔

کہیں فرمایا:-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (۱۰: ۱۰۰)

کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور اللہ اذن کی بندش کی یہی ہے کہ وہ ان لوگوں پر گندگی ڈالتا ہے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے۔

کہیں فرمایا:-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۲۸: ۵۶)

تو جسے چاہے ہدایت نہیں کر سکتا بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس میں ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہے

پس جبکہ رب قدیر و خالق کائنات خود نہیں چاہتا کہ اپنے بندوں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری پر مجبور کرے بلکہ وہ ان کی آزادانہ بندگی و غلامی کو زیادہ محبوب رکھتا ہے۔ تو پھر کسی بندے کو یہ حق کب پہونچتا ہے کہ اپنے جیسے بندوں پر اس کی بندگی و طاعت کے لئے جبر کرے۔ مجبورانہ ایمان کا ہے مول اور رب قیمت تحفہ اس کے حضور پیش کرنے ہی کی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی سید علیہ السلام کو بار بار یہ سمجھایا ہے کہ دین میں جبر و کراہ کا کام نہیں ہے۔ اور آپ کے لئے صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے:-

وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ (۵۰: ۴۵)

تو ان کو قبول ہدایت پر مجبور کرنے والا نہیں ہے جو کوئی اللہ کی وعید سے ڈرنے والا ہو اس کو قرآن سے نصیحت کئے جاؤ۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۸۸: ۲۱-۲۲)

تو نصیحت کئے جا کیونکہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ

کیا تو لوگوں کو مجبور کریگا کہ وہ مومن ہو جائیں۔ حالانکہ

مومنین (۱۰۱۰)

تیرا کام مجبور کرنا نہیں ہے)

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (۲۷۲)

ان کی ہدایت تیرے ذمہ نہیں ہے، بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے،

إِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ ۴۰)

تیرے اوپر پیغام پہونچانے کی ذمہ داری ہے اور حساب لینے والے ہم خود ہیں،

اشاعتِ اسلام میں تلوار کا حصہ، اس بحث سے یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اسلام اپنی صداقت پر ایمان لانے کے لئے کسی کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ دلائل و براہین کی روشنی میں ہدایت کی راہ کو ضلالت کی راہ سے ممتاز کرکے دکھا دینے کے بعد ہر شخص کو اختیار دیتا ہے کہ چاہے غلط راستہ پر چل کر ناامیدی کے گڑھے میں جا گرے، اور چاہے سیدھے راستہ پر لگ کر حقیقی اور دائمی فلاح و کامرانی سے بہرہ اندوز ہو، لیکن اس سلسلۂ کلام کو ختم کرنے سے پہلے ہم یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت کو تلوار سے ایک گونہ تعلق ضرور ہے، اس میں شک نہیں کہ جہاں تک تبلیغِ دینِ الٰہی کی حد ہے، اس میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے، لیکن اس تبلیغ کے ساتھ کچھ چیزیں اور بھی ہیں جن کے تعاون سے دنیا میں اسلام کی اشاعت ہوتی ہے، اور وہ یقیناً تلوار کی اعانت سے بے نیاز نہیں ہیں،

عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان بے قیدی کی زندگی بسر کرتا ہے، اور اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی اخلاقی قانون کا پابند نہیں ہوتا، تو اسے اپنی اس پر الم مگر بظاہر پر لطف زندگی میں ایک مزا آنے لگتا ہے، اور اس مزے کو چھوڑنے کے لئے وہ برضا و رغبت آمادہ نہیں کیا جا سکتا، وعظ و نصیحت اور دلیل و برہان کی قوت سے اس کو اخلاقی حدود کی پابندی، حلال و حرام کی تمیز، اور نیک و بد کے امتیاز کی خواہ کتنی ہی تلقین کیجائے، لیکن اول تو اس کی عقل و وجدان پر مسلسل بدکاریاں کرتے رہنے کے باعث ایسا پردہ پڑ جاتا ہے کہ اس قسم کی اخلاقی تعلیم کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور اگر اس کے ضمیر میں کچھ زندگی باقی بھی ہوتی ہے تو وہ اس کے نفس پر اتنی حاوی نہیں ہوتی کہ اس کے اثر سے وہ حق کو محض اس بنا پر کہ وہ حق ہے، بطوع و رغبت قبول کرلے، اور ان لذتوں سے دست بردار ہو جائے، جو بے قیدی کی زندگی میں اسے حاصل ہوتی ہیں، بخلاف اس کے جب کسی اخلاقی تعلیم کی پشت پر وعظ و تذکیر کیساتھ سیاست و تعزیر بھی ہوتی ہے اور بد کو بد کرکے دکھا دینے کے ساتھ، بدی کو روک دینے والی

قوت سے بڑی کام لیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ طبیعت میں نیک بننے کی صلاحیت پیدا ہونے لگتی ہے اعتدال کی
پابندی اور برے بھلے کی تمیز آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہے اور آخرکار وہی انسان اس نیکی کی تعلیم کو دل میں
جگہ دینے لگتا ہے جو بے قیدی کی زندگی میں اس کو سننے کا بھی روادار نہ تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی سوسائٹی کا تصور کیجئے جسمیں کوئی قانون، ضابطہ نہیں ہے، اسکا
ہر فرد اخلاقی حدود کی پابندی سے مبرا ہے جس پر جس چاہتا ہے، سے لوٹ لیتا ہے جس سے عداوت ہوتی
ہے اسے مار ڈالتا ہے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے چھین کر حاصل کر لیتا ہے جو خواہش
دل میں پیدا ہوتی ہے اسے جس طریقہ سے چاہتا ہے پورا کر لیتا ہے عفت و حرمت کسی سے تعرض نہیں
ہوتی جائز و ناجائز کے فرق سے وہ ناواقف ہوتا ہے حقوق و فرائض کے تخیل سے اس کا دماغ خالی
ہوتا ہے اس کے سامنے بس اپنی خواہشات ہوتی ہیں اور انھیں پورا کرنے کے لئے اسکی قوتیں جو
ہیں ایسی حالت میں اگر کوئی اخلاقی مصلح کھڑا ہو اور لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز سکھائے اور ان کی
کی حد بندی کرے، مقاصد میں حسن و قبح اور طریقوں میں نیک و بد کا فرق قائم کرے، چوری سے حرام خوری
سے خون ناحق سے زنا اور سرقت سے ردے افراد کے لئے حقوق و فرائض متعین کرے اور ایک
مکمل ضابطہ قوانین اخلاق مرتب کر کے رکھدے، مگر اس قانون کی تنفیذ کے لئے اس کے پاس وعظ و
پند اور دلیل و حجت کے سوا کوئی قوت نہ ہو تو کیا یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ جماعت اپنی آزادی پر ان
قیود کی بخوشی قبول کرے گی کیا وہ اس کے مکث اور اس سے مغلوب ہو کر اپنے [illegible]
پابند بن جائیگی؟ کیا وہ اس کی پر درد نصیحتوں سے متاثر ہو کر خود بخود [illegible]
ہو جائے گی جو اس کو اس بے قیدی کی زندگی میں حاصل تھیں، ہر شخص جو [illegible]
اس سوال کا جواب صاف نفی میں دیگا کیونکہ دنیا میں ایسے پاک نفسوں کی تعداد [illegible]
کو محض نیکی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور بدی کو صرف اسلئے چھوڑ دیتے ہیں کہ اس کی برائی
ہو چکا ہے

[illegible] اس صورت میں کیا جائے جب کہ وہ اخلاقی وعظ اور تعلیم ہی نہیں عام
درجہ کے [illegible] جو ملک میں ایک ضابطہ حکومت قائم کر دے جس کی قوت سے وہ تمام برائیاں
یکلخت دور ہو جائیں جو حیوانی آزادی سے پیدا ہوتی ہیں، تو یقیناً یہ فعل ثبات سے بدل جائیگی اور

یہ شخص اس تعلیم کی کامیابی کا فتویٰ لگا دیگا۔

اسلام کی اشاعت کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ مگر اسلام صرف چند عقائد کا مجموعہ ہوتا، اور اللہ کو ایک کہنے، رسالت کو برحق ماننے، یوم آخر اور ملائکہ پر ایمان لانے کے سوا انسان سے وہ کوئی اور مطالبہ نہ کرتا تو شاید مشیت الٰہی کی طاقتوں سے اس کو کچھ زیادہ جھگڑنے کی نوبت نہ آتی لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ صرف ایک عقیدہ ہی نہیں بلکہ یک قانون بھی ہے، اور ایسا قانون ہے جو انسان کی عملی زندگی کو اوامر و نواہی کی بندشوں میں جکڑ دینا چاہتا ہے، اس لئے اس کا کام صرف پند و موعظت سے نہیں چل سکتا اور اسے نوک زبان کے ساتھ نوک سناں سے بھی کام لینا پڑتا ہے، اس کے عقائد سے سرکش انسان کو اتنا بعد نہیں ہے جتنا اس کے قوانین کی پابندی سے انکار ہے، وہ چوری کرنا چاہتا ہے اور اسلام اسے ہاتھ کاٹنے کی دھمکی دیتا ہے، وہ زنا کرنا چاہتا ہے، اور اسلام اسے کوڑوں کی مار کا حکم سناتا ہے، وہ سود کھانا چاہتا ہے، اور اسلام اس کو فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کا چیلنج دیتا ہے، وہ حرام و حلال کی قیود سے نکل کر نفس کے مطالبات پورے کرنا چاہتا ہے، اور اسلام ان قیود سے باہر نفس کے کسی حکم کی پیروی نہیں کرنے دیتا، اس لئے نفس پرست انسان کی طبیعت اس سے متنفر ہوتی ہے، اور اس کے آئینۂ قلب پر گناہ گاری کا ایسا زنگ چڑھ جاتا ہے کہ اس میں صداقت اسلام کے نور کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی، یہی وجہ ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، وعظ و تلقین کا جو موثر سے موثر انداز ہو سکتا تھا اسے اختیار کیا، مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زور خطابت سے دلوں کو گرمایا، اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھائے، اپنے اخلاق اور اپنی پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا، اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا، لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، حق ان کے سامنے خوب ظاہر ہو چکا تھا، انھوں نے بچشم خود دیکھ لیا تھا کہ جس راہ کی طرف ان کا داعی انھیں بلا رہا تھا، وہ سیدھی راہ ہے، مگر اس کے باوجود صرف یہ چیز انھیں اس راہ کو اختیار کرنے سے روک رہی تھی کہ ان لذتوں کو چھوڑنا انھیں ناگوار تھا جو کافرانہ بے قیدی کی زندگی میں انھیں حاصل تھیں، لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی، اور

آلا کل مشرکوں دوم دوسرے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ان کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا جائے۔ غرضیکہ اقتدار کے تمام ہتھوں کو توڑ دیا۔ ملک میں ایک منظم اور منضبط حکومت قائم کر دی۔ اخلاقی قوانین کو بجبر نافذ کر کے اس بدکاری و گناہگاری کی آزادی کو سلب کر دیا جس کی بدولت لوگ مدہوش سے ہوئے تھے۔ اور وہ پر امن فضا پیدا کر دی جو اخلاقی فضائل اور انسانی محاسن کے نشو و نما کے لئے ہمیشہ ضروری ہوا کرتی ہے۔ دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ جبلتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا۔ بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی۔ تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔ اس فضا کو صاف کر دیا جس کے اندر کوئی اخلاقی تعلیم پنپ نہیں سکتی۔ ان حکومتوں کے تختے الٹ دیئے جو حق کی دشمن اور باطل کی پشت پناہ تھیں۔ ان بدکاریوں کا استیصال کر دیا جو دلوں کو نیکی و پرہیزگاری سے دور رکھتی ہیں۔ ان عادات و اخلاقی قوانین کو نافذ کیا جو آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے نکال کر انسان بنا دیتے ہیں۔ اور پھر اسلام کو بھی پیکر میں پیش کر کے دنیا پر ثابت کر دیا کہ انسان کی اخلاقی و مادی اور روحانی ترقی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور دستور عمل نہیں ہو سکتا۔

پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کی زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے جس عرح ہر منقلب کے قیام میں ہوتا ہے تبلیغ کا کام تخم ریزی ہے۔ اور تلوار کا کام قلبہ رانی ہے جب تلوار زمین کو نرم کرتی ہے تاکہ اس میں بیج کو پرورش کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔ پھر تبلیغ بیج کو اس زمین میں

کرتی ہے تاکہ وہ پھل حاصل ہو جو اس باغبانی کا مقصود حقیقی ہے، ہمکو دنیا کی پوری تاریخ میں کسی ایسی تہذیب کا نشان نہیں ملتا جس کے قیام میں ان دونوں عناصر کا حصہ نہ ہو، تہذیب کی کسی خاص شکل کا کیا ذکر ہے، خود تہذیب کا قیام ہی اس وقت تک ناممکن ہے، جب تک قلبہ رانی اور تخم پاشی کے یہ دونوں عمل اپنا اپنا حصہ ادا نہ کریں، ہر شخص جو انسانی فطرت کا رمز شناس ہے، اس حقیقت سے ناآشنا نہیں ہے، کہ جماعتوں کی ذہنی و اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب کہ قلب و روح کو خطاب کرنے سے پہلے جسم و جان کو خطاب کرنا پڑتا ہے،

جنگ کے ضوابط و قواعد

گذشتہ باب میں جو کچھ بیان کیا گیا اس کا تعلق جنگ کے محض اخلاقی پہلو سے تھا اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ جنگ کے عملی پہلو میں اسلام نے کس قدر عظیم الشان اصلاح کی ہے۔

ہر کام کے حسن و قبح کا فیصلہ دو چیزوں پر کیا جاتا ہے ایک مقصد دوسرے طریق حصول مقصد اگر نفس مقصد ہی برا ہو تو خواہ اس کو کتنے ہی شریفانہ طریقہ سے حاصل کیا جائے وہ بہرحال مکروہ ہی رہیگا اور اگر مقصد فی نفسہ نہایت شریف و اعلیٰ ہو لیکن اسے حاصل کرنے کے طریقے پر یہ شرافت سے گرے ہوئے ہوں تو ان سے خود مقصد کی شرافت بھی داغدار ہو جاتی ہے مثال کے طور پر ایک شخص کا مقصد تو یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوہ عورتوں کی پرورش ہو مگر اس نیک کام کے لئے وہ چوری اور رہزنی کے ذریعہ روپیہ حاصل کرتا ہے تو گو اس کا مقصد نہایت پاکیزہ ہے لیکن قانون و اخلاق کی نظر میں وہ اسی طرح مجرم ٹھہرایا جائیگا جس طرح ایک چور اور رہزن ٹھہرایا جاتا ہے بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص حقیقت میں قوم کو گمراہ کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن عوام پر اپنا علم و تقویٰ کے لئے مسجد میں بیٹھ کر علم دین کی تعلیم دیتا ہے، مواعظ و نصائح کے دریا بہاتا ہے، اور اپنا تمام وقت ذکر الٰہی میں صرف کر دیتا ہے تو گو اس کے یہ افعال نہایت مقدس ہیں مگر وہ مقصد جس کے لئے اس نے یہ روپ بھرا ہے اس کے حسن عمل کی پونجی کو نہ صرف برباد کر دیتا ہے بلکہ اس پر فریب دینداری سے اس کا جرم اور بھی زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔

یہی حال جنگ کا بھی ہے۔ اگر جنگ کا مقصد کمزور قوموں کی آزادی چھیننا، ملکوں کی دولت لوٹنا، اور بندگان خدا کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا ہو تو ایسی جنگ خواہ کتنے ہی ضبط و نظم کے ساتھ کیجائے خود اس میں غیر مقاتلین کی عصمت، بچوں کی حفاظت، عورت کی عزت، اور مرد کی عزت کا کتنا ہی لحاظ رکھا جائے خود اس میں لوٹ، آتش زنی، تباہ کاری، قتل عام، اور

رہیگی، اور اس غضب طور سے تقدم سے اس کی ذات میں کوئی فرق نہ آئیگا، زیادہ سے زیادہ اتنا ہوگا کہ وہ ایک بد تر ظلم نہ رہیگی، خوش تر ظلم ہو جائیگی، اسی طرح اگر جنگ کا مقصد نہایت شریف ہو، مثلاً وہ کسی جائز حق کی حفاظت یا دفع فساد و دفع شر کے لئے لڑی جائے، مگر اس کے طریقے ظالمانہ ہوں، اسمیں کسی قسم کے اخلاقی حدود ملحوظ نہ رکھے جائیں، اور لڑنے والوں کا مطمح نظر محض دشمن کو تباہ کرنا اور اس کو مبتلائے عذاب کرکے جذبۂ انتقام کی آگ بجھانا ہو، تو ایسی جنگ بھی حق کے راستہ سے ہٹی ہوئی ہوگی، اور اس کے لڑنے والے اصلاً برحق ہونے کے باوجود اپنے ان افعال سے اپنے آپ کو ظالموں کی صف میں پہونچا دیں گے۔

پس ایک جائز اور خالص حق پرستانہ جنگ کی تعریف یہ ہے کہ اس کا مقصد اور طریق حصول مقصد دونوں پاکیزہ اور اشرف و اعلیٰ ہوں، اسلام کی تعلیم جنگ کے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، وہ صرف اس کے مقصد کی پاکیزگی اور شرافت و بزرگی کو ثابت کرتا ہے، اب اثبات مدعا کے لئے دوسرا مرحلہ باقی ہے، سو اس باب میں ہم یہ تحقیق کریں گے کہ طریق حصول مقصد کے اعتبار سے اسلام کی جنگ کس حد تک تہذیب و شرافت کے اس معیار پر پوری اترتی ہے،

اسلام سے پہلے عرب کا طریق جنگ

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے طریق جنگ کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دیا جائے کہ اسلام جس زمانہ میں ظاہر ہوا ہے، اس وقت عام طور پر کس قسم کا طریق جنگ رائج تھا، تاکہ قارئین کرام ٹھیک ٹھیک معلوم کر سکیں کہ اسلام نے آکر اس میں کیا اصلاح کی؟ اور اس اصلاح کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کے لئے سب سے پہلے خود اس قوم پر نظر ڈالئے جسمیں ابتداءً اسلام ظاہر ہوا،

عرب میں جنگ کی حیثیت ایک قومی پیشہ کی سی تھی، ذرائع معاش کی قلت، ضروریات زندگی کی کمیابی، اور اجتماعی ضبط و نظام کے فقدان سے عربوں میں جنگجوئی کی عادت اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ وہ قتل و خوں ریزی اور لوٹ مار کو اپنی قومی خصوصیات بلکہ مفاخر میں

شمار کرنے لگے تھے، غالباً ابتدا میں صرف پیٹ بھرنے، پانی لینے یا چراگاہوں میں جانور چرانے یا انتقام لینے کے لئے اس کی ضرورت پیش آتی ہوگی، لیکن صدیوں تک شمشیر زنی و مردم کشی کے کھیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے ان کو خونخواری کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ خوں ریزی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ مقصود بالذات بن گئی تھی، اور اس کے ساتھ شقاوت سنگدلی انتقام جوئی کینہ پروری درندگی وحشت اور وہ تمام خصائص بھی ان کی سیرت میں نمایاں ہوگئے تھے جو اس قسم کی زندگی بسر کرنے سے قدرتی طور پر نشو و نما پاتے ہیں، قبیلوں اور خاندانوں میں پشتہا پشت تک عداوتیں منتقل ہوتی تھیں، دشمن قبیلہ کو ہر طرح تباہ و برباد کیا جاتا تھا، آتش انتقام کو بجھانے کے لئے دشمن کو عذب دینے اور بے حرمت کرنے کے نہایت وحشیانہ طریقے اختیار کئے جاتے تھے، اور محض اظہار فخر و شجاعت کے لئے بھی بسا اوقات نوع انسان کا خون بے دریغ بہایا جاتا تھا۔

جنگ کا تصور عرب جاہلیت میں اعرب قدیم کے حالات معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس صرف دو ذریعے ہیں، ایک وہ داستانیں جو بہ اعرب کے نام سے عرب میں رائج تھیں، دوسرے شعرائے عرب کا کلام جس میں وہ اپنی سوسائٹی کی معاشرت، تہذیب، معاملات و رسوم اور عواطف کی صحیح صحیح تصویریں کھینچتے تھے، عجم کی طرح ان کی شاعری نازک خیالیوں اور مبالغہ آفرینیوں کا مجموعہ نہ تھی، بلکہ وہ اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھتے تھے اسی کو اپنی زبان میں بے تکلف ادا کر دیتے تھے اس لئے ان کی شاعری نری شاعری ہی نہ تھی بلکہ قومی سیرت کی تصویر بھی تھی جنگ کے متعلق اہل عرب کا تصور کیا تھا؟ وہ اس کو کیا سمجھتے تھے؟ ان کے لڑنے کے طریقے کیا تھے؟ دشمن کیسے تھے؟ ان کا برتاؤ کیسا تھا؟ کون کون سے محرکات ان کو جنگ پر بھڑکاتے تھے؟ کن اغراض و مقاصد کے لئے وہ جنگ کیا کرتے تھے؟ یہ سب چیزیں ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہیں، اور وہ مصطلحات تشبیہات و استعارات جن کو وہ جنگ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے ان کے تصور جنگ کا نہایت ٹھیک نقشہ کھینچ دیتے ہیں، مثال کے طور پر ہم یہاں چند لغات و مصطلحات و استعارات و تشبیہات کو نقل کرتے ہیں۔

حرب، جنگ کے لئے ایک عام لفظ ہے لغت میں اس کے اصلی معنی خشمگیں ہونے کے ہیں،

تحریب، غصہ کرنے اور بھڑکانے اور نیزہ تیز کرنے کو کہتے ہیں،

حَرَاب، کسی کے مال کو لوٹ لینا،

حُرَیبہ، لوٹا ہوا مال جس پر آدمی زندگی بسر کرتا ہو،

محروب، اور حریب، وہ شخص جس کا مال لوٹ لیا گیا ہو،

احراب، دشمن کا مال لوٹنے کے لئے کسی کی رہنمائی کرنا،

سادع، لڑائی کے لئے عام طور پر بولا جاتا ہے، اسکے اصلی معنی فزع اور خوف کے ہیں، گویا جنگ کو ایک خوفناک چیز سے موسوم کیا گیا ہے، ودّاک بن ثمیل المازنی کہتا ہے:-

متادیمُ وصالون فی الروع خطوھم

وہ آگے بڑھنے والے اور لڑائی کے خطرہ میں قدم ملا کر چلنے والے ہیں،

وغیٰ، یہ بھی لڑائی کا ایک مشہور نام تھا، اس کے لغوی معنی شور و ہنگامہ کے ہیں، شاعر کہتا ہے:-

ما زال معروفاً لمُرّۃ فی الوغیٰ عَلُّ القنا وعلیھم انھا لھا

"ہمیشہ سے بنو مرہ کی یہ صفت مشہور ہے کہ وہ جنگ میں بار بار دشمنوں کے خون سے اپنے نیزوں کی پیاس بجھاتے ہیں، اور کم از کم ایک مرتبہ ان کی تشنگی فرو کرنا تو ان پر فرض ہے"

شر، اصلی معنی بدی کے ہیں، اور جنگ کے لئے مجازاً بکثرت بولا جاتا ہے، شاعر اپنے ممدوح قبیلہ کی اس طرح تعریف کرتا ہے:-

قومٌ اذا الشر ابدیٰ ناجذیہ لھم طاروا الیہ زرافاتٍ ووُحدانا

"وہ ایسی قوم ہے کہ جب لڑائی اپنی کچلیاں نکال کر اس کو ڈراتی ہے، تو وہ گروہ در گروہ اور تنہا تنہا اس کے مقابلہ کے لئے دوڑ پڑتے ہیں"

کریہۃ، یہ بھی اسماے جنگ میں سے ہے اور اس کے اصلی معنی سختی، مصیبت اور بلا کے ہیں، شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:-

صعب الکریھۃ لا یرام مُجانبُہ ماضی العزیمۃ کالحسام المقصل

"وہ جنگ کی مصیبت میں سخت ہے، اس کے احاطۂ مکان کا کوئی قصد نہیں کر سکتا

شمشیر براں کی طرح ارادہ کا پورا ہو"

ھیاج، برانگیختی و خشم گرفتگی کے معنی میں آتا ہے اور مجازاً جنگ کے لئے بھی بولا جاتا ہے، شاعر کہتا ہے:-

کل امرئ یجری الی یوم الھیاج بما استعدا

"ہر شخص لڑائی کے دن اسی سامان کے ساتھ جاتا ہے جو اس نے مہیا کیا ہو"

مغضبۃ، اصلی معنی غصہ و ناراضی اور خشم گرفتگی کے ہیں، اور عرف عام میں جنگ کے لیے مستعمل ہوتا ہے، ابن عنمہ کہتا ہے:-

ان تدع زید بنی ذھل لمغضبۃ نغضب لرزعۃ ان الفضل محسوب

"اگر زید بن ذہل کو جنگ کے لئے بلائیگا تو ہم بنی زرعہ کی طرف سے لڑیں گے، کیونکہ فضیلت محسوب ہوتی ہے"

شعرائے عرب نے جنگ کو مینڈھوں کے ٹکر لڑنے سے تشبیہ دی ہے چنانچہ اس کے لئے نطاح کا لفظ استعمال کرتے ہیں، سعد بن مالک کہتا ہے:-

واکر بعد الفر اذ کرہ الاقدام والنطاح

"گریز کے بعد حملہ بہتر ہے جبکہ آگے بڑھنا اور دشمن سے ٹکر لڑنا ناپسند نہ ہو"

جنگ کو اونٹ کے سینے سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ اونٹ جب کسی چیز پر اپنا سینہ رکھ دیتا ہے، تو وہ واپس کر ہی جاتی ہے، اور اس لئے بھی کہ اونٹ ایک سخت کینہ پرور اور انتقام جو جانور ہے، شاعر کہتا ہے:-

انختم علینا کل الحرب مرۃ فنحن مینخھا علیکم بکلکل

"تم نے ایک مرتبہ ہمارے اوپر جنگ کے سینہ کو رکھا ہے، اس لئے ہم بھی عنقریب تم پر اس کا سینہ رکھنے والے ہیں"

جنگ کو چکی سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ بھی دشمن کو آٹے کی طرح پیس دیتی ہے، عمرو بن کلثوم تغلبی کہتا ہے:-

فوارس لا یملون ان منا یا اذا دارت رحی الحرب الزبون

وہ ایسے شہسوار ہیں کہ موت سے نہیں گھبراتے جبکہ شدید جنگ کی چکی چلتی ہے"

عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

متی تنقل الی قوم رحانا یکن لوائی فی القاء لھا طحینا

"جب ہم کسی قوم کی طرف اپنی چکی کو لیجاتے ہیں تو وہ لڑائی میں اس کا آٹا بن جاتی ہے"

جنگ کے لئے محض "چکر" کا بھی استعارہ مستعمل تھا۔ عنترہ بن شداد عبسی کہتا ہے:۔

ولقد خشیت بان اموت ولم تکن للحرب دائرۃ علی ابنی ضمضم

"مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں مرجاؤں اور ضمضم کے دونوں بیٹے لڑائی کے چکر میں نہ آئیں"

جنگ کو آگ سے بھی بکثرت تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ وہ بھی دشمن کو آگ کی طرح جھلس دیتی ہے، حارث بن حلزہ کہتا ہے:۔

ما جزعنا تحت العجاجۃ اذ ولّوا شلالا واذ تلظی الصلاء

"ہم گرد و غبار میں مضطرب نہ ہوئے جبکہ سوار متفرق ہو کر بھاگے اور جنگ کی آگ خوب بھڑکی"

سعد بن مالک کہتا ہے:

من صد عن نیرانھا فانا ابن قیس لا براح

"کوئی جنگ کی آگ سے منہ موڑ جائے تو موڑ جائے، میں تو قیس کا بیٹا ہوں، ہرگز نہ ٹلوں گا"

یشامہ بن غدیر کہتا ہے:۔

قومی ھم قتلوا الحرب العوان بجمعھم والمشرفیۃ والقنا اشعالھا

"میری قوم ساری کی ساری شدید جنگ کی حریف ہے، اور اس کے پاس مشرفی تلوار اور نیزہ، جنگ کی آگ کو بھڑکانے کا ایندھن ہے"

ابو العول طہوی کہتا ہے:۔

ولا تبلی بسالتھم وان ھم صلوا بالحرب حینا بعد حین

"ان کی دلیری و مردانگی میں کمی نہیں آتی، اگرچہ وہ آتش جنگ میں پے در پے کودتے ہیں"

ان تمام تشبیہوں اور استعاروں اور محاوروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک جنگ ایک ایسی چیز کا نام تھا جسمیں لوٹ مار ہو، شور و ہنگامہ ہو، غضب و اشتعال ہو، جسکے خلاف لڑی جائے اس کو پیس دے، مسل دے، تہس نہس کر دے، اور اس پر ایسی مصیبتیں وارد ہوں جن کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اور لڑنے والے دشمنوں کی ہیبت ان کے تصور میں اس مینڈھے کے مانند تھی جو غضبناک ہو کر اپنے حریف سے ٹکر لڑتا ہے، اس میں نجابت و بسالت کا جوہر تو ضرور ہے، مگر اخلاقی فضیلت اور انسانی شرافت کا نام تک نہیں۔

عربی سیرت میں جنگجوئی کا اثر یہ جنگ جو عرب کے قلب و روح کی سب سے زیادہ مرغوب چیز تھی، ان کے ہاں عام عقیدہ یہ تھا کہ اگر کوئی شخص پلنگ پر پڑ کر مرتا ہے تو اس کی روح ناک سے نکلتی ہے، اور اگر میدان جنگ میں لڑ کر جان دیتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے نکلتی ہے، ہر عرب کی تمنا تھی کہ اس کی روح دشمن کے زخم سے نکلے کیونکہ ناک سے روح کے نکلنے کو وہ سخت عار سمجھتا تھا، شعرائے عرب فخر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں کوئی ناک کی موت نہیں مرتا، چنانچہ ایک شاعر اپنے قومی مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وما مات منا سید حتف انفه

"ہم میں سے کوئی سردار ناک کی موت نہیں مرا"

جنگ کی صدا کان میں پڑتے ہی ہتھیار بکر دوڑ جانا عربی سوسائٹی میں فرض کا درجہ رکھتا تھا، جنگ خورہ کیسی ہو اس سے اجتناب کرنا بڑی بزدلی و نامردی کی بات سمجھی جاتی تھی اور اگر کسی کی قوم اس قسم کی بزدلی دکھاتی تو وہ اس پر بڑی شرم و غیرت کا اظہار کرتا تھا، ایک شاعر اسی کے متعلق کہتا ہے:۔

لا یسألون اخاهم حین یندبهم فی النائبات علی ما قال برهانا

"بنو مازن کا یہ حال ہے کہ جب ان کا کوئی بھائی حوادث و مصائب میں ان کو مدد کے لیے پکارتا ہے تو وہ ان سے قول کی کوئی دلیل اور وجہ پوچھے بغیر جنگ میں کود پڑتے ہیں"

لکن قومی وان کانوا ذوی عدد لیسوا من الشر فی شیء وان هانا

"مگر میری قوم کثیر التعداد ہونے کے باوجود ایسی ہے کہ جنگ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی

خواہ وہ معمولی ہی سی جنگ ہو،

فلیت لی بھم قومًا اذا رکبوا شدوا الاغارۃ فرسانًا و رکبانا

کاش اس کے بدلہ مجھے ایسی قوم ملتی جو گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر خوب غارتگری کرتی،

ایک دوسرا شاعر اپنے خاندان کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

انی لمن معشر افنی اوائلھم قیل الکماۃ الا این المحاموتا

"میں اس قوم سے ہوں جس کے بزرگ، بہادروں کے محض اس غیرت دلانے والے قول پر مرمٹے، کہ ہاں! کہاں ہیں نسب کی حفاظت کرنے والے"

اس قسم کے جذبات سے عرب جاہلیت کا لٹریچر بھرا پڑا ہے، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جنگجوئی کو بڑے فخر کی چیز سمجھتے تھے، اور ان کی نگاہ میں خوں ریزی ایک بڑی ہی خوبی کا کام تھا۔

جنگ کے محرکات اور غنیمت کا شوق اس خوفناک کام پر جو چیزیں ان کو ابھارتی تھیں ان میں سے ایک مالِ غنیمت کا شوق تھا، ایک عرب جب ہتھیار سنبھالتا تھا تو پہلی تمنا جو اس کے دل میں پیدا ہوتی تھی، وہ یہ تھی کہ جنگ میں اسے خوب مالِ غنیمت اور لونڈی غلام ہاتھ آئیں، تجارت یا محنت و مشقت سے حاصل کیا ہوا مال اس کی نگاہ میں ذلیل مال ہے، اصلی عزت اس کے نزدیک اس طیب مال کے حاصل کرنے میں تھی جسے وہ میدانِ جنگ سے لوٹ کر لائے، رات دن مختلف قبیلے ایک دوسرے پر اسی غرض کے لئے چھاپے مارا کرتے تھے، کہ بکریاں، اونٹ، لونڈی غلام اور مال و متاع لوٹ لائیں، اور یہی شوق ان کو زیادہ تر جنگ پر ابھارا کرتا تھا، ایک شاعر اپنے جذبۂ شوقِ غنیمت کو اس طرح ظاہر کرتا ہے:-

فلئن بقیت لارحلن لغزوۃ تحوی الغنائم او یموت کریم

"اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسی جنگ پر جاؤں گا جس میں خوب غنائم ہاتھ آئیں، یا پھر میں ایک شریف کی سی موت مرجاؤں"

ایک دوسرا شاعر اپنے قبیلہ کی تعریف میں کہتا ہے، کہ وہ لوٹ مار کے جوش میں خود اپنے بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑتا:-

وکن اذا اغرن علی جناب واعوزهن نهب حیث کانا

ہمارے گھوڑے جب قبیلہ جناب پر غارتگری کرتے ہیں اور وہاں کچھ لوٹ کا مال ہاتھ نہیں آتا تو وہ،

اغر من الضباب علی طریٰ وضبۃ انہ من حان حانا

ضباب اور ضبہ پر جبکہ وہ اپنے گھروں میں ہوتے ہیں تاخت کرتے ہیں، پھر جو مرے سو مرے اس کی وہ پروا نہیں کرتے،

"واحیانا علی بکر اخینا اذا ما لم نجد الا اخانا

"اور کبھی کبھی خود بکر پر بھی حملہ کر دیتے ہیں جبکہ ہمیں اپنے بھائی کے سوا کوئی اور لوٹ مار کے لئے نہ ملے"

جب کوئی قبیلہ جنگ کے لئے نکلتا تو اس کی عورتیں اپنے مردوں کو قسم دیدیا کرتی تھیں کہ بغیر مال غنیمت لئے واپس نہ آنا چنانچہ عمرو بن کلثوم کہتا ہے:-

اخذن علی بعولتھن عھدا اذا لاقی کتائب معلمینا

انھوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب بہادری کے نشان لگائے ہوئے دشمن کے لشکر سے ملیں،

لکی یسلبن فارسۃ وبیضا وسربی فی الحبال مقرنینا

"تو گھوڑے اور صیقل شدہ تلواریں لیکر لوٹیں اور لونڈی غلام رسی میں بندھے ہوئے لیکر آئیں"

یہی شاعر دوسری جگہ اظہار فخر کے طور پر کہتا ہے:-

فاوبوا بالنھاب وبالسبایا وابنا بالملوک مصفدینا

"وہ لوٹے ہوئے مال اور لونڈی غلام لیکر واپس ہوئے، اور ہم بادشاہوں کو بیڑیوں میں جو بندھے ہوئے تھے"

تحالف امم کی جنگ میں طرفہ کے قبیلہ کو جو فتح حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:-

بنی مرتبدی البیض عن سوقھا وتلف الخیل فی اجاج النعم

"وہ دن جبکہ چمکتی ہوئی تلواریں اپنی پنڈلیاں کھول رہی تھیں اور سوار اونٹوں کے غول کے غول جمع کرتے پھرتے تھے"

زہیر آلِ ربیعہ پر اپنی فتح کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

وسبینا من تغلب کل بیضا ء ترقد الضحیٰ برود الرضاب

"ہم تغلب سے تمام گوری گوری لڑکیاں لوٹ لائے جو دن چڑھے تک سوتی رہتی ہیں اور جنکا لعاب دہن چوسنے سے ٹھنڈک پہونچتی ہے"

یوم مسحان میں بنی شیبان کو بنی کلب پر جو فتح حاصل ہوئی تھی، اس کی کیفیت ایک شیبانی شاعر اس طرح بیان کرتا ہے:-

عشیۃ ولّی جمعھم ننتابعوا فصار الینا نھبہ وعوانسہ

"اس رات ان کی جمعیت بھاگی اور بھاگے ہی چلی گئی، پھر ان کا مال اسباب اور ان کی دراز قد کنواری لڑکیاں ہمارے ہاتھ آگئیں"

اس غنیمت کے شوق میں اکثر ایسا ہوتا کہ جب کوئی فوج کسی قبیلہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلتی تو بہت سے مالِ غنیمت کے بھوکے محض لوٹ مار کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتے تھے، حارث بن حلزہ ایک قوم پر نعمان بن منذر کی چڑھائی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

فنادت لہ قراضبۃ من کل حی کانھم اَلقاع

"اس کی مدد کے لئے ہر قبیلہ سے بھوکے لٹیرے جمع ہو گئے، گویا کہ وہ عقاب تھے"

آگے چل کر کہتا ہے:-

ثم مینا علی تمیم فاحرمنا وفیھا نبات حرّ اماء

"پھر ہم بنی تمیم پر ٹوٹ پڑے اور ماہِ حرام میں ان پر پہونچ ان کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا لیا"

یہ لوٹ مار اہل عرب کی جنگ کے اولین مقاصد میں سے تھی، اور عقلاے عرب اس جنگ کو بیکار و بے نتیجہ سمجھتے تھے جسمیں کچھ مال ہاتھ نہ آئے، اکثم بن صیفی جو اپنی قوم کا بڑا جہاندیدہ و فرزانہ شخص تھا، کہا کرتا تھا کہ اھنأ الظفر کثۃ الاسری وخیر الغنیمۃ المال، "بہترین فتح وہ ہے جسمیں قیدی ہاتھ آئیں اور بہترین غنیمت وہ ہے جسمیں اونٹ اور بکریاں ملیں"

تفاخر حصول غنائم کے ساتھ دوسرا اہم محرک یہ جذبہ تھا کہ اپنی بزرگی و شرافت اور بہادری کی دھاک بٹھائی جائے۔ یہ تفاخر کا جذبہ دراصل عربوں کی فطری خصوصیات میں سے تھا اور اپنے ہمجنسوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو طاقتور، ممتاز اور معزز ثابت کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے خطرات برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے، ایک بہادر عرب کی بڑی سے بڑی تمنا یہ ہوتی تھی کہ اس کی چراگاہ میں دوسرے کا اونٹ نہ چر سکے، جس چشمہ سے وہ پانی پئے اس پر دوسرا نہ آنے پائے، جس منزل میں وہ ٹھہرے وہ دوسروں کے لئے تنگ ہو جائے، جو لباس وہ پہنے اس کے مثل کوئی دوسرا نہ پہن سکے، اس کے مقابلہ پر کسی کو بڑا اور بزرگ نہ سمجھا جائے، اس کے سامنے کسی کی غیبت نہ کی جاوے، وہ جس کو چاہے قتل کر دے، کوئی اس سے خون کا انتقام نہ لے سکے، اس کا ہاتھ سب پر وار ہے، اس کی خدمت سے کسی کو عار نہ ہو، غرض یہ کہ ہر طرح اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل رہے، اور اس کے سامنے کوئی سر نہ اٹھا سکے۔ شعرائے جاہلیت کا سارا کلام اسی قسم کے بیانات سے بھرا پڑا ہے، ایک شاعر اپنے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:-

وقد علم القبائل من معدٍ اذا قببٌ بابطحها بُنينا

"تمام قبائل معد جب سے وہ زمین پر آباد ہیں یہ جانتے ہیں کہ:-

بانا الماٰنعون لما اردنا وانا لنازلون بحيث شئنا

"ہم جس چیز کو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں اور جس منزل میں چاہتے ہیں ٹھہرتے ہیں

وانا تارکون اذا سخطنا وانا آخذون اذا رضينا

"جب ہم ناراض ہوتے ہیں تو بے خوف چھوڑ دیتے ہیں اور جب ہم راضی ہوتے ہیں تو بے تکلف لے لیتے ہیں

وانا العاصمون اذا اُطعنا وانا العازمون اذا عصينا

"جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم بچانے والے ہوتے ہیں اور جب ہم سے نافرمانی کی جاتی ہے تو عازم جنگ ہوتے ہیں"

وشارب ان وردنا الماء صفو ويشرب غيرنا كدرا وطينا

"جب ہم کسی چشمہ پر پہونچتے ہیں تو صاف پانی پیتے ہیں اور غیروں کو گدلا اور ملا ہوا پانی پینا پڑتا ہے"

قیس بن خلبہ کہتا ہے :-

بیض مقاریقنا تغلی مراجلنا ناسو بامو النا آثار ایدینا

"ہمارے سر سفید ہیں اور ہماری دیگیں جوش کھاتی ہیں، ہم اپنے ہاتھ کے پہونچائے ہوئے زخموں کا مداوا اپنے مال سے کرتے ہیں، (یعنی کوئی ہم سے انتقام نہیں لے سکتا)

ایک اور شاعر بنی وبر کی تعریف میں کہتا ہے :-

قومٌ اذا ما جنی جانیھم امنوا من لؤم احسابھم ان یقتلوا قودا

"وہ ایسی قوم ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی دست درازی کرنے والا کسی کو قتل کر دے تو وہ اس سے بخوف رہتے ہیں کہ ان سے قصاص لیکر کوئی ان کے حسب کو بٹہ لگا سکے گا"

حجر بن خالد ثعلبی فخر کے لہجہ میں کہتا ہے :-

منعنا حمانا واستباحت رماحنا حمی کل قوم مستجیر مراتعہ

"ہم نے اپنی محفوظ چراگاہ کو دوسروں کے لئے ممنوع کر رکھا ہے، اور ہمارے نیزوں نے ہر قوم کی محفوظ چراگاہوں کو جن کے زبردست محافظ موجود ہیں، اپنے لئے مباح کر لیا ہے"

اعشیٰ اپنی قوم کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہتا ہے :-

اری کل قوم قارباً قید فحلھم ونحن خلعنا قیدہ فھو سارب

"میں دیکھتا ہوں کہ ہر قوم نے اپنے اونٹ کی رسی چھوٹی کر رکھی ہے، مگر ہم نے اس کو کھلا چھوڑ دیا ہے، اور وہ آزادی سے چرتا پھرتا ہے"

ایام عرب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت میں جتنی ہولناک لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر اسی جذبۂ تفاخر کا نتیجہ تھیں، مشہور حرب بسوس جو بنی تغلب اور بنی بکر بن وائل کے درمیان کامل ۴۰ برس تک جاری رہی، صرف اتنی سی بات پر ہوئی تھی، کہ بنی تغلب کے سردار کلیب نے ربیعہ کی چراگاہ میں بنی بکر بن وائل کے ایک مہمان کی اونٹنی گھس گئی، اور وہاں کلیب کے اونٹوں کے ساتھ چرنے لگی، کلیب کا قاعدہ تھا کہ وہ نہ اپنے حمی میں کسی کے جانور چرنے دیتا، نہ اپنی چراگاہ میں کسی کو کھیلنے دیتا، نہ اپنے جانوروں کے ساتھ کسی کے جانوروں کو پانی پینے دیتا، حتیٰ کہ اپنی آگ کے سامنے کسی کی آگ بھی جلتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا، اس نے جب غیر کی اونٹنی

کو پینے ہی میں چرتے دیکھا تو غصہ میں آکر اس کو ایک تیر مارا جو اس کے تھن میں جا لگا۔ اونٹنی کے
مالک نے جو اس کو زخمی دیکھا تو اس نے فریاد کی اور للذل ہائے یہ کیسی ذلت ہے۔ اس پر بنی بکر میں
تلوار چل گئی اور ان کے ایک نوجوان حساس بن مرہ نے جا کر کلیب کو جو اس کا حقیقی بہنوئی تھا
قتل کر ڈالا۔ کلیب کے بھائی مہلہل کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے بھائی کا انتقام لینے کھڑا ہو گیا۔ اور
نتیجہ دونوں قبیلوں میں ایسی جنگ ٹھن گئی کہ جب تک دونوں تباہ نہ ہو گئے تھوار میان میں نہ گئی۔

ایک دوسری جنگ جو حرب داحس کے نام سے مشہور ہے محض گھوڑ دوڑ میں ایک گھوڑے
کے آگے نکل جانے پر برپا ہوئی تھی۔ بنی عبس کے سردار قیس بن زہیر کے پاس داحس اور غبراء نامی
دو گھوڑے تھے جن کی تیز رفتاری عرب میں مشہور تھی۔ بنی بدر کے سردار حذیفہ بن بدر کو یہ بات ناگوار
ہوئی کہ اس کے ایک چشمہ کے گھوڑوں کو اتنی شہرت نصیب ہو۔ اس نے قیس سے اپنے دو گھوڑوں
کے ان کی شرط بدی۔ اور فریقین کے درمیان یہ بات طے ہوئی کہ جس کے گھوڑے آگے نکلیں
سو اونٹ لے لے۔ شرط کے بعد فریقین کے گھوڑے دوڑائے گئے۔ اور جب داحس آگے
نکلنے لگا۔ تو حذیفہ کے ایک آدمی نے اس کے سوار پر ایک دوڑتی کی طرف سے توجہ ہٹا دی۔ اس پر
فریقین میں جھگڑا ہو گیا۔ قیس نے حذیفہ کے بیٹے مرہ کو قتل کر دیا۔ حذیفہ نے قیس کے بھائی
کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی عبس و بنی ذبیان میں ایسی شدید جنگ ہوئی جس کا سلسلہ چالیس برس
جاری رہا۔ اور اس وقت تک نہ رکی جب تک فریقین کے گھوڑوں کی نسل منقطع
ہونے کے قریب نہ پہونچ گئی۔

اوس و خزرج کی مشہور لڑائیاں جن کا سلسلہ ۱۲۰ سال تک جاری رہا۔ ایک معمولی بات
کے یک نہایت ہی حقیر واقعہ سے شروع ہوئی تھی۔ بنی سعدہ ایک شخص ایک
جانور کے جو رہیں۔ بتایا تھا ایک دن اس نے بنی قینقاع کے بازار میں
مالک بن عجلان سے
نکلوا دی اس نے
ہوئے

کا ایسا خوفناک سلسلہ شروع ہوگیا کہ اگر اسلام نہ آتا تو دونوں قبیلے لڑ لڑ کر فنا ہو جاتے[1]

سوقِ عکاظ میں قبیلۂ کنانہ کا ایک شخص بدر بن معشر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا اور پکار کر بولا کہ میں عرب کا سب سے معزز آدمی ہوں، جس کسی کو مجھ سے زیادہ معزز ہونے کا دعویٰ ہو وہ میرے پاؤں پر تلوار مارے، اس پر بنو ضمان کا ایک منچلا جوان آگے بڑھا اور اس نے بدر کے پاؤں پر تلوار ماردی، یہ چنگاری دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی تھی، تلواریں کھنچ گئیں، اور وہ جنگ برپا ہوئی جو پہلی حرب فجار کہلاتی ہے[2]، اس کے بعد کنانہ اور ہوازن میں کبھی صفائی نہ ہوئی دونوں کی عداوتیں یہاں تک بڑھیں کہ دونوں قبیلوں کے حلیف قبائل بھی ان میں شریک ہوگئے

آخری حرب فجار بھی جس کے متعلق ابن اثیر کہتا ہے کہ ایام عرب میں اس سے زیادہ زبردست جنگ کوئی نہیں ہوئی، اسی جذبۂ فخر و غرور کا نتیجہ تھی، سنہ ۲۶ قبل بعثت میں نعمان بن منذر بادشاہِ حیرہ نے اپنے ہاں سے ایک تجارتی قافلہ سوقِ عکاظ میں بھیجنے کا ارادہ کیا اور رؤسائے عرب سے پوچھا کہ کون اس کو اپنی حفاظت میں لیجانے کا ذمہ لیتا ہے، براض بن قیس کنانی نے کہا کہ میں بنی کنانہ سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں، ہوازن کے ایک سردار عروۃ الرحال نے کہا کہ میں اس کو تمام عرب سے محفوظ رکھنے کا ذمہ لیتا ہوں، براض اس ادعا کو برداشت نہ کرسکا، اور جب عروہ قافلہ کو لیکر چلا تو راستہ میں اس نے عروہ کا کام تمام کردیا، اس واقعہ سے کنانہ اور ہوازن کی عداوت پھر تازہ ہوگئی، دونوں میں جنگ چھڑی، قریش نے کنانہ کا اور بنو ثقیف نے ہوازن کا ساتھ دیا، چار سال تک شدید خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہا، اور یوم شمطہ، یوم العبلاء، یوم شرب، اور یوم الکریہ کے وہ ہولناک معرکے برپا ہوئے جنھوں نے عرب کے تمام پچھلے معرکوں کو بھلا دیا[3]،

انتقام، ایک اور قوی و شدید محرک جس نے عرب قبل الاسلام کی تاریخ کو خون سے رنگین کردیا، انتقام کا جذبہ تھا، عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جب کوئی شخص قتل کیا جاتا ہے، تو اس کی روح پرند بن کر اڑ جاتی ہے، اور جب تک اس کا بدلہ نہیں لے لیا جاتا، اس وقت تک وہ کوہ و بیابان میں اسقونی، اسقونی (مجھے پلاؤ مجھے پلاؤ) کہکر چیختی پھرتی ہے، ان کی اصطلاح میں اس پرندے کا نام ھامہ یا صدیٰ تھا،

---

[1] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۰۰ : ۱۱ [2] عقد الفرید ج ۳ ص ۸۶، [3] ابن اثیر ج ۱ ص ۴۰۹ - ۴۱۵ :

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہ لیا جاتا ہے وہ زندہ رہتا ہے جس کا انتقام نہیں لیا جاتا ہے بے جان ہو جاتا ہے بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے مقتول کی قبر میں اندھیرا رہتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کی بنا پر مقتول کے رشتہ دار اہل قبیلہ حتی کہ اس کے قبیلہ کے حلیف تک اپنا فرض سمجھتے تھے کہ اس کے قاتل سے خون کا بدلہ لیکر اس کی روح کو مطمئن کر دیں۔ اور اگر قاتل اس کے درجہ سے کمتر درجہ کا آدمی ہو تو اس کے قبیلہ کے کسی ایسے آدمی کو قتل کریں جس کا خون ان کے خیال میں مقتول کے خون کے برابر قیمت رکھتا ہو اس طرح بسا اوقات ایک شخص کے قتل ہو جانے سے بڑے بڑے قبیلوں میں آگ لگ جاتی تھی اور ایسی خوں ریزیوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا کہ سالہا سال تک نہ تھمتا تھا۔ اگر کوئی شخص یا قبیلہ اپنے آدمی کے خون کا بدلہ (دیت) لینے میں کوتاہی کرتا۔ یا اس کے عوض دیت قبول کر لیتا تو یہ بڑی ذلت کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اور اس بزدلی سے اس کی شرافت کو بٹہ لگ جاتا تھا۔

شعرائے جاہلیت کے کلام میں جو مضامین بکثرت وارد ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہی ثار کا عقیدہ ہے اور اسی عقیدہ کی بنا پر قوموں کو جنگ کا جوش دلاتے تھے۔ اور رجز میں اکثر اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے قبیلہ نے کبھی اپنے کسی مقتول کا خون رائگاں نہ جانے دیا۔

سموال بن عادیا کہتا ہے:-

وما مات منا سید حتف انفہ ولا طل منا حیث کان قتیل

"ہم سے کوئی سردار اپنی ناک کی موت نہیں مرا۔ اور جب وہ مارا گیا تو اس کا خون بھی رائیگاں نہ گیا۔"

حارث بن حمزہ کہتا ہے:-

ان تبتشم ما بین ملحۃ فالصا قبۃ فیہا الاموات والاحیاء

"اگر تم ملحہ سے صاقب تک قبریں کھودو گے تو دیکھو گے کہ کچھ مقتول وہ ہیں جنکا خون بھلا گیا اور وہ تم میں سے ہیں۔ اور کچھ زندہ ہیں جنکا ثار رہ گیا اور وہ تم میں سے ہیں۔"

قیس بن عاصم نے قبیلہ کو جوش انتقام دلانے کے لئے کہا تھا:-

فدبا بنی سعد ابنی عریبۃ تلاقوا مع الاطلال یا ابن حنظل

بنی اسد کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو وصیت کرتا ہے:-

فلا تاخذوا عقلاً من القوم انني ارى العار يبقى والمعاقل تذهب

"میرے خون کے بدلہ میں اس قوم سے دیت نہ قبول کرلینا، کیونکہ عار باقی رہجاتا ہے اور دیت کا مال خرچ ہوجاتا ہے"

بنو خزاعہ کا ایک شاعر اپنے قبیلہ کو انتقام کا جوش اس طرح دلاتا ہے:-

ولا تطمعن ما يعطونك انهم الوك على قربا هم بالمثمل

"جو کچھ وہ تجھے دیت میں دیتے ہیں اس کا خیال بھی نہ کر کیونکہ وہ باوجود قرابت کے تیرے پاس زہر ہلاہل لائے ہیں"

ابعد الاراهم محمد آنك شاهدا اتيت به في الدام لم يتزيل

"ایک تو وہ خون آلود کرتا دیکھنے کے بعد بھی دیت لے گا جو تیرے پاس لائی گئی۔ اور جس

ابھی تک خون دور نہیں ہوا ہے"۔

اراک ذا قد صرت للقوم ناضحاً ۔۔۔ یقال لہ بالغرب اذیر و قبیل

"اگر تو نے ایسا کیا تو میں سمجھتا ہوں کہ تو وہ اب کش اونٹ بن گیا جس پر کجاوہ رکھ کر کہتے ہیں گے بڑھ در پیچھے ہٹ"۔

فخذھا فلیست للعزایز بخطبۃ ۔۔۔ وفیھا مقال لامرئ متنائل

"اگر تو چاہے تو لے مگر یہ شریفوں کا چین نہیں ہے۔ اور اس میں تو ذلیل آدمی کو بھی کلام ہوگا"۔

کلیشہ بن عدیکرب اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بنی زبیہ کو اس طرح بھارتی ہے

ارسل عبد اللہ اذ حان وفتہ ۔۔۔ الی قومہ لا تقبلوا لھم دی

"عبد اللہ کا جب آخری وقت آیا تو اس نے اپنی قوم کو زبان حال سے کہلا بھیجا کہ ان سے میرے خون کی دیت نہ قبول کرنا"۔

ولا تاخذوا منھم افالا و ابکرا ۔۔۔ و اترک فی بیت بصعدۃ مظلم

"کہ ان سے بچے اور جوان اونٹ لیکر نہ بیٹھ جانا درآں حالیکہ میں صعدہ کی تنگ و تاریک قبر میں پڑا رہوں"۔

فان انتم لم تاثروا واتلیتم ۔۔۔ فمشوا باذناب المطی و ھلھلوا

"اگر تم نے میرے خون کا بدلہ نہ لیا، دیت قبول کر لی تو تم کن کٹے مترنج کی طرح ذلیل پھرو"۔

ولا تدروا الا فضول لنسائکم ۔۔۔ اذا محلات عقائبن من دم

"اور نہ کوئی عورتوں کے پاس سوائے اس کے جبکہ ان کی پڑیاں تک خون سے سنی ہوں"۔

یہ عرب کی قبائلی عداوتوں اور لڑائیوں کے اصلی محرکات ہیں۔ ان میں کسی تعریف تو درکنار مبنہ ترین غضب جبین کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہی خاص بھی درجہ کی حیوانی حمیت جو ایک درندے کو اپنے مدمقابل کے پھاڑ کھانے پر ابھارتی ہے زیادہ تر قتل و غارت گری پر آمادہ کرتی

اس واقعہ پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

سبانا بنی شیبان یوم وارۃ علی النار اذ تجلی به فتیاتها

اس نے جنگ وارہ میں بنی شیبان کے اسیروں کو چھڑا لیا، جب کہ ان کی جوان لڑکیاں آگ میں ڈالی جا رہی تھیں۔

عمرو بن منذر نے ایک قصور کی بنا پر منت مانی تھی کہ بنی دارم کے سو آدمیوں کو زندہ جلاؤنگا چنانچہ اس نے ان پر چڑھائی کی اور وہ آدمی ہاتھ آئے جنھیں اس نے جلا دیا، اب منت پوری کرنے میں ایک کسر رہ گئی تھی، اتفاق سے اس وقت قبیلہ برجم کا ایک شخص ادھر سے گذر رہا تھا وہ گوشت کی بو سونگھ کر سمجھا کہ کھانا پک رہا ہے، اس لئے عمرو کے لشکر کی طرف آگیا، عمرو نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے اسی کو آگ کے الاؤ میں جھونک دیا، اسی واقعہ کے متعلق جریر کہتا ہے کہ:-

این الذین بنار عمرو احرقوا اهل ابن اسعد فیکم المسترضع

کہاں ہیں وہ جو عمرو کی آگ میں جلائے گئے، اور کہاں ہے اسعد جو تمھارے درمیان پرورش پاتا تھا۔

اسیران جنگ سے بدسلوکی: اسیرانِ جنگ کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اور بسا اوقات جوشِ انتقام میں ان کو انتہا درجہ کی اذیتیں دے دے کر مارا جاتا تھا، عکل اور ینہ کا قصہ احادیث میں مذکور ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے ان کی آنکھیں پھوڑیں، اور انھیں تپتی ہوئی ریت پر ڈالدیا، یہاں تک کہ وہ پیاس اور تکلیف سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔

جنگ وارہ کا واقعہ مشہور ہے کہ بنی شیبان کے جتنے اسیر منذر بن امرؤالقیس کے ہاتھ آئے ان سب کو اس نے کوہ اوارہ کی چوٹی پر بٹھا کر قتل کرنا شروع کیا اور کہا کہ جب تک ان کا خون بہ کر پہاڑ کی جڑ تک نہ پہونچ جائیگا قتل کا سلسلہ بند نہ کرونگا، آخر جب مقتولوں کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہوگئی تو مجبوراً اس نے منت پوری کرنے کے لئے خون پر پانی ڈلوا دیا، اور وہ بہ کر پہاڑ کی جڑ تک پہونچ گیا۔

مرثد قیس کے باپ حجر بن حارث نے بنی اسد پر چڑھائی کی قوم کے جتنے آدمی اس کے ہاتھ قید ہوئے ان سب کو اس نے قتل کرادیا، اور حکم دیا کہ انھیں تلواروں سے نہیں، بلکہ ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کیا جائے[1]۔

غفلت میں حملہ کرنا: دشمن کو مقابلہ کا موقع دیئے بغیر غفلت کی حالت میں اس پر جا پڑنا، مرغوب ترین جنگی چالوں میں شمار ہوتا تھا، اس فعل کے لئے عموماً رات کے آخری حصہ میں حملے کئے جاتے تھے اور یہ دستور ایسا رائج ہوگیا تھا کہ لفظ تصبیح اسی معنی میں صبح کے وقت حملہ کرنے کے ہوگئے تھے۔ قرہ بن زید کہتا ہے:-

فصبحهم بالجيش قيس بن عاصم فلم يجدوا الا الاسنة مصدرا

"قیس بن عاصم ان پر صبح کے وقت لشکر لیکر جا پہونچا، مگر وہاں اس کے سوا کچھ نہ پایا کہ نیزوں کی انیاں جسموں سے پار ہوتی تھیں"۔

عباس بن مرداس سلمی کہتا ہے:-

فلم ار مثل الحي حيا مصبحا ولا مثلنا يوم التقينا فوارسا

"میں نے اس قبیلہ جیسا قبیلہ کبھی نہیں دیکھا جس پر ہم نے صبح حملہ کیا، اور نہ ہم جیسا کوئی تھا جبکہ ہم نے شہسواروں کا مقابلہ کیا"۔

اسی بنا پر لوگ اپنے دوستوں کو دعا دیتے تھے کہ تم صبح کے وقت بخیریت رہو۔ عنترہ بن شداد اپنی معشوقہ سے کہتا ہے:-

يا دار عبلة بالجواء تكلمي وعمي صباحا دار عبلة واسلمي

"اے عبلہ کے مکان کہ تو مقام جواء میں ہے، کچھ بول، اور صبح کے وقت غارت گروں سے محفوظ رہ"۔

عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ دشمن کے سرداروں کو رات کے وقت حالت خواب ہی میں قتل کر ڈالتے تھے اس فعل کی حسب حال داد تک تھا اور اس کے مرتکبین فتاک کہلاتے تھے حارثہ بن ظالم نہشلی، مرقع بن ذرارہ ضبی، سمیدع بن سکہ ثابت شاعر عرب کے مشہور قاتل ہیں۔

مقتولین کی تحقیر، جوش انتقام میں دشمن کی مردہ لاشوں تک کو نہ چھوڑا جاتا تھا، ان کے ناک کان کاٹ جاتے تھے ان کے اعضا کی قطع و برید کرکے زندوں کا بدلہ مردوں سے لیا جاتا تھا اور بسا اوقات ایسی ایسی وحشیانہ حرکات کیجاتی تھیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، جنگ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ قریش کی عورتوں نے شہدائے اسلام کے ناک کان کاٹ کر ان کے ہار بنائے تھے ابوسفیان کی بیوی ہند سید نا حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی یوم الیحامیم میں جب بنی جدیلہ کا سردار سبیع بن عمرو گرفتار ہوکر بنی سنبس کے ایک شخص کے پاس آیا تو اس نے اس کے دونوں کان کاٹ کر اپنے جوتے میں لگائے ابوسروۃ سنبسی اسی پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

نخصف بالآذان منکم نعالنا

"ہم تمہارے کانوں کا پیوند اپنی جوتی میں لگاتے ہیں"

ایک اور سنبسی شاعر بنی جدیلہ کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ:-

فان تبغضونا بغضۃً فی صدورکم فاجدعنا منکم و نشر بینا

"اگر تم اپنے سینوں میں ہمارے خلاف بغض رکھتے ہو تو بیجا نہیں ہے کیونکہ ہم نے تمہارے ناک کان کاٹے ہیں، اور تمکو پکڑ پکڑ کر بیچا ہے"

کبھی کبھی دشمن کی لاشوں کو مثلہ کرکے گھسیٹا جاتا تھا، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:-

ومشدوا شدۃ اخری فجروا بارجل مثلھم قد مثلوا بینا

"انھوں نے ایک دوسرا حملہ کیا اور اپنے حریف کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹیں، اور جیسا کو تیسا مارا"

جب کسی شخص سے سخت دشمنی ہوتی تو قسم کھاتے تھے کہ اس کو قتل کرکے اس کی کھوپڑی میں شراب پینگے جنگ احد میں عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے سافع بن طلحہ اور مسافع بن طلحہ دو بھائی قتل ہوئے تھے، ان دونوں کی ماں سلافہ نے قسم کھائی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پینگی، جب مقام رجیع میں عاصم شہید ہوئے تو قریش کے لوگ ان کی تلاش میں گئے تاکہ ان کا سر سلافہ کے ہاتھ بیچیں[1] حرب الفساد میں (جو ۲۵ سال تک جاری رہی) یہ یقین

[1] یہ واقعہ غزوات بن سعد فتح الباری اور اسد الغابہ وغیرہ میں مذکور ہے،

نے بکثرت یک دوسرے کے مقتولوں کی کھوپڑیوں میں شراب پی تھی جنگ یمامہ میں بھی اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں چنانچہ ابو مرثد غنوی انھیں کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے:۔

ونشرب کرھا منکرفی الجماجم

"ہم بدمزگی کیساتھ بھی کھوپڑیوں میں شراب پیتے ہیں"

"دشمن کی لاشوں کو مردار خوار جانوروں کا طعمہ بنایا جاتا تھا" اور یہ ان کے ہاں انتہا درجہ کی بہادری تھی عنترہ کہتا ہے:۔

ان یغدروا فقد ترکت اباھم جزر السباع وکل نسر قشعم

"اگر وہ مجھے گالیاں دیتے ہیں تو بیجا نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کے باپ کو درندوں اور گدھوں کا طعمہ بننے کے لیے چھوڑ دیا ہے"

شریح عبسی کہتا ہے:۔

واقسم لولا درعه ترکته علیه عوف من ضباع ونسر

قسم کھا کر کہتا ہوں اگر وہ زرہ پہنے ہوئے نہ ہوتا تو میں اس کو گدھوں اور چیلوں جیسے مردار خوار جانوروں کے لیے پڑا چھوڑ دیتا۔

عاتکہ بنت عبد المطلب حرب فجار کے واقعات پر فخر کرتے ہوئے کہتی ہیں:۔

وجدنا لا غادر نه بقاع تنضمه ضباعه

"ہمارے سواروں نے بنک کو زمین پر پڑا چھوڑ دیا اسے بجو نوچ نوچ کر کھاتے تھے"

مہلہل حرب بسوس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

قتلی اقاموا لھا [illegible]

[illegible] مقتولوں پر کوے اور گدھ [illegible] نوچ کر کھاتے ہیں۔

[illegible] عہد کی [illegible] جب جنگ [illegible] کوئی [illegible] کبھی دشمن سے [illegible] کوئی اچھا موقع مل جاتا [illegible] عہد و پیمان توڑ کر رکھ دیتے جاتے تھے [illegible]

... بے ... خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفارِ عرب کی بدعہدیوں کے واقعات نہایت کثرت سے ملتے ہیں۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سے رسول اللہ صلعم کے معاہدے ہو چکے تھے لیکن تینوں نے وقت پڑنے پر توڑ ڈالا۔ بنو نضیر نے خود آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی سازش کی۔ بنو قریظہ نے جنگِ احزاب میں علانیہ اسلام کے خلاف شرکت کی۔ اور بنو قینقاع نے قریش کے بھڑکانے پر سب سے پہلے اعلانِ جنگ کیا۔ قبائل رعل و ذکوان نے خود ہی رسول اللہ صلعم سے چند آدمی مدد کے طور پر طلب کئے اور جب آپ نے ۷۰ صحابہؓ کی ایک جماعت ان کے پاس بھیجی تو انھوں نے بیر معونہ پر سب کو قتل کر دیا۔ بنو لحیان نے مقام رجیع میں حضرت خبیبؓ، زید بن دثنہؓ اور عبد اللہ بن طارقؓ کو امان دی۔ اور جب انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے، تو تینوں کو پکڑ کر باندھ لیا۔ ایک کو قتل کیا اور دو کو مکہ لیجا کر بیچ ڈالا۔ اسی قسم کی بدعہدیوں کے متعلق قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمۃ (۹:۲) وہ کسی مسلمان کے ساتھ قرابت یا معاہدے کا لحاظ نہیں رکھتے۔

یہ اس قوم کی جنگ کا حال تھا جس میں اسلام ابتداً ظاہر ہوا۔ اس کی فوج کی خصوصیات کو ایک شاعر نے جامعیت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:-

فلست بجانبی ان لم تزرکم خلال الدار مشتبلۃ طعان

"میں ایک مہذب شہری نہ ہوں، اگر تمھارے عین گھروں کے سامنے ایک پھاڑنے اور پینے والا لشکر نہ آئے"۔

یدین بھا العزیز اذا راھا ویسقط من مخافتھا الجنین

"اس کو دیکھتے ہی سے قوت والے مسخر ہو جاتے ہیں اور پیٹ والیوں کے حمل خوف سے گر جاتے ہیں"۔

لشیب لناھد العذراء منھا ویھرب من مخافتھا الفطین

"جوان کنواری لڑکیاں اس کی ہیبت سے بوڑھی ہو جاتی ہیں، اور اس کے خوف سے وہ لوگ بھاگ جاتے ہیں جو کبھی اپنی جگہ نہیں چھوڑتے"۔

یطوف بھا من لجب سدیٌ کاسد الغیل مسکنھا العرین

"اس میں بنی نجار کے شیر پھرتے ہیں، ان جنگلی شیروں کے مانند جنکا مسکن گھنی جھاڑی ہو"

یظل اللیث فیھا مستکینا لہ فی کل ملتفت انین

"جس میں شیر ہمیشہ خاموش رہتا ہے، اور سننے والا بس اس شخص کی بات ہی سنتا ہے جسے وہ پھاڑ ڈالے"

اسلام سے پہلے روم و ایران کا طریق جنگ

یہ عرب تو خیر وحشی تھے حضریت و مدنیت کا ان میں نام و نشان تک نہ تھا، علوم و تہذیب سے ناآشنا تھے، ان میں اس قسم کی درندگی و بہیمیت کا موجود ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں تھی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد میں جو قومیں تہذیب و تمدن کے آسمان پر پہونچی ہوئی تھیں ان کا کیا حال تھا؟

تاریخ نے اس زمانہ کی لڑائیوں کے متعلق بہت کچھ معلومات محفوظ رکھی ہیں جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کم از کم اس اعتبار سے مہذب و غیر مہذب دنیا کے طرز عمل میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا، ایک قوم جب دوسری قوم پر چڑھائی کرتی تھی تو یہ طے کر لیتی تھی کہ اس کو تباہ کر چھوڑیگی مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز عملاً مفقود تھا، دشمن قوم کا ہر فرد کشتنی و سزاوار زدنی سمجھا جاتا تھا، عورتیں، بچے، بوڑھے، زخمی، بیمار، مذہب اور مذہب پیشوا جنگ کا دائرہ تک سے باہر تھا، فوجوں کے اقدام میں دشمن کی فصلوں کو تباہ کرنا، باغات کو جس جس کر دینا، عمارت کو مسمار کرنا بستیوں کو لوٹنا اور جلانا ایک عام بات تھی، کسی شہر کا شدید مزاحمت کے بعد مفتوح ہونا گویا اس کے لئے پیام موت تھا، حضین کہ فاتح جب اس میں گھستے تو بے تمیز قتل عام شروع کر دیتے اور جب خون سے بھی جوش انتقام فرو نہ ہوتا تو شہر میں آگ لگا دیتے حد یہ ہے کہ اس معاملہ میں سکندر اعظم بھی عام کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھا [illegible] کے وقت قیدیوں کی تجارت [illegible] جب اس نے [illegible] مہینہ کے سخت محاصرہ کے بعد فتح کیا تو [illegible] قتل عام کا حکم دیدیا [illegible] قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ہونے کا فخر حاصل تھا اس نے [illegible] ہزار [illegible] کو قتل کیا [illegible] تقریباً ۳۰ ہزار کو غلام بنا کر بیچ ڈالا، ایران جیسی [illegible] اس زمانہ میں قتل اور غلامی سے [illegible] بچی ہوئی عورت نہ تھی، بعض اوقات دشمن کے [illegible] اور خود اپنے ہوں پر

...تا ہو تو اس کو بدترین ذلت اور عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیا جاتا تھا، سفرا کا احترام جنگ کے
...ترین مصالح میں سے ہے، مگر اس عہد میں یہ جماعت بھی بسا اوقات تعدی سے محفوظ نہ رہتی تھی، فریق
...لف کی جانب سے کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی ایسا پیغام لیجانا جس کو وہ اپنی توہین یا کسر شان
...تھا، گویا خود اپنی موت کا پیغام لیجانا تھا، ایسے موقع پر سفرا کا ذلیل و خوار ہونا اور قید میں پڑ جانا
...ولی بات تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ بے تکلف قتل کر دیے جاتے تھے، سب سے زیادہ
...یبت مذہبی حلقہ پر آتی تھی، اگر بدقسمتی سے مفتوح ملک کے باشندے کسی دوسرے مذہب کے
...رو ہوتے، تو فاتح کا پہلا کام یہ ہوتا تھا کہ ان کے معابد کو تباہ کرے، متبرک مقامات کو بے حرمت
...ے اور مذہبی پیشواؤں کو ذلیل و خوار کرے، اس میں بسا اوقات یہاں تک غلو کیا جاتا کہ فاتح
...ر شمشیر مفتوحوں کو مذہب بدلنے پر مجبور کرتا تھا،

اسلام جس عہد میں ظاہر ہوا ہے، اس کی سب سے زیادہ مہذب سلطنتیں دو تھیں ایک روم
...سرے ایران، تہذیب و تمدن، علوم و آداب، اور شان و شوکت ہر اعتبار سے وہ اس وقت
...ں کی تمام قوموں پر فوقیت و برتری رکھتی تھیں، اس لئے انھیں کی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ
...ب میں ان کا طرز عمل کیا تھا،

مذہبی مظالم روم و ایران کے درمیان سیاسی اختلاف کے ساتھ مذہبی اختلاف
...تھا، مجوسی ایران اور مسیحی روم میں جب کبھی لڑائی ہوتی اور ایک کو دوسرے کے ملک میں گھسنے
...وقع ملتا تو اس کے مذہب کو سب سے زیادہ ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جاتا تھا، قباد کے زمانہ
...سنہ ۵۰۲ء میں جب حکومت ایران کی شہ سے حیرہ کے بادشاہ منذر نے شام پر
...ونی کی تو اس نے یہ ...ہر مسیحیات کو پکڑ کر عزی کے بت پر بھینٹ چڑھا دیا، خسرو پرویز نے
...قیصر ماریس کا بدلہ لینے کے بہانہ سے سلطنت روم کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اپنے
...رد مملکت میں مسیحیوں کے کلیسا مسمار کر دیے، ان کے اموال لوٹ لئے، اور صلیب پرستوں
...تش پرستی پر مجبور کیا، سنہ ۶۱۵ء میں جب اس نے بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں کے بطریق اعظم

History of the Decline and Fall of the Roman Empire

Gibbon's Roman Empire vol V. ch. XLVI

[illegible] دوبارہ قتل کر دیا۔ اس مصیبت کو جس پر حضرت عیسیٰ پر جھاگ کے قتل کیے جانے کا ماتم ہوا تھا [illegible] قسطنطین کے عظیم الشان کنیسوں کو آگ لگا دی تین سو سال کی جمع شدہ مذہبی یادگاروں اور نذر و نیاز کی قیمتی چیزوں کو لوٹ لیا اور ۹۰ ہزار عیسائیوں کو قتل و اسیر کیا۔[1] اس کے جواب میں جب ہرقل نے شمال کی جانب سے ایران پر حملہ کیا تو مجوسیوں کے آتشکدوں کو برباد کرا دیا۔ [illegible] کے وطن ارمیاہ کو پیوند خاک کر دیا۔ اور مجوسی مذہب کی توہین و تذلیل میں کوئی قسر اٹھا نہ رکھی۔[2] رومیوں کی دشمنی میں خود ایران کی مسیحی رعایا پر نہایت سختیاں کی جاتی تھیں۔ رومی سلطنت کے مسیحی مذہب اختیار کرنے سے پہلے تک ایران کے مسیحی مامون و محفوظ تھے اور قسطنطین کے بپتسمہ لیتے ہی ایران کا رویہ اپنی مسیحی رعایا کے ساتھ بدل گیا۔ ۳۳۹ء میں شاپور ذوالاکتاف نے بشپ سمعون اور ۱۲ دوسرے پادریوں کو قتل اور بہت سے مسیحی کنیسوں اور صومعوں کو منہدم کرا دیا۔[3] اس کے بعد ۴۰ سال تک مسیحیوں پر نہایت وحشیانہ سختیاں جاری رہیں۔[4]

بہرام نے فرقہ مانویہ کو مٹانے کے لئے جو شدید کارروائیاں کیں وہ سب سے زیادہ ہولناک تھیں۔ مانی نے جب زرتشت کے مذہب کو چھوڑ کر اپنا الگ مذہب پیدا کیا اور زرتشت سے بڑھ کر اس کے معتقد بننے لگے تو بہرام نے جدید مذہب کے پیروؤں کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ اور خود مانی کو گرفتار کر کے قتل کرایا۔ اس کی کھال کھینچ کر اس میں بھس بھروا دیا اور اس کو جندی سابور کے دروازہ پر لٹکوا دیا۔ یہ دروازہ عرصہ تک باب مانی کے نام سے موسوم رہا۔[5]

سفرا پر تعدی نظری حیثیت سے سفرا کے احترام کا تصور اس زمانہ میں موجود تھا اور سیاسی عقلیں اس احترام کے اہم مصالح کو سمجھتے تھے لیکن عملاً اس کا پاس بہت کم کیا جاتا تھا۔ قبیلہ سعید کے [illegible] اسکندر کے دربار میں روشنیہ کے سفیر جب یہ پیغام لیکر پہنچے کہ رومیوں کو صرف یہ پر قناعت کرنی چاہیے اور شام کے [illegible] کو ایرانیوں کے لئے چھوڑ دینا چاہیے تو اس نے ان کو سخت سزا دی اور اس نے ان سفرا کو قید میں ڈلوا دیا۔[6]

---

[1] [illegible] [2] [illegible]

[3] [illegible] [4] Sykes vol. I. P. 426 علامہ یزدانی نے اس واقعہ کو [illegible] ذکر کیا ہے۔

[5] Sykes vol. I. P. 426

[6] Sykes vol. I. P. 426

نوشیرواں جیسے فرمانروا و شاہ کے دربار میں جب ایلچیان اتراک کے سفیر عقدِ محلف
کی تجویز لے کر آئے تو اس نے اقرار یا انکار کا صاف جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ ان کے
زہر دیکر مار ڈالنا زیادہ مناسب سمجھا۔

خسرو پرویز کے فاتحانہ اقدامات نے جب ایشیا اور افریقہ میں رومی سلطنت کا تقریباً خاتمہ کر
دیا تھا اور قسطنطنیہ کے پورا ایشیائے کوچک رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا، یہاں تک کہ ایرانی
فوجیں عین قسطنطنیہ کے سامنے (Chalcedon موجودہ قاضی کوئی) تک پہونچ گئیں
تو ہرقل نے خسرو سے صلح کی گفتگو کرنے کے لئے اپنے سفیر بھیجے، مگر خسرو نے ہیئتِ سفراء کے رئیس کی
جیتے جی کھال کھنچوا ڈالی، بقیہ ارکانِ سفارت کو قید کر دیا، اور ہرقل کو جواب میں ایک توہین نامہ
لکھا جس کا عنوان یہ تھا:۔

"خسرو، خداوند بزرگ فرماں روائے عالم کی جانب سے اپنے احمق اور ذلیل غلام ہرقل
کے نام"[1]

بدعہدی عہد و پیمان کے احترام پر حملہ کرنے میں بھی یہ مہذب قومیں چنداں کم حوصلہ نہ تھیں،
ان کے نزدیک ضرورتِ وقت کے سامنے عہد کوئی چیز نہ تھا، تاریخ میں اس قسم کی بیسیوں مثالیں
ملتی ہیں کہ جب کبھی قیاصرۂ روم یا اکاسرۂ فارس نے اپنے دشمن کو نازک حالت میں مبتلا دیکھا بے تکلف
معاہدات کو بالائے طاق رکھکر اعلانِ جنگ کر دیا، اور تو اور خود نوشیرواں اور جسٹینین بھی جو اس زمانہ
کی رومی و ایرانی تہذیب کے بہترین نمائندے تھے بدعہدوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتے ہیں،
نوشیرواں کو جب اپنے اندرونی احوال کی اصلاح کے لئے امن کی ضرورت ہوئی، تو اس نے جسٹینین
کی خواہش صلح کو فوراً قبول کر لیا، اور ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے، مگر جب اٹلی میں بیلیساریوس
کی کامیابیوں سے روم کی طاقت کو بڑھتے دیکھا تو حیرہ سے غسان پر حملہ کرا دیا، اور پھر خود حیرہ کی
مدد کو اٹھ کھڑا ہوا تاکہ روم بھی اپنے حلیف غسان کی مدد کرنے پر مجبور ہو جائے[2]،
دوسری طرف سے ۵۷۱ء میں ایلچیان اتراک نے نوشیرواں سے ناراض ہو کر جسٹینین سے

---

[1] Byzantine Empire. Prof. Sykes. ص ۹۰

[2] Gibbon ch. X. LII

[illegible] کی خواہش کی تو اس نے بھی [illegible] کی حیثیت
سمجھا اور معاہدۂ صلح کو توڑ کر ۵۷۲ء میں نوشیرواں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔

جنگ کے وحشیانہ طریقے علمی و نظری حیثیت سے محاربین کے حقوق و فرائض کا ایک نہایت ابتدائی تصور زمانۂ قدیم سے دنیا میں موجود تھا، قدیم یونان کے مقننوں نے یہ قاعدہ بنایا تھا کہ جنگ میں جو لوگ مارے جائیں ان کو دفن کرنا چاہئے، مفتوح شہر کے جو لوگ معابد میں پناہ لیں انھیں قتل نہ کرنا، اور کھلاڑی لوگوں یا معابد کے خادموں سے کوئی تعرض نہ کرنا چاہئے۔ مگر اول تو یہ قواعد بین الملی لڑائیوں کے لئے نہ تھے بلکہ واضعین نے انھیں خود اپنی آپس کی خانہ جنگیوں کے لئے وضع کیا تھا، دوسرے عملی حیثیت سے سلطنتوں نے کبھی ان کو قانون کے طور پر نہ تو قبول کیا اور نہ ان کی پابندی کی، رومن سلطنت کی خصوصیت کے ساتھ غیر رومی سلطنتوں کے قانونی وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی تھی، اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں کسی فرض یا حق کا تصور سرے سے اس کے ہاں ناپید تھا، یہی حال ایران کا تھا، ان کے نزدیک غیر ایرانی قومیں وحشی اور ان کی سلطنتیں دراصل سلطنت ایران کی باغی تھیں، اس لئے ان کے ساتھ جنگ کرنے میں وہ کسی قسم کے اخلاقی فرض محسوس نہ کرتے تھے،

روم و ایران کا فوجی نظام بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ اس میں اخلاقی حدود کی پابندی نہیں ہو سکتی تھی، ان میں فوجی تربیت، آداب جنگ کی تعلیم، اور عسکری ضبط و نظم کے قائم رکھنے کا کوئی بندوبست نہ تھا، جنگ کے موقع پر عام جنگجو باشندوں کا ایک انبوہ امنڈ آیا کرتا تھا، اور صرف یہ شوق ان کو قتل و خون کے کھیل میں شرکت کے لئے کھینچ لاتا تھا کہ ہمسایہ ممالک کو لوٹیں، مخالف قوموں کو تہس نہس کریں، خوش باشی کے لئے مال و دولت، خدمت کیلئے لونڈی غلام، اور شہوت رانی کے لئے خوبصورت لڑکیاں حاصل کریں، خود ان کے فرمانروا کے سامنے بھی جنگ کا کوئی اخلاقی نصب العین نہ ہوتا تھا، بلکہ وہ محض دشمن کو نیچا دکھانے یا تباہ کر دینے کے لئے تلوار اٹھایا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ان کی فوجیں کسی ملک میں یلغار کرتی تھیں تو بچے، بوڑھے، عورتیں، جانور، درخت، معبد، مندر، غرض کوئی چیز ان کی دست برد

[illegible]

سے زیادہ تھی جو وہ اب سنتا ہوا آتا، اور جو نہ ہوتا جاسکتا اس کو گنگ کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

رومیوں سے وہ یقہ کے وحشی قبائل اور یورپ کے گاتھوں کی ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ ان کے ساتھ جو وحشیانہ برتاؤ کیا جاتا تھا اس کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ قیصر جسٹینین کے زمانہ میں جب وینڈالوں پر چڑھائی کی گئی تو ان کی پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ جنگ سے پہلے اس قوم میں ۶۰۰۰۰ مرد تھے، اور ان کے علاوہ عورتوں، بچوں اور غلاموں کی بھی ایک تعداد کثیر موجود تھی، مگر رومی فاتحوں نے جب ان پر قابو پایا تو ان میں سے ایک متنفس کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ گبن کہتا ہے کہ سارا ملک ایسا تباہ کر دیا گیا تھا کہ ایک مقامی سیاح اس کے ویرانوں میں سارے سارے دن گھومتا تھا اور کہیں آدمزاد کی شکل نہ دکھائی دیتی تھی۔ پروکوپیوس نے جب اول اول اس سرزمین پر قدم رکھا تھا تو اس کی آبادی کی کثرت اور تجارت و زراعت کی فراوانی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا تھا، مگر ۲۰ سال سے بھی کم عرصہ میں وہ ملک بھی ویرانی سے بدل گیا، اور پچاس لاکھ کی عظیم الشان آبادی جسٹینین کے حملوں اور جنگاکیوں کی بدولت فنا کے گھاٹ اتر گئی۔

یورپ میں گاتھوں کے ساتھ بھی یہی وحشیانہ سلوک ہوا، یہاں تک کہ ہم سنتے ہیں کہ انکا بادشاہ ٹوٹیلا جب میدانِ جنگ سے زخمی ہو کر بھاگا اور ایک دور دراز مقام پر جا کر مر گیا تو رومی سپاہی اس کی تلاش میں نکلے، اس کی لاش کا سراغ لگایا، اس کو برہنہ کر کے ڈال دیا، اور اس کے خون آلود کپڑوں کو تاج سمیت قیصر جسٹینین کے پاس تحفۃً بھیجا۔

۶۷۰ء میں ٹیٹوس رومی نے جب بیت المقدس فتح کیا تو سنتے ہیں کہ دو لاکھ حسین لڑکیاں فاتح کے لئے چن لی گئیں، ۱۷ سال سے زیادہ عمر کے آدمی ہزار در ہزار پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے، کئی ہزار آدمیوں کو گرفتار کر کے سلطنت کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے اور شمشیر زنوں سے کٹوانے یا خود آپس میں ایک دوسرے کو کاٹنے کے کام میں لایا جا سکے۔ دورانِ جنگ میں ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کئے گئے، جنمیں سے ۱۱ ہزار صرف اس وجہ سے مر گئے کہ ان کے نگہبانوں نے انھیں کھانے کو نہیں دیا، ان کے علاوہ جنگ اور قتلِ عام میں

جو لوگ ہلاک ہوئے ان کی مجموعی تعداد ۹۰۰۰۰ بتائی جاتی ہے۔

روم و ایران کی باہمی لڑائیوں میں بھی اسی قسم کے وحشیانہ حرکات کی جاتی تھیں، شاپور ذوالاکتاف نے جب الجزیرہ میں پیش قدمی کی اور امیڈا (موجودہ دیاربکر) زیادہ شدید مزاحمت کے بعد فتح ہوا، تو غضبناک فاتح نے شہر میں داخل ہو کر قتل عام کا حکم دیدیا، اور اس کو ایسا بھرپور نہ تپ سکا، ۳۴۰ء میں جب نوشیرواں نے شام پر چڑھائی کی تو اس کے دارالحکومت انطاکیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی، باشندوں کا قتل عام کیا، عمارتوں کو مسمار کیا اور جب اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو شہر میں آگ لگوادی، ۵۴۳ء میں نوشیرواں نے پھر شام پر چڑھائی کیا، اپامیا اور انطاکیہ وغیرہ کو لوٹا جلایا، ۲۹۲۰۰۰ شامیوں کو پکڑ کر ایران بھیجدیا، اور بہت سی خوبصورت لڑکیاں چن کر ہیاطلہ ترک کے پاس بھیجیں تاکہ اس کی ناراضی دور ہو جائے وہ جسٹینین سے اتحاد چھوڑ دے، ۵۷۶ء میں اس نے آرمینیا پر حملہ کیا اور جب تھیوڈوسیوپولیس کو فتح نہ کر سکا تو کیپیڈوسیا میں گھس کر ہر چیز کو جو سامنے آئی تباہ کر دیا، یہاں تک کہ میلی تین (Melitene) کو جلا کر خاک کر دیا، اخیر زمانہ میں خسرو پرویز نے جو زبردست حملہ سلطنت روم پر کیا تھا وہ شام فلسطین اور ایشیائے کوچک کے لئے قیامت کا نمونہ تھا، تنہا بیت المقدس میں جو ستم ڈھائے گئے ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کے علاوہ دمشق انطاکیہ اور حلب وغیرہ شہروں کا حشر بھی کچھ اس سے کم وحشت ناک نہ تھا۔

یہ وحشیانہ حرکات بعض اوقات بدترین مکر و فریب اور بزدلانہ سازشوں کی شکل میں بھی ظاہر ہوا کرتی تھیں، چنانچہ روتیر کا واقعہ مشہور ہے کہ جب خسرو ارمنستان کو فوجی قوت سے مغلوب نہ کر سکا تو اس نے اپنی فوج کے ایک افسر کو خفیہ طریقہ سے بھیج کر اسے قتل کرا دیا[۵۲]، روم و ایران کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں۔

اسیرانِ جنگ کی حالت اب سے زیادہ بدتر سلوک جس جماعت کے ساتھ کیا جاتا تھا

---

[۵۱] [illegible] 588-89 [illegible]

[۵۲] یہ تمام تفصیلات گبن، ساکس اور فوردی کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

[۵۳] Sykes vol. I. pp. 427-28

ہ یہ ان جنگ کی بابت تھی، قدیم رومی ویونانی اپنے سوا دوسری قوموں کو وحوش و
برابر (Barbarians) سمجھتے تھے، اور ان کے قانون میں اس بدقسمت مخلوق
کے لئے قید یا غلامی کے سوا کوئی تیسری صورت موجود ہی نہ تھی، ارسطو جیسا معلم اخلاق بے تکلف
کہتا ہے۔ کہ قدرت نے برابرہ کو محض غلامی کے لئے پیدا کیا ہے[1]، اور ایک دوسرے مقام پر
حصول ثروت کے جائز اور معزز طریقے گناتے ہوئے کہتا ہے کہ ان قوموں کو غلام بنانے کے
لئے جنگ کرنا بھی ان میں شامل ہے جنھیں قدرت نے اسی غرض کے لئے پیدا کیا ہے[2]،
ایک طرف ان عقائد نے رومیوں کے ذہن میں غیر قوموں کی جان و مال کو بے قدر
کر دیا تھا، دوسری طرف رومی سوسائٹی کی پرورش کچھ ایسی بہیمیت کی فضا میں ہوئی
تھی کہ لوگ اپنے کھیل تماشوں میں ہیبتناک نظارے دیکھ کر خوش ہوتے تھے، اور ان
نظاروں میں مجاز کے بجائے حقیقت کو دیکھنا زیادہ پسند کرتے تھے، اگر کسی گھر کو جلتے ہوئے
دکھانا ہو تو وہ چاہتے تھے کہ فی الواقع ایک گھر جلا دیا جائے، اسی طرح کسی آدمی کا زندہ
جلایا جانا یا کسی مجرم کو شیروں سے پھڑواتے ہوئے دکھانا منظور ہوتا تو تماشائیوں کی تسلی
اس کے بغیر نہ ہوتی تھی کہ ایک آدمی واقعی زندہ جلا دیا جائے، اور ایک دوسرے آدمی کو
واقعی شیروں کے پنجے میں چھوڑ دیا جائے، اس کام کے لئے انھیں ہمیشہ ایسے آدمیوں
کی ضرورت رہتی تھی جنھیں ان وحشیانہ کھیلوں کے لئے استعمال کیا جا سکے، ظاہر ہے کہ
روم کے آزاد شہری اس کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے تھے، لہذا دوسرے ملکوں سے
لڑائیوں میں جو قیدی پکڑے ہوئے آتے ان کو اس خونی تفریح کا سامان بنایا جاتا
تھا، بعض اوقات یہ کھیل اتنے بڑے پیمانہ پر ہوتے تھے کہ کئی کئی ہزار آدمیوں کو
بیک وقت تلوار اور درندوں کی نذر کر دیا جاتا تھا، ہیٹوٹس نے جو "نسل انسانی کا دلارا"
(Darling of the human race) کہلاتا ہے، ایک دفعہ ۵۰ ہزار درندے
جانوروں کو پکڑوایا اور کئی ہزار یہودی قیدیوں کو ان کے ساتھ ایک احاطہ میں چھڑوا دیا،
ٹراجان کے کھیلوں میں گیارہ ہزار درندے اور دس ہزار آدمی بیک وقت لڑائے

[1] Politics, Bk. I. ch. VIII [2] Politics, Bk. I. Chs. II, VI

جاتے تھے، کلاڈیوس نے ایک دفعہ جنگی کھیل میں ۱۹ ہزار آدمیوں کو تلواریں دیکر ایک دوسرے سے لڑا دیا، قیصر آگسٹس نے اپنی وصیت کے ساتھ جو تحریک منسلک کی تھی اس میں لکھتا ہے کہ ۸ ہزار شمشیر زنوں اور ۳۵۱۰ جانوروں کے کھیل دیکھے ہیں۔

اس کے علاوہ اسیرانِ جنگ کا دوسرا مصرف یہ تھا کہ آزاد رومیوں کی غلامی کریں۔ میں ان کا درجہ سب سے نیچا تھا، ان کے کوئی متعین حقوق نہ تھے۔ ان کی جان کی کوئی قیمت تھی، ان کی زندگی کا مقصد اپنے آقاؤں کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کے بقول، وہ ذلت کے بچپن، مشقت کی جوانی اور بیرحمانہ تغافل کے بڑھاپے میں پیدائش سے موت تک کے مراحل طے کرتے تھے[1]۔ رومی قانون میں غلاموں کے لئے اس قدر سخت قوانین تھے کہ اگر کوئی غلام اپنے آقا پر دست درازی کرتا تو اس کو اور بعض اوقات اس کے سارے خاندان تک کو موت کی سزا دیدی جاتی تھی[2]۔ عین ظہور اسلام کے زمانہ میں ان غلاموں کی جو حیثیت تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۱۷ء میں جب ہیڈرین کی تخت نشینی کے تھوڑے عرصہ بعد اس کی بیوی یوڈوکسیا کا انتقال ہوا اور اس کا جنازہ قبرستان کی طرف چلا، تو اتفاق سے ایک لونڈی نے اس کی مشایعت کرتے ہوئے زمین پر تھوک دیا، اس قصور میں وہ فوراً گرفتار کر لی گئی، اور اس کے قتل کا حکم دیا گیا[3]۔

فیرر کا بیان ہے کہ جب روم کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو نہایت کثرت سے اسیرانِ جنگ مملکت میں آنے لگے تھے، اور ایک وقت میں ان کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ تک پہونچ گئی تھی[4]۔

روم کی طرح ایران میں بھی اسیرانِ جنگ کے لئے کسی قسم کی رعایت نہ تھی، معمولی قیدی تو درکنار خود قیصر روم و الیریان جب شاپور اول کے ہاتھ قید ہوئے تو سونے زنجیروں سے باندھ کر شہر میں گشت کرایا گیا، عمر بھر اس سے غلاموں کی طرح خدمت لی گئی اور مرنے کے بعد اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیا گیا[5]۔ شاپور ذوالاکتاف کا واقعہ مشہور ہے کہ بحرین

---

[1] Constantine the Great [2] Early days of Christianity Vol. P. 2
Early days of Christianity P. 99 [3] Empire of the Tiberius P. 57 [4] SYKES VOL. I. P

[illegible] سے انتقام لینے کے لئے اس نے حکم دیا تھا کہ ان کے
شانوں میں سوراخ کرکے ان کے اندر رسیاں پروئی جائیں اور سب کو ملا کر باندھ دیا جائے،
اسی بنا پر تاریخ نے اس کو ذوالاکتاف کے نام سے یاد رکھا ہے،

خونخواری کی یہ داستانیں اور بھی زیادہ ہولناک ہوجاتی ہیں جب سنتے ہیں کہ نوع
انسان پر یہ ظلم وستم کسی علمی مقصد کے لیے نہیں کیے جاتے تھے بلکہ محض ناموری وتہمت
کے حصول اور شاہانہ ہیبت وجلال کے اظہار کے لئے کئے جاتے تھے پھر کبھی کبھی ایسا بھی
ہوتا تھا کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا خون محض بادشاہوں کی ذلیل ترین نفسانی خواہشات
کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ خسرو پرویز نے
نعمان بن منذر کی بیٹی کے حسن کی تعریف سنی اور اس کو حکم دیا کہ اپنی لڑکی شاہی حرم میں داخل
کرے، نعمان کی عربی غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور صاف انکار کردیا، اس پر خسرو نے
فرمان صادر کیا کہ حیرہ کی ریاست ضبط کیجائے، اور نعمان گرفتار کرلیا جائے، نعمان اپنے
بال بچوں کو بنی شیبان کی حفاظت میں دیکر خود کسریٰ کے دربار میں پہونچا کہ عفو تقصیر چاہے
مگر کسریٰ نے اسے قتل کرادیا، اور ۴۰ ہزار کی زبردست فوج بھیجی تاکہ بنی شیبان سے
نعمان بن منذر والوں کو چھین لائے، ذوقار کے مقام پر اس فوج کی عربوں سے ایک خونریز
جنگ ہوئی جسمیں طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے، اور صرف اتنی سی بات پر انسانی
خون کی ندیاں بہ گئیں کہ ایک بادشاہ اپنے پہلو میں ایک حسین عورت کو دیکھنا چاہتا تھا،

اس مختصر تاریخی بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں جنگ کے اخلاقی حدود، محاربین
کے حقوق وفرائض، عداوت میں ضبط نفس، اور لڑائی میں رحم وغضب کے امتزاج کا وجود
کیا معنی، ذہنوں میں اس کا تصور تک نہ تھا، اور مہذب ترین قومیں بھی جہاں تک جنگ کا
تعلق ہے، وحشت وحیوانیت کے ابتدائی درجہ میں تھیں، اس زمانہ میں جنگ کا مفہوم اس کے
سوا کچھ نہ تھا کہ وہ ایک ہنگامۂ قتل وخون اور فتنۂ سلب ونہب ہے، جو طاقتور کی ہر خواہش
اور ضرورت کو پورا کرنے کے لئے برپا کیا جا سکتا ہے، شقاوت وسنگدلی وحشت وبربریت

وحشیانہ وسفاکی عین جنگ کی حقیقت میں داخل ہوگئی تھی، مقصد جنگ ہوتے ہی آدمی کا ذہن ایک ایسی چیز کی طرف منتقل ہوجاتا تھا جو اپنے اندر انسان کے جان لینے، اور اس کی آبادیوں کو غارت کرنے کے ہر طریقہ کو متضمن تھی، صدیوں کے تغافل نے جنگ ساتھ ان وحشیانہ حرکات کا اس قدر گہرا تعلق قائم کر دیا تھا کہ انسان مشکل ہی سے کسی ایسی جنگ کا تصور کر سکتا تھا جس میں لوٹ مار، قتل عام، آتش زنی، اور تباہ کاری نہ ہو، جس میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، زخمیوں، اور بیماروں کو قتل نہ کیا جاتا ہو، جس میں دوسرے مذہب وملت کے معابد وآثار کی بے حرمتی اور تخریب نہ کی جاتی ہو، اور جو اخلاقی حدود کی پابندی کے ساتھ لڑی جاتی ہو،

اسلام کی اصلاحات

یہ حالات تھے جن میں اسلام ظاہر ہوا، اور اس نے حقیقتِ جنگ کو بدل کر بالکل ایک نیا نقطۂ پیش کیا جس سے اس وقت تک دنیا ناآشنا تھی، اس کا نظریہ یہ تھا کہ جنگ وقتال فی نفسہٖ معصیت ہے جس سے ہر انسان کو اجتناب کرنا چاہیے، لیکن جب دنیا میں اس سے بڑی معصیت یعنی ظلم وطغیان اور فتنہ وفساد پھیل گیا ہو اور سرکش لوگوں نے خلق خدا کے امن وراحت کو خطرہ میں ڈال دیا ہو، تو محض دفع مضرت کے لئے جنگ کرنا ضروری اور ضروری ہی نہیں بلکہ فرض ہے، جنگ کا اسلامی تصور! اس نظریہ کے مطابق چونکہ جنگ کا اصلی مقصد حریف مقابل کو ہلاک کرنا اور بالکل نقصان پہونچانا نہیں ہے بلکہ محض اس کے شر کو دفع کرنا ہے، اس لئے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے، کہ جنگ میں صرف اتنی ہی قوت استعمال کرنی چاہیے جتنی دفع شر کے لئے ناگزیر ہو، اور اس قوت کا استعمال صرف انھیں طبقوں کے خلاف ہونا چاہیے جو عملاً برسرپیکار ہوں یا حد سے حد جنسے شر کا اندیشہ ہو، باقی تمام انسانی طبقات کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رہنا چاہیے اور دشمن کی ان چیزوں تک بھی ہنگامۂ کارزار کو تجاوز نہ ہونا چاہیے جنکو اس کی جنگی قوت سے کوئی تعلق نہ ہو، جنگ کا یہ تصور ان تصورات سے مختلف تھا جو پہلے سے دماغوں میں موجود تھے، اس لئے اسلام نے تمام پچھلی اصطلاحات کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ کی جدید اصطلاح وضع کی، جو اپنے معنی موضوع لہ پر ٹھیک ٹھیک دلالت کرتی ہے، اور وحشیانہ جنگ کے تصورات

سے ل کر بنا ہے جو لغت کے اعتبار سے جہاد کے معنی ہیں استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو، دشمن کو دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا، اس لفظ میں تو حرب کی طرح خشم، ورسب وغیب کا مفہوم شامل ہے۔ نہ ردع کی طرح خوف و دہشت کا، نہ شر کی طرح بدی و شرارت کا، نہ نطاح کی طرح بہیمیت وحیوانیت کا، اور نہ کبھ کی طرح مصیبت وشدت کا، بلکہ اس کے وہ صاف صاف ظاہر کرتا ہے کہ قاتل کا منشا مضرت کو دفع کرنا ہے، اور اس کے لئے وہ اتنی کوشش کرنا چاہتا ہے جتنی دفع مضرت کے لئے درکار ہو۔ مگر محض کوشش بھی اداے مفہوم کے لئے کافی نہ تھی، کیونکہ اس سے جہت ظاہر نہیں ہوتی، کوشش نیکی کی جہت میں بھی ہو سکتی ہے، اور بدی کی جہت میں بھی، اس لئے مزید تحدید کے لئے فی سبیل اللہ کی قید لگادی تاکہ نفس کی کسی خواہش، کسی ملک کی تسخیر، کسی عورت کے وصال، کسی ذاتی عداوت کے انتقام یا مال و دولت یا حکومت و اقتدار یا شہرت و ناموری کے حصول کی خاطر کوشش کرنا اس میں داخل نہ ہو سکے اور صرف وہی کوشش مراد لیجائے جو محض اللہ کے لئے ہو، جس میں ہواے نفس کا شائبہ تک نہ ہو، اور جسکو ایسے مقاصد کے حصول میں صرف کیا جائے جنھیں اللہ نے پسند کیا ہے،

اس جدید تصور کے ماتحت اسلام نے جنگ کا ایک مکمل ضابطۂ قانون وضع کیا جسمیں جنگ کے آداب، اس کے اخلاقی حدود، محاربین کے حقوق و فرائض، مقاتلین اور غیر مقاتلین کا امتیاز اور ہر ایک کے حقوق، معاہدین کے حقوق، سفرا اور اسیرانِ جنگ کے حقوق، مفتوح قوموں کے حقوق تفصیل کے ساتھ بیان کئے، ہر ایک کے لئے قواعد کلیہ اور حسب ضرورت جزئی احکام مقرر کئے، اور اس کے ساتھ داعی اسلام اور خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم نے نظائر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ بھی چھوڑا، تاکہ قانون پر عملدرآمد کرنے اور قواعد کلیہ کو احوال جزئیہ پر منطبق کرنے کا طریقہ واضح ہو جائے،

مقصدِ جنگ کی تطہیر لیکن اس قانون سازی کا مدعا صرف اتنا ہی نہ تھا کہ کاغذ پر ایک ضابطہ قوانین تیار کیا جائے، بلکہ اصل مقصود یہ تھا کہ سابقہ حالت کی اصلاح کیجائے اور جنگ کے وحشیانہ طریقوں کو مٹا کر اس نئے قانون کو رائج کیا جائے، اس کے لئے سب سے پہلے اس غلط تصور کو دلوں سے محو کرنے کی ضرورت تھی، جو صدیوں سے جما ہوا تھا، لوگوں کی عقلیں یہ سمجھنے سے قاصر

تھیں کہ جب مال و دولت کے لئے جنگ نہ کی جائے، ملک و زمین کے لئے نہ کیجائے، شہرت و ناموری کے لئے نہ کیجائے حمیت و عصبیت کے لئے نہ کیجائے، تو پھر جنگ کا اور کون سا مقصد ہو سکتا ہے جس کے لئے انسان اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے۔ وہ ایسی جنگ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس کو انسان کی خود غرضی اور نفسانیت سے کوئی تعلق نہ ہو، لہذا داعیِ اسلام صلعم نے پہلا کام یہی کیا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے معنی اور وہ حدود جو اسے جہاد فی سبیل الطاغوت سے ممتاز کرتے ہیں پوری طرح واضح کر دے، اور مختلف طریقوں سے جنگ کے اس جدید تصور کو لوگوں کے ذہن نشین کیا، اس بارے میں کثرت سے احادیث آئی ہیں جن میں سے چند کو یہاں درج کیا جاتا ہے[1]،

ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ :-

جاء رجلٌ الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال، الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر، والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ،

ایک شخص رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوا، اور بولا کہ کوئی شخص مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی شہرت و ناموری کے لئے جنگ کرتا ہے، کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے جنگ کرتا ہے، فرمایئے کہ ہم میں سے کس کی جنگ راہِ خدا میں ہے، حضورؐ نے جواب دیا کہ راہِ خدا کی جنگ تو صرف اس شخص کی ہے جو محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے،

یہی ابو موسیٰؓ روایت کرتے ہیں :-

جاء رجلٌ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ما القتال فی سبیل اللہ؟ فان احدنا یقاتل غضبا

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اور بولا کہ یا رسول اللہ قتال فی سبیل اللہ کیا ہے ہم میں سے کوئی جوش غضب میں لڑتا ہے اور کوئی حمیت کی بنا پر، آپ نے سر

[1] اس باب میں جتنی احادیث نقل کی گئی ہیں اکثر بخاری (کتاب الجہاد) و کتاب المغازی) مسلم (کتاب الجہاد) و نسیر و کتاب الامارۃ) ابوداؤد (کتاب الجہاد) و کتاب العتق و الامارۃ) نسائی (کتاب الجہاد) ابن ماجہ (ابواب الجہاد) و ترمذی (ابواب السیر و ابواب الجہاد) موطا (امام مالک (کتاب الجہاد) سے ماخوذ ہیں۔

فقال من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله،

تھا، اور جواب دیا کہ جو شخص اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑتا ہے، اسی کی جنگ راہِ خدا میں ہے،

ابو امامہ باہلیؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا ارأیت رجلاً غزا یلتمس الاجر والذکر، ما لہ؟ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو مال فائدے اور شہرت کے لئے جنگ کرتا ہے؟ ایسے شخص کو کیا ملے گا؟ آنحضرت صلعم نے جواب دیا لا شئی لہ، اس کو کچھ ثواب نہ ملے گا، سائل کے لئے یہ بات عجیب تھی، پلٹ کر پھر آیا اور پھر یہی سوال کیا، آپؐ نے دوبارہ وہی جواب دیا، اس کا اطمینان اب بھی نہ ہوا، تیسری اور چوتھی مرتبہ پلٹ پلٹ کر آیا اور یہی سوال کرتا رہا، آخر آنحضرت صلعم نے اس کو مطمئن کرنے کے لئے فرمایا، ان اللہ لا یقبل من العمل الا ما کان لہ خالصاً وابتغی بہ وجہہ اللہ کوئی عمل اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ خالص اسی کی خوشنودی و رضا کے لئے نہ کیا جائے،

عبادہ بن الصامتؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا من غزا فی سبیل اللہ ولم ینو الا عقالا فلہ ما نوی، جس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا، اور صرف ایک اونٹ باندھنے کی رسی کی نیت بھی کر لی، تو بس اس کو وہ رسی ہی ملے گی، ثواب کچھ نہ ملے گا،

معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:-

الغزو غزوان، فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام، وانفق الکریمۃ، واجتنب الفساد فان نومہ ونبہہ اجر کلہ، واما من غزا ریاءً وسمعۃ وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لا یرجع بالکفاف،

لڑائیاں دو قسم کی ہیں، جس شخص نے خالص اللہ کی رضا کے لئے لڑائی کی، اور اس میں امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا اور فساد سے پرہیز کیا تو اس کا سونا جاگنا سب اجر کا مستحق ہے، اور جس نے دنیا کے دکھاوے اور شہرت و ناموری کے لئے جنگ کی، اور اس میں امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا، تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا (یعنی الٹا عذاب میں مبتلا ہو گا،)

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اول الناس یقضی لھم یوم القیامۃ ثلاثۃ رجل استشھد فاتی بہ فعرفہ نعمہ فعرفھا قال فما عملت؟ قال قاتلت فیک حتی استشھدت قال کذبت ولکنک قاتلت لیقال فلان جری فقد قیل ثم امر بہ فسحب علی وجھہ حتی القی فی النار الحدیث

قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے آدمیوں کا فیصلہ کیا جائیگا، پہلے وہ شخص لایا جائیگا جو لڑ کر شہید ہوا تھا خدا اس کو اپنی نعمتیں جتائیگا اور جب وہ ان کا اقرار کریگا تو پھر خدا پوچھے گا کہ تو نے میرے لئے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ تیرے لئے جنگ کی یہاں تک شہید ہوگیا، اس پر خدا فرمائیگا تو جھوٹ بولا، تو تو اس لئے لڑا تھا کہ لوگ کہیں کہ فلاں شخص بڑا جری ہے، سو تیرا یہ مقصد پورا ہوگیا، پھر خدا اس کے عذاب کا حکم دیگا، اور اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائیگا، الخ

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یجیٔ الرجل آخذ ابید رجل فیقول یارب! ھذا قتلنی فیقول اللہ لہ لم قتلتہ؟ فیقول قتلتہ لتکون العزۃ لک فیقول انھا لی ویجیٔ الرجل آخذ ابید الرجل فیقول ان ھذا قتلنی فیقول اللہ لم قتلتہ؟ فیقول لتکون العزۃ لفلان فیقول انھا لیست لفلان فیبوء باثمہ

قیامت کے دن ایک شخص دوسرے شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا، اور عرض کریگا کہ اے رب اس نے مجھے قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ دریافت کریگا کہ تو نے اس کو کیوں قتل کیا وہ کہے گا کہ میں نے اسے اس لئے قتل کیا تھا کہ عزت تیرے لئے ہو، اس پر خدا فرمائیگا کہ ہاں عزت میرے ہی لئے ہے، پھر ایک دوسرا شخص ایک شخص کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا، اور عرض کریگا، کہ اس نے مجھے قتل کیا تھا اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیگا کہ تو نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ کہیگا کہ میں نے اس لئے قتل کیا کہ عزت فلاں شخص کے لئے ہو اس پر اللہ کہے گا کہ عزت فلاں شخص کا حق نہیں ہے پھر مقتولوں کے گناہ اس پر ڈالے جائیں گے۔

یہ تعلیم جنگ کو ہر قسم کے دنیوی مقاصد سے پاک کردیتی ہے۔ شہرت و ناموری کی طلب

ملت وغیرہ کی خواہش، مال و دولت اور حصول غنائم کی طمع، شخصی و قومی عداوت کا انتقام، غرض کوئی دنیوی غرض ایسی نہیں ہے جس کے لئے جنگ جائز رکھی گئی ہو، ان چیزوں کو الگ کر دینے کے بعد جنگ محض ایک خشک و بے مزہ اخلاقی و دینی فرض رہجاتی ہے جس کے مہالک و خطرات میں مبتلا ہونے کی از خود خواہش تو کوئی کر ہی نہیں سکتا، اور اگر دوسرے کی طرف سے فتنہ کی ابتدا ہو تب بھی صرف اس وقت مقابلہ کے لئے تلوار اٹھا سکتا ہے، جب کہ اصلاح حال اور دفع ضرر کے لئے تلوار کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہ رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی فرمادیا ہے کہ:-

لا تتمنوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ، فاذا لقیتموھم فاصبروا واعلموا ان الجنۃ تحت ظلال السیوف،	دشمن سے مقابلہ کی تمنا مت کرو، بلکہ اللہ سے امن و عافیت کی دعا کیا کرو، مگر جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو پھر جم کر لڑو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کے سایہ تلے ہے،

طریق جنگ کی تطہیر مقصد اصلاح کے ساتھ داعی اسلام نے طریق حصول مقصد کی بھی اصلاح کی اور رفتہ رفتہ ان تمام وحشیانہ حرکات کو روکدیا جو جاہلیت کی لڑائیوں میں کیجاتی تھیں، اس کے متعلق امتناعی احکام بکثرت موجود ہیں جنمیں مجموعاً و منفرداً تمام وحشیانہ افعال سے منع کیا گیا ہے،

غیر اہل قتال کی حرمت اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ محاربین (BELLIGERENTS) کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا، ایک اہل قتال (COMBATANTS) دوسرے غیر اہل قتال (NONCOMBATANTS) اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں، یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں یعنی جوان مرد، اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو عقلاً عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے، یا عدم قدرت کے باعث، یا عادت جاریہ کے اعتبار سے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مقطوع الاعضا، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ، اسلام نے طبقہ اول کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے، اور طبقہ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے

منع کر دیا ہے۔

ایک مرتبہ میدان جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ عورت کی لاش پڑی دیکھی، ناراض ہو کر فرمایا کہ ما کانت ھذہ تقاتل فیمن یقاتل یہ تو لڑنے والوں میں شامل نہ تھی۔ پھر سالار فوج حضرت خالدؓ کو کہلا بھیجا کہ لا تقتلن امرأۃ ولا عسیفا، عورت اور اجیر کو ہرگز نہ قتل کرو، ایک دوسری روایت کے مطابق اس کے بعد آپ نے عورتوں اور بچوں کے قتل کی عام ممانعت فرما دی، فنھی النبی عن قتل النساء والصبیان۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

لا تقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا صغیرا ولا امرأۃ، ولا تقتلوا وضموا غنائمکم واصلحوا واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین

نہ کسی بوڑھے ضعیف کو قتل کرو، نہ چھوٹے بچوں کو، اور نہ عورت کو، اموال غنیمت میں چوری نہ کرو، جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے سب ایک جگہ جمع کرو، نیکی و احسان کرو کیونکہ اللہ محسنوں کو پسند فرماتا ہے۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ نے پہلے سے ہدایت فرما دی کہ کسی زخمی پر حملہ نہ کرنا، جو کوئی جان بچا کر بھاگے اس کا پیچھا نہ کرنا، اور جو اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اسے امان دینا۔[1]

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم جب کہیں فوج بھیجتے تھے تو ہدایت کر دیتے تھے کہ معابد کے بے ضرر خادموں اور خانقاہ نشین زاہدوں کو قتل نہ کرنا، لا تقتلوا اصحاب الصوامع،

ان مختلف جزئی احکام سے فقہائے اسلام نے یہ قاعدۂ کلیہ مستنبط کیا ہے کہ تمام وہ لوگ جو لڑنے سے معذور ہیں، یا عادۃً معذور کے حکم میں ہیں، قتال سے مستثنیٰ ہیں، لیکن ان کا استثنا علی الاطلاق نہیں ہے، بلکہ مقید ہے، اس سے کہ وہ عملاً جنگ میں حصہ نہ لیں، اگر ان میں سے کوئی اعمال جنگ میں فی الواقع شرکت کرے، مثلاً بیمار پلنگ پر لیٹے لیٹے فوجوں کو جنگی چالیں بتا رہا ہو، یا عورت غنیم کی جاسوسی کا کام کر رہی ہو، یا بچہ خفیہ خبریں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا مذہبی طبقہ کا کوئی فرد دشمن قوم کو جنگ کا جوش دلاتا ہو، تو اس کا قتل جائز ہوگا، کیونکہ

[1] فتوح البلدان ص ۴۷،

اس نے خود اپنے آپ کو مقاتلین میں شامل کرکے غیر مقاتلین کے حقوق سے محروم کر لیا، اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہل قتال میں سے ہے اس کا قتل جائز ہے خواہ وہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے، اور ہر شخص جو اہل قتال سے نہیں ہے، اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقۃً لڑائی میں شامل ہو یا مقاتلین کے سے کام کرنے لگے،

اہل قتال کے حقوق، غیر اہل قتال کے حقوق بیان کرنے کے بعد یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اہل قتال جن پر تلوار اٹھانا جائز ہے، ان پر بھی دست درازی کا غیر محدود حق حاصل نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بھی کچھ حدود ہیں جنکی پابندی ضروری ہے، یہ حدود ایک ایک کرکے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں،

غفلت میں حملہ کرنے سے احتراز، اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ راتوں کو اور خصوصاً آخر شب میں جبکہ لوگ بے خبر سوتے ہوتے، اچانک جا پڑتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عادت کو بند کر دیا، اور قاعدہ مقرر کیا کہ صبح سے پہلے کسی دشمن پر حملہ نہ کیا جائے، انس بن مالکؓ غزوۂ خیبر کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:-

کان اذا جاء قوما باللیل لم یغر علیھم حتی یصبح، — آنحضرت صلعم جب کسی دشمن قوم پر رات کے وقت پہونچتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہ کرتے تھے،

آگ میں جلانے کی ممانعت، عرب اور غیر عرب شدت انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دیا کرتے تھے، رسول اللہ صلعم نے اس وحشیانہ حرکت کو بھی ممنوع قرار دیا، حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:-

لا ینبغی ان یعذب بالنار الا رب النار ۵ — آگ کا عذاب دینا سوائے آگ کے پیدا کرنے والے کے اور کسی کو سزاوار نہیں،

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے ہم لوگوں کو لڑائی پر جانے کا حکم دیا، و بدیں کی کہ اگر فلاں دو آدمی تم کو ملیں تو ان کو جلا دینا مگر جب ہم روانہ ہونے لگے تو بلا کر فرمایا:-

---

۵ ہدایہ باب کیفیۃ القتال، فتح القدیر ج ۴ ص ۲۹۲-۲۹۰، بدایع الصنایع ج ۷ ص ۱۰۱،

انی قد کنت حرقت فلانا وفلانا وانی لم اکن احرق احدا فان وجدتموهما فاقتلوهما
ان النار فلا یعذب بها الا اللہ فان آگ کا عذاب سوائے خدا کے کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر
وجدتموهما فاقتلوهما۔ اگر تم انھیں پاؤ تو بس قتل کر دینا

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے زنادقہ کو آگ کا عذاب دیا تھا۔ جس پر حضرت ابن عباسؓ نے
انھیں روکا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم بیان کیا کہ لا تعذبوا بعذاب اللہ آگ اللہ کا عذاب ہے
اس سے بندوں کو عذاب نہ دو۔

قتل صبر کی ممانعت رسول اللہ صلعم نے دشمن کو باندھ کر قتل کرنے اور تکلیفیں دے دے کر
مارنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ عبید بن یحییٰ کا بیان ہے کہ ہم عبدالرحمن بن خالد کے ساتھ جنگ پر
گئے تھے۔ ایک موقع پر ان کے پاس لشکر اعادی سے چار گبر پکڑے ہوئے آئے اور انھوں نے
حکم دیا کہ انھیں باندھ کر قتل کیا جائے۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوایوب انصاریؓ کو ہوئی
انھوں نے کہا:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے رسول اللہ صلعم سے سنا ہے کہ آپ نے قتل صبر
نهی عن قتل الصبر فوالذی نفسی بیدہ (باندھکر مارنے) سے منع فرمایا، خدا کی قسم اگر مرغی بھی
لو کانت الدجاجة مما تعبث بها فبلغ ہوتی تو میں اس کو اس طرح باندھ کر نہ مارتا۔ اس کی
ذلك عبد الرحمن بن خالد بن ولید خبر جب عبدالرحمن بن خالد کو پہونچی تو انھوں نے چار
فاعتق اربعة رقاب غلام آزاد کر دیئے۔

لوٹ مار کی ممانعت جنگ خیبر میں جب اسلامی فوج کے بعض نئے رنگروٹ بے قابو ہو گئے
اور انھوں نے غارت گری شروع کر دی، تو یہودیوں کا سردار رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر
ہوا اور کرخت لہجہ میں آپ کو خطاب کر کے بولا یا محمد ألکم ان تذبحوا حمرنا وتاکلوا ثمرنا
وتضربوا نساءنا؟ اے محمدؐ! کیا تم کو یہ زیبا ہے کہ ہمارے گدھوں کو ذبح کرو، ہمارے پھل
کھا جاؤ، اور ہماری عورتوں کو مارو؟ اس پر رسول اللہ صلعم نے عوف بن عوف کو حکم دیا کہ
لشکر میں اجتمعوا للصلوٰۃ کی منادی کریں جب تمام لشکر جمع ہو گئے تو حضورؐ کھڑے
ہوئے اور فرمایا:۔

اعجب احدکم متکأ علی اریکتہ قد یظن کیا تم میں کا کوئی شخص تخت غرور پر بیٹھا یہ سمجھ رہا ہے کہ اللہ نے سوائے ان
ان اللہ لم یحرم شیئا الا ما فی ھذا القرآن؟ چیزوں کے جو قرآن میں حرام کی گئی ہیں کوئی اور چیز حرام نہیں
الا وانی واللہ قد وعظت وامرت ونھیت عن اشیاء انھا لمثل القرآن او اکثر، وان اللہ تعالیٰ لم یحل لکم
کی قسم میں جو کچھ تم کو نصیحت کرتا ہوں اور جو امر و نہی کے احکام دیتا ہوں وہ بھی قرآن کی طرح یا اس سے
ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن اھل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھس جاؤ ان
ولا ضرب نساءھم ولا اکل ثمارھم کی عورتوں کو مارو پیٹو، اور ان کے پھل کھا جاؤ حالانکہ
اذا اعطوکم الذی علیھم ان پر جو کچھ واجب تھا وہ تمہیں دے چکے،

ایک دفعہ جہاد میں لشکر نے کچھ بکریاں لوٹ لیں اور ان کا گوشت پکا کر کھانا پایا آنحضرت کو خبر ہوئی تو آپ نے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا ان النھبۃ لیست باحل من المیتۃ لوٹ گھسوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے،

عبداللہ بن یزید روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم نے لوٹے ہوئے مال کو حرام قرار دیا، نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النھبی والمثلۃ،

اگر راستہ میں دودھ دینے والے جانور مل جائیں تو ان کا دودھ دوہ کر پینے کی بھی اجازت نہ تھی تاوقتیکہ ان کے مالکوں سے اجازت نہ لے لیجائے، شدید ضرورت کی حالت میں صرف اتنی اجازت تھی، کہ بآواز بلند تین مرتبہ پکار دو تاکہ اگر کوئی مالک ہو تو آجائے، اور جب کوئی نہ آئے تو پی لو،

تباہ کاری کی ممانعت فوج کی پیش قدمی کے وقت فصلوں کو خراب کرنا، کھیتوں کو تباہ کرنا، بستیوں میں قتل عام، اور آتش زنی کرنا جنگ کے معمولات میں سے ہے، مگر اسلام اس کو فساد سے تعبیر کرتا ہے اور سختی کے ساتھ ناجائز قرار دیتا ہے، قرآن مجید میں آیا ہے،

واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا جب وہ حاکم بنتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین پر فساد
ویھلک الحرث والنسل واللہ لا پھیلائے اور فصلوں اور نسلوں کو برباد کرے مگر اللہ فساد

سلب کرنا یہ ہے کہ جنگ میں مقتول کے کپڑے ہتھیار وغیرہ قاتل سے چھین لیا جائے، اسکے علاوہ بہت سی اور غنیمت کو بھی کہتے ہیں جو باقاعدہ تقسیم سے پہلے لیا جائے،

یحب الفساد (۲۸:۵) کو پسند نہیں کرتا

حضرت ابوبکرؓ نے شام و عراق کی طرف فوجیں بھیجتے وقت جو ہدایت دی تھیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ بستیوں کو ویران نہ کرنا اور نخلستانوں کو خراب نہ کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جنگی ضروریات کا تقاضا ہو تو درختوں کو کاٹنے اور جلا کر میدان صاف کر دینے کی اجازت ہے جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرہ میں کیا گیا، لیکن محض تخریب کی نیت سے ایسا کرنا بالاتفاق ممنوع ہے۔

مخالفین نے غزوۂ بنی نضیر کے واقعہ کو اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ اسلام جنگ میں غارت گری کو جائز رکھتا ہے، خود ہمارے محدثین میں سے بھی بعض نے اس کو حرق النخل و قطع النخیل کے جواز کی دلیل سمجھا ہے، مگر واقعات کی تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی نضیر کی کھجوروں کو کاٹنا درحقیقت محض جنگی ضرورت پر مبنی تھا، دشمن کو نقصان پہونچانا اس سے انتقام لینا ہرگز مقصود نہ تھا، اور جو درخت کاٹے گئے تھے وہ قرآنی تصریح کے مطابق یک خاص قسم کی کھجور کے تھے جس کو لینہ کہتے ہیں۔ ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا (۵:۵) اور سہیلی کا بیان ہے کہ بنی نضیر اس کھجور کو غذا کے کام میں نہ لاتے تھے، بلکہ عجوہ و برنی کو استعمال کرتے تھے، علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ:-

قال السہیلی فی تخصیصھا بالذکر سہیلی خاص طور پر لینہ کا ذکر کئے جانے سے یہ اشارہ کرتا ہے ایماءٌ الی ان الذی یجوز قطعہٗ من ہے کہ دشمن کے درختوں میں سے صرف انہیں کو کاٹنا شجر العدو ما لا یقتاتون معتادًا للاقتیات جائز ہے جو غذا کے کام میں نہ آتے ہوں، کیونکہ بنو نضیر لانھم کانوا یقتاتون العجوۃ والبرنی عجوہ اور برنی کو کھایا کرتے تھے، لینہ کو نہیں کھاتے دون اللینۃ[1] تھے۔

پھر واقعہ کی نوعیت بھی وہ نہیں ہے جو بیان کی جاتی ہے۔ عام راویوں نے تو یہ دیکھ کر کہ آنحضرت صلعم خود محاصرہ میں موجود تھے، اور آپؐ کی موجودگی میں فوجوں نے درخت کاٹے اور جلائے تھے، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ یہ کام آپؐ ہی کے حکم یا اجازت سے کیا گیا، لیکن ابن عباسؓ نے صاف تصریح کی ہے کہ مسلمانوں نے محاصرہ کی ضروریات سے کاٹا اور

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۴

بعد ان کو ڈر ہوا کہ ہم پر کوئی عذاب نہ آجائے کیونکہ معلوم نہیں کہ اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اھل ان فیما قطعنا من اجر واھل علینا فیما ترکنا من وزر؟ چنانچہ انھوں نے جا کر رسول اللہ صلعم سے استفتا کیا اور اس پر آیت اتری کہ ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھا فباذن اللہ "لینہ کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا اور جو کچھ چھوڑ دیا سب اللہ ہی کے اذن سے تھا"

جابر نے بھی یہی روایت کی ہے کہ درخت کاٹنے کے بعد لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پوچھتے ہوئے آئے کہ یا رسول اللہ ھل علینا ثم فیما قطعنا او علینا وزر فیما ترکنا؟ یا رسول اللہ ہم نے جو کچھ کاٹ دیا یا چھوڑ دیا ہے، اس کا کوئی گناہ تو ہم پر نہیں ہے؟ اس پر یہ آیت اتری کہ ما قطعتم من لینۃ الآیۃ

مجاہد نے اس قول کی تائید کرتے ہوئے آیت مذکورہ کی تفسیر یہ کی ہے کہ بعض مہاجرین درختوں کو کاٹنے لگے تھے، اور بعض نے ان کو چھوڑ دیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کر کے دونوں کے فعل کو درست قرار دیا، اس تفسیر کے مطابق آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم میں سے جنھوں نے محاصرہ کو موثر بنانے کی نیت سے لینہ کے درخت کاٹے وہ بھی حق پر ہیں، اور جنھوں نے اس فعل کو فساد سمجھ کر انھیں چھوڑ دیا وہ بھی حق پر ہیں، کیونکہ دونوں نے اللہ کے ایک ایک حکم کی پیروی کی۔

محمد بن اسحٰق کی تحقیق یہ ہے کہ غزوۂ بنی نضیر میں جب اس طرح درختوں کو کاٹا جانے لگا تو بنو قریظہ نے آپ کو کہلا بھیجا کہ "اے محمدؐ! تم تو فساد کو منع کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں اصلاح کرنے آیا ہوں، پھر یہ درخت کیوں کاٹ رہے ہو؟ کیا یہ اصلاح ہے؟" اس پر آنحضرت صلعم اور مسلمان متفکر ہوئے، اور اللہ نے ان کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی کہ ما قطعتم من لینۃ الآیۃ یعنی جو کچھ تم نے کاٹا، اور جو کچھ چھوڑا سب اللہ کے اذن سے تھا،

بہر صورت واقعات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلعم نے قطع اشجار کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ فوج نے محاصرہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر بلا اجازت چند درخت کاٹ لئے تھے، اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اس بنا پر صحیح قرار دیا تھا کہ درخت کاٹنے والوں

کی نیت تخریب و فساد کی تھی بعض فقہاء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ حکم رعایت کے موقع کے لئے تھا، اور اس خاص حکم سے یہ عام جواز نہیں نکل سکتا کہ جب بھی جنگی ضروریات متقاضی آئیں تو دشمن کے درختوں کو کاٹا اور جلایا جائے، چنانچہ امام اوزاعی، لیث، اور ابو ثور اسی طرف گئے ہیں لیکن جمہور محققین کا مذہب یہ ہے کہ تمام جنگی ضروریات کے لئے محض حسب ضرورت ایسا کرنا جائز ہے، رہا تخریب و غارت گری کی نیت سے کرنا تو اس کے حرام و ناجائز ہونے پر سب متفق ہیں، علامہ ابن جریر نے اوزاعی اور لیث کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

ان النهی محمول علی القصد لذالک ممانعت تو وہیں عمداً تخریب کی کیگئی ہے، بخلاف بخلاف ماذا اصابوذالک فی خلال اس نقصان کے جو دوران قتال میں ان کو پہونچ القتال کما دفع فی نصب المنجنیق علی جائے جیسا کہ حالت پر منجنیق سے سنگ باری کرتے الطائف، وقت ہوا۔

امام احمد بھی یہی کہتے ہیں کہ:۔

قد تکون فی مواضع لا یجدون منه یہ ایسے مواقع پر ہو سکتا ہے جبکہ کاٹنا اور جلانا بالکل بدًا فاما بالبعث فلا تحرق، ناگزیر ہو ورنہ بلا ضرورت نہیں جلانا چاہئے۔

اس قسم کی ناگزیر تباہ کاری پر کسی طرح اعتراض نہیں کیا جا سکتا، موجودہ زمانہ کے توپوں جنگ میں بھی محاصرہ کو موثر بنانے اور محصورین کو درختوں اور عمارتوں کی آڑ میں پناہ لینے سے روکنے کے لئے درختوں کو کاٹنا عمارتوں کو توڑنا حتی کہ بستیوں تک کو جلانا جائز رکھا گیا ہے[1]

مثلہ کی ممانعت، دشمن کی لاشوں کو بے حرمت کرنے اور ان کے اعضائے قطع و برید کرنے کو بھی اسلام نے سختی سے منع کیا، عبد اللہ بن یزید انصاری روایت کرتے ہیں کہ:۔

نهی النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ کے مال اور مثلہ (قطع النهبی و المثلة، اعضاء) سے منع فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوجوں کو بھیجتے وقت جو ہدایات دیا کرتے تھے ان میں بتاکید فرماتے اغزوا ولا تغلوا ولا تمثلوا بد عہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو،

---

[1] فتوح البلدان ص ۴۷۱

قتل بے گناہ کی ممانعت فتح مکہ کے موقع پر آنحضرت صلعم جب شہر میں داخل ہونے لگے تو فوج کے

[illegible]

لا یجھز علی جریح ولا یتبع کسی مجروح پر حملہ نہ کیا جائے، کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا
مدبر ولا یقتل اسیر ولا من جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، اور جو اپنے گھر کا دروا
غلق بابہ فھو آمن بند کرلے وہ امان میں ہے،

حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ ایک اسیر کو قتل کریں، اس پر انھوں نے فرمایا کہ اللہ نے ہمکو اس کی تو اجازت نہیں دی، البتہ یہ حکم دیا ہے کہ جو قیدی گرفتار ہو کر آئیں ان کو یا تو بطریق احسان چھوڑ دو یا فدیہ لیکر رہا کردو، وما امرنا بھذا الا بقول اللہ تعالیٰ حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء،

قتل سفیر کی ممانعت، سفرا اور قاصدوں کے قتل کو بھی آنحضرت صلعم نے منع فرمایا، مسیلمہ کذاب کا قاصد مجاعہ بن الحارث جب اس کا گستاخانہ پیغام لیکر حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا:-

ولولا ان الرسل لا تقتل لضربت عنقک اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا،

اسی اصل سے فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ جب کوئی شخص اسلامی سرحد پر پہونچ کر بیان کرے کہ میں فلاں بادشاہ کا سفیر ہوں اور بادشاہ عرب کے پاس پیغام لیکر بھیجا گیا ہوں تو اس کو امن کے ساتھ داخلہ کی اجازت دیجائے، اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کیجائے، اس کے مال و متاع خدم و حشم حتی کہ سلاح سے بھی تعرض نہ کیا جائے، الا اس صورت میں کہ وہ اپنا سفیر ہونا ثابت نہ کرسکے، بعض فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ اسلامی حکومت میں رہ کر زنا اور چوری بھی کرے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی،

بدعہدی کی ممانعت غدر، نقض عہد، اور معاہدین پر دست درازی کرنے کی برائی میں بے شمار احادیث آئی ہیں، جن کی بنا پر یہ فعل اسلام میں بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے، عبداللہ بن عمرو رضؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

من قتل معاھدا لم یرح رائحۃ جو کوئی کسی معاہد کو قتل کریگا اسے جنت کی بو تک

لہ فتوح البلدان صفحہ ۴۰ ۲ کتاب الخراج صفحہ ۱۱۶

اعنده وان سر یحبها لتوجد من نصیب نہ ہوگی یہ کہ کسی کی خوشی ہو اور اس کی خوشی
مسیرتہ مرجبین عاما ہے بھی محسوس ہوتی ہے

ایک دوسری حدیث میں نہیں جبہ اللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ:-

اربع خلال من کن فیہ کان منافقا خالصا من اذا حدث کذب واذا وعد اخلف واذا عاھد غدر واذا خاصم فجر؛

چار خصلتیں ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہوگا۔ ایک یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے تیسرے یہ کہ جب معاہدہ کرے تو اس کو توڑ دے۔ چوتھے یہ کہ جب جھگڑے تو گالیاں دے،

ایک اور حدیث میں ہے کہ:-

لکل غادر لواء یوم القیامۃ یرفع لہ بقدر غدرہ الا ولا غادر اعظم غدرا من امیر عامۃ

ہر غدر کی بے ایمانی کا اعلان کرنے کے لئے قیامت کے دن ایک جھنڈا ہوگا جو اس کے غدر کا ہم قدر ہوگا۔ اور یہ کہ جو سردار قوم غدر کرے اس سے بڑا کوئی غدر نہیں ہے

ایک مرتبہ امیر معاویہؓ بلاد روم پر حملہ کرنے کے لئے جا رہے تھے اور ابھی معاہدہ صلح کی مدت منقضی نہ ہوئی تھی۔ امیر معاویہؓ کا ارادہ تھا کہ مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں مگر عمرو بن عنبسہؓ نے ایام موعدہ میں جنگ کی تیاری اور سرحدوں کی طرف فوج کی روانگی کو بھی بدعہدی سے تعبیر کیا اور امیر کے پاس دوڑتے ہوئے اور یہ پکارتے ہوئے پہونچے کہ معاویہ بدعہدی نہ کرو۔ معاویہ نے سبب پوچھا تو کہا کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:-

من کان بینہ وبین قوم عھد فلا یحلن عقدۃ ولا یشدنھا حتی یمضی امدھا او ینبذ الیھم علی سواء

جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کرے تا وقتیکہ اس کی مدت گذر نہ جائے یا پھر برابر کا خون ہو تو برابری کو ملحوظ رکھکر اس کو ختم معاہدہ کا اعلان دیدے،

بدنظمی و انتشار کی ممانعت: اہل عرب کی عادت تھی کہ جب جنگ کو نکلتے تو راستہ میں جو ملتا اسے تنگ کرتے، اور جب کسی جگہ اترتے تو ساری منزل پر پھیل جاتے تھے یہاں تک

کہ راستوں پر چلنا مشکل ہوجاتا تھا، داعی اسلام نے اگر اس کی بھی ممانعت کردی، ایک مرتبہ جب آپ زکوٰۃ کو تقسیم فرما رہے تھے تو آپ کے پاس شکایت آئی کہ فوج میں عہد جاہلیت کی سی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے اور لوگوں نے منزل کو تنگ کر رکھا ہے، اس پر آپؐ نے منادی کرائی کہ من ضیق منزلا او قطع طریقا فلا جهاد له، جو کوئی منزل کو تنگ کریگا یا راہ گیروں کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں ہوگا، ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ ان نفر قلکم فی هذه الشعاب والاودیة انما ذالکم الشیطان، تمہارا اس طرح وادیوں اور گھاٹیوں میں منتشر ہوجانا یہی شیطانی فعل ہے،

ابو ثعلبہ خشنی کا بیان ہے کہ اس کے بعد یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ جب اسلامی فوج کسی جگہ اترتی تو اس کا گنجان پڑاؤ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک چادر تان دی گئی تو سب اس کے نیچے آجائیں گے،

شور و ہنگامہ کی ممانعت عرب کی جنگ میں اس قدر شور و ہنگامہ برپا ہوتا تھا کہ اس کا نام ہی وغی پڑ گیا تھا، اسلام لانے کے بعد بھی عربوں نے یہی طریقہ برتنا چاہا، مگر داعی اسلام نے اس کی اجازت نہ دی، ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ:-

کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنا اذا اشرفنا علی واد هللنا وکبرنا، ارتفعت اصواتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا ایها الناس ارتبعوا علی انفسکم فانکم لا تدعون اصم ولا غائبا، انه معکم انه سمیع قریب،	ہم رسول اللہ صلعم کے ساتھ تھے اور جب کسی وادی پر پہونچتے تھے تو زور شور سے تکبیر و تہلیل کے نعرے بلند کرتے تھے اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اے لوگو! وقار کے ساتھ چلو، تم جس کو پکار رہے ہو وہ نہ بہرا ہے نہ غائب، وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سب کچھ سنتا ہے اور بہت ہی قریب ہے،

وحشیانہ افعال کے خلاف عام ہدایات فوجوں کی روانگی کے وقت جنگی برتاؤ کے متعلق ہدایات دینے کا طریقہ جس سے انیسویں صدی کے وسط تک مغربی دنیا نابلد تھی، ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے امی پیغمبرؐ نے ایجاد کیا تھا، داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ

تھا کہ جب آپ کسی سردار کو جنگ پر بھیجتے تو خود اس کی فوج کو پہلے تقوی اور خوف خدا کی نصیحت کرتے، پھر فرماتے :۔

اغزوا باسم اللہ وفی سبیل اللہ، قاتلوا من کفر باللہ، اغزوا ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا، ولا تقتلوا ولیدا	جاؤ اللہ کا نام لیکر اور اللہ کی راہ میں کفار سے لڑو مگر جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرو، غنیمت میں خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو، اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو۔

اس کے بعد فوج کو ہدایت کرتے کہ دشمن کے سامنے تین چیزیں پیش کرنا، اول اسلام، دوسرے جزیہ، تیسرے جنگ، اگر وہ اسلام قبول کرے تو پھر اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ، اگر جزیہ دیکر اطاعت قبول کرے تو اس کی جان و مال پر کسی قسم کی تعدی نہ کرو، لیکن اگر وہ اس سے بھی انکار کرے تو اللہ سے مدد مانگ کر جنگ کرو۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایتیں کی تھیں جنکو تمام مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے، وہ ہدایات یہ ہیں :۔

(۱) عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کئے جائیں،

(۲) مثلہ نہ کیا جائے،

(۳) راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے، اور نہ ان کے معابد مسمار کئے جائیں

(۴) کوئی پھلدار درخت نہ کاٹا جائے اور نہ کھیتیاں جلائی جائیں،

(۵) آبادیاں ویران نہ کی جائیں،

(۶) جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے،

(۷) بدعہدی سے ہر حال میں احتراز کیا جائے،

(۸) جو لوگ اطاعت کریں ان کی جان و مال کا وہی احترام کیا جائے جو مسلمانوں کی جان و مال کا ہے،

(۹) اموال غنیمت میں خیانت نہ کیجائے،

(۱۰) جنگ میں پیٹھ نہ پھیری جائے،

اصلاح کے نتائج : ان احکام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے جنگ کو تمام

وحشیانہ قہاری سے پاک کر دیا، جو اس عہد میں جنگ کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔ اسیرا
جنگ اور سفرا کا قتل، سابقین کا قتل، مجروحین جنگ کا قتل، غیر اہل قتال کا قتل، اعضا کی
تقطیع و بریدہ، مردوں کی بے حرمتی، آگ کا عذاب، لوٹ مار اور قطع طریق، فصلوں اور بستیوں کی تخریب
بدعہدی و پیمان شکنی، فوجوں کی پراگندگی و بدنظمی، لڑائی کا شور و ہنگامہ، سب کچھ آئین جنگ کے خلاف
قرار دیدیا گیا، اور جنگ صرف ایک ایسی چیز رہ گئی جسمیں شریف اور بہادر آدمی دشمن کو کم سے کم
نقصان پہونچا کر اس کے شر کو دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس اصلاحی تعلیم نے ۸ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم الشان نتائج پیدا کئے ان کا بہترین
موازنہ فتح مکہ ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی فتح اور خصوصاً دشمن کے کسی بڑے شہر کی تسخیر کے موقع
پر وحشی عرب ہی میں نہیں بلکہ متمدن روم و ایران میں بھی جو کچھ ہوتا تھا اسے پیش نظر رکھئے، اور
اس کے بعد غور کیجئے کہ وہی عرب جو چند برس پہلے تک جاہلیت کے طریقوں کے عادی تھے،
اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جس سے ۸ ہی برس پہلے ان کو بری طرح بیکلیفہ
دے دے کر نکالا گیا تھا، اور جنھیں دشمنوں پر فتح حاصل کرتے ہیں، جنھوں نے ان فاتحوں کو گھر
سے بے گھر کرنے ہی پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ جس جگہ انھوں نے جا کر پناہ لی تھی وہاں سے
بھی ان کو نکال دینے کے لئے کئی مرتبہ چڑھ کر آئے تھے، ایسے شہر اور ویسے دشمنوں پر غلبہ
حاصل ہوتا ہے مگر کوئی قتل عام نہیں کیا جاتا، کسی قسم کی لوٹ مار نہیں ہوتی، کسی کی
جان و مال اور عزت و آبرو سے تعرض نہیں کیا جاتا، پرانے اور کٹے دشمنوں میں سے بھی کسی
پر انتقام کا ہاتھ نہیں اٹھتا، تسخیر شہر کی پوری کارروائی میں صرف ۲۴ آدمی مارے جاتے ہیں
اور وہ بھی اس وقت جبکہ دست درازی میں پیشقدمی ان کی طرف سے ہوئی، سالار فوج
داخلہ سے پہلے اعلان کر دیتا ہے کہ جب تک تم پر کوئی ہاتھ نہ اٹھاوے تم بھی ہاتھ نہ اٹھانا،
شہر میں داخل ہوتے ہی منادی پکاری جاتی ہے کہ جو کوئی اپنا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیگا اسے
امان ہے، جو کوئی ہتھیار ڈال دیگا اسے امان ہے، اور جو کوئی ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیگا
اسے بھی امان ہے، پھر تسخیر کے بعد فاتح سردار کے سامنے وہ سب دشمن ایک ایک کر کے
لائے جاتے ہیں جنھوں نے اسی شہر میں اس کو تیرہ برس تک انتہائی اذیتیں پہونچانے

کے بعد آخر جب وحشی پر مجبور کیا تھا، اور جو گھر سے نکالنے کے بعد اس کو اور اس کے ساتھیوں کو دنیا سے مٹانے کے لئے بدر و احد اور جنگ احزاب میں بڑی بڑی تیاریاں کرکے گئے تھے، یہ دشمن گردنیں جھکائے ہوئے آکر کھڑے ہوتے ہیں، فاتح پوچھتا ہے "اب تم کیا امید کرتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا کرونگا"، مفتوح شرمساری کے ساتھ جواب دیتے ہیں "تو فیاض بھائی ہے، اور فیاض بھائی کا بیٹا ہے"، "اخ کریم و ابن اخ کریم"، اس پر فاتح کہتا ہے کہ جاؤ، تم آزاد ہو، آج تم سے کوئی باز پرس نہیں، "لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء"۔ یہ صرف جان ہی کی بخشش نہ تھی، صرف مال کی بھی بخشش نہ تھی، بلکہ اس کے ساتھ فاتح اور اس کی فوج نے ان جائدادوں کو بھی انھیں کے حق میں معاف کر دیا، جو ۸ برس پہلے اس کی ملک تھیں،

تاہم ان میں کچھ ایسے شدید دشمن بھی تھے جن کی ایذا رسانی حد برداشت سے بڑھی ہوئی تھی، فاتح نے شہر میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیدیا تھا کہ ان میں سے چند کو اسے قتل کر دینا، مگر جب ان پر قابو چل گیا، تو وہ بھی اس خلق عظیم و رحیم سے فیض نہ پا سکے، ہبار بن اسود جو فاتح کی جوان بیٹی سیدہ زینبؓ کا قاتل تھا عاجزی کے ساتھ مسلمان ہو اور معاف کیا گیا، وحشی بن حرب جس نے فاتح کے نہایت محبوب چچا کو قتل کیا تھا مسلمان ہوا اور بخشا گیا، ہند بن عتبہ جو حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی تھی، اپنی انتہائی شقاوت کے باوجود فاتح کے غضب سے محفوظ رہی، اور آخر عفو و درگذر کا دامن اس کے لئے بھی وسیع ہوا، سب سے بڑے دشمن اسلام ابوجہل کا بیٹا عکرمہ جو خود بھی بڑا دشمن اسلام تھا مسلمان ہو کر آیا، اور جلیل القدر صحابہؓ کی صف میں شامل کیا گیا، ان کے علاوہ عبداللہ بن ابی سرح، سارہ اور کعب بن زبیر بھی جو سب کے سب فاتح کے جانی دشمن تھے معاف کئے گئے، وحشی بن بقیہ، عبدالعزی بن خطل اور مقیس بن صبابہ قتل کئے گئے، سودہ بھی دشمنی کے جرم میں نہیں بلکہ خون کے قصاص میں،

یہ تھی وہ اصلاح جو صرف ۸ سال کے اندر دنیا کی سب سے زیادہ وحشی قوم میں کی گئی تھی، آج اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی دنیا کی مہذب ترین قومیں جب کسی دشمن

کے شہر میں فاتحانہ داخل ہوتی ہیں، تو سب کو معلوم ہے کہ مفتوح شہر پر کیسے کیسے مظالم توڑے جاتے ہیں، بیسویں صدی کی جنگ عظیم میں تہذیب مغرب کے علم برداروں نے ایک دوسرے کے ملک میں گھس کر جو تباہیاں پھیلائیں ان کا نظارہ دیکھنے والی آنکھیں ابھی تک موجود ہیں۔ اس کے مقابلہ میں غور کرو کہ اب سے ۱۳ سو برس پہلے کے تاریک زمانہ میں جبکہ دنیا کی تہذیب کا علم خسرو پرویز اور ہرقل جیسے بادشاہوں کے ہاتھ میں تھا عرب کی ایک جاہل اور بادیہ نشین قوم نے اپنے بدترین دشمنوں کے شہر میں داخل ہو کر جو شریفانہ برتاؤ کیا، وہ کیسی زبردست اصلاح، کیسی اعلیٰ اخلاقی تربیت، اور کیسے صحیح و مضبوط عسکری ضبط و نظم کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔

جنگ کے مہذب قوانین

یہ تو ان چیزوں کا ذکر تھا جو پہلے رائج تھیں، اور اسلام نے ان کو بند کیا، اب ہم ان چیزوں پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور اسلام نے ان کو جاری کیا، ہم کو دیکھنا ہے کہ اسلام نے جنگ کے پچھلے طریقوں کو موقوف کر کے خود کس قسم کے قوانین مقرر کئے، اس کے لئے ہم صرف ان اصولی احکام کو لیں گے جن پر قوانین جنگ کی بنیاد قائم ہے، باقی رہے فروعی احکام سو وہ ائمہ وقت اور فقہائے عصر پر چھوڑ دیئے گئے ہیں، کہ اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اصول و قواعد کلیہ سے مستنبط کر لیں اس لئے جو جزئی تفصیلات فقہ کی قدیم کتابوں میں مذکور ہیں ان پر بند اں انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

اطاعت امام، جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے فوجی نظام میں مرکزیت پیدا کی، اور فوج میں سمع و طاعت کا زبردست قانون جاری کیا، [illegible] عہد حرب میں اولین اور اہم ترین قاعدہ یہ ہے کہ کوئی خفیف سے خفیف جنگی کارروائی بھی امام کی اجازت کے بغیر نہیں کی جا سکتی، دشمن کو قتل کرنا، اس کے مال پر قبضہ کر لینا اس کو قید کرنا، اس کے جنگی آلات کو برباد کر دینا، فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود ایسی حالت میں سخت ناجائز بلکہ گناہ ہو جاتا ہے، جب کہ امام کے حکم و اجازت کے بغیر ایسا کیا جائے، جنگ بدر سے پہلے جب عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلعم کی اجازت کے بغیر قریش کی ایک

جماعت سے جنگ کی تھی اور کچھ مال غنیمت لوٹ لائے تھے۔ قوم پر آنحضرت صلعم نے سخت ناراضی کا اظہار کیا، اور ان کے مال غنیمت کو ناجائز قرار دیدیا تھا، اور صحابہؓ کی جماعت نے ان کو یہ کہکر ملامت کی تھی کہ صنعتم ما لم تومروا بہ، تم نے وہ کام کیا ہے جس کا تمھیں حکم نہیں دیا گیا تھا، حضرت خالدؓ نبی جذیمہ کی طرف دعوت اسلام کے لئے بھیجے گئے، اور وہاں انھوں نے امام کی اجازت کے بغیر ایک غلط فہمی کی بنا پر قتل کا بازار گرم کر دیا، اس کی اطلاع جب رسول اکرم کو ہوئی تو آپؐ شدت غضب سے بیتاب ہو کر کھڑے ہو گئے، اور فوراً حضرت علیؓ کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ اجعل امر الجاھلیۃ تحت قدمیک، تم اس جاہلیت کے کام کو جا کر مٹاؤ۔

اسلام نے اطاعت امام کو خود خدا اور رسول کی اطاعت کے برابر ضروری قرار دیا ہے اور امام کی نافرمانی کو وہی درجہ دیا ہے جو رسول خدا کی نافرمانی کا ہے، حدیث میں ہے:

الغزو غزوان، فاما من ابتغی وجہ اللہ واطاع الامام وانفق الکریمۃ واجتنب الفساد فان نومہ ونبھہ اجر کلہ، واما من غزا ریاءً وسمعۃً وعصی الامام وافسد فی الارض فانہ لا یرجع بالکفاف۔

لڑائیاں دو قسم کی ہیں جس شخص نے خاص خدا کی خوشنودی کے لئے جنگ کی، امام کی اطاعت کی، اپنا بہترین مال خرچ کیا، اور فساد سے پرہیز کیا، اس کا سونا اور جاگنا سب اجر کا مستحق ہے، اور جس نے دکھاوے اور شہرت کے لئے جنگ کی، امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد پھیلایا تو وہ برابر بھی نہ چھوٹے گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:

من اطاع امیری فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی۔

جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی، جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا خود مجھ سے نافرمانی کی۔

ف فتح الباری ج ۸ ص ۴۳۔

ان تاکیدی احکام نے جنگ میں یک باقاعدگی پیدا کردی، اور وہ محض ایک خونی کھیل نہیں رہی کہ فوج کا ہر سپاہی فرد فرد لوگوں کی جان و مال کا مختار، اور قتل و غارت گری کا مجاز ہوتا۔ سلامت سے پہلے فوجوں کے سپاہی آزادی کے ساتھ لوٹ مار کیا کرتے تھے، اور غنیم کے ملک میں گھسنے کے بعد ہر سپاہی کو اختیار ہوتا تھا کہ جس کو چاہے قتل کرے، جسے چاہے لوٹ لے، جس گاؤں، اور جس کھیتی کو چاہے جلا دے، اور دشمن قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے جو جی میں آئے کرے۔ خود سکندر کی فوج بھی جس کا ڈسپلن بہت مشہور ہے، اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھی، ایران میں جیشنی کرتے وقت اس کے سپاہیوں نے جس آزادی کے ساتھ ملک کو تباہ کیا تھا اس کے حالات تاریخوں میں محفوظ ہیں، لیکن اسلام نے فوج کے لئے جو قواعد و ضوابط مقرر کئے ان میں افراد فوج کو اس قسم کی آزادی دینے سے قطعاً انکار کر دیا، کیونکہ اسلام کے نزدیک انسانی خون بہانے کی ذمہ داری ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، جس کا نہ ہر شخص متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ ہر شخص اس کے موقع و محل اور ضرورت و عدم ضرورت کا فیصلہ کر سکتا ہے، اسلامی قانون میں جنگ کے تمام اعمال کی ذمہ داری اور امر و نہی کے تمام اختیارات کا حامل ایک "امیر" کو بنایا گیا ہے، اور فوج پر اس کی کامل اطاعت فرض کر دی گئی ہے، یہاں تک کہ کسی سپاہی کو اتنا اختیار بھی نہیں دیا گیا ہے کہ امیر کی اجازت کے بغیر دشمن کی سرزمین سے کسی درخت کے پھل توڑ کر کھائے۔

وفائے عہد اسلامی قانون نے جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں وفائے عہد کی سخت تاکید کی ہے۔ حقیقتہً اخلاقیات اسلام کے قواعد اصلیہ میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ انسان کو سخت سے سخت ضرورت کی حالت میں بھی اپنے عہد پر قایم رہنا چاہئے، بدعہدی سے خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ پہونچتا ہو، اور وفائے عہد سے کتنا ہی شدید نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، اسلام ہر صورت اپنے پیروؤں کو تاکید کرتا ہے، کہ اس فائدے کو چھوڑ دیں اور اس نقصان کو برداشت کریں، کیونکہ نہ بدعہدی کا کوئی بڑے سے بڑا فائدہ اس نقصان کی تلافی کر سکتا ہے جو اس سے انسان کے اخلاق و روحانیت کو پہونچتا ہے، اور نہ وفائے عہد کا کوئی بڑے سے بڑا نقصان اس اخلاقی و روحانی فائدے کو کم کر سکتا ہے، جو اس کے ساتھ توام ہے، یہ قاعدہ

کلیہ جس طرح انفرادی و شخصی زندگی پر حاوی ہے اسی طرح اجتماعی و قومی زندگی پر بھی حاوی ہے، آج کل دنیا میں یہ دستور ہوگیا ہے کہ جن کاموں کو ایک شخص اپنی ذاتی حیثیت میں سخت شرمناک سمجھتا ہے، انھیں ایک قوم اپنی اجتماعی حیثیت میں بے تکلف کر گذرتی ہے اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھتی، سلطنتوں کے مدبرین اپنی ذاتی حیثیت میں کیسے ہی اخلاق فاضلہ و تہذیب کاملہ کے مالک ہوں مگر اپنی سلطنت کے فائدے اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے جھوٹ، بے ایمانی کرنا، عہد توڑ دینا، وعدہ خلافیاں کرنا، بالکل جائز سمجھتے ہیں، اور بڑی بڑی مدعی تہذیب سلطنتیں ایسی بیباکی کے ساتھ یہ حرکات کرتی ہیں کہ گویا یہ کوئی عیب ہی نہیں ہے، لیکن اسلام اس معاملہ میں، فرد اور جماعت، رعیت اور حکومت، شخص اور قوم میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اور بدعہدی کو ہر حال میں ہر غرض کے لئے ناجائز قرار دیتا ہے، خواہ وہ شخصی فائدے کے لئے ہو یا قومی فائدے کے لئے،

واوفوا بعهد الله اذا عاهدتم ولا تنقضوا الايمان بعد توكيدها وقد جعلتم الله عليكم كفيلا، ان الله يعلم ما تفعلون ولا تكونوا كالتي نقضت غزلها من بعد قوة انكاثا، تتخذون ايمانكم دخلا بينكم ان تكون امة هي اربى من امة (۱۶: ۱۳)	اللہ کے عہد کو پورا کرو جب کہ تم کسی سے معاہدہ کرلو اور اپنی قسموں کو مضبوط کرنے اور اللہ کو ان پر ضامن کرنے کے بعد نہ توڑو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کا حال بالیقین معلوم ہے، تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنا ہی کاتا ہوا تاگا محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کردیا، تم اپنی قسموں کو باہمی دغا کے طور پر استعمال کرتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے مال و عزت میں بڑھ جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بکثرت آئی ہیں، یہاں ان سب کا احاطہ مقصود نہیں ہے، احکام کی تصریح کے لئے صرف چند آیات نقل کی جاتی ہیں:-

الذين يوفون بعهد الله ولا ينقضون الميثاق، والذين يصلون ما امر الله به ان يوصل ..... اولئك	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد و پیمان کو نہیں توڑتے، اور اللہ نے جس رشتہ کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے قائم رکھتے ہیں ..... ان کے لئے

لهم عقبى الدار (۱۳ : ۲۲)	انجام ہے،
بلى من اوفى بعهده واتقى فان الله يحب المتقين ان الذين يشترون بعهد الله ثمنا قليلا اولئك لا خلاق لهم فى الاخرة ولا يكلمهم الله ولا ينظر اليهم يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب عظيم (۳ : ۸)	ہاں! جس شخص نے اپنا عہد پورا کیا اور پرہیزگاری اختیار کی سو اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے، اور جو لوگ عہد کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، ان کے لئے آخرت میں کوئی عزت نہیں ہے، اللہ ان سے نہ کلام کرے گا نہ قیامت کے دن ان کی طرف توجہ کرے گا، اور نہ ان کو پاکیزگی بخشے گا، ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا،
والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصابرين فى البأساء والضراء وحين البأس اولئك الذين صدقوا واولئك هم المتقون (۲ : ۱۷۷)	اور وہ لوگ جو عہد کرنے کے بعد اسے پورا کرتے ہیں اور اور وہ جو سختی و تکلیف اور جنگ کی مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں، وہی سچے لوگ ہیں، اور وہی پرہیزگار ہیں،
واذا قلتم فاعدلوا ولو كان ذا قربى وبعهد الله اوفوا ذلكم وصاكم به لعلكم تذكرون (۶ : ۱۵۲)	جب تم بولو تو انصاف کی بات بولو، خواہ وہ شخص جس کے خلاف تم کہہ رہے ہو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور اللہ کے عہد کو پورا کرو، اللہ نے اس کی تم کو نصیحت کی ہے شاید کہ تم نصیحت پکڑو،
واوفوا بالعهد ان العهد كان مسئولا (۱۷ : ۳۴)	عہد پورا کرو کیونکہ عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی،

اس تعلیم کا جو عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیرت میں پیش کیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عہد کی کیا قیمت ہے، جنگ بدر میں جب کہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی، اور مسلمان اپنی جمعیت بڑھانے کے لئے ایک ایک آدمی کے حاجت مند تھے، حذیفہ بن الیمان اور ان کے والد حسیل بن جابر لشکر اسلام کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں کفار نے ان کو روک لیا اور کہا کہ تم ضرور محمدؐ کی مدد کو

جارہے ہو، انھوں نے کہا کہ نہیں ہم تو مدینہ کا رخ کرتے ہیں اس پر کفار سے یہ عہد کر چھوڑ دیا کہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے، یہ دونوں کفار سے چھوٹ کر بدر کے میدان میں حضرت صلعم کے پاس پہونچے اور یہ قصہ دہرایا، آپ نے سنکر حکم دیا کہ انصرفا الی لھم لعھدھم ونستعین اللہ علیھم،، تم مدینہ چلے جاؤ، ہم عہد کو پورا کریں گے، اور ان کے مقابلہ میں اللہ سے مدد مانگیں گے۔

صلح حدیبیہ میں جو شرائط کفار قریش سے طے ہوئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اگر مکہ سے کوئی شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس جائیگا تو مسلمان اس کو واپس کردیں گے، اور اگر مسلمانوں کا کوئی آدمی مکہ جائیگا تو اسے واپس نہ کیا جائیگا، یہ معاہدہ ابھی لکھا ہی جارہا تھا کہ ابوجندل بن سہیل کفار مکہ کی قید سے کسی طرح چھوٹ کر لشکر اسلام میں پہونچ گئے، پاؤں میں بیڑیاں تھیں، بدن پر مار کے نشان تھے، چہرے پر شدید مصائب کے آثار ہویدا تھے، رسول اللہ صلعم کے سامنے آکر فریاد کی کہ للہ مجھکو اس مصیبت سے نکالئے، مسلمان ان کی یہ حالت دیکھکر بے چین ہوگئے، چودہ سو تلواریں رسول اللہ صلعم کے اشارہ کی منتظر تھیں، اسلامی اخوت ایک مسلمان بھائی کو قید سے چھڑانے کے لئے مضطرب تھی، مگر شرائط صلح طے ہوچکی تھیں، معاہدہ لکھا جارہا تھا، اس لئے اللہ کے رسول صلعم نے ابوجندل کو چھڑانے سے صاف انکار کردیا، اور فرمایا تو یہ فرمایا:-

"ابوجندل صبر کر، اللہ تیرے لئے رہائی کی کوئی صورت ضرور نکالے گا"

مدینہ واپس ہوئے تو ایک اور صحابی ابوبصیر کفار مکہ کی قید سے چھوٹ کر آپ کے پاس پہونچے، ان کے پیچھے پیچھے کفار بھی دو آدمی یہ پہونچ گئے جنھوں نے حاضر ہوکر ابوبصیر کی واپسی کا مطالبہ کیا، رسول کریم کو معلوم تھا کہ مکہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا ظالمانہ سلوک ہوتا ہے، وہ خصوصاً بھاگ کر جانے والے قیدی کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا، مگر پاس عہد سب پر مقدم تھا آپ نے مظلوم مسلمان کو ظالموں کے حوالہ کردیا، اور عہد کو توڑنا پسند نہ کیا۔

اس قسم کے بے شمار واقعات عہد رسالت اور عہد صحابہؓ کی تاریخ میں ملتے ہیں جنکا حاصل یہ ہے کہ

غیر جانبداروں کے حقوق۔ اسلام میں غیر جانبداری (NEUTRALITY) کی

اصطلاح نہیں ہے بلکہ اس کو معاہدہ کے ذیل میں داخل کیا گیا ہے۔ اسلامی قانون تمام غیر قومو کو دو جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے، ایک وہ جن سے معاہدہ ہے، دوسرے وہ جنسے معاہدہ نہیں ہے معاہدین جب تک شرائط معاہدہ پر قایم رہیں گے ان کے ساتھ شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائیگا اور جنگ میں ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائیگا، یہی غیر جانبداری اور نیوٹریلیٹی کا مفہوم ہے، باقی رہے غیر معاہدین، سو خواہ ان سے عملاً جنگ ہو، یا نہ ہو، یعنی وہ برسر جنگ سمجھے جائیں گے، کیونکہ غیر قوموں سے مواوعت اور عدم مواوعت کے بیچ میں کوئی درمیانی حالت اسلام نے تسلیم نہیں کی ہے،

معاہدین کے ساتھ تمام معاملات شرائط معاہدہ کے تابع ہوں گے، مگر اسلام نے مسائل جنگ میں معاہدین کے لئے چند اصولی حقوق متعین کر دیے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) جب تک معاہد قوم عہد پر قایم رہے، اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض کرنا مسلمانوں کے لئے سخت ممنوع ہے،

الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین	مگر وہ مشرکین جنسے تم نے معاہدہ کیا تھا، اور جنھوں نے وفاے عہد میں کوئی کمی نہیں کی، اور تمھارے خلاف کسی کو مدد دی ان کے ساتھ مدت معاہدہ کے ختم ہونے تک تم عہد پر قایم رہو کیونکہ اللہ پرہیزگاری کو پسند کرتا ہے،

(۲) اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت کسی معاہد قوم کے ملک میں آباد ہو، اور وہاں اس پر ظلم ہوتے ہوں، تو اسلامی حکومت ان مسلمانوں کی حمایت نہیں کر سکتی،

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق، واللہ بما تعملون بصیر (۸ : ۷۲)	دار الکفر کے رہنے والے مظلوم مسلمان اگر تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد تم پر فرض ہے، مگر اس موقع کے خلاف مدد نہیں دینی چاہئے، جس سے تمھارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا ہے،

(۳) حالت جنگ میں معاہد قوم کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز کرنا جائز نہیں ہے، اگر دشمن بھاگ کر کسی ایسی قوم کے حدود میں پناہ لے تو اسلامی فوج وہاں اس کا تعاقب نہیں کر سکتی

فان تولوا فخذوهم واقتلوهم حیث	پھر وہ باز نہ آئیں تو انھیں پکڑو اور جہاں پاؤ قتل کرو
ثقفتموهم ولا تتخذوا منهم ولیا ولا	دوست اور مددگار نہ بناؤ سوائے ان لوگوں کے جو کسی ایسی
نصیرا، الا الذین یصلون الی قوم	قوم سے جا ملیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔
بینکم وبینهم میثاق (۴: ۱۲)	

یہ قواعد کلیہ غیر جانبداری کے قانون کی بنیاد ہیں، ان سے جزئی احکام حسب ضرورت مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔

اعلان جنگ، جب کوئی قوم شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی کرے، اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرے، تو اس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ اس کو باضابطہ الٹی میٹم دیا جائے، اور ایفائے عہد کے لئے کافی مہلت دینے کے بعد جنگ چھیڑی جائے۔

واما تخافن من قوم خیانة فانبذ	اگر تمھیں کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا خوف ہو تو انکا
الیهم علی سواء (۸: ۷)	معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھکر ان کی طرف پھینک دو۔

برابری کو ملحوظ رکھکر معاہدہ کو پھینک دینے کا مطلب مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کو صاف طور پر مطلع کر دیا جائے کہ تمھارے معاندانہ افعال، جیسے ہیں جس کی بنا پر ہمارا تمھارا معاہدہ باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد دیکھا جائے کہ وہ اپنے افعال سے باز آتے ہیں، یا نہیں، اگر وہ پھر بھی باز نہ آئیں تو ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ:-

ای اطرح الیهم عهدهم وذالك	یعنی ان کا معاہدہ ان کی طرف پھینک دو، اور یہ اس طرح
بان یرسل الیهم من یعلمهم بان العهد قد انتقض	کہ انھیں کسی کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ عہد ٹوٹ چکا۔

علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

ای اعلمهم بانك قد نقضت عهدهم حتی یبقی علمك وعلمهم بانك	یعنی ان کو خبر کر دو کہ تم نے معاہدہ فسخ کر دیا ہے تاکہ اس
حرب لهم وهم حرب لك والله	علم میں تم اور وہ برابر ہو جائیں، کہ تم ان کے دشمن اور وہ
لا یحب الخائنین	تمھارے دشمن ہو گئے، اور اب تمھارے اور
	ان کے درمیان کوئی عہد باقی نہیں رہا۔

ای تستوی انت وھم فی ذالت

ازہری کا قول ہے:-

اذا عاھدت قوما فخشیت منھم جب تمہارا کسی قوم سے عہد ہو اور تمہیں اس سے نقضِ عہد
النقض فلا توقع بھم بمجرد ذالک کا خوف ہو جائے، تو یہ خوف ہونے کے ساتھ ہی ان پر
حتی تعلمھم نہ ٹوٹ پڑو، بلکہ پہلے ان کو خبردار کر دو،

فقہائے مجتہدین نے صرف اطلاع دینے کو بھی کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ اس نقضِ عہد کرنے والی قوم کو ایک سال تک مہلت دینے کی بھی سفارش کی ہے تاکہ اگر وہ اپنے معاندانہ رویہ کی اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں اور جنگ سے احتراز ممکن ہو تو یہ امکان ضایع نہ جائے، اس باب میں اسلامی قانون کی صحیح اسپرٹ صدر اول کے ایک واقعہ سے معلوم ہو سکتی ہے، جسمیں خوش قسمتی سے ہم کو بہت سے اکابر فقہا کے فتوے ملتے ہیں، عبد الملک بن صالح کے ایام ولایت میں جب قبرس کے لوگوں نے بدعہدی کی تو اس نے لیث بن سعد، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، موسی بن اعین، ہیثم بن عباس، یحیی بن حمزہ، ابو اسحق فزاری، وغیرہ ممتاز فقہا سے استفسار کیا کہ فانبذ الیھم علی سواء کا حکم اس معاملہ میں جاری ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور ہو سکتا ہے تو کس صورت سے؟ اس پر فقہا نے جو جواب دیئے ان میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

لیث بن سعد نے لکھا:-

"ان کو ایک سال کی مہلت دیجائے تاکہ باہم مشورہ کر لیں، جو کوئی ذمی بنکر بلادِ مسلمین میں آنا چاہے، یہاں آجائے، جو بلادِ روم کی طرف ہجرت کرنا چاہے، وہ وہاں چلا جائے، اور جو قبرس ہی میں رہکر لڑنا چاہے اس سے تم لڑنے کے حق دار ہو"

امام مالک نے لکھا:-

"میری رائے میں فسخِ معاہدہ میں جلدی نہ کرنی چاہیئے، بلکہ ان پر اتمامِ حجت کر لینا چاہیئے اللہ کہتا ہے، فانبذوا الیھم علی سواء، فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم، پس اگر وہ تمہارے ڈھیل دینے پر بھی باز نہ آئیں اور بے وفائی پر اصرار کریں، اور تم دیکھو کہ غدر ان پر ثابت ہے تو پھر تمھیں اختیار ہے کہ ان پر حملہ کر دو"

موسیٰ بن اعین نے لکھا:۔

"اس سے پہلے جب کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں تو حکام نے ہمیشہ مہلت دی ہے بہت ممکن ہے کہ اہل قبرس کے عوام اس فعل میں نہ شریک ہوں جو ان کے خواص کر رہے ہیں، اس لئے میری یہ رائے ہے کہ ان سے عہد قائم رکھا جائے، اور شرائطِ صلح پوری کیجائیں، گو ان میں کچھ مفسد لوگ موجود ہیں"۔

اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ عہد شکنی کرنے والے معاہدین کو کافی مہلت دینی چاہیئے، ان کے عہدِ خلافت میں عمیر بن سعد نے لکھا کہ ہمارے علاقہ میں عربسوس ایک مقام ہے جہاں کے لوگ دشمن کو ہماری خفیہ خبریں پہونچاتے ہیں، اور ہم کو دشمن کی خبریں نہیں دیتے، اس پر حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ پہلے تم ان سے جاکر کہو کہ ہم تم کو ایک بکری کی جگہ دو بکریاں، اور ایک گائے کی جگہ دو گائیں، اور اسی طرح ہر چیز کے عوض دوگنی چیز دیں گے، تم اس جگہ کو چھوڑ دو، اگر وہ مان جائیں تو بہتر، ورنہ ان سے کہدو کہ ہمارا تمھارا عہد ختم ہوا، پھر انھیں ایک سال کی مہلت دو، اور اس مدت کے ختم ہونے پر انھیں وہاں سے نکال دو[1]۔

اسیرانِ جنگ، اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کی ممانعت کی ہے لیکن اسلامی قانون میں ان کے لئے صرف اتنی ہی رعایت نہیں ہے کہ وہ قتل نہ کئے جائیں بلکہ مزید برآں ان کے ساتھ انتہا درجہ کی نرمی و ملاطفت کا بھی حکم دیا ہے، قرآن مجید میں اسیر و مسکین و یتیم کو کھانا کھلانے کی تعریف آئی ہے، اور ایسے نیکوکاروں کا فعل قرار دیا گیا ہے جو وہ خاص اللہ کی خوشنودی کے لئے مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم تو محض اللہ کے لئے تمھیں کھلاتے ہیں، کسی جزا یا شکریہ کے خواستگار نہیں ہیں، ہم تو صرف اس تنگی کے دن سے ڈرتے ہیں جس میں شدتِ تکلیف سے چہرے بگڑ جائیں گے۔

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا، انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا، انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا (۷۶: ۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سبایا اور رقاء کے بارے میں ہمیشہ حسن سلوک کی نصیحت فرماتے

[1] فتوح البلدان بلاذری ص ۱۳۳ - ۱۳۲۔

تھے، جنگ بدر میں جب وہ لوگ پکڑے ہوئے آئے جنھوں نے ۱۳ برس تک آپ کو اور مسلمانوں کو تکلیفیں دے دے کر جلاوطنی پر مجبور کیا تھا، تو آپ نے صحابہؓ کو تاکید فرمائی کہ ان کے ساتھ فیاضی کا برتاؤ کریں۔ اس حکم کی تعمیل صحابہؓ نے اس طرح کی کہ ان کو اپنے سے اچھا کھانا کھلایا اور اپنے سے زیادہ آرام دیا۔ بعض صحابہؓ خود کھجوریں کھاتے تھے اور قیدیوں کو روٹی سالن کھلاتے تھے۔ قیدیوں کے پاس کپڑا نہ رہے تو رسول اللہ صلعم نے اپنے پاس سے ان کو کپڑے پہنائے حالانکہ وہ وقت مسلمانوں پر بے انتہا تنگی کا تھا۔ ان قیدیوں میں سے ایک شخص سہیل بن عمرو بڑا فصیح اللسان تھا، اور رسول اللہ صلعم کے خلاف زہریلی تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا، کہ اگر میں اس کا مثلہ کروں گا، تو اللہ میرا مثلہ کریگا۔ کچھ مدت قید رکھنے کے بعد آنحضرت صلعم نے آخر کار ان سب قیدیوں کو فدیہ لیکر رہا کر دیا۔

ے۔ یہ ان جنگ بدر کے فدیہ کے متعلق احادیث اور تفسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب یہ لوگ قید ہو کر آئے تو آنحضرت صلعم نے صحابہؓ سے مشورہ لیا کہ ان کے معاملہ میں کیا کیا جائے؟ یہ وہ وقت تھا کہ مہاجرینؓ کے دلوں پر ان کے مظالم کے زخم تازہ تھے، دو برس پہلے انھیں لوگوں نے ان کو مکہ سے نکالا تھا، اور اب اس لئے ان پر چڑھ کر آئے تھے کہ انھیں مدینہ میں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں۔ اس وجہ سے اکثر طبیعتوں میں ان کے خلاف سخت اشتعال تھا۔ علاوہ ازیں اس وقت مسلمانوں کی جمعیت بھی بہت تھوڑی تھی، کفار ان سے کئی گنی زیادہ طاقت لیکر میدان میں آئے تھے، اور ان کی تعداد میں ایک ایک آدمی کا اضافہ بھی مسلمانوں کے لئے مہلک تھا، اس لئے قدرتی طور پر مسلمان یہ چاہتے تھے، کہ جہاں تک ممکن ہو دشمن کی قوت کو توڑا جائے، اور یہ ۷۰ آدمی جو ان میں سے کم ہو گئے ہیں، دوبارہ ان سے مل کر ان کی فوجی قوت میں اضافہ نہ کر سکیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ اس وقت مسلمان بڑی فاقوں پہ فاقے گذر رہے تھے، اور ان کے پاس خود اپنا پیٹ بھرنے کے لئے بھی کافی سامان موجود نہ تھا، اس لئے اسیرانِ جنگ کو اختتام جنگ تک قید رکھنا اور ان کی خوراک کا بندوبست کرنا ان کی قدرت سے باہر تھا۔ ان تمام امور کو مدنظر رکھکر حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ ان کو قتل کر دیا جائے، عبداللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ گہری جھاڑی میں آگ لگا کر ان کو اسمیں پھینک دیا جائے، مگر حضرت ابوبکرؓ نے کہ سراسر لطف و رحم تھے اس کے خلاف یہ رائے دی کہ انھیں معاف کر دیا جائے، یہ مختلف رائیں سننے کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "اللہ بعض

اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کا قانون یہ ہے کہ ختامِ جنگ پر انھیں یا تو بغیر فدیہ کے چھوڑ دیا جائے، یا فدیہ لیکر رہائی دیدی جائے،

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء (۴۷: ۴)	جب کافروں سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو پہلے قتل کرو یہاں تک کہ جب ان کو مغلوب کرو تو پھر قید کی بندش مضبوط کرو اسکے بعد تمھیں اختیار ہے کہ چاہے احسان کرکے چھوڑ دو، یا فدیہ لیکر رہا کردو۔

(۱۴۷)

اس آیت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اکثر فدیہ لے بغیر ہی اسیرانِ جنگ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱) لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کردیتا ہے کہ دودھ کی طرح ہو جاتے ہیں، اور بعض کے دلوں کو اتنا سخت کردیتا ہے کہ پتھر بن جاتے ہیں، ابوبکرؓ کی مثال براہیمؑ اور عیسیٰؑ کی سی ہے، اور عمرؓ کی مثال نوحؑ کی سی، پھر آپؐ نے یہ فیصلہ کیا کہ نہ تو انھیں قتل کرو اور نہ معاف کرو بلکہ فدیہ لیکر رہا کردو، چنانچہ ان سے فدیہ قبول کرلیا گیا،

روایت مشہور کے مطابق اس پر عتاب ہی نازل ہوا اور یہ آیت اتری کہ :-

ماکان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض، تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ واللہ عزیز حکیم لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸: ۹)	نبی کے لئے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جبتک وہ بھی طرح جنگ نہ کرلے، تم محض دنیا کی دولت چاہتے ہو، اللہ آخرت کو چاہتا ہے، اور وہی غالب حکمت والا ہے اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ آچکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا

بخلاف اس کے اہل علم کی ایک قلیل جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہ عتاب اسیروں سے فدیہ لینے پر نہ تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ آسمانی اجازت سے پہلے مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا شروع کردیا تھا چنانچہ امام ترمذی نے اپنی جامع کی کتاب التفسیر میں امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں اور امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں یہ بات نقل کی ہے کہ :-

لما کان یوم بدر وقعوا فی الغنائم	جب بدر کا معرکہ ہوا تو مسلمان غنیمت کے جمع ہونے سے
قبل ان تحل لھم، فانزل اللہ لولا	پہلے ہی لوٹ پڑے اس پر یہ آیت اتری کہ لولا کتاب

رہا کردیا کرتے تھے جبال تنعیم میں مکہ کے ۸۰ آدمیوں نے لشکر اسلام پر حملہ کیا اور سب کے سب گرفتار ہوگئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انھیں پیش کیا گیا تو آپؐ نے سب کو فدیہ لئے بغیر چھوڑ دیا، یمامہ کا سردار ثمامہ بن اثال گرفتار ہوکر آیا اور اسے بھی بطریق احسان رہائی بخشی گئی اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہوگیا، تاہم بعض اوقات فدیہ بھی لے لیا کرتے تھے، خصوصاً تنگی و عسرت کی حالت میں،

غلامی کا مسئلہ اس سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو لونڈی غلام بنا کر رکھنے کی جو اجازت دی ہے، اور جنگ سے پکڑی ہوئی عورتوں کے ساتھ تمتع کو جائز رکھا ہے اس کی کیا اصلیت ہے؟ اور اگر یہ مسئلہ فی الواقع اسلام میں موجود ہے تو یہ کہاں تک اس سیرت کے مطابق ہے، جو اسیرانِ جنگ کے متعلق فاما منا بعد و اما فداءً کے قانون میں پیش کی گئی ہے؟ معترضین نے اس سوال کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اور اسلام کے بعض دشمنوں نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نے مسئلہ کی حقیقت اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر پوری طرح غور نہیں کیا، یہ واقعہ ہے کہ اسلام میں "سبی" کا قاعدہ موجود ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ سبایا کو غلام بنا کر رکھنے اور لونڈیوں سے تمتع کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس کی علت اور اصلیت کو سمجھنے کے لئے چند مقدمات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے

اولاً، اس عہد کا یہ عام دستور تھا کہ اسیرانِ جنگ غلام بنا کر رکھے جاتے تھے اور ان کو دنیا میں سب سے بدتر درجہ کی مخلوق سمجھا جاتا تھا، عرب اور اس سے باہر دنیا کے مہذب ممالک میں بھی یہی دستور تھا، اور لوگ صدیوں سے غلاموں کے ساتھ یہی سلوک کرنے کے عادی تھے

تبیان شیء منہ کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم، من اللہ، الآیہ،

بہرحال جو صورت بھی ہو، یہ امر متفق علیہ ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے موقع پر اتری تھی اور اسی جنگ سے متعلق تھی، اس سے کوئی عام اور دائمی قانون بنانا مقصود نہ تھا، اسیرانِ جنگ کے متعلق اسلام کا اصلی قانون سورہ محمد کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، جو متن میں درج ہے، کیونکہ اس کے الفاظ عام ہیں، کسی موقع کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، آیت "ما کان لنبی" کے بعد نازل ہوئی ہے، اور رسول اللہ کا عمل بھی اسی پر رہا ہے، ورنہ اگر جنگ بدر والی آیت کا حکم عام ہوتا تو کبھی کوئی اسیر رہا نہ کیا جاتا،

اسلام کے لئے اس دستور کو دفعتہً موقوف کر دینا مشکل تھا، اسلام کا صول، وقت کی سپر سے جنگ کرنا نہیں ہے، بلکہ وہ تدریجی اصلاح کا قائل ہے، شراب کی تحریم جس تدریج کے ساتھ ہوئی نماز میں سکون و وقار اور خاموشی کو جس تدریج کے ساتھ قائم کیا گیا، غنایم جنگ پر جس طرح رفتہ رفتہ پابندیاں عاید کی گئیں، اور ایسے ہی دوسرے تمام مسائل میں جس طرح تدریج کیساتھ اصلاح کی گئی، اس سے اسلام کا طریق اصلاح اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے، غلامی کے مسئلہ میں بھی اس نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

ثانیاً، اس عہد میں اسیرانِ جنگ کے تبادلہ کا دستور نہ تھا، جب مسلمانوں کے آدمی دوسری قوموں کے پاس قید ہوتے تو غلام بنا کر رکھ لئے جاتے تھے، اس لئے مسلمانوں کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، کہ دشمن قوموں کے جو لوگ گرفتار ہو کر آئیں انھیں وہ غلام بنا کر رکھ لیں، تاہم جہاں کہیں تبادلہ کا موقع آیا ہے، تو مسلمانوں نے اس کو خوشی کیساتھ منظور کیا ہے، فتح الباری میں علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے پاس مشرکین کے قیدی ہوتے اور مشرکین کے پاس مسلمانوں کے قیدی ہوتے، اور اپنے اپنے قیدیوں کو چھڑانے پر اتفاق ہو جاتا تو اس کا بندوبست کر لیا جاتا[1]، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمدؒ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے اسیروں کا تبادلہ کرنے پر راضی ہو تو تبادلہ کر لینا چاہئے[2]، خود رسول کریمؐ سے تبادلہ اسارٰی کا ثبوت ملتا ہے، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرتؐ نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک دفعہ مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔

ثالثاً، بعض اوقات لڑائیوں میں ایک شہر کے مردوں کا اکثر حصہ کام آجاتا تھا، بلکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک بستی کے تمام ہتھیار اٹھانے کے قابل آدمی قتل ہو جاتے تھے، ایسی حالت میں لاوارث عورتوں اور بچوں کی پرورش کا انتظام اس کے سوا اور کسی صورت سے نہ ہو سکتا تھا، کہ خود فاتح قوم اس کی ذمہ داری اپنے سر لے، اور جب یہ کام فاتحین ہی کو کرنا تھا، تو عورتوں کی حفاظت اور سوسائٹی میں ان کی وقعت قایم رکھنے کے لئے، اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ مسلمان مردوں کو ان سے ازدواجی تعلق قایم کرنے کی

[1] ج ۶ ص ۱۰۱ [2] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۶۔

اجازت دیدیجاتی، اس صورت سے وہ اسلامی سوسائٹی کے رکن رکین بن گئیں، اور ان مفاسد کا دروازہ بند ہو گیا، جو ہزاروں عورتوں کے بے شوہر رہجانے سے لازمی طور پر پیدا ہوتے

رابع، اسلام نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے حکم نہیں دیا ہے۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا مسلمانوں کا اختیاری فعل ہے، بلکہ خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ فائدہ نہ اٹھانا افضل ہے، مصر، شام، عراق، افریقہ، آرمینیہ اور فارس کی فتوحات میں بیشمار مقامات عنوۃً فتح ہوئے، اور ان کے لاکھوں آدمی گرفتار کئے گئے، مگر ایک قلیل تعداد کے سوا کسی کو غلام نہیں بنایا گیا، متعدد مقامات پر ایسا ہوا ہے کہ کسی امیر فوج نے لوگوں کو غلام بنا لیا اور خلیفہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے رہائی کا حکم دیدیا، بلاذری لکھتا ہے کہ "مصر کے بعض دیہات شدید مقابلہ کے بعد فتح ہوئے اور مسلمانوں نے انکے باشندوں کو غلام بنا کر حضرت عمرؓ کے پاس مدینہ بھیج دیا لیکن حضرت عمرؓ نے ان کو رہا کر کے ان کے وطن کی طرف واپس کر دیا، اور حکم فرمایا کہ انھیں بھی عام قبطیوں کی طرح ذمی بنایا جائے"[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بنانا نہ ضروری تھا، نہ افضل و احسن بلکہ تباہ کن اساری کا دستور نہ ہونے کے باعث اس کو ایک ناگزیر برائی کے طور پر قبول کیا گیا تھا،

خامساً، اسلام نے صرف ان لوگوں کو غلام بنانے کی مجوزاً اجازت دی ہے جو جنگ میں پکڑے ہوئے آئیں، باقی رہا آزاد لوگوں کو پکڑ کر بیچنا جو زمانۂ قدیم میں عموماً رائج تھا، سو اس کو اسلام نے سختی کے ساتھ منع کیا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ رجل اعطی بی ثم غدر و رجل باع حراً فاکل ثمنہ و رجل استاجر اجیراً فاستوفی منہ ولم یعط اجرہ (بخاری کتاب البیوع)

تین شخص ہیں جن کے خلاف قیامت میں میں خود مدعی بنونگا، ایک وہ جس نے میرا ذمہ دیکر بدعہدی کی، دوسرا وہ جس نے آزاد انسان کو بیچا اور اس کی قیمت کھائی، تیسرا وہ جس نے کسی مزدور سے پورا پورا کام لیا اور اس کی مزدوری نہ دی،

---

[1] بلاذری کے الفاظ یہ ہیں:۔ فوقع سباؤھم بالمدینۃ فردھم عمر بن الخطابؓ وصیرھم وجماعۃ القبط اھل الذمۃ (فتوح البلدان طبع مصر صفحہ ۲۲۳)

اہم مجبوریوں اور مصلحتوں سے جائز رکھا تھا، تاہم بہت ممکن تھا کہ اس طریقے کو مطلقاً جائز رکھنے سے مسلمانوں میں بھی غلامی کا وہی طریقہ رائج تھا جو عرب جاہلیت اور روم و ایران وغیرہ ممالک میں رائج تھا، اور شاید ہندوستان کے شودروں کی طرح سیاہ کی ایک نیچ ذات الگ بنا جاتی۔ لیکن اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ جن امور میں وہ بالواسطہ اصلاح کو مشکل پاتا ہے، ان کو قائم تو ضرور رکھتا ہے، مگر علی حالہ قایم نہیں رہنے دیتا، بلکہ بالواسطہ اصلاح کے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے، جن سے اس کی تمام مضرتیں اور خرابیاں دور ہو جاتی ہیں، غلامی کے مسئلہ میں بھی اس نے یہی کیا، غلامی کو مٹانا چند در چند وجوہ سے مشکل تھا، اس لئے اس نے صورت کو باقی رکھا، اور بالواسطہ طریقوں سے مادہ کو اس طرح بدل دیا کہ وہ ایک شدید اجتماعی مضرت کے بجائے ایک شاندار انسانی منفعت بن گئی، اس غرض کے لئے اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کئے، ہیں جنمیں سے تین اہم تر ہیں:

۱- غلام کو آزاد کرنے، اور آزادی کے حصول میں اسے مدد دینے کو بہت بڑا ثواب قرار دیا، اور ہر طریقہ سے اس کی ترغیب دی، قرآن مجید میں آیا ہے:-

وما ادراک ما العقبۃ؟ فک رقبۃ او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً ذا متربۃ (۱۰:۹۰)

اور تو کیا جانتا ہے کہ وہ نیکی کا دشوار گذار راستہ کون سا ہے وہ یہ ہے کہ ایک گردن (یعنی غلام کی گردن) آزاد کیجائے یا بھوک کے دن میں کسی قریبی یتیم یا خاکسار مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مختلف طریقوں سے اس کی فضیلت بیان فرمایا کرتے تھے جس سے مسلمانوں میں فک رقاب اور اعتاق عبید کا خاص شوق پیدا ہو گیا تھا، ایک دفعہ ایک اعرابی حاضر ہوا اور بولا کہ یا رسول اللہ صلعم کوئی ایسا عمل بتایئے جس سے میں جنت میں داخل ہو سکوں، آپ نے فرمایا اعتق النسمۃ وفک الرقبۃ (غلام کو آزاد کر اور گردن کو غلامی سے چھڑا) ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا من اعتق رقبۃ مسلمۃ کانت فکاکہ من النار عضواً بعضو، (جو کوئی کسی مسلمان غلام کو آزاد

کریگا، اس کا ہر عضو اس غلام کے ہر عضو کے بدلے دوزخ سے بچ جائے گا، ایک اور حدیث میں ہے کہ من اعتق نفسا مسلمۃ کانت فدیتہ من جھنم "جس نے ایک نفس مسلمہ کو آزاد کیا تو وہ جہنم سے بچنے کے لئے اس کا فدیہ ہو گیا" ایک مرتبہ امام زین العابدین نے یہ حدیث سنی کہ "جو شخص کسی غلام کو آزاد کریگا، اس کا ہر ہر عضو اس غلام کے ہر ہر عضو کے بدلے بخشا جائیگا" آپ نے اسی وقت اپنے غلام مطرف کو جسے دس ہزار درہم میں خریدا تھا بلاکر آزاد کر دیا،

غلاموں کو آزاد کرنے کا مزید شوق دلانے کے لئے آنحضرت صلعم نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ جتنا زیادہ قیمتی اور زیادہ پسندیدہ غلام آزاد کیا جائیگا، اتنا ہی زیادہ ثواب ہوگا، حضرت ابوذرؓ نے پوچھا ای الرقاب افضل؟ "کیسے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے" فرمایا اغلاھا ثمنا و انفسھا عند اھلھا "وہ جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو مالک کو زیادہ پسند ہو" اسی طرح لونڈی کو عمدہ تربیت دیکر آزاد کرنے اور اس کا نکاح کر دینے کو بڑی نیکی کا فعل قرار دیا من کانت لہ جاریۃ ادبھا و احسن تعلیمھا و اعتقھا و تزوجھا کان لہ اجران "جس نے اپنی لونڈی کو اچھی طرح تعلیم و تربیت دیکر آزاد کیا اور اسے اپنے نکاح میں لے آیا، اس کے لئے دوہرا ثواب ہوگا"

پھر مختلف گناہوں کے لئے جو کفارے مقرر کئے گئے ہیں، ان میں غلام آزاد کرنے کو بہترین کفارہ قرار دیا گیا ہے، کسوف شمس اور دوسرے مواقع پر بھی بردہ آزاد کرنے کو دفع بلیات کا ذریعہ بتایا گیا ہے، اور ہر طریقہ سے اعتاق عبید کی ہمت افزائی کی گئی ہے،

۲- دوسرا طریقہ یہ تھا کہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی و ملاطفت کی سخت تاکید کی گئی، رسول اکرم صلعم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں اپنی امت کو جو وصیت فرمائی تھی اسمیں پہلے نماز کی تاکید تھی، اور اس کے بعد غلاموں سے حسن سلوک کی الصلوۃ و ما ملکت ایمانکم[1]

---

[1] نہایہ میں ہے کہ ما ملکت ایمانکم سے یہاں غلام ہی مراد ہیں، اور اس سے حضور کا مقصد احسان فی الرقیق کی تاکید فرمانا تھا، بعض لوگوں نے ما ملکت ایمانکم سے مراد زکوٰۃ بھی لی ہے مگر قول راجح یہی ہے کہ آپ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت عبادات میں نماز کی تاکید فرمائی اور معاملات میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی،

عہدِ جاہلیت سے دماغوں میں غلامی کا جو تصور جما ہوا تھا، اس کے ترے بھی کبھی کبھی تحت پر غلاموں کے ساتھ برا سلوک بھی کر بیٹھتے تھے، اس پر رسول اکرم صلعم نے بڑے اپنے معزز ترین اور محبوب ترین صحابیوں کو ڈانٹا ہے، معرور بن سوید نے ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاری کو دیکھا کہ جو چادر وہ اوڑھے ہوئے ہیں ویسی ہی ان کے غلام کے بدن پر بھی ہے، پوچھا کہ اس کا کیا سبب ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک غلام کو گالی دی تھی، اس نے جا کر رسول اللہ سے شکایت کی، رسول اللہ صلعم سخت ناراض ہوئے، اور مجھے بلا کر فرمایا، ابوذر تم میں سے ابھی تک جاہلیت کی بو نہیں گئی،

ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ یہ تمھارے بھائی تمھارے خادم ہیں جنھیں اللہ نے تمھارا تحت ایدیکم فمن کان اخوہ دست نگر بنایا ہے، پس جس کسی کا بھائی اس کا ماتحت ہو تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل اسے چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وروی ولیلبسہ مما یلبس، ولا تکلفوھم پنھائے جو خود پہنتا ہے، تم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ مالا یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم بوجھ نہ ڈالو، اور اگر ایسی کوئی بھاری خدمت ان کے سپرد کرو، تو خود ان کا ہاتھ بٹاؤ،

ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا، یکایک میں نے سنا، کہ پیچھے سے کوئی کہہ رہا ہے، اعلم ابا مسعود، للہ اقدر علیک منک علیہ "خبردار ابو مسعود، اللہ تجھ پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے، جو تجھ کو اس غلام پر حاصل ہے" پلٹ کر دیکھا تو رسول اللہ صلعم تھے، میں نے فوراً عرض کیا ھو حر لوجہ اللہ، "وہ خدا کے واسطے آزاد ہے"، اس پر حضور نے فرمایا، اما انک لو لم تفعل لمستک النار، "اگر تو اسکو آزاد نہ کرتا تو آگ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتا"،

ایک مرتبہ ایک شخص نے حاضر ہو کر پوچھا کہ ہم کتنی مرتبہ اپنے خادم کو معاف کیا کریں، آپ نے جواب دیا، اعفوا عنہ فی کل یوم سبعین مرۃ، "اگر وہ روزانہ ستر بار بھی قصور کرے تو تم معاف کئے جاؤ"،

سوید بن مقرن کا بیان ہے کہ ہم سات بھائیوں میں ایک غلام تھا، ایک مرتبہ ہم سے

[illegible] کے منہ پر تھپڑ مارا تو رسول اللہ صلعم نے ہمکو حکم دیا کہ اسے آزاد کردو،

ہیں سوید بن مقرن کے صاحبزادے معاویہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے ہاں کے ایک غلام کو تھپڑ مارا، والد کو خبر ہوئی تو انھوں نے ہم دونوں کو بلایا اور غلام سے کہا تو معاویہ سے بدلہ لے لے،

عرب میں دستور تھا کہ غلام کو عبدی (میرا بندہ) اور لونڈی کو امتی (میری بندی) کہکر پکارتے تھے، اور اپنے آپ کو غلاموں سے سیّد کہلواتے تھے، آنحضرت صلعم نے اس کو منع کیا اور فرمایا کہ انھیں فتای (میرا لڑکا) اور فتاتی (میری لڑکی) کہکر پکارا کرو اور اپنے آپکو سیدی یا مولائی کہلوایا کرو، اہل عرب غلام کو اپنے پاس جگہ دینا بھی عار سمجھتے تھے، مگر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ان کو اپنے ساتھ ایک دسترخوان پر بٹھا کر کھلاؤ، اور اگر اتنا نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے کھانے میں سے ایک دو لقمے ہی ان کو کھلا دیا کرو، اذا اتی احدکم غلامہ بطعام فان لم یجلسہ معہ فلیناولہ لقمۃ او لقمتین،

ان سب باتوں سے یہی مقصود تھا کہ غلاموں کو عزت و آرام سے رکھا جائے، اور وہ خاندان کے رکن بنکر رہیں،

(۳) اسلامی قانون میں غلاموں کو وہ وسیع حقوق دیئے گئے جن سے وہ آزادوں کے لگ بھگ پہونچ گئے، فوجداری قانون ان کو اسی حفاظت کا مستحق قرار دیتا ہے جس کا استحقاق آزادوں کو حاصل ہے، ان کا مال چرانے والا، ان کو قتل کرنے والا، ان کی عورتوں کی آبروریزی کرنے والا، ان کو جسمانی نقصان پہونچانے والا خواہ آزاد ہو یا غلام بہرصورت اس کو وہی سزا دیجائیگی جو آزاد لوگوں کے ساتھ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والے کے لئے مقرر ہے، اسی طرح دیوانی قانون ان کی املاک پر ان کے مالکانہ حقوق تسلیم کرتا ہے، اور انھیں اپنے ذاتی اموال میں تصرف کرنے کے وسیع اختیارات دیتا ہے، از روے قانون خود ان کے آقا کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ ان کے ذاتی مال میں ان کی مرضی کے خلاف تصرف کرے، یا ان کو کسی قسم کا جسمانی ضرر پہونچائے (سوائے تادیب کے جسمیں رفق اور نرمی کی سخت

لہ ابوداؤد کتاب الادب باب فی حق المملوک،

تائید ہے) یا ان کی بھوپھیوں سے ناجائز علاقہ رکھتے۔

قانون سے زیادہ اسلامی سوسائٹی نے ان کو اپنے اندر مساوات کا درجہ دیا ہے جہاں کی زندگی میں غلاموں کی حیثیت کسی طرح آزادوں سے کم نہ تھی علم، سیاست، مذہب، معاشرت غرض ہر شعبہ میں ان کے لئے ترقی کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں، اور غلام ہونا ان کے لئے کسی حیثیت سے بھی رکاوٹ کا باعث نہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینبؓ کو جنھیں بعد میں ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا، اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہؓ سے بیاہ دیا، امام حسینؓ کا نکاح ایران کی ایک شہزادی سے ہوا جو جنگ میں لونڈی بن کر آئی تھیں، امام زین العابدین انھیں لونڈی کے بطن سے تھے جنھیں ولاد اشراف اسلام میں سب سے بالاتر درجہ رکھتی ہے، سالم بن عبداللہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر جو فقہائے تابعین کی اولین صف میں ہیں دو لونڈیوں کے پیٹ سے تھے، امام حسن بصریؒ جو ائمہ تابعین کے سرخیل اور اصحاب طریقت کے پیشوا ہیں ایک غلام کے بیٹے تھے، امام ابوحنیفہ جو کروڑوں مسلمانوں کے مقتدا ہیں، اور جنکو اسلامی دنیا امام اعظم کے لقب سے یاد کرتی ہے بنی تیم اللہ کے موالی میں سے بتائے جاتے ہیں، مشہور محدث محمد بن سیرین جن کا شمار اکابر تابعین میں ہوتا ہے، ایک غلام کے بیٹے تھے، ان کے باپ سیرین اور ماں صفیہ دونوں مملوک تھے، مگر اس درجہ کے مملوک تھے کہ حضرت صفیہ کو ان امہات المومنین نے دلہن بنایا تھا اور سیرین سے ان کا نکاح ابی بن کعبؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے پڑھایا تھا، امام مالکؒ کے استاد نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے، امام مالکؒ کو جس سلسلۃ الذہب پر ناز ہے، اس کی ایک کڑی یہی نافع تھے، ابوعبدالرحمن عبداللہ بن مبارک جن کا شمار اکابر مجتہدین میں ہوتا ہے ایک غلام مبارک نامی کے بیٹے تھے، عکرمہ جو ائمہ مفسرین میں ہیں خود غلام تھے، محمد بن اسحٰق مشہور صاحب سیرۃ کے دادا یسار معرکہ عین التمر سے پکڑے ہوئے آئے تھے، مکہ کے امام المحدثین عطاء بن رباح، یمن کے امام طاؤس بن کیسان، مصر کے امام یزید بن حبیب،

سلہ رومہ میں یہ عام دستور تھا کہ جب کسی غلام کی لڑکی بیاہی جاتی تو اس کو پہلی شب کے لئے اپنے آقا کے پاس بھیجنا پڑتی تھی، اس شرمناک ظلم سے عیسائی بشپ تک نہ چوکتے تھے، دیکھو امیر علی کی سپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۲۰۔

شام کے امام اوزاعی، جزیرہ کے امام میمون بن مہران، خراسان کے امام ضحاک، کوفہ کے امام ابراہیم نخعی سب کے سب غلاموں کے گروہ سے تھے، سلمان فارسیؓ غلام تھے جنھیں حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ سلمان منا اھل البیت "سلمان تو ہم اہلبیت میں سے ہیں"، بلال حبشیؓ غلام تھے جنکو حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ بلال سیدنا وموٰلی سیدنا، "بلال ہمارے آقا کا غلام اور ہمارا آقا ہے"، صہیب رومیؓ غلام تھے جنھیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ مسلمانوں کی امامت کے لئے کھڑا کیا تھا، سالمؓ ابوحذیفہؓ کے غلام تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلافت کے لئے منتخب کرتا، اسامہ بن زیدؓ غلام زادے تھے جنھیں رسول اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں اس لشکر کا سردار بنایا تھا جسمیں حضرت ابوبکرؓ جیسے جلیل القدر صحابی شریک تھے، اور جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے کہا تھا کہ اسامہ کا باپ تیرے باپ سے اور اسامہ خود تجھ سے رسول اللہ کو زیادہ محبوب تھا، یہ تو قرون اولیٰ کی باتیں ہیں، بعد میں جبکہ اسلامی روح بہت کچھ کمزور پڑگئی تھی، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، اور غیاث الدین بلبن جیسے جلیل القدر غلاموں نے خود ہمارے ملک ہندوستان پر حکومت کی ہے، محمود غزنوی جو اپنے وقت میں دنیا کا سب سے بڑا فاتح تھا، نسلاً ترکی غلام تھا، مصر میں کئی صدی تک ممالیک کی حکومت رہی ہے اور ان کا نام خود کہتا ہے کہ وہ دراصل غلام تھے جنھوں نے بادشاہی کے تخت پر بار پایا،

ان غلاموں کو کون غلام کہہ سکتا ہے؟ کیا آزادوں کے لئے ان سے کچھ زیادہ ترقی، عزت اور اقتدار حاصل کرنے کے مواقع تھے؟ کیا ان کی غلامی نے ان کو اجتماعی زندگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج تک پہونچنے سے روکا؟ اگر غلامی اسی چیز کا نام ہے اور وہ ایسی ہی ہوتی ہے تو آزادی کا نام غلامی رکھدینے میں کیا ہرج ہے؟

یہ طریقے تھے جن سے اسلام نے غلامی کو گھٹاتے گھٹاتے آزادی سے جا ملایا، بلکہ دونوں میں کوئی فرق نہ رہنے دیا، لفظ "غلامی" تو بے شک باقی رہا، مگر غلامی کی حقیقت بدل کر کچھ سے کچھ ہوگئی،

غنیمت کا مسئلہ اسلام میں مال غنیمت کا جواز بھی ان مسائل میں سے ہے جن پر مخالفین

نے بہت کچھ حاشیہ آرائیاں کی ہیں اور جنکی خود موافقین نے بھی کڑی غلطی کا ثابت کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ غنیمت کے معاملہ میں بھی اسلام نے وہی تدریجی اصلاح کا طریقہ اختیار کیا ہے جو غلامی کے مسئلہ میں اختیار کیا تھا، عرب میں غنیمت کا شوق جس قدر بڑھا ہوا تھا اسکا حال اوپر بیان ہو چکا ہے، مالِ غنیمت کا حصول وہ سب سے بڑا لالچ تھا جس کے لئے ایک عرب جنگ کے خطرات برداشت کرنے اور مرنے مارنے پر آمادہ ہوا کرتا تھا، عرب کی جنگ کے عین مفہوم میں لوٹ مار داخل تھی حتی کہ لفظ حرب کے مدلول کا تصور ہی اس وقت تک دماغوں میں مکمل نہ ہو سکتا تھا جب تک اسمیں سلب ونہب کا مفہوم شامل نہ ہو جب اسلام آیا تو عرب اسی موروثی رغبت و شوق کو لیکر اس میں بھی داخل ہوئے، اور اس کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ اس صدیوں کی متوارث ذہنیت کو دفعتہً بدل دے، اسے جن نومسلم عربوں کی اصلاح کرنی تھی ان کا حال یہ تھا کہ بلا ارادہ جبلی طور پر غنیمت کی طرف کھنچتے تھے، اور میدانِ جنگ میں اموالِ غنیمت کو دیکھ کر نفس کو نہ روک سکتے تھے، جنگِ بدر سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کو ایک جماعت کیساتھ بطنِ نخلہ کی طرف بھیجا کہ دشمن کی اطلاعات فراہم کریں، راستہ میں قریش کے چند تاجروں سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی، مالِ غنیمت دیکھ کر ان کے آدمی قابو سے باہر ہو گئے، اور ان لوگوں کو قتل کر کے سامان لوٹ لائے، مورخین نے اس واقعہ کو جنگِ بدر کے فوری اسباب میں شمار کیا ہے[1] خود جنگِ بدر میں ایک طرف قریش کا تجارتی قافلہ شام کی جانب سے آ رہا تھا، اور دوسری طرف قریش کی فوجیں مکہ سے آ رہی تھیں، باوجودیکہ اس وقت عقیدہ کا زور تو ہر بات سے زیادہ ضروری تھا مگر لشکرِ اسلام کی عام خواہش یہی تھی کہ پہلے قافلہ پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا جائے اسی کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے:-

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمتہ ویقطع	اور جبکہ اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک پر تم کو غلبہ ہوگا، اور تم چاہتے تھے کہ کمزور اور غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے حالانکہ اللہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ

[1] طبری، طبع مصر ج ۲ ص ۲۰۰، ابن اثیر طبع مصر ج ۲ ص ۸۲ - ۸۳۔

کاٹ دے،

پھر جب لڑائی میں جیت گئے تو صحابۂ کرامؓ کی مقدس جماعت کے لئے شوقِ غنیمت کو ضبط کرنا مشکل ہوگیا اور حکم الٰہی کا انتظار کئے بغیر غنائم کے لوٹنے میں مشغول ہوگئے اسی کے متعلق یہ آیت اتری کہ[1]

لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم (۸:۶۸)	اگر پہلے سے خدا کا نوشتہ نہ آچکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا،

جنگِ احد میں اسی شوقِ غنیمت نے فتح کو شکست سے بدل دیا تھا، قریش کے پاؤں اکھڑتے ہی صحابہؓ اموالِ غنیمت کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان تیر اندازوں کو بھی عالمِ بیخودی میں سرکارِ رسالتمآبؐ کا حکم یاد نہ رہا جنھیں آپ نے عقب کی حفاظت پر متعین فرمایا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فوج پراگندہ ہوگئی، اور لشکرِ کفار نے پلٹ کر ایسا حملہ کیا کہ خود رسول اللہ صلعم زخمی ہوگئے، حنین میں بھی یہی ہوا کہ پہلے حملہ سے دشمنوں میں ابتری پھیلی تو معاً جدید الاسلام اعراب غنیمت پر ٹوٹ پڑے، اور ان میں برہمی دیکھ کر بنی ہوازن کے تیر اندازوں نے ایسا حملہ کیا کہ بڑے بڑے جاں نثاروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بخاری میں براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ انا لما حملنا علیھم انکشفوا فاکببنا علی الغنائم فاستقبلنا بالسھام[2]

معاذ اللہ یہ واقعات بیان کرنے سے صحابۂ کرامؓ کی تنقیص مقصود نہیں ہے، بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ غنیمت کا شوق ایک فطری جذبہ تھا جو صدیوں کی روایات سے طبیعتوں میں اسقدر راسخ ہوگیا تھا کہ کسی انسانی جماعت حتیٰ کہ صحابۂ کرامؓ جیسی مقدس، اور متاعِ دنیا کو حقیر جاننے والی جماعت کے لئے بھی اس کے اثرات کو دفعۃً دل و دماغ سے محو کر دینا غیر ممکن تھا جب حال یہ تھا تو ایک حکیمانہ مذہب جو فطرت سے جنگ نہیں، بلکہ اس کی اصلاح کرنا چاہتا تھا اس سے بہتر طریقہ اور کیا اختیار کر سکتا تھا، کہ نفسِ غنیمت کو حلال کر دیتا اور بالواسطہ طریقوں سے اسکے شوق کو گھٹانے اور اس کے حدود کو کم کرنے کی کوشش کرتا، یہی راستہ تھا جو اسلام نے اختیار

---

[1] طبری ج ۲ ص ۲۰۰، کتاب الخراج ص ۲۲، ترمذی کتاب التفسیر [2] بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین، الخ

گیا، اس نے جس مجبوری سے غنیمت کو حلال کیا ہے، اس کا حال ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے، جس کو امام ابو یوسفؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے نکالا ہے:-

قال رسول اللہ صلعم لم تحل الغنائم لقوم سود الرؤس قبلکم، کانت تنزل نارٌ من السماء فتاکلھا، فلما کان یوم بدر اسرع الناس فی الغنائم، فانزل اللہ عزوجل لولا کتابٌ من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذابٌ عظیم فکلوا مما غنمتم حلالاً طیباً،

رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ تم سے پہلے کسی کالے سر والی قوم کے لئے غنیمت حلال نہیں کی گئی، ایک آگ آسمان سے اترتی اور مالِ غنیمت کو کھا جایا کرتی تھی[1]، جب جنگ بدر واقع ہوئی تو لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے، اس پر یہ آیت اتری کہ، اگر اللہ کا نوشتہ پہلے ہی سے نہ آچکا ہوتا تو تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا، خیر اب جو کچھ تم نے لوٹا ہے، اسے کھاؤ، کہ وہ تمھارے لئے حلال و پاک ہے،

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت پہلے حلال نہ تھی، مگر انسانی فطرت کے ناقابل تغیر رجحان کو دیکھ کر اسے حلال کر دیا گیا، تاہم محض فطرت کی رعایت ہی کرکے سبر نہیں ڈال دی گئی، بلکہ اس رجحان کی اصلاح اور اس کی حد بندی کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے۔ جنھوں نے رفتہ رفتہ دلوں سے شوقِ غنیمت ہی کو دور کر دیا، اور جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا، اسکی اصلاح اس طرح کی گئی کہ اموالِ غنیمت پر متعدد اقسام کی پابندیاں عائد کر دی گئیں، اور خود اموالِ غنیمت کے دائرہ کو بہت محدود کر دیا گیا،

اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ تین طریقے ایسے ہیں جنکا ذکر ضروری ہے،

۱- اسلام نے غنیمت کی معنوی قیمت اس قدر گرا دی کہ دین داروں میں حصولِ غنائم کا شوق ہی باقی نہیں رہا، پہلے کہا کہ جو شخص غنیمت حاصل کرنے کی نیت سے جنگ کریگا اسکو جہاد کا ثواب نہیں ملے گا، ثواب صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو دل کو دنیوی غرض سے پاک رکھکر خاص خدا کے لئے جنگ کریں، پھر جب دلوں میں غنیمت سے زیادہ حصولِ ثواب کی

[1] یہ اشارہ ہے ایک واقعہ کی طرف جس کو حضرت ابو ہریرہؓ ہی نے ایک دوسری حدیث میں بیان کیا ہے، دیکھو بخاری کتاب الجہاد باب قول النبی احلت لکم الغنائم،

قید پیدا ہوئی، تو یہ ہوا کہ جو شخص دنیا میں پہنچ جہاد کا فائدہ حاصل کرے گا، اس کے لئے آخرت کا ثواب کم ہو جائیگا، اور جو دنیا میں فائدہ نہ اٹھائیگا، اس کو آخرت میں پورا ثواب ملیگا،

ما من غازیۃ تغزو فی سبیل اللہ فیصیبون الغنیمۃ الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الآخرۃ ویبقی لھم الثلث، وان لم یصیبوا غنیمۃ تم لھم اجرھم[1]	جس فوج نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور مال غنیمت پالیا، تو اس نے اپنے آخرت کے ثواب میں دو تہائی حصہ یہیں پالیا اور اس کے لئے صرف ایک تہائی باقی رہگیا، اور اگر اس نے غنیمت نہ پائی تو اس کو پورا اجر ملے گا،

اس تعلیم نے مسلمانوں میں مال غنیمت کی آرزو سے بڑھ کر ثواب آخرت کی تمنا پیدا کردی اور وہی عرب جو کبھی غنائم کے انبار دیکھ کر بے قابو ہو جاتے تھے، چند ہی برس کے اندر متاع دنیا سے اس قدر بے نیاز ہو گئے کہ مال غنیمت ان کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، اور وہ انکار کر دیتے تھے، رسول اکرمؐ کی زندگی کے آخری زمانہ میں جب غزوۂ تبوک کے لئے نفیر عام دیگئی تو واثلہ بن اسقع نے لوگوں سے کہا کہ جو شخص مجھ کو اپنے ساتھ جنگ میں لے چلے گا، اسے غنیمت میں سے آدھا حصہ دونگا، انصار میں سے ایک صحابی نے یہ شرط قبول کرلی اور ان کو اپنے ساتھ لیگئے غزوہ میں لشکر اسلام کو جو کچھ مال ملا، اس میں سے واثلہ کے حصہ میں چند نہایت عمدہ جوان اونٹنیاں آئیں، انھیں لیکر وہ ان انصاری شیخ کے پاس پہونچے اور کہا کہ یہ وہی مال غنیمت ہے جسکا حصہ دینے کی میں نے آپ سے شرط کی تھی، مگر انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میرا مقصد غنیمت حاصل کرنا نہ تھا، محض ثواب مطلوب تھا[2]،

ایک دفعہ ایک بدوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوا، اور ان جنگ میں کچھ مال غنیمت آپ کے پاس آیا اور آپ نے دوسرے مجاہدین کی طرح اس بدوی کا حصہ بھی لگایا، اس کی اطلاع جب اس کو ہوئی تو اس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "میں نے

---

[1] مسلم کتاب الجہاد، نسائی باب السریۃ التی تخفق

[2] ابوداؤد ج ۲ باب الرجل یغزی دابتہ علی النصف او السہم،

اس مال کے لئے آپ کی پیروی فیصلہ کن ہے میں چاہتا ہوں کہ جنت کی طرف اشارہ کرکے اس جگہ تیر کھاؤں اور شہید ہو جاؤں[1]۔

۲۔ مالِ غنیمت میں محتاجوں، معذوروں اور مسکینوں کی پرورش اور عام قومی ضروریات کے لئے پانچواں حصہ مقرر کیا گیا،

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین و ابن السبیل (۸ : ۵)	جان لو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم کو حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہل قرابت و یتامیٰ و مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔

اس طریقہ سے اموالِ غنیمت کا ایک معتدبہ حصہ نیک کاموں کے لئے الگ کر لیا گیا اور افرادِ فوج کے حصہ میں بہت کچھ کمی کر دی گئی،

۳۔ مالِ غنیمت کا اطلاق پہلے ہر اس مال پر ہوتا تھا جو ایک فوج دشمن کے ملک سے لوٹ لے خواہ کسی طرح لوٹے، لیکن اسلام نے غنیمت صرف اس مال کو قرار دیا جو میدانِ جنگ میں دشمن کی افواج سے فاتح فوج کے ہاتھ آئے۔ اس سے ایک طرف غارت گری کا سلسلہ بند ہوا جو پر امن غیر فوجی آبادیوں میں کیا جائے غنیمت کی جائز حدود سے خارج ہو جاتا ہے دوسری طرف وہ مال بھی غنیمت کی تعریف سے نکل جاتا ہے جو جنگ کے بغیر صلح یا امن کے ذریعہ دشمن کے ہاتھ آئے، یا جس پر میدانِ جنگ کا معرکہ ختم ہونے کے بعد مسلمان فوج کا قبضہ ہو۔ اسلام نے اس دوسری قسم کے مال کو فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے حکومت اسلامیہ کی ملک قرار دیا ہے چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:-

ما افاء اللہ علی رسولہ منھم فما اوجفتم علیہ من خیل ولا رکاب ولکن اللہ یسلط رسلہ علی من یشاء واللہ علی کل شئ قدیر	جو مال اللہ نے اپنے رسولؐ کو دلایا ہے ان سے تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے ہیں بلکہ اللہ اپنے رسولؐ کو جس پر چاہتا ہے تسلط بخشتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، سو یہ مال جو اللہ نے اپنے رسولؐ

[1] نسائی کتاب الجنائز، باب الصلوۃ علی الشہید ۱۶۔

ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ فللہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل کی لا یکون دُولۃ بین الاغنیاء منکم (۵۹ : ۱)	کوئے کے طور پر عطا فرمائے، اللہ اور اس کے رسولؐ اور اہلِ قرابت، یتامیٰ، مساکین، اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتا پھرے،

اس آیت نے یہ تصریح کردی ہے کہ صرف وہ اموال مفتوحہ غنیمت کے تحت آتے ہیں جنکو اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر (یعنی میدانِ جنگ میں لڑکر) فوج نے حاصل کیا ہو باقی رہے وہ اموال و املاک اور آراضی جو "ایجاف خیل و رکاب" کا بلا واسطہ نتیجہ نہ ہوں، تو وہ حکومت اسلامیہ کی ملک ہیں، اور خدا و رسولؐ کے کاموں پر خرچ ہونے کے لئے ہیں،

یہ حکم ابتداً صرف رسول اللہ صلعم کی ذات کے لئے مخصوص سمجھا گیا تھا، مگر جب صحابہؓ کرام نے غور کیا تو نظر آیا کہ "فے" کے حقداروں میں چھ نام گنائے گئے ہیں، اللہ، رسولؐ، ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل، ان میں سے صرف ایک "رسولؐ" دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں، باقی "اللہ حی ولا یموت ہے، اور ذی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، اور ابن سبیل تا قیام قیامت موجود ہیں، پس تنہا رسولؐ کے رخصت ہوجانے سے یہ پانچ حقدار کیونکر بے حق ہوسکتے ہیں، پھر خود رسولؐ کا استحقاق بھی تنہا ان کی ذات کے لئے نہ تھا، بلکہ اس کام کے لئے تھا جو وہ اپنی زندگی میں کرتے تھے، اور وہ کام بدستور جاری ہے، اس لئے "فے" میں سے رسولؐ کا حق بھی فوت نہیں ہوا، علاوہ ازیں "فے" کو ان چھ حقداروں کا حق قرار دینے کی جو مصلحت بیان کی گئی تھی وہ یہ تھی، کہ یہ مال تنہا مال داروں ہی میں گشت نہ کرتا پھرے بلکہ قوم کے تمام طبقے اس سے مستفید ہوں، کی لا یکون دُولۃ بین الاغنیاء منکم، یہ مصلحت جس طرح رسولؐ کی زندگی میں تھی اسی طرح اب بھی باقی ہے، اور جب تک دنیا آباد ہے باقی رہے گی، اس بنا پر یہ قانون قرار دیا گیا ہے کہ "فے" کا مال خدا رسولؐ کے کاموں اور امت کے عام طبقوں کی خدمت کے لئے محفوظ رکھا جائے[1]،

---

[1] یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اجتہاد تھا، جبوقت فوج نے سوادِ عراق کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا تو آپ نے اسکی تردید میں یہی آیت دلیل کے طور پر پیش کی تھی، اور کہا تھا کہ ھذہ عامۃ فی القریٰ کلھا، (کتاب الخراج صفحہ ۱۵)۔

اسی قانون کے مطابق حضرت عمرؓ نے ممالک مفتوحہ کو فوج پر تقسیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور فوجوں کو صرف اس مال پر قناعت کرنی پڑتی تھی جو لڑائیوں کے دوران میں غنیمت کے طور پر دشمن کی افواج سے حاصل ہوا تھا، اس بارے میں حضرت عمرؓ کا وہ خط جو انھوں نے سعد بن وقاصؓ کو لکھا تھا، اسلامی قانون کو بالکل واضح کر دیتا ہے، بلاذری نے اس خط کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:-

"تمھارا خط پہونچا، تم بیان کرتے ہو کہ لوگ تم سے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ملک و مال اللہ تعالیٰ نے ان کو غنیمت میں عطا کیا ہے، اس کو تقسیم کر دیا جائے، سو تم میرا یہ خط ملنے کے بعد ایسا کرو کہ فوج نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر جو مال، اسباب اور جانور لوٹے ہیں، ان کو خمس وضع کرنے کے بعد، اہل فوج میں تقسیم کر دو، باقی اراضی اور انہ کو پیشکاروں کے پاس رہنے دو تاکہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے کام آئیں، ورنہ اگر ان کو موجودہ زمانہ کے لوگوں میں تقسیم کر دو گے بعد میں آنے والوں کے لئے کچھ نہ بچیگا"[1]

حضرت ابو عبیدہؓ نے جب شام فتح کیا، تو اس وقت بھی فوج نے تمام ملک کو غنیمت قرار دیکر یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے تقسیم کر دیا جائے، اس کی اطلاع انھوں نے حضرت عمرؓ کو دی، اور حکم دریافت کیا، جواب میں آپ نے ایک طویل خط لکھا جسمیں آیت مذکورہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

فاقسم ما افاء اللہ علیک فی یدی اھلہ واجعل الجزیۃ علیھم تقدیر طاقتھم[2]	پس تم ان املاک کو جو اللہ نے تم کو دشمن میں عطا کی ہیں، اہل ملک کے ہاتھ میں رہنے دو اور ان پر انکی طاقت کے مطابق ٹیکس لگا دو۔

اس طرح ایک طرف تو اسلام نے غنیمت کے شوق کو کم کیا جو لوٹ مار اور غارتگری کا اصلی محرک تھا، دوسری طرف ایسے قوانین مقرر کئے جن سے غنیمت کا دائرہ گھٹ کر صرف منقول اموال تک محدود رہ گیا جو جنگی اعمال کے سلسلہ میں غنیم کی شکست خوردہ افواج سے

[1] فتوح البلدان صفحہ ۲۰۸، نام ابو یوسف نے کتاب الخراج صفحہ ۲۰۰ میں بھی تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اسے نقل کیا ہے [2] کتاب الخراج صفحہ ۲۰۲

حاصل ہوتے ہیں، اور تیسری طرف اس مال غنیمت میں سے بھی پانچواں حصہ بیت کا مول کے لئے لیا، اب اسلامی اصطلاح میں لفظ غنیمت جس چیز پر بولا جاتا ہے، وہ بعینہ وہی ہے جسے مغربی قانون میں اغنام جنگ (SHOILS OF WAR) کہا جاتا ہے اور جسے تمام دنیائے متمدن نے فاتح کا فطری حق تسلیم کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مغربی قانون تمام اموال غنیمت کو حکومت کا حصہ قرار دیتا ہے، اور اسلامی قانون ان میں سے پانچواں حصہ لیکر باقی چار حصے ان جاں باز سپاہیوں میں تقسیم کر دیتا ہے جنھوں نے جانوں پر کھیلکر انھیں حاصل کیا ہے،

صلح و امان اسلامی جنگ کے شعائر میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسلمان کو ہر وقت صلح کے لئے تیار رہنا چاہیے چونکہ اسلام کی جنگ کا مقصد "جنگ" نہیں ہے، امن و سلامتی ہے، اس لئے اگر مصالحت کے ذریعہ یہ مقصد حاصل ہونے کی کوئی صورت موجود ہو، تو ہتھیار اٹھانے سے پہلے اس صورت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کی آخری حد، وجوہ نزاع کے ارتفاع، اور جنگ کی ضرورت باقی نہ رہنے کو قرار دیا ہے، حتی تضع الحرب اوزارھا، اور حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ پس قرآن مجید ہمکو حکم دیتا ہے کہ اگر دشمن تم سے خود صلح کی درخواست کرے تو اسے کھلے دل سے قبول کرلو،

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا و توکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمومنین (۸:۸)	اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو کہ وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے اور اگر وہ تمھیں دھوکہ دینے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پرواہ نہ کرو کہ تمھارے لئے اللہ کافی ہے وہی ہے جس نے تم کو نصرت بخشی اور مومنوں کی کثرت سے تم کو تقویت دی،

یہ بھی حکم ہے کہ اگر کوئی دشمن ہتھیار ڈالدے، اور اپنی زبان سے یا زبان حال سے امان مانگے تو پھر تمکو اس پر ہاتھ اٹھانے کا حق باقی نہیں رہتا،

فان اعتزلوکم فلم یقاتلوکم والقوا الیکم السلم فما جعل اللہ لکم علیھم سبیلا (۴: ۹۲)	اگر وہ تم سے ہاتھ کھینچ لیں اور جنگ نہ کریں اور صلح کی خواہش کریں تو ایسی حالت میں اللہ نے تم کو ان پر دست درازی کی کوئی راہ نہیں دی ہے۔

اسی طرح اگر دشمن قوم کے افراد اپنے دستے ملجائیں اور امان مانگیں تو ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ امن کے ساتھ ان کو رہنے دینا چاہئے اور جب وہ اپنے ملک کی طرف واپس جانا چاہیں تو خیریت سے پہونچا دینا چاہئے:۔

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ، ذالک بانھم قوم لا یعلمون (۹: ۱)	اگر مشرکوں میں سے کوئی تمہاری پناہ میں آنا چاہے تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے مامن تک پہونچا دو، یہ اس لئے ہے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

ابتداءً اس آیت کی غرض اشاعتِ اسلام تھی جیسا کہ ابن جریر اور ابن کثیر نے بیان کیا ہے فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ سے مراد یہ ہے کہ ان کو اپنی پناہ میں لیکر اللہ کا کلام سناؤ اگر وہ اس طرح وعظ و نصیحت حاصل کریں اور اسلام قبول کرلیں تو بہتر ہے اور اگر ان کے دل اسلام کے لئے نہ کھلیں تو ان کو قتل نہ کرو بلکہ امن و عافیت کے ساتھ ان کو ان کے وطن تک پہونچا دو، ثم ابلغہ مامنہ، لیکن چونکہ آیت کے الفاظ عام تھے اس لئے ائمہ مجتہدین نے اس سے یہ حکم نکالا کہ دارالحرب سے جو لوگ تجارت یا سیاحت یا حصولِ علم یا کسی دوسری غرض سے آنا چاہیں اور حکومت اسلامیہ کی پناہ میں رہنے کی درخواست کریں تو انکو دارالاسلام میں آنے اور آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کرنے کی اجازت دینی چاہئے[1] فقہائے حنفیہ نے اس کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی ہے، اگر حربی مستامن کو دارالاسلام میں رہتے ہوئے ایک سال گذر جائے تو اس کو نوٹس دیا جائیگا کہ یا تو وہ واپس جائے یا ذمی

[1] اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وہ امان لیکر داخل ہوں، ورنہ بغیر امان طلب کئے آنے کی صورت میں ان کو جاسوس قرار دیا جائیگا، اور جاسوس کے لئے اسلامی قانون میں بھی تمام دوسرے قوانین کی طرح قتل کی سزا ہے۔

قومیت (جس کی تعریف ہدایہ کتاب السیر باب المستامن میں کی گئی ہے) بدل کر اسلامی رعیت بنجائے، تاہم حقوق کے اعتبار سے ذمی اور مستامن میں زیادہ فرق نہیں ہے، مستامن کے لئے شریعت نے یہ وسیع رعایات مقرر کی ہیں، کہ اس سے جزیہ نہیں لیا جائیگا، بڑے سے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے کے باوجود وہ امان جو اسے دی گئی ہے منسوخ نہ ہوگی، اگر وہ کسی مسلمان کو قتل کردے، یا رہزنی کرے یا مسلمان عورت سے زنا کرے تب بھی اسے محض عام مجرموں کی طرح سزا دیجائیگی، حد یہ ہے کہ اگر وہ دار الاسلام کی خبریں بھی دشمنوں کو خفیہ خفیہ بھیجتا ہو تو امان کا عہد نہ ٹوٹے گا، صرف جرم کی سزا دیدیجائیگی، ان رعایات کے مقابلہ میں اس کے ساتھ صرف اتنی سختی برتی گئی ہے کہ اگر اسلامی رعایا کا کوئی فرد خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی، اس کو قتل کردے تو قاتل سے قصاص نہ لیا جائیگا محض دیت وصول کیجائے گی، مگر اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی رعیت نہیں ہے، اور اجنبی کو اپنی رعیت کے برابر حقوق کوئی حکومت بھی نہیں دیا کرتی، خصوصاً جبکہ وہ اجنبی ایک ایسی قوم سے ہو جس کا اس حکومت سے نہ کوئی معاہدہ ہو اور نہ باضابطہ سیاسی تعلق،

یہ تو وہ صورتیں تھیں جنمیں دعوتِ صلح کفار کی طرف سے ہو، اب رہی دوسری صورت یعنی مسلمانوں کی طرف سے صلح کی دعوت، تو اس کے متعلق اسلام نے یہ اعلیٰ درجہ کا اصول مسلمانوں کو سکھایا ہے، کہ جب تم بالادست اور طاقتور ہو، اس وقت دشمن کو صلح کا پیام دو،

فلا تهنوا وتدعوا الى السلم وانتم الاعلون (۴۷: ۳۵)	اعدا کے مقابلہ میں ضعیف نہ بنو، اور انھیں اس وقت صلح کی دعوت دو جبکہ تم غالب و سربلند ہو،

ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:-

قال جل وعلا لعباده المومنين	اللہ جل وعلا اپنے مومن بندوں سے کہتا ہے کہ فلا تهنوا

ع کتاب بخزانۃ النسخہ، ہدیہ کتاب السیر باب المستامن، بعض فقہاء نے یہ بھی فتویٰ دیا ہے کہ خواہ نوٹس دیا جائے یا نہ دیا جائے بہرصورت ایک سال گذرنے کے بعد اس کی قومیت خود بخود بدل جائے گی چنانچہ مبسوط کے الفاظ اسی پر دلالت کرتے ہیں، ۲ رد المحتار ج ۲ ص ۲۷۳،

فلا تهنوا ای تضعفوا عن
لاعدا وتدعوا الی السلم ای
المهادنة والمسالمة ووضع
القتال بینکم وبین الکفار فی
حال قوتکم وکثرة عددکم
ولهذا قال فلا تهنوا وتدعوا
الی السلم وانتم الاعلون ای
فی حال علوکم علی عدوکم،

تم ضعیف و کمزور نہ بنو، اور پے در پے دشمن کے درپے
سلم یعنی مصالحت و مسالمت اور ترک جنگ کی
دعوت اس وقت دو جبکہ تم طاقتور اور کثیر التعداد
ہو، اسی لئے فرمایا، فلا تهنوا وتدعوا الی السلم
وانتم الاعلون، یعنی دعوت صلح کی
اس حال میں کہ تم اپنے دشمن پر بالادست
ہو،

یہ کیسا اعلیٰ درجہ کا اصول ہے آج دنیا کی مہذب قوموں میں صلح صرف جنگ سے معذور و مجبور ہونے کا نام ہے، فرانس اور جرمنی میں اس لئے صلح ہے کہ وہ باہم لڑنے کی قدرت نہیں رکھتے، انگلستان اور روس میں اس لئے صلح ہے کہ کچھ مجبوریاں ان کو جنگ سے روکے ہوئے ہیں، اگر آج یہ مجبوریاں دور ہو جائیں، اور ایک قوم دوسری قوم کو مٹا دینے پر قادر ہو جائے تو شاید یہ قومیں جنگ میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کریں، لیکن اس کے برعکس اسلام یہ سکھاتا ہے، کہ جب تم کو دشمن پر نمایاں غلبہ حاصل ہو، اور تم اس پر اپنی بالادستی اور اپنی قوت و قدرت اچھی طرح ثابت کر دو، تو اس کو صلح کی طرف دعوت دو، اور اپنی طاقت کو دنیا میں جنگ برپا کرنے کے بجائے، امن و سلامتی قائم رکھنے کے لئے استعمال کرو،

بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی حالت بہت کمزور ہوتی ہے یا مسلمان اپنی اندرونی اصلاح کے لئے بیرونی امن و سکون کی ضرورت ہوتی ہے، ایسے حالات میں مسلمانوں کے امام کو اختیار دیا گیا ہے کہ موقع و محل کے لحاظ سے، اسلامی مصالح کو دیکھ کر دشمنوں کے ساتھ موادعت کرلے، اس باب میں صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جس میں رسول اللہ صلعم نے ضروریات وقت کے لحاظ سے قریش کے ساتھ ایسی شرائط صلح طے کر لی تھیں کہ بظاہر ان سے اسلام کی کمزوری محسوس ہوتی تھی، مگر درحقیقت انھیں نے اسلام کے لئے پھیلنے اور طاقتور بننے کے مواقع بہم پہونچا دیئے،

مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ، جنگ کے مسائل ختم ہوئے، اب ہم کو متعلقاتِ جنگ پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہئے، دشمن کے ساتھ ایسی حالت میں نیک سلوک کرنا جبکہ اس کے اندر مقاومت اور انتقام کی قوت موجود ہو، کسی نہ کسی حد تک "کلوخ انداز را پاداشِ سنگ" کے خوف پر محمول کیا جا سکتا ہے، مگر جب اس کی قوتِ مقابلہ بالکل ٹوٹ جائے، اور وہ بے بس ہو کر اپنے آپ کو فاتح کے رحم پر چھوڑ دے، اس وقت اس کے ساتھ فیاضی کا سلوک کرنا خالص اور کامل نیکی ہے، جو فاتح کے حسنِ نیت کو بالکل واضح کر دیتی ہے، مفتوح کیساتھ فاتح کے برتاؤ کا انحصار درحقیقت فاتح کے مقصدِ فتح پر ہوا کرتا ہے، اگر اس نے مفتوح کو حصولِ دولت کے لئے فتح کیا ہے، تو اس کی حاکمانہ سیاست پر استحصال بالجبر کا غلبہ ہوگا، اگر مذہبی عقائد کی بنا پر کیا ہے تو حکومت میں مذہبی تعصب و تشدد نمایاں ہوگا، اگر ملک گیری و فرماں روائی کی حرص اس کی محرک ہوئی ہے تو حکومت کی ساری عمارت ظلم و جور اور استکبار و استعباد پر قائم ہوگی، بخلاف اس کے اگر فاتح کا مقصد حقیقۃً اصلاح کے سوا کچھ نہ ہو، تو نہ وہ مفتوح قوم کی دولت لوٹے گا، نہ مذہبی تشدد برتیگا، نہ ظلم و جور کا برتاؤ کریگا، اور نہ اس کو ذلیل و خوار کر کے اپنا غلام بنائیگا، اس کی حکومت عدل، رواداری، مساوات اور فیاضی پر مبنی ہوگی، اور اس کی سیاست کا مدار صرف یہ ہوگا کہ مفتوح قوم کو فتنہ و فساد اور طغیان و سرکشی سے باز رکھے، اور اپنے دامنِ عافیت میں اسکو امن کے ساتھ اخلاقی، مادی اور روحانی ترقی کے مواقع بہم پہونچائے، اب اس معیار کے مطابق ہمکو دیکھنا چاہئے کہ اسلام اپنی مفتوح قوموں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟ اس کا قانون مفتوحین کو کیا درجہ دیتا ہے؟ اس کی شریعت ان کے لئے کیا حقوق مقرر کرتی ہے؟ اور اس کی حکومت ان کے ساتھ ایک مصلح حکومت کا سا برتاؤ کرتی ہے، یا مفسد حکومت کا سا؟

مفتوحین کی دو قسمیں، اسلامی قانون نے تمام مفتوحین کو دو اقسام پر منقسم کیا ہے، ایک وہ جو صلح کیساتھ اطاعت قبول کریں، دوسرے وہ جو بزورِ شمشیر مغلوب ہوں، ان دونوں کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے، اس لئے ہم دونوں کے احکام الگ الگ بیان کریں گے،

معاہدین، جو لوگ جنگ سے پہلے یا دورانِ جنگ میں اطاعت قبول کرنے پر راضی

ہوجائیں، اور حکومت اسلامیہ سے مخصوص شرائط طے کرلیں، ان کے لئے اسلام کا قانون یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمام معاملات ان شرائطِ صلح کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہیں، دشمن کو اطاعت پر آمادہ کرنے کے لئے چند خاص شرائط طے کرلینا اور پھر جب وہ پوری طرح قابو میں آجائے تو اس کے ساتھ مختلف برتاؤ کرنا آج کل کی تہذیب قوموں کے سیاسی معمولات سے ہے، مگر اسلام اس کو نا جائز بلکہ حرام اور گناہ عظیم قرار دیتا ہے، اس کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم کے ساتھ کچھ شرائط طے ہوجائیں، خواہ وہ مرغوب ہوں یا نہ ہوں، تو اس کے بعد ان شرائط سے یک سرِ مو بھی تجاوز نہ کیا جائے، بلا لحاظ اس کے کہ فریقین کی اعتبار حیثیت اور طاقت و قوت میں کتنا ہی فرق آجائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

لعلکم تقاتلون قوماً فتظهرون علیهم فیتقونکم باموالهم دون انفسهم و ابنائهم (وفی حدیث) فیصالحونکم علی صلح فلا تصیبوا منهم فوق ذالک فانه لا یصلح لکم[1]

اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آجاؤ، اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کرے (ایک دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے ایک صلحنامہ طے کرے) تو پھر تم اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

الا من ظلم معاهداً او انتقصه او کلفه فوق طاقته او اخذ منه شیئاً بغیر طیب نفس فانا حجیجه یوم القیامة[2]

خبردار، جو شخص کسی معاہد پر ظلم کریگا یا اس کے حقوق میں کمی کریگا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالیگا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کریگا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنونگا۔

ان دونوں حدیثوں کے الفاظ عام ہیں اور ان سے یہ عام حکم مستنبط ہوتا ہے کہ معاہد ذمیوں کے ساتھ صلحنامہ میں جو شرائط طے ہوجائیں ان میں سے کسی قسم کی کمی یا زیادتی کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، نہ ان پر ٹیکس بڑھایا جا سکتا ہے، نہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عمارتیں چھینی جا سکتی ہیں، نہ ان پر سخت فوجداری قوانین نافذ کئے جا سکتے ہیں،

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد [2] ایضاً۔

ن کے مذہب میں دخل دیا جا سکتا ہے، نہ ان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جا سکتا ہے، اور نہ کوئی ایسا فعل کیا جا سکتا ہے جو ظلم یا تعاقص، یا تکلیف مالا یطاق یا اخذ بغیر طیب نفس کی حدود میں آتا ہو۔ انھیں احکام کی بنا پر فقہائے اسلام نے صلحاً فتح ہونے والی قوموں کے متعلق کسی قسم کے قوانین مقرر نہیں کئے، اور صرف یہ عام قاعدہ وضع کر کے چھوڑ دیا کہ ان کے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل شرائطِ صلح کے مطابق ہوگا، امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ:-

یوخذ منھم ما صولحوا علیہ	ان سے وہی لیا جائیگا جس پر ان کے ساتھ صلح ہوئی ہے،
ویوفی لھم ولا یزاد علیھم[1]	ان کے حق میں صلح کی شرائط پوری کیجائیں گی، اور ان پر کچھ زیادہ نہ کیا جائیگا،

ظاہر ہے کہ صلحنامہ کے لئے قواعد و اصول معین نہیں کئے جا سکتے، وقت اور موقع کے لحاظ سے جیسی شرائط مناسب ہوں گی وہی طے کرلی جائیں گی، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدینؓ نے مختلف قوموں سے جو صلحنامہ کئے ہیں، ان سے ہمیں کم از کم وہ عام اصول معلوم ہو جاتے ہیں جن پر اسلام اپنے دشمنوں سے مصالحت کرتا، اور کر سکتا ہے، ان اصول کو واضح کرنے کے لئے ہم چند صلحنامے یہاں نقل کرتے ہیں،

اہل نجران کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صلحنامہ لکھ کر انھیں دیا تھا اس میں خراج کی رقم مقرر کرنے کے بعد لکھا ہے:-

ولنجران وحاشیتھا جوار اللہ	نجران کے عیسائیوں اور ان کے ہمسایوں[2] کے لئے
وذمۃ محمد النبی رسول اللہ	اللہ کی پناہ اور اللہ کے رسول محمد نبی کا ذمہ ہے انکی
علی انفسھم وملتھم، وارضھم	جانوں کے لئے، ان کے مذہب، ان کی زمین انکے
واموالھم، وغائبھم وشاھدھم	اموال ان کے حاضر و غائب، ان کے اونٹوں، انکے
وعیرھم ورسلھم وامثلتھم،	ان کے قاصدوں، اور ان کے مذہبی نشانات[3] سب

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۵، [2] ڈاکٹر اسپرنگر نے حاشیہ سے مراد یہودی لیے ہیں، (سیرۃ محمدؐ ج ۳ ص ۵۰۲) مگر دراصل اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جو عیسائیوں کے ساتھ وہاں آباد تھے، [3] اشلہ سے مراد صلیبیں اور تصویریں وغیرہ ہیں جو کنیسوں میں رکھی جاتی ہیں،

لا يغير ما كان فيه ولا
يغير حق من حقوقهم ولا مثلتهم
ولا فتين اسقف من اسقفيته
ولا راهب من رهبانيته
ولا واقف من وقاهيته على
ما تحت ايديهم من قليل او
كثير وليس عليهم رهق ولا دم
جاهلية ولا يحشرون ولا
يعشرون ولا يطاء ارضهم
جيش من سأل منهم حقا
فبينهم النصف غير ظالمين
ولا مظلومين بنجران ومن
كل منهم الربا من ذي قبل
ندمة منه برئية ولا
يوخذ منهم رجل بظلم آخر
لهم على ما في هذه الصحيفة
وان الله وذمة محمد النبي
ابدا حتى يات امر الله ما
نصحوا واصلحوا فيما عليهم

کے ساتھ جس حالت پر [illegible] تک ہیں اسی پر باقی
رہیں گے۔ ان کے حقوق میں سے کوئی حق اور ملت
میں سے کوئی نشان نہ بدلا جائیگا۔ ان کے کسی اسقف
کو اس کی اسقفیت سے، اور کسی راہب کو اس کی رہبانیت
سے، اور کسی خادم کلیسا کو اس کی خدمت سے نہ ہٹایا
جائیگا خواہ اس کے ہاتھ کے نیچے جو کچھ ہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ
ان پر عہد جاہلیت کے کسی خون یا عہد کی کوئی ذمہ داری
نہیں ہے۔ ان کو فوجی خدمت یا دہ یکی ادا کرنے پر
مجبور نہ کیا جائیگا اور ان کی زمین کو کوئی لشکر پامال
نہ کریگا۔ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کسی حق کا دعوی
کریگا تو فریقین کے درمیان انصاف کیا جائیگا۔ نہ بن
نجران ظالم بن سکیں گے۔ نہ مظلوم۔ اگر جس شخص نے
اس سے پہلے سود کھایا ہو اس کی ذمہ داری سے میں
بری ہوں۔ ان میں سے کسی شخص کو دوسرے کے گناہ
میں نہ پکڑا جائیگا۔ اس صحیفہ میں جو کچھ ہے اس کے لئے
اللہ کی ضمانت اور محمد نبی کا ذمہ ہے۔ ہمیشہ کے واسطے
جب تک کہ اللہ کا حکم آئے۔ اور جب تک وہ خیر خواہ رہیں
اور ان حقوق کو ادا کرتے رہیں جو اس معاہدہ کی رو سے
ان پر عائد ہوتے ہیں۔

ے اس سے معاہدہ کے وہ حقوق مراد ہیں جو اس میں تحریر ہیں یعنی نجران کی
لشکر ان کی زمین کو پامال نہ کریگا بلکہ یہ بھی ہے کہ تمام خارجی حملوں کے مقابلہ میں ان کی حفاظت کی جائیگی

سے اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے معاہدہ سے پہلے سود پر رقم دی ہو اور معاہدہ کے بعد وہ مدیون پر سود کا دعوی
کرے تو ہم اسکو دلوانے کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر یعقوبی نے جو معاہدہ نقل کیا ہے اس میں [illegible] کے بعد لکھا ہے کہ [illegible]

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس میں انھوں نے تمام باشندوں پر مجموعاً صرف ۷۰ ہزار درہم (یعنی محتاجوں اور مفلسوں کو الگ کرکے بقیہ آبادی پر ۱۰ درہم فی کس کے حساب سے) سالانہ خراج مقرر کیا، اور اس کے مقابلہ میں حکومت اسلامیہ کی جانب سے یہ عہد کیا کہ:-

لا یهدم لهم بیعة ولا کنیسة ولا یمنعون من ضرب الناقوس ولا من اخراج الصلبات فی یوم عیدهم[1]

ان کا کوئی معبد اور گرجا منہدم نہ کیا جائیگا، نہ ان کے قلعوں میں سے کوئی قلعہ توڑا جائیگا، جنہیں وہ اپنے دشمنوں سے بچاؤ کے لئے پناہ گزیں ہوا کرتے تھے، نہ انھیں ناقوس بجانے سے روکا جائیگا، اور نہ ان کی عید کے دن صلیبیں نکالنے سے منع کیا جائیگا،

حضرت عمرؓ نے اہل بیت المقدس کو جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

اعطاهم امانا لانفسهم و اموالهم ولکنائسهم وصلبانهم وسقیمها وبریها وسائر ملتها انه لا یسکن کنائسهم ولا تهدم ولا ینتقص منها ولا من حیزها ولا من صلبهم، ولا من شئ من اموالهم ولا یکرهون علی دینهم ولا یضار احد منهم[2]

ان کو امان دی ان کی جان و مال اور ان کے کنیسوں اور صلیبوں اور ان کے تندرستوں اور بیماروں کے لئے یہ امان ایلیا کی ساری ملت کیلئے ہے، عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائیگا، نہ ان کو منہدم کیا جائیگا، نہ ان کے احاطوں اور ان کی عمارتوں میں کوئی کمی کیجائیگی، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہونچایا جائیگا، ان پر دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہ کیا جائیگا، اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہونچایا جائیگا،

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۲ [2] یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب اہل بیت المقدس کی قوت مقابلہ بالکل ٹوٹ چکی تھی،

اہلِ دمشق کو حضرت عمرؓ نے جو صلحنامہ لکھدیا اس کے الفاظ یہ ہیں:-

اعطاهم امانا على انفسهم و اموالهم، وكنائسهم وسور مدينتهم لا يهدم ولا يسكن شئ من دورهم لهم بذلك عهد الله وذمة رسوله... ....لا يعرض لهم الا بخير اذا اعطوا الجزية۔

ان کو امان دی ان کی جان و مال کے لئے اور ان کے کنیسوں اور ان کے شہر کی فصیل کے لئے، ان کے مکانات میں سے نہ کوئی توڑا جائیگا اور نہ مسلمانوں کا مسکن بنایا جائیگا، اس پر ان کے لئے اللہ کا عہد اور اس کے رسول کا ذمہ ہے ..... ان کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا جائے گا جب تک وہ جزیہ ادا کرتے رہیں گے۔

حضرت خالد بن ولید نے اہل عانات کو جو صلحنامہ لکھدیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:-

لا يهدم لهم بيعة ولا كنيسة وعلى ان يضربوا نواقيسهم في اى ساعة شاؤا من ليل او نهار الا في اوقات الصلوة وعلى ان يخرجوا الصلبان في ايام عيدهم۔

ان کا کوئی معبد اور کوئی گرجا منہدم نہ کیا جائے گا، وہ رات دن میں جس وقت چاہیں اپنے ناقوس بجائیں، مگر اوقات نماز کا احترام ملحوظ رکھیں ان کو حق ہوگا کہ اپنے ایام عید میں صلیبیں نکالیں۔

بعلبک کے لوگوں کو حضرت ابوعبیدہؓ نے جو صلحنامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:-

هذا كتاب امان لفلان[1] بن فلان و اهل بعلبك رومهم و فرسهم وعربهم على انفسهم واموالهم وكنائسهم وديرهم داخل المدينة وخارجها وعلى سرحاتهم.....

یہ امان کی تحریر ہے فلاں بن فلاں اور اہل بعلبک کے لئے عام اس سے کہ وہ رومی ہوں یا فارسی یا عرب امان ہے ان کی جان مال کنائس و عمارت کے لئے عام اس سے کہ وہ شہر کے اندر ہوں یا باہر اور ان ہے ان کی چیزوں کے لئے ..... ان میں سے جو مسلمان ہو جائیگا اس کے وہی

[1] یہ صلحنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب دمشق پر دوبارہ تسخیر فتح ہو چکا تھا تاہم غالباً یہاں حاکم بعلبک کا نام ہوگا۔

من اسلم فله ما لنا وعليه ما علينا ولتجار هم ان يقيموا حيث اراد وا من البلاد اللتي صالحنا عليها وعلى من اقام منهم الجزية والخراج

حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور اس پر وہی فرائض ہیں جو ہم پر ہیں، ان کے تاجروں کو حق ہوگا کہ جن ملکوں سے ہماری صلح ہو چکی ہے، ان میں آزادی کے ساتھ آمد و رفت رکھیں، ان میں سے جو کوئی اپنے دین پر قایم رہیگا، اس کے لئے جزیہ اور خراج ہے۔

اہل دبیل کے صلحنامہ میں حبیب بن مسلمہؓ نے لکھا:۔

هذا كتاب من حبيب بن مسلمة لنصارى اهل دبيل ومجوسها ويهودها، شاهدهم وغائبهم الى من تسلم على انفسكم واموالكم وكنائسكم وبيعكم وسورمدينتكم فانتم آمنون وعلينا الوفاء لكم بالعهد ما وفيتم واديتم الجزية والخراج،

یہ تحریر ہے حبیب بن مسلمہؓ کی جانب سے اہل دبیل کے لئے عام اس سے کہ وہ عیسائی ہوں یا مجوسی یا یہودی، حاضر ہوں یا غائب، میں نے تم کو امان دی تمہاری جانوں اور مالوں اور کنیسوں اور معبدوں، اور تمہارے شہر کی فصیل کے لئے پس تم امان میں ہو اور جب تک تم اپنے عہد پر قائم رہو اور جزیہ و خراج ادا کرتے رہو، ہم پر فرض ہے کہ اس عہد کو پورا کریں،

آذربائیجان کے صلحنامہ میں حذیفہ بن الیمانؓ نے لکھا:۔

الامان على انفسهم واموالهم وملتهم وشرائعهم،

امان ہے ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں اور ان کی شریعتوں کے لئے،

جرجان کے صلحنامہ میں انھیں حذیفہؓ نے لکھا کہ:۔

لهم الامان على انفسهم واموالهم وملتهم وشرائعهم ولا يغير شئ من ذالك

ان کی جان و مال اور ان کی ملتوں اور شریعتوں کے لئے امان ہے، ان میں سے کسی چیز میں تغیر نہ کیا جائیگا،

ماہ دینار کے صلحنامہ میں انھوں نے لکھا کہ:۔

لا یغیر ن عن ملتہ ولا یحال بینھم وبین شی ائھم	ان کو مذہب بدلنے پر مجبور نہ کیا جائیگا اور نہ ان کے مذہبی قوانین میں مداخلت کی جائیگی۔

ہم نے اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معاہدات اس لئے نقل کئے ہیں کہ قارئین کرام کو اسلام کے انداز مصالحت کا ایک عمومی تصور ہو جائے ایک دو معاہدات کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہونا ممکن ہے، کہ شاید کسی خاص حالت میں رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہؓ نے مجبوراً ایسی شرائط قبول کرلی ہوں گی لیکن یہاں عرب شام، جزیرہ، ورفارس وغیرہ ممالک کے سبھی عہدنامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور تاریخوں میں ان کے علاوہ بیسوں اور عہدنامے مل سکتے ہیں جن کے اندر ایک ہی قسم کی فیاضانہ روح پائی جاتی ہے ہم نے خصوصیت کے ساتھ ان معاہدات کو نقل کیا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے پوری طرح غالب آجانے کے بعد کئے تھے، نجران کا معاہدہ اس وقت ہوا تھا جب تمام عرب پر اسلام کی دھاک بیٹھ چکی تھی، اور خود اہل نجران نے خوفزدہ ہوکر اپنے سید اور عاقب کو مصالحت کے لئے بھیجا تھا حیرہ کا معاہدہ اس وقت ہوا جب اس کے دیہات کے مقامات کو خالد بن ولیدؓ کی بے پناہ تلوار فتح کرچکی تھی، اور اہل حیرہ نے اپنی بیچارگی میں دیکھی تھی، کہ خود آگے بڑھکر اطاعت قبول کریں، دمشق اور بیت المقدس کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہوچکا ہے، کہ وہ قریب قریب فتح ہوچکے تھے، اور اگر مسلمان چاہتے کہ انہیں بزور شمشیر فتح کرلیں، تو یہ ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا، ایسی حالت میں صلح کرنا اور ان شرائط پر کرنا جو اوپر کے معاہدات میں درج ہیں، کسی ایسی قوم کا فعل نہیں ہوسکتا تھا جس کا مقصد اپنے مذہب کی جبریہ اشاعت کرنا ہوتا، یا جس نے غیر مذہب کا نام مٹانے کے لئے تلوار اٹھائی ہوتی، یا جو محض لوٹ مار اور حصول ملک و مال کے لئے نکلی ہوتی۔

غیر معاہدین مفتوحین کی دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں، اور جنھوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں انکے مستحکمات کو توڑکر ان کی بستیوں میں فاتحانہ داخل ہوچکی ہوں، ایسے مفتوحین کے بارے

تمام اسلام نے فاتح قوم کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کے تمام ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کر دے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالے اور ان کی املاک پر قبضہ کرلے، لیکن طریق اولیٰ یہ بتایا ہے کہ ان کو بھی ذمی بنا لیا جائے، اور اسی حال پر رہنے دیا جائے جس پر وہ جنگ سے پہلے تھے، آپ کو معلوم ہے کہ اس زمانہ کا عام دستور ہی یہ تھا کہ مفتوحوں کو غلام بنا لیتے، ان کے املاک پر قبضہ کر لیتے اور شہروں کی تسخیر کے بعد قتل عام کرکے ان کی جنگی طاقت کو فنا کر دیتے تھے، اسلام کے لئے، اس عام وقتی ذہنیت کو دفعۃً بدل دینا مشکل تھا، وقت کی روح سے جنگ کرنا اس کے طریق اصلاح کے خلاف تھا، اس لئے اس نے ایک طرف رواجوں اور دستوروں سے متاثر دماغوں کو مطمئن کرنے کے لئے پچھلے طریقہ کو ظاہری شکل میں باقی رکھا، اور دوسری طرف رسول اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے اپنی رہنمائی سے مسلمانوں میں اتنی فراخ حوصلگی اور فیاضی کی اسپرٹ پیدا کر دی کہ انھوں نے خود ہی اس اجازت سے فائدہ اٹھانا پسند نہ کیا، اور رفتہ رفتہ ایک جوابی رواج ایسا پیدا ہو گیا جس نے پچھلے رواج کو منسوخ کر دیا، عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین بلکہ پورے عہد اسلامی کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہزاروں ملکوں اور شہروں کو عنوۃً فتح کیا، مگر کسی ایک میں بھی نہ قتل عام کیا، نہ باشندوں کو غلام بنایا، اور نہ ان کی املاک ضبط کیں[1]، عہد رسالت میں خیبر عنوۃً فتح ہوا اور آنحضرت صلعم نے اس کے باشندوں کو ذمی بنا لیا، مکہ عنوۃً فتح ہوا، اور نہ زمین فوج میں تقسیم کی گئی، نہ باشندوں کو غلام بنایا گیا، غزوۂ حنین میں ہوازن مغلوب ہوئے اور آنحضرت صلعم کے حکم سے ان کی جان بخشی کی گئی، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق و شام کے علاقے عنوۃً فتح ہوئے تو پہلی مرتبہ اسلامی فوج میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ حق فتح سے فائدہ اٹھا کر زمین تقسیم کر دیجائے اور باشندے غلام بنا لئے جائیں، چنانچہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ:-

"ہم نے اس زمین کو اپنا خون بہا کر فتح کیا ہے، اس لئے آپ اسے ہمارے

[1] بنی قریظہ کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے، اور اس پر مفصل بحث آگے آتی ہے،

درمیان تقسیم کیجئے اور اس کے باشندوں کو خراج گزار بنائیے۔

مگر حضرت عمرؓ نے اپنے زبردست دلائل سے ان کے دلوں کا رخ پھیر دیا اور یہ قدیم ذہنیت ہمیشہ کے لئے بدل گئی[1]۔ امام ابو یوسفؒ نے وہ پورا مباحثہ نقل کیا ہے جو اس مسئلہ پر صحابہؓ کی کونسل میں ہوا تھا اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصلاح کا عمل کس طرح انجام پذیر ہوا حضرت بلالؓ اور حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کا مطالبہ تھا کہ زمین فوج میں تقسیم کیجائے اور باشندوں کو لونڈی غلام بنا لیا جائے لیکن حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت طلحہؓ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور انصارؓ کے تمام اکابر اس کے مخالف تھے اور سب کی رائے یہ تھی کہ ملک کو تقسیم کرنے اور باشندوں کو غلام بنانے کی پالیسی کسی طرح مناسب نہیں ہے خود حضرت عمرؓ سخت مخالف تھے۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"میری رائے یہ ہے کہ زمین کو اس کے غیر مسلم باشندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دوں ان کی زمین پر خراج اور ان کی گردنوں پر جزیہ مقرر کر دوں اور اس طرح یہ زمین مسلمانوں کے سپاہیوں اور بال بچوں اور آئندہ نسلوں کی ہمیشہ کے لئے وقف کے حکم میں ہو جائے اب کیا آپ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان علاقوں کو لوگوں کی ذاتی ملک بنا دیا جائے؟ کیا آپ کے نزدیک شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر جیسے بڑے بڑے صوبوں کو فوج میں تقسیم کر دینا ضروری ہے؟ اگر ایسا کر دیا گیا تو پھر لوگوں کے وظائف اور عربا کے روزینے کہاں سے آئیں گے؟"

اس پر پوری کونسل نے بالاتفاق حضرت عمرؓ کی تجویز منظور کر لی اور تمام اہل عراق ذمی بنا لئے گئے۔ شام کی فتح کے بعد بھی یہی جھگڑا تھا اور اس وقت بھی زبیر بن العوامؓ معاندین کے لیڈر تھے۔ مگر حضرت عمرؓ کے تدبر نے اس کا بھی وہی تصفیہ کیا جو مسئلہ عراق کا کیا تھا[2]۔ اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ۔ ۔

[1] جہ ی مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۰۰، فتوح البلدان صفحہ ۲۰۰

[2] کتاب الخراج صفحہ ۳ - ۵۔

[illegible] سے [illegible] تک [illegible] اور [illegible] فریقہ کی بیشمار زمینوں کو انھوں نے بغیر فتح کیا، اور کسی جگہ بھی حق فتح کو استعمال نہ کیا۔

اس قسم کے مفتوحین کو جب ذمی بنایا جاتا ہے، تو ان کو چند خاص حقوق دیئے جاتے ہیں، جنکی تفصیلات کتب فقہیہ میں موجود ہیں، ذیل میں ان احکام کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جسسے ذمیوں کی اس جماعت کی آئینی حیثیت معلوم ہوتی ہے،

(۱) جب امام ان سے جزیہ قبول کرلے تو ہمیشہ کے لئے عقد ذمہ قایم ہوجائیگا، اور ان کی جان ومال کی حفاظت کرنا مسلمانوں پر فرض ہوگا، کیونکہ قبول جزیہ کیساتھ ہی عصمت نفس ومال ثابت ہوجاتی ہے[1]، اس کے بعد امام کو یا مسلمانوں کو یہ حق باقی نہیں رہتا، کہ ان کی املاک پر قبضہ کریں یا انھیں غلام بنائیں، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو صاف لکھا ہے کہ فاذا اخذت منھم الجزیۃ فلا شئی لک علیھم ولا سبیل[2]،

(۲) عقد ذمہ قائم ہونے کے بعد زمینوں کے مالک وہی ہوں گے، انکی ملکیت ان کے ورثہ کو منتقل ہوگی، اور ان کو اپنی املاک میں بیع، ہبہ، رہن وغیرہ کے حاصل ہوں گے، حکومت اسلامیہ کو ان پر کسی قسم کے تصرف کا حق نہ ہوگا،

(۳) جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے متعین کیجائیگی، جو مالدار ہیں ان سے زیادہ جو متوسط الحال ہیں ان سے کم، اور جو غریب ہیں، ان سے بہت کم لیا جائیگا، اور جو کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رکھتے یا جن کی زندگی کا انحصار دوسروں کی بخشش پر ہے، ان پر جزیہ معاف کردیا جائیگا، اگرچہ جزیہ کے لئے کوئی خاص رقم متعین نہیں ہے، لیکن اس کی تعین میں یہ امر مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی رقم مقرر کیجائے جس کا ادا کرنا، ان کے لئے آسان ہو، حضرت عمرؓ نے مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ، توسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ مہینہ اور غریب محنت پیشہ لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا[3]،

---

[1] بدائع الصنائع ج ۷ ص [illegible] [2] کتاب الخراج ص ۷۲ [3] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۵۹ کتاب الخراج ص ۳۶

(۴) جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جائیگا جو اہل قتال ہیں غیر اہل قتال مثلاً بچے، عورتیں مجانین اندھے، اپاہج، اصحاب صوامع، از کار رفتہ بوڑھے، ایسے بیمار جن کی بیماری سال کے ایک بڑے حصہ تک ممتد ہو جائے، اور لونڈی غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں[۱]

(۵) عنوۃً فتح ہونے والے شہر کے معابد اور کنائس پر مسلمانوں کو قبضہ کر لینے کا حق ہے لیکن اس حق سے استفادہ نہ کرنا اور بطریق احسان ان کو علی حالہ قائم رہنے دینا اولیٰ اور افضل ہے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جتنے ممالک فتح ہوئے، ان میں کوئی معبد نہ توڑا گیا اور نہ اس سے کسی قسم کا تعرض کیا گیا، امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے ترکت علی حالھا ولم تھدم ولم یتعرض لھم، ان کو بحال رکھا گیا، انھیں نہ توڑا گیا، اور نہ کسی قسم کا تعرض کیا گیا[۲]۔ قدیم معابد کو مسمار کرنا بہر حال ناجائز ہے[۳]

ذمیوں کے عام حقوق۔ اب ہم ذمیوں کے وہ حقوق بیان کریں گے جو تمام اہل ذمہ کیلئے عام ہیں خواہ وہ معاہد ہوں یا غیر معاہد، صلحاً فتح ہوئے ہوں یا عنوۃً،

(۱) ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے، اگر کوئی مسلمان ذمی کو قتل کریگا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائیگا جس طرح مسلمان کے قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کیا تو آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور فرمایا، کہ انا احق من وفی بذمتہ، اس کے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں[۴]

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قبیلہ بکرؓ ابن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا، اس پر آپ نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے ورثوں کے حوالہ کیا جائے، چنانچہ وہ مقتول کے ورثہ کو دیدیا گیا، اور اس نے اسے قتل کر دیا[۵]

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں خود عبید اللہ بن عمرؓ کے قتل کا فتویٰ دیدیا گیا تھا، کیونکہ انھوں نے

---

[۱] بدائع ج ۷ ص ۳۔ [۲] فتح القدیر ج ۴ ص ۳۰۰۔ [۳] مسالک ج ۳ ص ۱۰۔ [۴] کتاب الخراج ص ۱۴۴ بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵] طحاوی شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۲۷۰۔ دقطنی نے بھی حدیث ابن عمرؓ سے قتل کی تردید میں ایک روایت نقل کی ہے۔ [۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۲۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۳۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۴۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۵۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۶۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۷۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۸۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۱] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۲] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۳] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۴] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۵] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۶] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۷] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۸] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۹۹] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔ [۱۰۰] بدائع ج ۷ ص ۱۰۰۔

ذمی بنا منہ آیا ہے۔ [۱۰۱] بدائع شرح مواہب الرحمن ج ۷ ص ۲۸۷۔

ہرمزان اور ابولؤلؤ کی بیٹی کو اس شبہ میں قتل کر دیا تھا کہ شاید وہ حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہوں۔

حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان پر ایک ذمی کے قتل کا الزام لگایا گیا، ثبوت مکمل ہونے کے بعد آپ نے قصاص کا حکم دیدیا، مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کیا مگر آپ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا، کہ لعلهم فزعوك او هددوك، "شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے"، اس نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے خوں بہا مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آجائیگا، تب آپ نے قاتل کو رہا کیا، اور فرمایا کہ من كان له ذمتنا فدمه كدمنا وديته كديتنا[1]، "جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح، اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے"، ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے فرمایا، انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماؤهم كدمائنا، "انھوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کیطرح اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہوجائیں"، اسی قول کی بنا پر فقہا نے یہ جزئیہ نکالا ہے کہ اگر مسلمان کسی ذمی کو بلا ارادہ قتل کرے تو اس کی دیت بھی وہی ہوگی جو مسلمان کو خطأً قتل کرنے سے لازم آتی ہے[2]۔

(۲) تعزیرات میں ذمی اور مسلمان کا درجہ مساوی ہے، جرائم کی جو سزا مسلمان کو دیجائیگی وہی ذمی کو بھی دیجائیگی، ذمی کا مال مسلمان چرائے یا مسلمان کا مال ذمی چرائے دونوں صورتوں میں سارق کا ہاتھ کاٹا جائیگا، ذمی کسی مسلمان عورت سے زنا کرے، یا مسلمان کسی ذمی عورت سے زنا کرے، دونوں صورتوں میں سزا یکساں ہوگی[3]، وهلم جرا[4]۔

(۳) دیوانی قانون میں بھی ذمی اور مسلمان کے درمیان کامل مساوات ہے، حضرت علیؓ کے ارشاد، اموالهم كاموالنا، کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان کے مال کی ویسی ہی حفاظت ہونی چاہئے جیسی مسلمانوں کے مال کی ہوتی ہے، اس باب میں ذمیوں کے حقوق کا اتنا لحاظ

---

[1] برہان ج ۲ ص ۲۰۰ میرے پیش نظر برہان کا وہ قلمی نسخہ ہے جو مدرسہ امینیہ دہلی کے کتبخانہ میں موجود ہے، [2] در المختار ج ۳ ص ۲۱۲

[3] کتاب الخراج صفحہ ۲۰۹-۱۰۸

لکھا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کی شراب یا ان کے خنزیر کو بھی تلف کردے تو اس پر ضمان لازم آئیگا، درالمختار میں ہے ویضمن المسلم قیمۃ خمرہ وخنزیرہ اذا اتلفہ۔ مسلمان اس کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کریگا، اگر وہ اسے تلف کردے۔

(۴) ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہونچانا، اس کو گالی دینا، مارنا پیٹنا، یا اس کی غیبت کرنا، اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں ناجائز ہے، درالمختار میں ہے، ویجب کف الاذی عنہ وعن عرضہ کالمسلم۔

(۵) عقد ذمہ مسلمانوں کی جانب ابدی لزوم رکھتا ہے یعنی وہ اسے باندھنے کے بعد پھر توڑ دینے کے مختار نہیں ہیں، لیکن دوسری جانب ذمیوں کو اختیار ہے کہ جب تک چاہیں اس پر قایم رہیں اور جب چاہیں توڑ دیں، ہدایہ میں ہے، واما صفۃ العقد فھو لازم فی حقنا حتی لا یملک المسلمون نقضہ بحال من الاحوال، واما فی حقھم فغیر لازم۔

(۶) ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے، اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا، حتی کہ جزیہ بند کردینا، مسلمان کو قتل کرنا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا، یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے، البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جنمیں عقد ذمہ باقی نہیں رہتا، ایک یہ کہ وہ دارالاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جاملے، دوسرے یہ کہ حکومت اسلامیہ کے خلاف علانیہ بغاوت کرکے فتنہ وفساد برپا کرے۔

(۷) ذمیوں کے معاملات ان کی شریعت کے مطابق طے کئے جائیں گے، اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائیگا، جن افعال کی حرمت ان کے مذہب میں ثابت ہے، ان سے تو وہ ہر حال میں منع کئے جائیں گے، البتہ جو افعال ان کے ہاں جائز اور اسلام میں ممنوع ہیں انھیں وہ اپنی بستیوں میں آزادی کے ساتھ کرسکیں گے، اور خالص اسلامی آبادیوں میں حکومت اسلامیہ کو اختیار ہوگا کہ انھیں آزادی دے یا نہ دے، ہدایہ میں ہے۔

ف۱ جوہرہ نیرہ، ف۲ شامی، ف۳ بدائع ج ۲، ف۴ فتح القدیر ج ۴، ف۵ خالص اسلامی آبادیوں سے مراد وہ مقامات ہیں جو اصطلاح شرع میں امصار مسلمین کہلاتے ہیں، اس لفظ کا اطلاق صرف انھیں مقامات پر ہوتا ہے جنکی زمین مسلمانوں کی ملک ہو، یا جنکو مسلمانوں نے خطہ بنانے کے لئے مخصوص کرلیا ہو،

ولا يمنعون من اظهار شيء مما ذكرنا من بيع الخمر والخنزير والصليب وضرب الناقوس في قرية او موضع ليس من امصار المسلمين ولو كان فيه عدد كثير من اهل الاسلام وانما يكره ذلك في امصار المسلمين وهي التي يقام فيها الجمع والاعياد والحدود ..... واما اظهار فسق يعتقدون حرمته كالزنا وسائر الفواحش التي حرام في دينهم فانهم يمنعون من ذلك سواء كانوا في امصار المسلمين او في امصارهم[1]

جو بستیاں اور مقامات امصارِ مسلمین میں سے نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو شراب وخنزیر بیچنے، اور صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائیگا، خواہ وہاں مسلمانوں کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو، البتہ یہ افعال امصارِ مسلمین میں مکروہ ہیں جہاں جمعہ وعیدین اور حدود قائم کی جاتی ہوں ..... رہا وہ فسق جس کی حرمت کے وہ بھی قائل ہیں، مثلاً زنا اور دوسرے تمام فواحش جو ان کے دین میں بھی حرام ہیں تو اس کے اظہار سے ان کو ہر حال میں روکا جائیگا خواہ وہ امصارِ مسلمین میں ہوں، یا خود اپنے امصار میں

لیکن امصارِ مسلمین میں بھی ان کو صرف صلیبوں اور مورتیوں کے جلوس نکالنے اور علانیہ ناقوس بجاتے ہوئے بازاروں میں نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے[2]، ورنہ اپنے قدیم معابد کے اندر رہکر وہ تمام شعائر کا اظہار کر سکتے ہیں، حکومت اسلامیہ اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے،

(۸) امصارِ مسلمین میں ذمیوں کے جو قدیم معابد ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا، اگر

---

[1] بدیع ج ۷ ص ۱۱۲ [2] امصارِ مسلمین میں یہ قیود عائد کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تصادم کے مواقع پیدا ہوں، افسوس ہے کہ بعد کے لوگوں نے اس کا منشا کچھ اور سمجھا،

ٹوٹ جائیں تو نہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے لیکن نئے معبد بنانے کا حق نہیں ہے[1]۔

(۹) جو مقامات امصار مسلمین نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معابد بنانے کی بھی عام اجازت ہے، اسی طرح جو مقامات "مصر" نہ رہے ہوں یعنی امام نے اس کو ترک کرکے اقامت جمعہ و اعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو، ان میں بھی نئے معابد کی تعمیر اور اظہار شعائر کفر جائز ہے[2]۔ ابن عباسؓ کا فتویٰ یہ ہے کہ:-

اما مصر مصرته العرب فليس	جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے، ان میں ذمیوں
لهم ان يحدثوا فيه بناء بيعة	کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد اور کنائس تعمیر کریں
ولا كنيسة ولا يضربوا فيه بناقوس	یا ناقوس بجائیں یا شراب پئیں اور سور پالیں، اپنی
ولا يظهروا فيه خمرا ويتخذوا فيه	رہتے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں، اور جن کو
خنزيرا وكل مصر كانت العجم مصرته	اللہ نے عربوں (یعنی مسلمانوں) کے ہاتھ پر فتح کیا، اور خوب
ففتحه الله على العرب فمن لوعلى	نے مسلمانوں کے حکم پر اطاعت قبول کرلی، تو عجم کے لئے
حكمهم فللعجم ما لهم وعليهم	وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور
ما عليهم وعلى العرب ان يوفوا لهم بذالك[3]	عرب پر ان کا ادا کرنا لازم ہے۔

(۱۰) جزیہ و خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے، ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی تاکید کی گئی ہے، اور ان پر ایسا بار ڈالنے سے منع کیا گیا ہے جسے اٹھانے کی ان میں قدرت نہ ہو۔

جزیہ کی مقدار مقرر کرنے میں ذمیوں پر تشدد کرنا ممنوع ہے، ان کے ساتھ نرمی اور رفق کی حضرت عمرؓ کی وصیت ہے کہ لا یکلفوا فوق طاقتهم جتنا مال دینا ان کی طاقت سے باہر ہو اس کے ادا کرنے کی تکلیف نہ دو[4]۔

جزیہ کے عوض ان کی املاک کا نیلام نہیں کیا جا سکتا، حضرت علیؓ کا حکم ہے کہ لا تبیعن

---

[1] ج ۱۰ ص ۷۸ [2] ایضاً ص ۷۹ [3] ایضاً ص ۸۰ و ۸۲
[4] ایضاً ص ۸۸

لھم فی خراجھم حمارا ولا بقرۃ ولا کسوۃ شتاء ولا صیفا۔ خراج میں نہ گدھا ان کی گائے، یا ان کے کپڑے نہ بیچنا، ایک اور موقع پر اپنے عامل کو بھیجتے وقت جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا:-

"ان کے جاڑے گرمی کے کپڑے اور ان کے کھانے کا سامان اور ان کے جانور جن سے وہ کھیتی باڑی کرتے ہیں خراج وصول کرنے کی خاطر ہرگز نہ بیچنا، نہ کسی کو درہم وصول کرنے کے لئے کوڑے مارنا، نہ کسی کو کھڑا رکھنے کی سزا دینا، اور نہ خراج کے عوض کسی چیز کا نیلام کرنا۔ کیونکہ ہم جو ان کے حاکم بنائے گئے ہیں تو ہمارا کام نرمی سے وصول کرنا ہے، اگر تم نے میرے حکم کے خلاف عمل کیا تو اللہ میرے بجائے تمکو پکڑیگا، اور اگر مجھے تمھاری خلاف ورزی کی خبر پہونچی تو میں تمھیں معزول کر دونگا"[1]

جزیہ کی تحصیل میں ان پر ہر قسم کی سختی کرنے سے منع کیا گیا ہے، حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا تھا، اس میں منجملہ اور احکام کے ایک یہ بھی تھا کہ:-

وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکل اموالھم الا بحلھا[2]۔	مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے، اور انھیں ضرر پہونچانے اور ناجائز طریقہ سے ان کے مال کھانے سے منع کرنا۔

شام کے سفر میں حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے عامل جزیہ وصول کرنے کے لئے ذمیوں کو سزائیں دے رہے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ ان کو تکلیف نہ دو، اگر تم انھیں عذاب دوگے تو قیامت کے دن اللہ تمھیں عذاب دیگا، لا تعذبوا الناس فان الذین یعذبون الناس فی الدنیا یعذبھم اللہ یوم القیامۃ[3]۔

ہشام بن حکم نے حمص کے ایک سرکاری افسر کو دیکھا کہ وہ ایک قبطی کو جزیہ وصول کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کر رہا ہے، اس پر انھوں نے اسے ملامت کی اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ، ان اللہ عزوجل یعذب الذین یعذبون

[1] فتح البیان ج ۴ ص ۹۳، [2] کتاب الخراج صفحہ ۹، [3] کتاب الخراج صفحہ ۷۲، [4] کتاب الخراج صفحہ ۷۰۔

ان اللہ یعذب الذین یعذبون الناس فی الدنیا، اللہ عزوجل ان لوگوں کو عذاب دیگا جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔

فقہائے اسلام نے نادہندوں کے حق میں صرف اتنی اجازت دی ہے انھیں تادیباً قید بے مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے، امام ابو یوسفؒ نے لکھا ہے ولکن یرفق بھم ویحبسون حتی یؤدوا ما علیھم[1]،

(۱۱) جو ذمی محتاج اور فقیر ہوجائیں انھیں صرف جزیہ سے معاف ہی نہیں کیا جائیگا بلکہ ان کے لئے اسلامی خزانہ سے وظائف بھی مقرر کئے جائیں گے، حضرت خالدؓ نے اہل حیرہ کو جو امان نامہ لکھ کر دیا تھا اسمیں لکھتے ہیں:-

وجعلت لھم ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابتہ آفۃ من الآفات او کان غنیا فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین ھو وعیالہ[2]

میں نے ان کے لئے یہ حق بھی رکھا ہے کہ جو کوئی شخص بڑھاپے کے سبب از کار رفتہ ہوجائے یا اس پر کوئی آفت نازل ہوجائے، یا وہ پہلے مالدار تھا پھر فقیر ہوگیا یہاں تک کہ اس کے ہم مذہب لوگ اسکو صدقہ وخیرات دینے لگے، تو اس کا جزیہ معاف کردیا جائیگا اور اسے اور اس کے بال بچوں کو مسلمانوں کے بیت المال سے خراج دیا جائیگا،

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک ضعیف العمر ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا اور اس سے اس ذلیل حرکت کا سبب دریافت کیا، اس نے کہا کہ جزیہ ادا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں اس پر آپ نے اس کا جزیہ معاف کردیا، اس کے لئے وظیفہ مقرر کیا اور اپنے خزانچی کو لکھا کہ:-

"یہ فقط اس قسم کی بہت سی ناانصافیوں میں سے ایک ہے کہ ہم اس کی جوانی میں اس سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اس کو ضائع کردیں"

دمشق کے سفر میں بھی حضرت عمرؓ نے معذور ذمیوں کے لئے مدد دی وظائف مقرر کرنے کے احکام جاری کئے تھے[3]،

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۲ [2] فتوح البلدان بحث یرموک صفحہ ۱۳۱

(۱۲) اگر کوئی ذمی مرجائے اور اس کے حساب میں جزیہ کا بقایا واجب الادا ہو، تو وہ اسکے ترکہ سے وصول نہیں کیا جائیگا، اور نہ اس کے ورثہ پر اسکا بار ڈالا جائیگا، امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ ان وجبت علیہ الجزیۃ فمات قبل ان تؤخذ منہ او اخذ بعضھا وبقی البعض لم یؤخذ بذالک ورثتہ ولم تؤخذ من ترکتہ[1]،

(۱۳) مسلمان تاجروں کی طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائیگا جبکہ ان کا راس المال ۲۰۰ درہم تک پہونچ جائے یا وہ ۲۰ مثقال سونے کے مالک ہوجائیں[2]، اسمیں شک نہیں کہ فقہا نے ذمی تاجر پر تجارتی محصول ۵ فی صدی لگایا ہے، اور مسلمان تاجر پر ۲½ فی صدی، لیکن یہ فعل نص پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد پر مبنی تھا، اور وقتی مصالح اسی کے مقتضی تھے، اس زمانہ میں مسلمان زیادہ تر جہاد اور تغور اسلامیہ کی حفاظت میں مشغول رہتے تھے، اور تمام تجارت ذمیوں کے ہاتھ میں آگئی تھی، اس لئے مسلمان تاجروں کی ہمت افزائی اور ان کی تجارت کے تحفظ کے لئے ان پر ٹیکس کم کردیا گیا،

(۱۴) ذمی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اور دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے، چونکہ ان سے جزیہ اسی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا جاتا ہے، اس لئے اسلام نہ تو ان کو فوجی خدمت کی تکلیف دینا جائز سمجھتا ہے، اور نہ انکی حفاظت سے عاجز ہونے کی صورت میں جزیہ وصول کرنا، اگر مسلمان ان کی حفاظت نہ کرسکے، تو انھیں ذمیوں کے اموال جزیہ سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، جنگ یرموک کے موقع پر جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلہ پر ایک زبردست فوج جمع کی اور مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوح علاقے چھوڑ کر ایک مرکز پر جمع ہونے کی ضرورت لاحق ہوئی تو حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ وخراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے، انھیں واپس کردو، اور ان سے کہو کہ "اب ہم تمھاری حفاظت سے عاجز ہیں، اس لئے ہم نے جو مال تمھاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے واپس کرتے ہیں[3]" اس حکم کے مطابق

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۰ [2] ایضاً
[3] کتاب الخراج صفحہ ۱۱۱

تمام اجنادکے امرانے جمع شدہ رقم واپس کردی۔[1]

اسلامی قانون سے یہ چند احکام صرف یہ دکھانے کے لئے نقل کئے گئے ہیں، کہ اسلام نے اپنی مفتوح قوموں کے ساتھ جس انصاف و عدل و مساوات کا سلوک روا رکھا ہے اس کی نظیر گذشتہ قوموں میں اور اکثر حیثیات سے موجودہ زمانہ کی مہذب قوموں میں بھی نہیں ملتی، یہ قانون محض ایک کاغذی قانون نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عملی تنقید کی ایک شاندار تاریخ بھی موجود ہے، چنانچہ ہم نے اس قانون کی ہر ہر دفعہ کے ساتھ حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں سے متعدد نظائر بھی پیش کردیئے ہیں، تاکہ قارئین کو معلوم ہوجائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے کس طرح اس قانون کو عملی جامہ پہنایا، عہد رسالت صلعم اور عہد صحابہؓ کے بعد بھی فقہائے اسلام ہمیشہ اس قانون کو ٹھیک ٹھیک نافذ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اور جب کبھی سرکش امرانے اس کے خلاف عمل کیا ہے، تو انھوں نے اس سے باز رکھنے یا کم از کم اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبد الملک اموی نے دمشق کے کنیسہ یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کرلیا، جب حضرت عمر بن عبد العزیز تخت خلافت پر متمکن ہوئے اور عیسائیوں نے ان سے اس ظلم کی شکایت کی تو انھوں نے اپنے عامل کو حکم دیا کہ مسجد کا جتنا حصہ گرجا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے، اسے منہدم کرکے عیسائیوں کے حوالہ کردو۔[2]

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرس کے ذمی باشندوں کو جلاوطن کرکے شام میں آباد کیا، تو اس پر فقہائے اسلام اور عام مسلمان سخت ناراض ہوئے، اور اسے گناہ عظیم سمجھا پھر جب یزید بن ولید نے ان کو دوبارہ قبرس میں لیجاکر آباد کردیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے، اسمٰعیل بن عیاش کا بیان ہے کہ، فاستقطع ذالک المسلمون واستعظمہ الفقہاء، فلما ولی یزید بن الولید بن عبد الملک ردھم الی قبرس

---

[1] بلاذری نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے کہا تھا کہ تمھارا عدل و انصاف ہمکو اس ظلم و ستم کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے، اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز نہ گھسنے دیں گے تاوقتیکہ لڑکر مغلوب ہوجائیں (فتوح البلدان طبع یورپ صفحہ ۱۳۰، [2] فتوح البلدان صفحہ ۱۳۱)

فاستحسن المسلمون ذالك من فعله وسرأ وه علاً[1]

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جبل لبنان کے باشندوں میں سے ایک گروہ نے بغاوت کردی، اس پر صالح بن علی بن عبداللہ نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، اور اس نے ان کے ہتھیار اٹھانے والے مردوں کو قتل کردیا، اور باقی لوگوں میں سے ایک جماعت کو جلاوطن کیا اور ایک جماعت کو وہیں آباد رہنے دیا، امام اوزاعیؒ اس زمانہ میں زندہ تھے، انھوں نے صالح کو اس ظلم پر سخت تنبیہ کی، اور ایک طویل خط لکھا جس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

"جبل لبنان کے اہل ذمہ کی جلاوطنی کا حال تمکو معلوم ہے، ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ کوئی حصہ نہیں لیا تھا، مگر باوجود اس کے تم نے کچھ کو قتل کیا اور کچھ لوگوں کو ان کی بستیوں کی طرف واپس بھیجدیا، میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام لوگوں کو بعض خاص لوگوں کے جرم کی سزا کیونکر دیجاسکتی ہے، اور کس بنا پر ان کے گھروں اور ان کی جائدادوں سے بے دخل کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ لاتزر وازرۃ وزر اخری، اور یہ ایک واجب التعمیل حکم ہے، تمھارے لئے بہترین نصیحت یہ ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو یاد رکھو کہ "جو کوئی کسی معاہد پر ظلم کریگا، اور اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا اس کے خلاف میں خود مدعی بنونگا"[2]

یہ اور ایسی ہی بیشمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ اسلام نے ہمیشہ اہل الذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے، اور اگر کبھی کسی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر و ظلم کیا بھی ہے تو وہ اسلامی قانون کے صریح خلاف تھا جس سے اسلام بری الذمہ ہے،

ذمیوں کے لباس کا مسئلہ۔ ایک چیز البتہ اسلام میں ایسی ملتی ہے جس پر مخالفین کو بہت کچھ اعتراض کی گنجایش مل گئی ہے، اور وہ ذمیوں کے لباس کا مسئلہ ہے، مگر افسوس ہے کہ ابتداءً اس کی جو حیثیت تھی اسے بعد میں غلط صورت دیدی گئی، اور اسی سے لوگوں کو یہ سمجھنے کا موقع مل گیا کہ اسلام نے ذمیوں کی تحقیر و تذلیل کے لئے ایک مخصوص لباس اور ایک مخصوص وضع معاشرت

[1] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۵۶۔ [2] فتوح البلدان صفحہ ۱۶۹،

[illegible]

میں اس قسم کی شرط موجود ہے۔ بل ذمہ یک خاص قسم کا لباس پہنیں اور مسلمانوں سے مشابہت نہ اختیار کریں۔ شام حیرہ کے معاہدہ میں ہمکو یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

ولهم كل ما لبسوا من الزي الا زي الحرب من غير ان يتشبهوا بالمسلمين	ان کو حق ہوگا کہ جیسا لباس چاہیں پہنیں مگر جنگی لباس نہ پہنیں، اور مسلمانوں سے تشابہ نہ اختیار کریں۔

اسی طرح دمشق کے معاہدہ میں جس کی شریط خود عیسائیوں کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، یہ الفاظ موجود ہیں:۔

ولا نتشبه بهم في شئ من ملابسهم في قلنسوة ولا عمامة ولا نعلين ولا فرق شعر	ہم مسلمانوں سے ان کے لباس میں کسی قسم کی مشابہت نہ اختیار کریں گے نہ ٹوپی میں نہ عمامہ میں نہ جوتیوں میں اور نہ مانگ نکالنے میں

ہماری کتب فقہ میں بھی اسی قسم کے احکام پائے جاتے ہیں، الخ۔ ہر ذمہ کو ایسی علامات اور نشانات لگانی پڑیں گی جنسے وہ پہچانے جاسکیں اور جس مسلمانوں سے مشابہت نہ اختیار کرنے دیجائیگی۔

امام ابو یوسف نے بھی اپنی کتاب الخراج میں اس قسم کے احکام بیان کئے ہیں کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ وضع قطع میں مشابہت اختیار نہ کرنی چاہئے۔

یہ سب احکام بالشبہ بارسے ماخوذ ہیں، لیکن ان کا مقصد فصل تحقیر نہیں ہے بلکہ مختلف ملتوں کے متبعین کو ہر خصوصیت سے روکنا ہے جو کہ جس سے ذمیوں

[illegible]

بتفصیل خطہ سے متعلق بیان کئے ہیں، شے بر قسمتی سے ختم ہو گئی ہے اسی کی ایک کتاب پر مقدمہ ہے کہ [illegible] اسی کی کتابوں پر مقدمہ ہے کہ [illegible] منقول ہیں ہے خود حضرت عمر کے احکام اس باب میں بالکل خاموش ہیں، لطف یہ ہے کہ تشابہ سے منع کرنے کا مقصد ذمیوں کو ذلیل کرنا ہے۔

کو مسلمانوں کے ساتھ تشابہ اختیار کرنے سے روکا گیا ہے، اسی طرح مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں کے ساتھ تشابہ اختیار کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، لباس کے تشابہ میں جو مفاسد پوشیدہ ہیں ان سے اسلام غافل نہیں ہے، خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں میں اکثر یہ عیب پیدا ہو جایا کرتا ہے کہ وہ اپنے قومی لباس اور قومی معاشرت کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں، اور حاکم قوم کا لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، یہ غلامانہ ذہنیت آج بھی دنیا کی محکوم قوموں میں موجود ہے، خود ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بیشمار رسمندی نژاد حضرات انگریزی لباس بڑے شوق کے ساتھ پہنتے ہیں اور اسے چین کریہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا ترقی کے کسی بہت ہی اعلیٰ مرتبہ پر پہونچ گئے ہیں، حالانکہ کوئی انگریز ہندوستانی لباس نہیں پہنتا اور اگر خالص انگریزی سوسائٹیوں میں پہنتا بھی ہے تو تفاخر کے لئے نہیں بلکہ تفنن اور مسخرہ پن کے لئے، نفسیات محکومیت کے اس نکتہ کو ائمہ اسلام خوب سمجھتے تھے، اس لئے انھوں نے اہل الذمہ کو تشابہ بالمسلمین سے منع کر کے ان کی تذلیل و تحقیر نہیں کی بلکہ ان کی قومی عزت و شرافت کو برقرار رکھا، ممکن ہے کہ اس قسم کے قوانین بعض لوگوں کی نگاہ میں موجب حقارت ہوں، مگر ہمارے نزدیک اسمیں کوئی تحقیر نہیں ہے، بلکہ ہم بہت خوش ہوں اگر ہمارے حکمراں بھی ہمکو یورپین لباس اور طرز معاشرت اختیار کرنے سے حکماً منع کر دیں،

بڑی غلط فہمی ان احکام سے پیدا ہوئی ہے جنمیں کہا گیا ہے کہ ذمی زنار باندھیں، دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں، اونچی باڑھ کی ٹوپی پہنیں اور ان کی زین کے آگے گول لکڑی ہو، لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ احکام ذمیوں کے حق میں دائمی ہیں اور ان کے لئے یہ وضع اسلام نے مخصوص کر دی ہے، حالانکہ در صل یہ احکام اصولی نہیں بلکہ فروعی ہیں، اصل حکم تو یہ ہے کہ "ذمی مسلمانوں کے ساتھ تشابہ اختیار نہ کریں"، اب اس اصل سے فقہائے عصر نے فروع نکال لئے اور اسی لباس و وضع کو جو ان کے زمانہ میں عموماً عجم کے مجوسیوں اور شام کے عیسائیوں میں رائج تھی، ان کے لئے لازم کر دیا، اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ذمی زنار باندھیں، لمبی ٹوپی اوڑھیں، اور دوہرے تسمے کی جوتی پہنیں،

یہ احکام تو صرف اسی زمانہ کے تھے، آج کل کے فقہا حسب ضرورت یعنی منعقد البلد مسلمین سے ایسے ہی دوسرے جزئی احکام مستنبط کر سکتے ہیں،

چند مستثنیات

جنگ اور متعلقات جنگ کے متعلق اسلام نے جو قواعد وضوابط اور حدود وقیود مقرر کئے ہیں انھیں صفحات بالا میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، مگر رسول اکرمؐ اور خلفاے راشدینؓ کے زمانہ میں بعض واقعات ایسے بھی پیش آئے ہیں جو بظاہر ان قوانین سے مختلف معلوم ہوتے ہیں، اور ان سے ایک ناواقف اس شبہہ میں پڑ سکتا ہے کہ شاید اسلام کے اصل احکام وہ نہیں ہیں جو بیان کئے گئے ہیں، یا اس کے احکام میں اختلاف اور تضاد ہے، یا رسول اللہ صلعم اور صحابہؓ کا عمل اسلامی قوانین کے خلاف تھا، اس لئے اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان مستثنیٰ واقعات کی تشریح بھی کر دی جائے۔

بنو نضیر کا اخراج اس سلسلہ میں پہلا واقعہ بنو نضیر کے اخراج کا ہے، یہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو صدیوں سے یثرب میں آباد تھا، ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کا ان سے معاہدہ ہوا اور جنگ بدر کے بعد آپ نے ان کو مدینہ سے نکال دیا، مخالفین اس واقعہ کو یہ معنی پہناتے ہیں، کہ آنحضرت صلعم نے بنی نضیر کیساتھ نعوذ باللہ مکر کیا یعنی جب کمزور تھے تو ان سے معاہدہ کر لیا اور جب طاقتور ہو گئے تو عہد توڑ کر انھیں جلاوطن کر دیا، لیکن یہ واقعہ کی محض یک طرفہ صورت فرض کر لینے کا نتیجہ ہے، ورنہ اگر اسکی تمام تفصیلات پر نظر کی جائے تو صورت واقعہ بالکل برعکس نظر آئیگی، عہد شکنی کے مجرم رسول اللہ صلعم نہیں بلکہ خود بنی نضیر نکلیں گے، اور ان کے خلاف آنحضرت صلعم کی جنگی کارروائی ظلم نہیں بلکہ عین حق ثابت ہوگی،

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے تو آپ نے یہودیوں کے دوسرے قبائل کی طرح بنو نضیر سے بھی ایک معاہدہ کیا تھا جس کی بنیادی شرط یہ تھی کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی نہ کریں گے، اور نہ ایک دوسرے

ے ابن ہشام نے سیرت میں [illegible] تفصیل نقل کیا ہے

کے دشمنوں کی مدد کریں گے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ:-

واوعدھم علی ان لا یعاونوا علیہ ولا یمالئوا علیہ عدوہ[1]	ان سے مواعدت کی تھی اس بات پر کہ نہ وہ آپ سے جنگ کریں گے اور نہ آپ کے خلاف آپ کے دشمنوں کی اعانت کریں گے

اس معاہدہ کے بعد آنحضرت صلعم اور عام مسلمان ان کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے اور ان سے دوستانہ میل جول شروع کر دیا تھا، لیکن شرائط معاہدہ کے بالکل خلاف وہ کفار قریش سے سازباز کر رہے تھے، اور چپکے چپکے ان کو مسلمانوں کے متعلق خفیہ اطلاعات فراہم کرنے لگے، موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں لکھا ہے کہ:-

کانت نضیر قد سوا الی قریش وحضوھم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ودلوھم علی العورۃ[2]	بنی نضیر قریش سے خفیہ سازش کرتے تھے، ان کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ پر ابھارتے تھے، اور انھیں خفیہ خبریں دیتے تھے،

پھر انھوں نے اسی پر بس نہ کی بلکہ آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی بھی متعدد مرتبہ کوشش کی، ایک مرتبہ آپؐ کو کہلا کر بھیجا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لیکر آئیے اور ہم بھی اپنے تین عالم بھیجتے ہیں، ایک درمیانی مقام پر ان سے آپ کا مناظرہ ہو، اور اگر آپ ان پر اپنے دین کی حقانیت ثابت کر دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، آنحضرت صلعم نے اس دعوت کو منظور کر لیا، مگر ابھی جائے معینہ کی جانب روانہ نہ ہوئے تھے، کہ خود بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے بھائی کو جو مسلمان تھا یہ اطلاع دی کہ یہودی خنجر لیکر آرہے ہیں، اور تمھارے نبی صلعم کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ سن کر آپؐ نے مناظرہ کا ارادہ ترک کر دیا،[3]

ایک دوسرے موقع پر آنحضرت صلعم بنی عامر کے دو آدمیوں کی دیت کا معاملہ طے کرنے کے لئے بنو نضیر کے ہاں تشریف لے گئے، ان لوگوں نے بظاہر دوستانہ برتاؤ کیا، اور آپؐ سے کہا کہ ہم مدد دینے کو حاضر ہیں، مگر آپس میں جا کر مشورہ کیا کہ یہ شخص تم کو ایسی حالت میں پھر نہ ملے گا، بہتر ہے کہ ہم میں کا ایک آدمی مکان کی چھت پر چڑھے اور

---

[1] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۳ [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۳، [3] اس واقعہ کو تھوڑے اختلاف کیساتھ ابوداؤد باب فی خبر النضیر اور فتح الباری ج ۷، ص ۲۳۳ میں بیان کیا گیا ہے،

اس پر ایک بھاری پتھر پھینکدے، چنانچہ یہ بات طے ہوئی اور اس کام کے لئے محمد بن مسلمہ انصاری اور عباد بن بشر مقرر کیا گیا، مقررہ وقت پر آپ کو اطلاع ہوئی اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے[1]۔

اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، مسلسل بدعہدیوں اور سازشوں کے باعث اندیشہ تھا کہ کہیں یہ آستین کے سانپ کسی بیرونی حملہ کے وقت مدینہ کی سلامتی کو خطرہ میں نہ ڈال دیں، یہی نہیں بلکہ یہاں تک اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ خفیہ طریقہ سے آنحضرت صلعم کو شہید نہ کر دیں، مسلمان ان سے ایسے خوفزدہ ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ جب ایک صحابی کا انتقال ہونے لگا، تو انھوں نے اپنے عزیزوں کو وصیت کی کہ میرے مرنے کی اطلاع رسول اللہ صلعم کو رات کے وقت نہ دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ جنازہ کی شرکت کے لئے نکلیں اور کوئی یہودی آپ کو قتل کر دے[2]، ایسی حالت میں ان عہد شکن دشمنوں سے مزید چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی، مگر آنحضرت صلعم نے پھر بھی ان کے ساتھ رعایت کی اور دفعۃً ان پر حملہ کر دینے کے بجائے محمد بن مسلمہ کے ذریعہ ان کو یہ الٹی میٹم دیا کہ:-

"تم نے میرے ساتھ غدر کیا ہے، لہذا تم یا تو خود دس دن کے اندر مدینہ خالی کر دو، ورنہ میں مجبوراً تم سے جنگ کرونگا"

اس کے ساتھ عبد اللہ بن ابی سردار منافقین نے انھیں کہلا بھیجا کہ تم ہرگز نہ نکلنا ہم تمھاری مدد کریں گے، چنانچہ انھوں نے آنحضرتؐ کے ایلچی پیغام کا جواب یہ دیا:-

انا لا نبرح دارنا فاصنع ما بدا لک[3] ہم اپنا وطن نہ چھوڑیں گے تمھارا جو جی چاہے کرو۔

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم ان کے خلاف جنگ کرنے میں حق بجانب نہ تھے، آپ نے اتمام حجت کا پورا پورا حق ادا کیا تھا، اور معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کے مقابلہ میں جو زیادہ سے زیادہ نرمی کی جا سکتی تھی وہ کر چکے تھے اب مجبوراً جنگ کے لئے

---

[1] طبری، سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۷، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۰، فتوح البلدان صفحہ ۲۸، [2] اسد الغابہ ج ۳ ص ۵۱، ذکر طلحہ بن براء، [3] خمیری ج ۲ ص ۳۸، فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۳، فتوح البلدان ص ۲۴،

نکلے، اور ان کا محاصرہ کر لیا قبل اس کے کہ خوں ریزی کی نوبت آتی، صرف محاصرہ ہی کی شدت نے یہودیوں کو بدحواس کر دیا، اور انھوں نے خود ہی تجویز پیش کی کہ آپ ہمارے خون معاف کر دیں ہم مدینہ سے نکل کر اذرعات (شام) چلے جائیں گے، اور جو کچھ مال ہمارے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ تو لیجائیں گے باقی سب کچھ یہیں چھوڑ جائیں گے، اس شرط کو آنحضرت صلعم نے منظور کر لیا اور بغیر کسی ادنیٰ اصرار کے بنو نضیر اسلامی علاقہ سے گذر کر شام کی طرف چلے گئے[1]، اس مصالحت کے متعلق بلاذری لکھتا ہے:-

ثم صالحوہ علی ان یخرجوا من بلدہ ولھم ما حملت الابل الا الحلقۃ والآلۃ[2]۔

پھر انھوں نے اس شرط پر آپ سے صلح کر لی کہ وہ آپ کے شہر سے نکل جائیں گے، اور سوائے اسلحہ اور زرہوں کے باقی، جو مال ان کے اونٹ اٹھا سکیں گے وہ انکا ہے

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ:-

فسألوا ان یجلوا عن ارضھم علی ان لھم ما حملت الابل فصولحوا علی ذالک[3]۔

پھر انھوں نے درخواست کی کہ ہمیں اپنے علاقہ سے نکل جانے دیا جائے، اور جو کچھ ہمارے اونٹ اٹھا سکیں وہ مال ہمارا ہو، چنانچہ اسی پر ان سے صلح ہو گئی،

اب یہ ظاہر ہے کہ اعلان جنگ ہونے کے بعد، ایسی حالت میں جبکہ ان کو آسانی کے ساتھ مغلوب کر کے پورا پورا انتقام لیا جا سکتا ہے، ان کی شرائط مان لینا، اور ان کو امن و سلامتی کے ساتھ صرف اپنی جانیں ہی نہیں بلکہ اپنا مال بھی لیکر نکل جانے دینا، بجز رحمدلی اور صلح پسندی کے اور کسی چیز کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا، اور صرف وہی شخص ایسا کر سکتا تھا جس کا مقصد خوں ریزی و غارت گری نہ ہو، بلکہ محض دفع شر ہو، مگر اس احسان کا جو بدلہ آنحضرت صلعم کو ملا وہ بہت ہی تلخ تھا، جن دشمنوں کو آپ نے قابو میں آجانے کے بعد محض رحم کھا کر چھوڑ دیا تھا انھوں نے مدینہ سے نکل کر تمام عرب میں آپؐ کے خلاف سازش کا جال پھیلا دیا، اور دو ہی سال بعد ۲۴ ہزار کا لشکر جرار اکٹھا کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوئے، اگر آپؐ اسی وقت ان سانپوں کا سر کچل دیتے تو یہ طوفان ہرگز نہ اٹھتا، لیکن رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بالاتر تھی،

---

[1] طبری ج ۳ ص ۱۳۰۰، [2] فتوح البلدان صفحہ ۲۴، [3] فتح الباری ج ۷ ص ۲۳۲،

کہ کسی مغلوب دشمن کی نسبت رحم کو رد کر دیتے۔ آپ کو ان کے جذبۂ عناد کا بھی خوب معلوم تھا، اور آپ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ فتنہ پرداز چین سے نہ بیٹھیں گے، مگر اس کے باوجود جب انھوں نے جاں بخشی کی درخواست کی تو آپ نے اسے قبول کر لیا،

بنو قریظہ کا واقعہ، بنو قریظہ کے قتل عام کو اس سے زیادہ اعتراضات کا مورد بنایا گیا ہے، یہ لوگ مذہباً یہودی تھے اور بنو نضیر کی طرح مدینہ میں آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے ان سے بھی دوسرے یہودی قبائل کی طرح وہی معاہدہ کیا، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، پھر جب بنو نضیر سے جنگ ہوئی تو آپ نے دوبارہ بنو قریظہ کو معاہدہ کی دعوت دی، اور قدیم معاہدہ کی تجدید کر لی[1]، مگر جب جنگ احزاب میں انھوں نے کھلم کھلا دشمنوں کا ساتھ دیا تو آپ نے ادھر سے فارغ ہو کر ان پر حملہ کیا، ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا، بچوں اور عورتوں کو غلام بنا لیا، اور ان کا مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیا، اس واقعہ کی بنا پر مخالفین نے آنحضرت صلعم پر بدعہدی اور شقاوت و سنگدلی کے شدید الزامات لگائے ہیں، مگر جب تفصیلات پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو اس کی حقیقت بھی مخالفین کے زعم و بیان سے بالکل مختلف نظر آتی ہے،

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنو قریظہ سے دو مرتبہ معاہدہ ہوا تھا، ایک عام معاہدہ جو دوسرے یہودی قبائل کی معیت میں ہوا، دوسرا خاص معاہدہ جو بنی نضیر سے لڑائی کے موقع پر ان سے کیا گیا، ان دو معاہدات کے بعد بنو قریظہ کا فرض تھا کہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے متبعین کے خلاف کسی قسم کی معاندانہ کارروائی میں حصہ نہ لیتے، لیکن جنگ احزاب میں جب بنو نضیر کی تحریص پر عرب کے بڑے بڑے قبائل اسلام کو مٹانے کے لئے متفق ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے، تو بنو قریظہ نے حیی بن اخطب نضری کے بہکانے سے علانیہ معاہدہ توڑ دیا، اور جنگ میں شامل ہو گئے[2]، آنحضرت صلعم کو ان کے نقض عہد کی خبر ہوئی تو آپ نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ کو ان کے پاس بھیجا اور وفائے عہد کی نصیحت کی، مگر انھوں نے صاف عہد یا

---

[1] ابوداؤد کتاب خراج و فئی و ... باب فی خبر النضیر، [2] ابن ہشام طبع مصر ج ۲ ص ۲۰۰، فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۰،

[illegible] عہد توڑ دینے اور جنگ میں شریک ہو جانے سے مدینہ
دو طرف سے محصور ہو گیا، ایک طرف قریش اور غطفان وغیرہ کی فوجیں تھیں، اور دوسری طرف
بنو قریظہ [illegible] زیادہ خطرہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے جس قلعہ میں اپنی عورتوں کو حفاظت کے لئے
بھیجا [illegible] قریظہ کی عین زد میں تھا اور یہ لوگ اس کا محاصرہ کرنے کی دھمکی دے رہے
تھے، اس صورت حال نے مسلمانوں کو انتہائی دہشت و پریشانی میں مبتلا کر دیا، حتی کہ آنحضرت صلعم
نے مجبور ہو کر یہ تہیہ کر لیا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دیکر حملہ آوروں سے مصالحت کر لیں[1]
قرآن مجید میں اس پریشانی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:-

اذجاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وادا بلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا (۳۳: ۲)	جبکہ وہ تم پر بالائے شہر اور پائین شہر کی جانب چڑھ آئے اور جبکہ تمہاری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اور جبکہ دل منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے متعلق طرح طرح کی بدگمانی کرنے لگے،

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں:-
"اس رات ہماری پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ایک طرف ابوسفیان اور
اس کے ساتھی زبردست فوجیں لئے ہوئے اوپر سے آئے، اور دوسری طرف بنو قریظہ
نیچے سے بڑھے اور ان کے حملہ سے ہمارے بال بچوں کی سلامتی بھی خطرہ
میں پڑ گئی تھی"

اس شدید اور خطرناک بدعہدی کے بعد ان لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا خودکشی کرنا تھا چنانچہ جب احزاب کے دل بادل چھٹ گئے، اور بیرونی حملہ کا خوف جاتا رہا تو آنحضرت صلعم نے فوراً بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا، ۱۵ دن یا ۲۰ دن تک اسلامی فوجیں ان کے قلعہ کے گرد پڑی رہیں، جب انھوں نے دیکھا کہ یہ قضا کا پیغام ٹل نہیں سکتا، تو آنحضرت صلعم کی خدمت میں اپنا

[1] ابن اثیر ج ۲، ص ۶۸، فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱، [2] فتح الباری ج ۷، ص ۲۸۱، ابن ہشام ج ۳، ص ۲۵۲،

سعد بن معاذ کے حق میں جو فیصلہ کریں وہ ہمیں منظور ہے۔ چنانچہ یہودیوں نے یہ بات کہہ کر خود اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کے سپرد کر دیا، اور آپ نے اس خیال سے سعد بن معاذ کو حکم بنایا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیف تھے، ان پر کسی کو شک نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے حق میں ناواجب فیصلہ کریں گے۔ بہرحال جو صورت بھی ہو سعد بالاتفاق حکم بنائے گئے، اور انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کئے جائیں عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا جائے، اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہی فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے مرد قتل کر دیئے گئے۔

اب جہاں تک بدعہدی کے الزام کا تعلق ہے، وہ تو صاف ہو چکا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آنحضرت صلعم نے ان پر حملہ کر کے عہد شکنی کی۔ لیکن دوسرا الزام یہ باقی رہ جاتا ہے کہ ان کے ساتھ انتقام بہت سخت لیا گیا، مگر اس کو سختی اور سنگدلی سے تعبیر کرنے سے پہلے چند امور کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

(۱) بنو قریظہ اور ان کے ہم قوم بنو نضیر کی بدعہدیوں کو دیکھکر یہ ناممکن تھا کہ ان سے از سر نو کوئی معاہدہ کیا جاتا، اور یہ توقع قائم کیجا سکتی کہ پھر کسی نازک موقع پر وہ اسے نہ توڑ دیں گے۔

(۲) ان کے قلعے مدینہ سے بالکل متصل تھے اور ایسی صریح غداری کے بعد ان کے اتنے قریب رہنے سے ہر وقت خطرہ تھا کہ کب کسی دشمن کو عین مسلمانوں کے گھروں پر چڑھا لائیں۔

(۳) ان کو جلاوطن بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ ان سے پہلے ان کے بھائی بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں سے دور بیٹھکر اطمینان کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور فوجیں جمع کر کے مدینہ پر چڑھ آئے۔

(۴) ان باتوں کے باوجود آنحضرت صلعم نے خود ان کے لئے کوئی سزا تجویز نہیں کی بلکہ ان کی مرضی اور اتفاق سے ایک ایسے شخص کو حکم بنایا جو خود ان کا حلیف تھا۔

(۵) ثالثی اور پنچایت کے متعلق یہ تمام دنیا کا مسلمہ قانون ہے کہ جب فریقین کے اتفاق سے کوئی شخص حکم، ثالث یا پنچ بنایا جائے، تو جو فیصلہ وہ کر دے، اس کی پابندی فریقین پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) سعد بن معاذؓ نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ توراۃ کے احکام پر مبنی تھا، اسی لئے کسی

ے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب جواز قتال من نقض العہد وفتح الباری صفحہ ۴۸۰ ج ۷ توراۃ میں استثنا باب ۲۰ دیکھو صفحہ

یہودی نے اس کے خلاف ایک لفظ نہ کہا،

(۷) ان میں سے صرف دو مرد قتل کئے گئے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل تھے، کیونکہ انھیں سے جنگ کا اندیشہ تھا، باقی رہیں عورتیں اور بچے تو ان کے سرد ھروں کے قتل ہوجانے کے بعد ان کی پرورش کا عجز اس کے اور کیا وسیلہ ہوسکتا تھا کہ مسلمان خود ان کے کفیل بنتے،

ان وجوہ کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کوئی روک باقی نہیں رہتی کہ بنو قریظہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ عین انصاف کے مطابق تھا اور اس کے سوا ان سے کوئی سلوک نہیں کیا جاسکتا تھا

کعب بن اشرف کا قتل

عہد رسالت کا ایک اور واقعہ جس پر سخت اعتراضات کئے جاتے ہیں یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنے ایک دشمن کعب بن اشرف کو خفیہ طریقہ سے قتل کرادیا، مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ یہ وہی عہد جاہلیت کا فتک تھا، اور علاوہ بزدلی کے، آداب جنگ کے بھی خلاف تھا، لیکن اس واقعہ کے بھی چند مخصوص اسباب تھے جن کو معترضین نے نظر انداز کردیا ہے،

یہ شخص یہود بنی النضیر میں سے تھا، اور اپنی قوم کیساتھ اس معاہدہ میں شریک تھا جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلعم کے اور انکے درمیان ہوا تھا، مگر اسے اسلام اور خاص کر داعی اسلام سے سخت عداوت تھی، آپ کی شان میں ہجویہ اشعار کہتا، مسلمان عورتوں کے متعلق نہایت گندے عشقیہ قصائد کہتا[1] اور کفار قریش کو آنحضرت صلعم کے خلاف اشتعال دلاتا تھا[2] جب جنگ بدر میں آنحضرت صلعم کو فتح ہوئی تو اس کو سخت رنج ہوا اور شدت غضب میں پکار اٹھا کہ

واللہ لئن کان محمد اصاب ھؤلاء القوم لبطن الارض خیر لنا من ظھرھا،	خدا کی قسم اگر محمدؐ نے قریش کو واقعی شکست دیدی ہے تو زمین کا پیٹ ہمارے لئے اس کی پیٹھ سے زیادہ بہتر ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماقبل) جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے پہونچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری باج گذار ہوگی اور تیری خدمت کریگی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر، جب خداوند خدا تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں کردے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لئے غنیمت کے طور پر لے، (استثنا، باب ۲۰، آیت ۱۰-۱۴) [1] ابن الاثیر جلد ۲ ص ۵۳ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۰ میں ہے کہ وتشبب بنساء المسلمین حتی اذاھم [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب کیف کان اخراج الیھود من المدینۃ علیہ کفار قریش

پھر وہ یہاں سے مدینہ پہونچا اور وہاں نہایت درجہ تحریص سے قریش کے مقتولوں کے وہ بدلہ کرنے
عوام اور سرداروں کو انتقام کا جوش دلانے لگا۔ اس کی یہ سب حرکات اس معاہدہ کے خلاف تھیں جو
مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا اور جسمیں وہ بھی اپنی قوم کے ساتھ شریک تھا تاہم انھیں کسی
نہ کسی طرح معاف کیا جا سکتا تھا لیکن ان سب سے گذر کر وہ اپنے جذبۂ عناد میں یہاں تک پہونچا
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان تک لینے کا تہیہ کر لیا، اور ایک سازش کی تیاری کی جس کا مقصد
آپ کو دھوکہ سے قتل کرنا تھا۔ علامہ ابن کثیر نے ابو مالک کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے ایک جماعت
کے ساتھ مل کر یہ انتظام کیا تھا کہ آنحضرت صلعم کو اپنے گھر بلائے اور چپکے سے قتل کرا دے چنانچہ اسی پر
یہ آیت نازل ہوئی تھی کہ:۔

اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم (۵:۲)	جبکہ ایک جماعت نے تم پر دست درازی کا قصد کیا اور اللہ نے ان کے ہاتھ تم پر بڑھنے سے روک دیے۔

ابن حجر بھی اس روایت کو فتح الباری میں لائے ہیں مگر جس طریق سے انھوں نے اسے لیا ہے وہ
ضعیف ہے تاہم یعقوبی نے جو ایک بڑا مورخ ہے بنو نضیر کا حال بیان کرتے ہوئے صاف لکھا ہے کہ:۔

اراد ان یفتک برسول اللہ	اس نے رسول اللہ صلعم کو دھوکہ سے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

ان تمام بیانات سے اس واقعہ کی صداقت مسلم ہو جاتی ہے کہ اس کے جرائم کی فہرست کو اس سازش
قتل نے مکمل کر دیا تھا، اور اس کے بعد اس کے کشتنی ہونے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی ایک
شخص معاہدہ کو توڑتا ہے، مسلمانوں کے دشمنوں سے ساز باز کرتا ہے، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی آگ
بھڑکاتا ہے، اور مسلمانوں کے امام کو قتل کرنے کی خفیہ سازشیں کرتا ہے، ایسے شخص کی سزا بجز قتل کے اور
کیا ہو سکتی ہے، تنہا اس کے فعل کی بنا پر اس کی قوم کے خلاف تو اعلان جنگ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کھلے
میدان میں اس سے مقابلہ ہوتا اور اسے قتل کیا جاتا، خود اس کی قوم سے بھی یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کو
ان حرکات سے روکے گی، کیونکہ ساری قوم کا رویہ اسی کی طرح عداوت و بغض سے بھرا ہوا تھا، پھر وہ دوسرے
اعدائے اسلام کے ساتھ بھی ملکر کبھی کھلے میدان میں لڑنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ہمیشہ پردہ کے پیچھے چھپکر
سازشیں کرتا رہا، اس لئے اس کے شر کے متعلق اس کی موت ہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ پردہ کے
پیچھے ہی اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جاتا، چنانچہ آنحضرت صلعم نے مجبوراً اسی آخری تدبیر کو اختیار کیا، محمد بن مسلمہ

اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کے سرداروں کو قتل کرادینا اسلام کے قانونِ جنگ کی کوئی مستقل دفعہ ہے، اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلعم سب سے پہلے ابوجہل اور ابوسفیان جیسے دشمنوں کو قتل کراتے، اور صحابہؓ میں ایسے فدائیوں کی کمی نہ تھی جو اس قسم کے تمام دشمنوں کو ایک ایک کرکے قتل کرا سکتے تھے، لیکن عہدِ رسالتؐ و عہدِ صحابہؓ کی پوری تاریخ میں ہمکو کعب بن اشرف اور ابورافع کے سوا کسی اور شخص کا نام نہیں ملتا جسے اس طرح خفیہ طریقہ سے قتل کیا گیا ہو، حالانکہ آپ کے دشمن صرف یہی دو شخص نہ تھے، پس یہ واقعہ خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ خفیہ طریقہ سے دشمن کو قتل کرنا اسلام کی کوئی مستقل جنگی پالیسی نہیں ہے بلکہ ایسے مخصوص حالات میں اس کی اجازت ہے جبکہ دشمن خود سامنے نہ آتا ہو اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر خفیہ سازشیں کیا کرتا ہو،

یہودِ خیبر کا اخراج عہدِ رسالت صلعم کے بعد عہدِ خلافت میں یہودِ خیبر کے اخراج کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے، مخالفین کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلعم نے اہلِ خیبر سے پیداوار کے نصف حصہ پر معاملہ کرلیا تھا، اور وہ مستقل طور پر اسلام کی رعایا بن چکے تھے تو حضرت عمرؓ کو انھیں جلاوطن کرنے کا کیا حق تھا، کیا اس طرح انھوں نے عہدِ شکنی اور اہل الذمہ کی حق تلفی نہیں کی؟ یہ اعتراض بہ ظاہر بہت وزنی ہے، مگر تاریخ نے وہ تمام حقایق محفوظ رکھے ہیں جن سے اس اعتراض کا سارا تار و پود بکھر جاتا ہے،

خیبر جب فتح ہوا تھا تو ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہودیوں کی صلح اس شرط پر ہوئی تھی

ست بو رافع کے متعلق صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ کان ابو رافع یؤذی رسول اللہ صلعم ویعین علیہ، ابورافع آنحضرت صلعم کو اذیت پہونچاتا تھا اور آپ کے خلاف دشمنوں کی اعانت کرتا تھا، (کتاب المغازی، باب قتل ابی رافع) لیکن ابن عائذ نے عروہ کے طریق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ کان ممن اعان غطفان وغیرھم من مشرکی العرب بالمال الکثیر، اس نے غطفان وغیرہ مشرکین عرب کو رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ میں بہت روپیہ سے مدد دی تھی، (فتح الباری ج ۷ ص ۲۴۰) طبری نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کان حزب الاحزاب علی رسول اللہ، اس نے رسول اللہ صلعم کے خلاف جنگ احزاب میں فوجیں اکٹھی کی تھیں (ج ۳ ص ۰) ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے کہ قد اجلب فی غطفان ومن حولہ من مشرکی العرب وجمع لھم الجمع العظیم لحرب رسول اللہ، اس نے غطفان اور دوسرے مشرکین عرب کی ایک بہت بڑی جمعیت رسول اللہ صلعم سے لڑنے کے لئے اکٹھی کی تھی (ج ۲ ص ۰) ابن اثیر نے لکھا ہے کہ کان یظاھر کعب بن اشرف علی رسول اللہ، وہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ صلعم کے خلاف مدد دیتا تھا، (ج ۲ ص ۰ طبع یورپ) ان تمام بیانات سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بھی کعب کی طرح خود کبھی کھلے میدان میں لڑنے نہیں آیا، اور پردے کے پیچھے سے دشمنوں کو مال اور فوجوں سے مدد دے کر رسول اللہ صلعم کے خلاف استعمال کرتا رہا،

کہ آپ کی جان بخشی کردیں گے۔ وردوں کا علاقہ تو چھوڑ کر میں دیتے جاتا ہوں۔ یہ سن کر جب زمین کے باقاعدہ بندوبست کا موقع آیا تو اہل خیبر نے آپ سے درخواست کی کہ:۔

"آپ ہمکو یہیں رہنے دیں اور ہم سے معاملہ کرلیں کیونکہ ہم زراعت اور نخلستان کے کام سے خوب واقف ہیں"

آنحضرت صلعم نے ان کی یہ درخواست قبول کرلی اور ان سے عارضی طور پر معاملہ کر لیا لیکن معاملہ کی شرائط تحریر کرتے وقت صاف طور پر یہ تصریح کردی کہ اقرکم ما اقرکم اللہ ہم تمکو برقرار رکھینگے جب تک اللہ تمکو برقرار رکھے گا[1] اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو مستقل طور پر نہیں رکھا جائیگا بلکہ جب تک حکام خداوندی کے مطابق ہمارے قومی مصالح تمھیں رکھنے کی اجازت دیں گے اس وقت تک تمھیں رہنے دیا جائیگا اور جب تمھارا طرز عمل نامناسب ہوگا تو ہمیں آزادی ہوگی کہ تمہیں صحیفہ کی شرائط کو نافذ کرکے تمھیں جلاوطن کردیں، ابن حجر نے اس جملہ کی یہ تشریح کی ہے:۔

وان المراد بقولہ ما اقرکم اللہ ماقدرکم اللہ انا نترککم فیھا فاذا شئنا فاخرجناکم تبین ان اللہ قدر اخراجکم[2]	یہ جو آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ جب تک اللہ تمکو رکھے گا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک اللہ نے تمھارا یہاں رہنا مقدر کر رکھا ہے ہم تمکو رہنے دیں گے۔ اور جب ہم تمھیں نکالنا چاہیں گے اور نکال دیں گے، تو یہ فعل خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ تمھارے اخراج کے لئے اللہ کی تقدیر پوری ہوچکی ہے

ابوداؤد نے ایک اور روایت میں اس سے بھی زیادہ صاف تصریح کی ہے:۔

کان عامل خیبر علی ان نخرجھم اذا شئنا[3]	آنحضرت صلعم نے ان سے اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے ان کو نکال دیں گے

اس سے یہ بات تو بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ نہ تھا جس کے لئے ان کا اخراج ناقض ہوتا، بلکہ اس کے برعکس اصل معاہدہ ان کے خروج ہی کا مقتضی تھا۔

[1] فتوح البلدان ص ۲۹ سطر ۳، ابن ہشام ص ۶۰۹، ابن سعد ج ۲ ص ۹۵ سطر ۱۰، [2] بخاری کتاب شروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ، فتوح البلدان صفحہ ۲۹۔ [3] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۰، [3] ابوداؤد باب ماجاء فی حکم ارض خیبر،

یہ سوال کہ نصف خراج پر جو عارضی معاملہ ان سے کیا تھا، اسے کن وجوہ کی بنا پر فسخ کیا گیا؟ تو اس کی تحقیق کے لئے ذیل کے واقعات پیش نظر رکھنے چاہئیں،

صلح کو چند ہی روز گذرے تھے کہ ان میں سے ایک عورت نے آنحضرت صلعم کی دعوت کی اور اس میں آپ کو زہر کھلا دیا، بعد میں جب تحقیق کی گئی تو خود مجرمہ نے اعتراف جرم کیا اور اس فعل میں دوسرے یہودیوں کی سازش بھی ثابت ہو گئی[1]،

آنحضرت صلعم ہی کے زمانہ میں انھوں نے عبداللہ بن سہل بن زید الانصاری کو قتل کر کے ایک نہر کے کنارے ڈال دیا[2]،

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں وہ علانیہ برسر بغاوت ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو سوتے میں پکڑ کر کوٹھے سے نیچے پھینک دیا جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے[3]،

ابتدائی واقعات خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص تھے، اس لئے عامۃ الناس کو ان کے جرم کا ذمہ دار نہ سمجھا گیا، مگر یہ آخری جرم کھلے بندوں کیا گیا تھا اور تمام قوم کا معاندانہ رویہ ظاہر نظر آرہا تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو صحابہؓ کی مجلس میں پیش کیا اور اس پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

ان رسول اللہ صلعم کان عامل یھود خیبر علی اموالھم وقال نقرکم ما اقرکم اللہ وان عبد اللہ ابن عمر خرج الی مالہ ھناک فعدی علیہ من اللیل فقدعت یدا ورجلاہ ولیس لنا ھناک عدو غیرھم فھم عدونا وتھمتنا وقد رایت اجلاءھم	رسول اللہ صلعم نے یہود خیبر سے ان کے اموال پر معاملہ کیا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ ہم تمھیں برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تمکو برقرار رکھے گا، اب عبداللہ بن عمرؓ وہاں اپنی جائداد پر گئے تھے، رات کے وقت ان پر حملہ کیا گیا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے، اس وقت اس ملک میں ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے، وہی ہمارے دشمن رہ گئے ہیں اس لئے میری رائے میں ان کو جلاوطن کر دینا چاہئے،

[1] صحیح بخاری میں یہ واقعہ گئی جگہ مذکور ہے، غزوۂ خیبر کے بیان، اور کتاب الطب میں اس کی تفصیل ملتی ہے، [2] اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۷۹، [3] فتوح البلدان صفحہ ۳۱، ابن ہشام صفحہ ۷۸۰،
[4] بخاری کتاب الشروط باب اذا اشترط فی المزارعۃ،

حضرت عمرؓ کی اس تجویز سے وہ مجلس سے متفق تھی، اور یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ ہو گیا، لیکن ان مجرموں کو بھی اس طرح جلاوطن نہیں کیا گیا کہ ان کے اموال و اراضی پر قبضہ کر کے انھیں بیک بینی و دوگوش نکال دیا گیا ہو بلکہ جو کچھ وہ چھوڑ گئے اس کا پورا پورا معاوضہ ان کو بیت المال سے دیا گیا اور سفر کی آسانی کے لئے اونٹ اور کجاوے دیئے گئے، یہاں تک کہ کجاوے باندھنے کی رسیاں تک حکومت کی طرف سے مہیا کی گئیں[1]۔

اس میں شک نہیں کہ بعض روایات میں ان کے اخراج کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی کہ لا یجتمع دینان فی جزیرۃ العرب "جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں" تو آپ نے اس کی تحقیق کی اور صحیح ثابت ہونے کے بعد یہودیوں کے اخراج کا فیصلہ کر لیا، بلاذری نے اس روایت کو ابن شہاب کے طریق سے نقل کیا ہے[2]، اور امام زہری نے عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے[3] لیکن اس حدیث کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ غیر مسلم قوموں کو بلا قصور عرب سے نکال دیا جائے، امام زہری نے اپنی روایت میں خود یہ تصریح کی ہے کہ جب اس حدیث کی صحت ثابت ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے اعلان کرایا کہ:-

من کان لہ من اھل الکتابین عھد فلیأت بہ انفذ لہ[4]	دونوں کتابوں (انجیل و توراۃ) کے متبعین میں سے جس کسی کے پاس کوئی معاہدہ ہو وہ لے آئے تاکہ میں اس کو نافذ کروں

ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کا یہ منشا ہوتا کہ بلا امتیاز تمام غیر مسلم جزیرۃ العرب سے نکال دیئے جائیں تو حضرت عمرؓ یہ اعلان ہرگز نہ کراتے، اور تمام غیر مسلموں کو یک قلم خارج البلاد کرا دیتے خواہ ان سے معاہدہ ہوتا یا نہ ہوتا، مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اہل معاہدہ سے ان کے عہدنامے طلب کئے اور وعدہ کیا کہ ان عہدناموں کو نافذ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث سے مطلقاً اخراج مقصود نہ تھا بلکہ ایک عام پالیسی کی تعیین مقصود تھی جس پر دوسرے واجبات کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل درآمد کیا جانا چاہیے تھا، پس یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ذمی قوم محض اس بنا پر ملک سے نکال دی گئی کہ عرب میں دو دینوں کا اجتماع ممنوع تھا، بلکہ زیادہ قرین قیاس

---

[1] بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد ج ۱ ص ۳۸۰ و فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۰

[2] فتح الباری ج ۵ ص ۲۰۷،

یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب یہود خیبر کی مسلسل چیرہ دستیوں سے تنگ آکر حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کرنے کا خیال کیا ہوگا تو بڑی طور پر انھیں ایک ذمی قوم کے ساتھ یہ معاملہ کرنے میں تامل ہوا ہوگا اور وہ کسی شرعی حجت کی تلاش میں ہوں گے، اسی دوران میں یہ حدیث ان کو پہونچی ہوگی اور اس کو اچھی طرح تحقیق کرنے کے بعد مطمئن ہوکر انھوں نے اپنی رائے کو عمل میں لانے کا فیصلہ کیا ہوگا، بعد میں راویوں نے اپنے اپنے رجحانِ طبع کے موافق اس ایک واقعہ کو دو الگ واقعے بنالیا اور دو مختلف روایتوں کی صورت میں بیان کرنے لگے

اہل نجران کا اخراج | خلافت راشدہ کا دوسرا اہم واقعہ جو خیبر کے معاملہ سے بھی زیادہ طعن و ملامت کا ہدف بنا ہوا ہے، نجران کے عیسائیوں کا اخراج ہے خیبر کے یہودی عنوۃً فتح ہوئے تھے اور ان سے ابتداءً جلاوطنی ہی کی شرط پر صلح ہوئی تھی، اس لئے مخالفین کو اسمیں اعتراض کی زیادہ گنجایش نہ مل سکی، لیکن اہل نجران نے تو بغیر جنگ کے خود بخود اطاعت قبول کی تھی، اور جزیہ دیکر آنحضرت صلعم سے باقاعدہ عہدنامہ لکھوایا تھا، اس لئے ان کے اخراج کو مخالفین اسلام صریح عہد شکنی قرار دیتے ہیں، ان کا سارا زور اس پر ہے کہ معاہدہ میں غیر مشروط امان دی گئی تھی، اور حضرت عمرؓ نے ناجائز طور پر اس امان کو فسخ کیا مگر واقعات کی تحقیق سے یہ دعویٰ غلط ثابت ہوتا ہے،

نجران سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معاہدہ ہوا تھا اسمیں نصاریٰ کو اس شرط کے ساتھ امان دی گئی تھی کہ جب تک وہ حکومت اسلامیہ کے وفادار رہیں گے، اور اپنے واجبات کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں گے، اس وقت تک انھیں اللہ کی پناہ اور رسول صلعم کی حفاظت حاصل رہیگی، بلاذری اور امام ابو یوسف نے جو معاہدہ نقل کیا ہے اسمیں یہ صریح الفاظ موجود ہیں کہ:-

لهم ما فی هذه الصحیفة جوار الله وذمة محمد النبی ابدا حتی یاتی امر الله، ما نصحوا واصلحوا فیما علیهم[1]

ان کے لئے جو کچھ اس عہدنامہ میں ہے اس پر اللہ کی پناہ اور محمد نبی (صلعم) کی دائمی حفاظت ہے جب تک کہ اللہ کا حکم آئے اور وہ خیر خواہ رہیں اور جو کچھ ان کے ذمہ واجب ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرتے رہیں،

اسی طرح حضرت ابوبکرؓ نے منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد جو عہدنامہ ان کو لکھکر دیا تھا اسمیں

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۲، فتوح البلدان صفحہ ۷۲،

ان کی بیخ کنی کر دی۔ فرزون قوت سے خود مسلمانوں کی حکومت کا قلب خطرے میں پڑ گیا تو آپ نے موقع کو غنیمت سمجھکر ان کی جلاوطنی کا حکم صادر کر دیا۔

تاہم ایک ایسی قوم جس کے خلاف بغاوت کی طیاری کا ثبوت بہم پہونچ چکا تھا حکومت اسلامیہ کے حدود سے خارج نہیں کی گئی بلکہ صرف عرب سے خارج کی گئی، اس کو اللہ کی پناہ اور محمد نبی صلعم کے ذمہ سے محروم نہیں کیا گیا، بلکہ اسی پناہ اور ذمہ میں ایک نامناسب مقام سے دوسرے مناسب مقام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ نجران سے اس کے اخراج کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ حجاز اور حبش کے درمیان ایک نازک سیاسی و حربی پوزیشن پر قابض نہ رہے، اس سے زیادہ کوئی اور سزا دینی مقصود نہ تھی، اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کو نجران یمن سے منتقل کر کے نجران عراق کی طرف بھیجدیا، ان کی زمینوں کے بدلے زمینیں دیں، دو سال کا جزیہ معاف کیا، یمن سے عراق تک کے سفر کے لئے پوری آسانیاں بہم پہونچائیں اور اپنے عمال کو حکم دیا کہ انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے، امام ابو یوسف نے اس فرمان کو لفظ بلفظ نقل کیا ہے، جس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"شام و عراق کے افسروں میں سے جس کے پاس یہ جائیں وہ ان کو قابل کاشت زمین عطا کرے اور جس زمین میں یہ کاشت کریں وہ ان کے لئے خدا واسطے کا صدقہ ہے اور اس زمین کا عوض ہے جو زمین میں ان سے لی گئی ہے، اس زمین میں ان پر کوئی دست درازی اور مداخلت نہ کی جائے، ..... اگر کوئی شخص ان پر ظلم کرتا ہو تو ہر مسلمان جو وہاں موجود ہو لازم ہے کہ ان کی مدد کرے کیونکہ وہ ایسی قوم ہیں، جو ہماری پناہ میں ہے، ان کا جزیہ ۲۴ مہینہ کے لئے معاف ہے[1]"

معترضین نے ان سب باتوں کو بھلا کر صرف اتنا یاد رکھا ہے کہ اہل نجران سے عہد تھا عمر بن خطابؓ نے اسے توڑا اور انھیں جلاوطن کر دیا، اگر ان تمام حالات کو دیکھ کر کوئی بتائے کہ اگر آج اس بیسویں صدی میں بھی کوئی قوم وہ روش اختیار کرے جو اہل نجران نے کی تھی اور اسکی سیاسی و جنگی پوزیشن وہی ہو جو اہل نجران کی تھی تو ایک مہذب حکومت جو اپنی مملکت کے امن کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گی؟

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۷۳، ابن اثیر ج ۲ ص ۱۱۲، [2] کتاب الخراج ص ۷۱۔

جدید قانونِ جنگ کی تدوین

اس باب میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے جنگ کے عملی پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی ایک مضبوط قانون سے منضبط کئے بغیر نہیں چھوڑا اپنے اس جنگ کے وہ وحشیانہ طریقے جو دنیا میں رائج تھے یک قلم موقوف کر دیے جنگ اور متعلقاتِ جنگ کے متعلق نئے مہذب قوانین وضع کئے کچھ پرانے طریقوں کو وقت کی روح کے لحاظ سے ایک بدلی ہوئی شکل میں باقی رکھا، مگر ان کے اندر تدریجی اصلاح پذیری کی ایسی لچک پیدا کر دی کہ زمانہ کی ترقی، حالات کے تغیر اور انسانی افکار کے نشوونما کے ساتھ ساتھ ان میں خود بخود اصلاح ہو جائے اسی طرح کچھ نئے اصول وضع کئے جنمیں ترقی کی ایسی صلاحیت رکھدی کہ ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق ان سے فروعی و جزئی احکام نکالے جا سکتے ہیں، اس کے ساتھ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ایک ایسا نمونہ عمل چھوڑ گئے ہیں جو روحِ شریعت کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے اور اس روح کو پیش نظر رکھکر ہم ہر نئی پیش آمدہ صورت میں یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اسلام اس میں عمل کا کون سا پہلو اختیار کریگا قرون اولیٰ میں فقہا نے اسی مواد سے ایک مکمل ضابطہ قوانین جنگ مرتب کیا تھا جو صدیوں تک اسلامی سلطنتوں میں رائج تھا، مگر اس زمانہ کے قوانین جنگ بعینہٖ آج کے حالات کے لئے کافی نہیں ہیں بہت سے فروع و جزئیات جو اس زمانہ میں مستنبط کئے گئے تھے آج بیکار ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اصل ماخذ یعنی قرآن مجید اور حدیث نبوی کی طرف رجوع کریں اور ان میں جو اصول و فروع موجود ہیں ان سے ایک یا ضابطہ قانون مدون کریں، اس جدید قانون کی تدوین اس طریقہ پر ہونی چاہئے کہ جن مسائل میں فروع کی تفصیل ہمکو قرآن و حدیث سے ملتی ہے ان کو بجنسہٖ باقی رہنے دیں جن مسائل میں صرف اصول ملتے ہیں اور فروع نہیں ملتے ان میں شریعت کی روح علمائے سلف کی تصریحات اور موجودہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق فروع نکالیں اور جن مسائل میں شریعت نے ہمکو ترک و اختیار کا حق دیا ہے ان میں ایسی چیزوں کو ممنوع یا حرام قرار دیں جنھیں موجودہ زمانہ کی دنیا چھوڑ چکی ہے اس کام میں ہمکو نہ تو فقہائے قدیم کی کسی ہوئی

[illegible] ہیں وہ تو محض بیگار ہیں کہ [illegible] کر بھیجتے ہیں اور نہ اصول شریعت کی روح کل ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہم ان کو بدل ہی سکیں ان دونوں طریقوں کے درمیان ہمکو ایک متوسط طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کے مجتہدات میں سے جو چیزیں ہمارے موجودہ عہد و بیت کے مطابق ہیں ان کو ہم باقی رکھیں [illegible] جو زمانہ کے ساتھ پرانی ہو چکی ہیں ان کو چھوڑ کر براہ راست اصول شریعت سے فروع اخذ کریں۔

مثال کے طور پر قرآن و حدیث میں ہمکو اسیران جنگ مجروحین و مرضی وغیرہ جانداروں کے حقوق و فرائض اور ایسے ہی دوسرے مسائل میں صرف اصول ملتے ہیں فروع کی کوئی تفصیل نہیں ملتی اس عدم تفصیل اور بیان اصول پر اکتفا کے معنی یہ ہیں کہ شریعت ہر زمانہ کے مسلمانوں کو یہ حق دیتی ہے کہ اپنے عہد کی ضروریات کے مطابق خود فروع اخذ کریں لہذا ہمکو اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ ان فروع کے لئے پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی لکھی ہوئی کتب فقہیہ کی طرف رجوع کریں اور ان میں جو کچھ تفصیلات ہیں ان کو بلا تامل قبول کر لیں۔ بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ خود اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر ان اصول شریعت سے ایسے قوانین مستنبط کریں جو موجودہ حالات کے لئے مناسب ہوں۔ بلکہ شریعت ہمکو یہ حق بھی دیتی ہے کہ زمانہ حال کے رائج الوقت قوانین جس حد تک روح شریعت کے مطابق ہوں ان کو ہم اختیار کر لیں۔ اور زمانہ حال کی مستنبط کے درمیان جو مفاہمتیں ہوں ان میں بھی احکام شرعیہ کو ملحوظ رکھا شریعت ہو جائیں۔

اسی خیال کے ماتحت میں نے اس باب میں شریعت کے اصلی ماخذ یعنی قرآن و حدیث سے وہ اصول و فروع نقل کر دیئے ہیں جو ایک مکمل ضابطہ قانون کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ جہاں ہمارے علمائے سلف کی تصریحات عہد جدید کی ضرورت کے مطابق پائی گئی ہیں ان کو بھی نقل کر دیا ہے اور ان کی توضیحات کی بھی تشریح کر دی ہے جنکی ظاہری شکل کو دیکھ کر لوگوں کو اسلامی قانون کے اندر تناقض ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اب میں تمام مواد کو پیش نظر رکھکر فقہ کی جدید کتاب اجتہاد مرتب کرنے [illegible]

جنگ و صلح اور مذاہب

کسی چیز کے عیب و ہنر کی جب تحقیق کی جاتی ہے تو پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ چیز کس جنس کی ہے۔ پھر یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ اپنی جنس کی دوسری چیزوں میں اس کا درجہ کیا ہے۔ اور اس کی خصوصیتیں کیا ہیں۔ اس کے بعد اس کے فوائد و مضار دریافت ہوتے ہیں۔ اس سے جہاں تک جنگ کا تعلق ہے اس کو کوئی مذہب جائز نہیں رکھتا۔ اسلام کو دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں رکھا جائے تو اس باب میں ان کا مرتبہ کیا نسبت رکھتا ہے؟ اگر وہ جنگ کو جائز رکھتے ہیں تو ان کے مقاصد و مناہج میں اسلام سے کیا امتیاز ہے؟ اگر جائز نہیں رکھتے تو اس باب میں ان کی تعلیم انسانی فطرت کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ وہ حقیقت ہے جس کا معلوم کرنا ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو مذہب کو ایک اصول کی حیثیت سے رکھتا ہو۔ اس کے لئے ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے ساتھ بحث کریں۔ اس بحث میں ہر مذہب کے پیرو جب دوسرے مذاہب پر تنقید کرتے ہیں تو ہمیشہ ان کے عیوب ہی پر نظر کرتے ہیں اور روشن پہلو کو یا تو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے یا اگر دیکھتے بھی ہیں تو سرسری دیدہ و دانستہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تنقید سے نہ صرف حق کی تلاش نہیں ہوتی بلکہ محض اس رسم کو جسے وہ تحقیق سے پہلے اختیار کرتے ہیں ذہنیت ثابت کرتی ہے۔ اس ذہنیت سے مقابل ادیان کے تمام محاسن زائل ہو جاتے ہیں اور خود اس مذہب کی کوئی خوبی حاصل نہیں ہوتی جس کی تائید میں یہ دلائل ضرور اختیار کیا جاتا ہے۔ اگر مقابل کا مقصد حق کی تحقیق ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس مقصد کے حصول کی راہ میں جو دقتیں پیش آتی ہیں

دوسرے مذہب کے متعلق ایک تعصب خانہ سے قائم کرے اور ان کا مطالعہ صرف اس نیت سے کرے کہ اُن کی خوبیوں پر پردہ ڈالنا ہے، اور ان کی برائیوں کو تلاش کرکے ان سے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنی ہے، اس قسم کی بددیانتی اور فریب کاری سے کسی مذہب کی برتری کا اثبات، نہ تو فی الحقیقت اس کی برتری کا اثبات ہوگا، نہ ایسی کامیابی کسی دینِ حق کے لئے باعثِ فخر ہوسکتی ہے، اور نہ حق وصداقت کی نظر میں ایسے مذہب کو کوئی وقعت حاصل ہوسکتی ہے، اگر اس طرح دھوکا کھاکر کھوٹی شخص اس کی حقانیت کا معتقد ہوجائے، تو یہ اعتقاد بالکل ناقابلِ اعتماد ہوگا، کیونکہ اس کی بنیاد ہی غلط ہوگی،

ان مفاسد سے احتراز کرکے تقابلِ ادیان کی بحث کو کسی صحیح نتیجہ تک پہونچانے کے لئے ضروری ہے، کہ چند اصول طے کرلئے جائیں، اور ان کی سختی کے ساتھ پابندی کیجائے، ہماری رائے میں وہ اصول یہ ہونے چاہئیں:-

(۱) ایک مذہب کی تعلیم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات کو کلیتہً غلط ثابت کیا جائے، اور نہ یہ ضروری ہے کہ ایک مذہب میں حق وصداقت کے موجود ہونے سے دوسرے مذہب میں اس کا عدم لازم آئے، حق ایک کلی ہے، جس کے افراد خواہ کہیں ہوں بہرحال اسی ایک کلی کے فرد رہتے ہیں، حال ومقام کے بدلنے سے ان کی حقیقت واصلیت نہیں بدلتی، جو حق ہمارے مذہب میں پایا جاتا ہے، اسی کا دوسرے مذہب میں پایا جانا ہمارے مذہب کے نقص کی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مذہب بھی ہمارے مذہب سے قریب تر ہے، لہذا تقابلِ ادیان کی بحث میں ایک محقق کو اس خیال سے بالکل خالی الذہن ہوجانا چاہئے، کہ اس کے مذہب کی حقانیت کا اثبات دوسرے مذاہب کے ابطال پر منحصر ہے، اگر دوسرے مذاہب کی کچھ خوبیاں اس کے سامنے نہیں تو اسے چاہئے کہ انھیں اپنے مذہب کے لئے مضر سمجھ کر دل کے دروازے بند نہ کرلے، بلکہ کھلے دل سے ان کا اعتراف کرے،

(۲) جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حق اس کے مذہب کے سوا کہیں اور موجود ہی نہیں ہے، وہ دوسرے مذاہب ہی پر نہیں خود حق پر بھی ظلم کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حق وصداقت کی روشنی کم وبیش سب جگہ موجود ہے، البتہ اربابِ تحقیق جب کسی ایک مذہب کو دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ مذہب تجلیاتِ حقیقت کا مظہرِ اتم ہوتا ہے، پس تقابلِ ادیان

کسی شخص کو بھی یہ یقینی فیصلہ کرنے میں مدد دینا چاہتے ہیں کہ اس کے مروجہ مذہب سے کونسا مذہب حق ہے
روشنی سے خالی ہیں، بلکہ اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کے سامنے حق اور باطل دونوں ملے جلے آئیں گے، اور
اس کا کام یہ ہوگا کہ اپنی عقل اور قوتِ تمیز سے کام لیکر حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھے اور ایک کو دوسرے سے مخلوط ہونے

(۳) مذہبی تحقیقات میں اس امر کا خاص اہتمام کرنا چاہیئے کہ کسی مذہب کے متعصب مخالفین اور
غالی متبعین، دونوں کی تصنیفات کا مطالعہ کرنے سے پرہیز کیا جائے، ابتدائی تحقیقات میں اس
قسم کے لوگوں کی تصنیفات کے مطالعہ سے ایک ناظر کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا، کیونکہ ہر تحقیق
مذہب کے اصلی چہرے کو دیکھنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک چڑھ جاتی ہے
جس سے وہ اس مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں نہیں دیکھ سکتا، اگر اس تحقیقات کو کسی صحیح نتیجہ تک
پہونچانا ہو تو یہ ضروری ہے کہ کسی مذہب کو اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو کس شکل
میں دیکھتے ہیں بلکہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ خود اپنے آپ کو کس شکل میں دکھانا چاہتے ہیں اس کے
لئے حتی الامکان ہر مذہب کے ماخذ اصلیہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اور ان کو پڑھ کر خود اپنی عقل سے فیصلہ کرنا
چاہیئے کہ وہ مذہب کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے، پھر جب آدمی خود ایک رائے قایم کرلے
تو اس کے بعد دوسروں کی آراء و افکار کا مطالعہ کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ اس وقت وہ حق
اور باطل میں بآسانی امتیاز کرسکے گا،

آیندہ صفحات میں مسئلہ جنگ پر مختلف مذاہب کی تعلیمات پر جو گفتگو کی جائیگی، اس میں بھی اصول
ثلثہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور اس امر کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ اپنے مذہب کی تائید و حمایت کے جذبہ سے
خالی ہوکر حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے،

دنیا کے چار بڑے مذاہب، اس مختصر کتاب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنگ سے متعلق دنیا کے تمام چھوٹے
بڑے مذاہب کی تعلیمات کا حصر کیا جائے، اس قسم کا احاطہ و استیعاب نہ تو آسان ہے، اور نہ ضروری ہے،
تقابلِ ادیان کی بحثیں صرف ان مذاہب تک محدود رہتی ہیں جو اپنے پیروؤں کی کثرت، اپنی وسعت
کی وجہ سے، اور اپنی گذشتہ و موجودہ عظمت کے اعتبار سے دنیا کے بڑے مذاہب شمار کئے جاتے ہیں، اسی
قاعدہ کی پیروی کرکے ہم بھی اپنی بحث کو بڑے بڑے مذاہب تک محدود رکھیں گے،
یہ مذاہب چار ہیں، ہندو مذہب، بودھ مذہب، یہودیت اور مسیحیت، مسئلہ جنگ کے سلسلہ

ہیں ایک فرقہ وہ ہے جس نے جنگ کو جائز رکھا ہے اور ہمیں ہندو مذہب اور
ہیں دوسرا فرقہ وہ ہے جس نے جنگ کو جائز نہیں رکھا اور یہ بودھ مذہب اور مسیحیت
ہے اس کے بعد ہم دوم پر

ہندو مذہب

اس مذہب سے بحث کرنے سے ایک شخص کو سب سے پہلے یہ مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس چیز کو ہندو
قرار دے اور وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر کسی مذہب کو ہندو مذہب کہا جائے اور یہ لفظ استعمال کیا جائے
اس کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس کا ایک مذہبی عقیدہ ہو جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہو مگر ہندو مذہب میں
ایسا کوئی مرکزی عقیدہ نہیں ملتا۔ طبقے اور گروہ ہیں۔ یہ عقائد، شعائر، اعمال اور کتابیں
ہندو سوسائٹی سے بالکل جدا ہیں۔ ہمیں سوال ہیں اور سب کے سب ہندو کہلاتے ہیں۔ اس سے یہ
مسلمان ہندو مذہب کا فلسفی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے
اس کے مختلف مذاہب میں سے کس کو اختیار کریں۔

اس مشکل کو ہندوؤں کے جدید مذہبی پیشوا سوامی وویکانند نے ایک حد تک آسان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے
کہ ہندو مذہب کی ایک خصوصیت ابھی باقی ہے اور وہ چند مخصوص کتابوں پر اپنی مذہبی عقیدت کو مرکوز
کرنا ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ ہے کہ ان کتابوں کی بڑی اکثریت نے الہام کا درجہ

[illegible] کہتا ہے "ہندو مذہب دنیا کے [illegible]
Guru Prasad Sen. Introduction to Hindu Religion)
ہندو مذہب کی [illegible] کہ اس میں رسوم، عبادت، عقائد، روایات اور تخیلات کا مجموعہ ہے
[illegible] ان کی متبرک کتابوں کی تصدیق حاصل ہے اور جنہیں ہر [illegible]
Clark Religious Systems of the World
[illegible] ہندو کی کتاب کے
[illegible] جو سناتن دھرم، بودھ مت، مسیحیت، پارسی مذہب، یہودی مذہب، یا دنیا کے کسی اور مذہب کے
[illegible] جن کی عبادت وحدانیت سے لیکر بت پرستی تک وسیع ہو اور جن کے دینیات کا لٹریچر سنسکرت زبان
لکھے ہوئے ہوں، ہندو ہیں۔" (Census Report Baroda 1901 Vol. 120)

واپنے دین کی اساس و بنیاد کے طور پر تسلیم کر لیا ہے، یہ کتابیں تین ہیں، چار وید، گیتا، و منوسمرتی یہاں
ہندو مذہب کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا اس کا ماخذ یہی تین کتابیں ہونگی،

ہندو مذہب کے تین دور | یہ تینوں کتابیں تاریخی حیثیت سے تین مختلف دوروں سے تعلق رکھتی ہیں
رسالہ جنگ میں ہندو مذہب کے تین مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں،

ویدوں کا تعلق اس دور سے ہے جسمیں آریہ قوم وسط ایشیا سے نکلکر ہندوستان پر حملہ آور ہوئی
تھی، اور اس ملک کے اصلی باشندوں سے جو رنگ، نسل، اور مذہب میں اس سے بالکل مختلف تھے
سر جنگ تھی، اس جنگ میں اپنے اجنبی دشمنوں کے خلاف ان حملہ آوروں کے جذبات کیا تھے؟ ان
وہ کس نظر سے دیکھتے تھے؟ ان سے بناہی مخاصمت کیا تھی؟ ان کے خلاف جنگ کے مقاصد کیا
ہے؟ اور وہ ان سے کس قسم کا معاملہ کرنا پسند کرتے تھے؟ ویدوں کی نظمیں ان سوالات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں

گیتا اس دور کی کتاب ہے جسمیں شمالی ہند پر آریوں کا تسلط قایم ہوچکا تھا، اور تفوق و برتری
لے لئے خود آریوں کے دو بااثر خاندانوں میں کشمکش ہو رہی تھی، یہ کتاب ہمکو کرشن جیسے مذہبی پیشوا
زبان سے جنگ کے متعلق ہندوؤں کے فلسفیانہ افکار سے روشناس کرتی ہے،

منوسمرتی اس دور کے مذہبی، سیاسی، اور تمدنی قوانین کا مجموعہ ہے جسمیں ہندوستان آریہ دور
ن چکا تھا، غیر آریہ قوموں کی طاقت فنا ہوچکی تھی، اور اس ملک میں آریہ قوم کی تہذیب عروج پر
ی، اس کتاب میں ہمکو جنگ کے قواعد و ضوابط اور مفتوح اقوام کے حقوق دفع النفس کے متعلق بہت
تفصیلات ملتی ہیں،

آیندہ بحث میں یہی ترتیب ملحوظ رکھی جائیگی،

ویدوں کی جنگی تعلیم | لفظ وید چار کتابوں پر بولا جاتا ہے، جو الگ الگ ناموں سے مشہور ہیں، سب
ب سے قدیم رگ وید ہے، پھر یجروید، پھر سام وید، پھر اتھروید، ان کے منتروں کو مضامین کے لحاظ
مرتب کرنا مشکل ہے، کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ایک منتر میں متعدد مضامین آجاتے ہیں
ں لئے ہم مضامین کے اعتبار کو نظر انداز کرکے ہر کتاب کے ان منتروں کو الگ الگ نقل کرینگے
جنگ سے کسی نوع کا تعلق رکھتے ہیں،

یہ بحث نظر ویدوں کا وہ ترجمہ پیش ہے جو ہمارے فاضل دوست [illegible] نے [illegible] کیا ہے

رگ وید کے مترجم حسب ذیل ہیں :-

"اے اندر! وہ دولت، جو مسرت بخشے، فاتح کی دائمی فاتحانہ دولت، جو ہماری خوب مدد کرے، جس کے ذریعہ ہم دست بدست لڑائی میں اپنے دشمنوں کو دفع کر سکیں"

(۱: ۸۱: ۲)

"اے روشن آگ! تو جس پر متبرک تیل ڈالا جاتا ہے، ہمارے دشمنوں کو جلا دے جنکی حفاظت خبیث روحیں کرتی ہیں" (۱: ۱۲: ۵)

"(اندرا اور وارونا) کی نصرت سے ہم دولت کا بڑا خزانہ جمع کر لیں اور اس کے کھتے بھر لیں، کافی اور بچا رکھنے کے قابل، اے اندرا اور وارونا! تمکو میں دولت کے لئے متعدد صورتوں سے پکارتا ہوں، ہم کو تم محفوظ رکھو" (۱: ۱۷: ۶، ۷)

"ہر بد کو قتل کر دے، اور جو کوئی ہمکو خفیہ طریقوں سے (غالباً جادو سے) تکلیف پہونچائے اسے برباد کر، اے اندر! ہمکو خوبصورت گھوڑے اور گائیں دلوا، ہزاروں کی تعداد میں اے بڑے دولت مند!" (۱: ۲۹: ۷)

"(تو آریوں اور دسیوؤں کے درمیان امتیاز کر جو اوھرمی ہیں ان کو سزا دے، اور انھیں اس کے حوالہ کر دے جس کی گھانس (دیوتاؤں کے نذرانے کے لئے) کٹی رکھی ہے" (۱: ۵۱: ۸)

ڈاکٹر جیمز مترنے اپنی کتاب (Muir's Sanskrit Texts) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دسیو سے خود آریوں کے نابکار قبائل مراد ہیں، (جلد اول صفحہ ۲۱۰) لیکن خود ویدوں کے مطالعہ سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہونچ جاتی ہے کہ آریہ حملہ آور اس لفظ سے ہندوستان کے ان اصلی باشندوں کو یاد کرتے تھے، جن سے ان کی جنگ تھی یہ صرف میری اپنی رائے نہیں ہے، بلکہ اکثر محققین اسی رائے کے موئد ہیں، گرفتھ لکھتا ہے،

"یہ نام اکثر ان دیسی اقوام کے لئے مستعمل ہوتا ہے جو آریوں کی مہاجرت میں مزاحم ہوئی تھیں، بعد میں یہ لفظ ان تمام لوگوں کے لئے بولا جانے لگا جو ویدکی عبادات اور مخصوص برہمنی رسوم ادا نہیں کرتے" (انھرو وید ج ۱ ص ۹)

پروفیسر بلوم فیلڈ لکھتا ہے :-

ایک نامعلوم زمانہ میں جو آج کل کے تخمینہ کے مطابق ۱۵۰۰ قبل مسیح میں شروع ہوا تھا، اگرچہ ممکن ہے کہ اس سے بھی

[illegible] خوبصورت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
گایوں کے افلاس کو دور کرتے ان قطروں کے باعث اندر، وسیوں کو منتشر کرتے
اور ان کی نظر سے محفوظ ہو کر ہم وافر سامان خوراک حاصل کریں۔ اے اندر ہم کو
خوب دولت اور خوراک جمع کر لینے دے ..... ہم بہادروں کی سی طاقت پیدا
کریں جو مویشی اور گھوڑے حاصل کرنے کا خاص وسیلہ ہے۔" (۱: ۵۳: ۵)

"پس اے اندر! ہمکو بڑھنے والی شوکت عطا کر۔ ہمکو وہ قہر اور طاقت عطا کر جو قوموں
کو مغلوب کرے۔ ہمارے دولت مند سرداروں کو برقرار رکھ۔ ہمارے راجاؤں کی
حفاظت کر ہمکو دولت اور خوراک، شریف اولاد کے ساتھ عنایت کر۔ (۱۰: ۱۳۴: ۵)

"اے اگنی، تیرے مالدار پوجاری خوراک حاصل کریں، اور ہم لڑائی عمر میں پائیں
ہم اپنے دشمنوں سے لڑائی میں مال غنیمت حاصل کریں، اور دیوتاؤں کو ان کا حصہ
نذر کریں۔ اے اگنی! ہم تیری مدد سے گھوڑوں کے ذریعہ گھوڑے، گئیوں کے ذریعہ آدمی
(یعنی غلام) اور بہادروں کے ذریعہ بہادر فتح کریں۔ (۱: ۷۴: ۵-۹)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲ زیادہ قدیم تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ قبائل [illegible] ہندوکش کے شمال میں ہیں شمالی مغربی ہندوستان یعنی دریائے سندھ اور اس کی پانچ معاون ندیوں کی سرزمین میں ہجرت کرنی شروع کی۔ ان کے اصل غیر آریہ باشندے جو آریوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد دکن کی طرف چلے جاتے ہیں آسانی سے مغلوب ہو گئے۔ [illegible]

پروفیسر میکڈانل لکھتا ہے:-

"رگ وید میں داس اور دسیو کی اصطلاحیں عموماً ان سیہ رنگ قدیم باشندوں کے لئے استعمال کی گئی ہیں جنہیں فاتح آریوں نے مغلوب کیا تھا۔" [illegible]

ویم کوڈک لکھتا ہے:-

"بڑے بڑے دیوتا اپنے پوجاریوں کے فیاض دشمن ہیں، وہ دسیو یا سیہ رنگ دشمن باشندوں کے خلاف جنگ کرنے میں ہندو آریہ کی قیادت کرتے ہیں۔" [illegible]

[illegible]

"طاقتور اندر نے اپنے حسین رنگ والے[1] دوستوں کیساتھ مل کر زمین فتح کی، سورج کی روشنی اور پانیوں کو فتح کیا، اندر ہمارا محافظ ہو اور ہم بے خوف و خطر مال لوٹیں"

(۱: ۱۰۰: ۱۸-۱۹)

"اے اندر تو نے پورو کے لئے، اپنے غلام دیوداس کے لئے، اپنے پوجاری کے لئے ۹۰ قلعوں کے پرخچے اڑا دیے، اس طاقتور نے ایتھگو کے لئے شمبر کو پہاڑوں سے اُتارا، اپنی قوت سے زبردست خزانے تقسیم کئے، اور تمام خزانوں کو بانٹ دیا، اندر نے جنگ میں اپنے آریہ پوجاریوں کی مدد کی، اس نے جو ہر جنگ میں سینکڑوں نصرتیں مہیا رکھتا ہے" (۱: ۱۳۰: ۷، ۸)

"اے اندر گھوڑوں! ہم جنگ میں تجھ سے امداد پا کر ان لوگوں کو مغلوب کریں جو ہمارا مقابلہ کرتے ہیں، ان کو فتح کریں جو ہم سے لڑتے ہیں، آج کے دن سوم رس انڈیلنے والوں کو برکت دے، ہم اپنی اس قربانی میں اپنی قوت دکھا کر مالِ غنیمت تقسیم کریں، لڑائی کا مالِ غنیمت (۱: ۱۳۲: ۱)

"جب اچھے نقشہ کے ساتھ بہادر لوگ فوج کو آگے بڑھاتے ہیں، تو وہ باقاعدہ جنگ میں فتح حاصل کرتے ہیں، اور شہرت دنا موری کی تلاش میں بڑھتے اور دباتے چلے جاتے ہیں" (۱: ۱۳۲: ۵)

"اے اندر! تو ہر موقع پر ہمارا رہے، آدمیوں کا محافظ، نہایت شریف دل ہمکو ہمارے تمام حریفوں پر فتح بخشنے والا، ہم نہایت وافر مقدار میں قوت بخش غذا حاصل کریں" (۱: ۱۷۴: ۱۰)

"تو اے بہادر! مالِ غنیمت لوٹنے والے! آدمی کی گاڑی تیز چلا، ایک جلتے ہوئے جہاز کی طرح بے دین وسیو کو جلا دے، اے فاتح!" (۱: ۱۷۵: ۳)

---

[1] حسین رنگ والوں سے مراد وہ گورے رنگ کے آریہ قبائل ہیں جنھوں نے ماوراء النہر سے اگر ہندوستان پر حملہ کیا تھا، ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے اصلی باشندے کالے رنگ کے تھے، دیکھو گرفتھ کا ترجمہ رگ وید جلد اول صفحہ ۱۳۰،

"اے شجون، اے اندر! تیری مدد سے ہم اپنے دشمنوں کو جو اپنے تئیں طاقتور سمجھتے ہیں مزید کریں، تو ہمارا محافظ بن ہمیں بڑھا، ہمیں قوی بنا، ہم وافر مقدار میں قوت بخش غذائیں حاصل کریں۔" (۱: ۷۹: ۵)

"ہم تیری مدد سے دولت حاصل کریں، تیری اعانت سے اور آریوں کی قوت سے اپنے تمام دشمن دسیوں کو مغلوب کرے۔" (۲: ۱۱: ۱۵)

"اے بہادر! تو ہمارے من چلے بہادروں کے ساتھ ملکر وہ شجاعانہ کارنامے دکھا جنھیں تجھ کو پورا کرنا ہے، وہ (یعنی دشمن) اپنی قوت کے زعم باطل سے پھولے ہوئے ہیں، ان کو قتل کر اور ان کی املاک یہاں ہمارے پاس لے آ۔" (۲: ۳۰: ۱۰)

اے اندر! تو جنگ کے میدانوں میں مویشی حاصل کرنے کے لئے لڑتا رہا ہے، کیونکہ بہت لوگ تیری حمد و ثنا کرتے ہیں۔" (۵: ۳۳: ۴)

"اندر نے سورج اور گھوڑوں پر قبضہ کرکے اس گائے کو حاصل کیا جو بہت سوں کو سیر کرتی ہے، اس نے سونے کے خزانے فتح کئے، اس نے دسیوں کو زیر کیا اور آریہ وروں کو محفوظ کر دیا۔" (۳: ۳۴: ۹)

"اے آگ کے دیوتا! جو کوئی خفیہ طور سے ہم پر حملہ کرے جو ہمسایہ ہمکو ضرر پہونچائے اس کو تو متر اکی طاقت سے، ہمیشہ مشتعل رہنے والے شعلے سے جلانے والی تیز حرارت سے، جلا دے ..... ہماری مدد کرتا کہ ہم یہ خواہش پوری کریں: دولت حاصل کریں، بہادروں کے دستہ کے ساتھ۔" (۷: ۵: ۴ - ۷)

"اے اندر! ہمکو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری در اس روز افزوں قوت کے ساتھ، جو مال غنیمت حاصل کرتی ہے، تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں چاہے وہ اپنے بول بالے ہم پر دشمن بختمند ہوں۔ اے بہادر! ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کرکے خوش ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔" (۷: ۹: ۸ - ۱۳)

"تو نے دشمن قبائل کے سات گروہوں کے سات گروہ دیئے جو ان کی جائے پناہ تھے، تو نے انکو
تہ تیغ کر دیا، اور پورکتا کی مدد کی" (۲: ۲۰: ۱۰)

"اے اندر ہمکو وہ دولت دے جو دشمن کو تہ تیغ میں اس طرح مغلوب کر دے جیسے آسمان

لے دیسیو کی طرح لفظ داس بھی ان دیسی قوموں کے لئے بولا جاتا تھا جو آریہ حملہ آوروں سے برسرپیکار تھیں، بعض لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ داس اور دیسیو سے مراد اہرمن خبیثہ ہیں، مگر یہ تاویل کسی طرح قابل تسلیم نہیں ہے، گرفتھ کہتا ہے:-

"یہ اصطلاح صرف ان خاص بدروحوں کے لئے وضع کی گئی تھی جو اندر اور انسانوں کی دشمن سمجھی جاتی تھیں، مگر بالعموم اس سے وہ وحشی لوگ مراد لئے جاتے تھے، جو اس ملک کے اصلی باشندے تھے، اور جن سے ابتدائی آریہ مہاجرین کی جنگ تھی"

دوسری جگہ یہی مصنف لفظ "داسم ورنم" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"اس سے مراد وہ وحشی بدشکل باشندے ہیں جنھیں آریہ مہاجرین نے بھوت پریت کی جماعت میں شامل کیا تھا" (گرفتھ کا ترجمہ، تھرویدجلد اول صفحہ ۱۰۴)

داس اور دیسیو کے مسخی کی تعیین میں اسوقت کسی شک کی گنجائش نہیں رہتی جب ہم خود رگ وید میں انکے انسان ہونے کے متعلق بین شہادتیں دیکھتے ہیں۔ مثلاً جگہ جگہ بے دین اور ادھرمی کہا گیا ہے، وہ دیوتاؤں کو نہ ماننے والے اپنی قوانین کی پابندی کرنے والے اور عقل سے بہرہ تھا دیئے گئے ہیں۔ ان کے پاس گائے بیل اور مویشی کی کثرت ہے، انکے پاس قلعے ہیں جنکو آریہ فتح کرتے ہیں، ان سب سے زیادہ وزنی دلیل یہ ہے کہ انکی ناک چپٹی، انکے جوڑے چوڑے اور رنگ کالے بتائے گئے ہیں جو بعینہ قدیم ڈراوڈین نسل کے لوگوں میں ہمکو آج بھی نظر آتے ہیں، رگ وید میں ایک جگہ لکھا ہے

"اے بہادر تو نے لڑائیوں میں بیل جیسے جبڑے والے داسوں کے جادو ٹونے تک کو مغلوب کر لیا (۷: ۹۹: ۴)"

دوسری جگہ دیسیو کا حلیہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے:-

"تو اپنے ہتھیار سے نکٹے دیسیوں کو قتل کرتا ہے" (۵: ۲۹: ۱)

ایک اور جگہ داسوں کے غلامی میں دیئے جانے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:-

"یادو اور تورو انے بھی ہمکو خدمت کیلئے دو داس دیئے ہیں، اور بہت سی گائیں" (۱۰: ۶۲: ۱۰)

پھر ایک جگہ داس عورتوں کے بھی غلامی میں دیئے جانے کا ذکر ہے چنانچہ ایک شخص ترآسا دیسیو کو ہم پچاس لونڈیوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے دیکھتے ہیں (۸: ۱۹: ۳۶) ان بین شہادتوں کی موجودگی میں خواہ مخواہ یہ تاویل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ لوگ آدمی نہ تھے بلکہ بھوت پریت تھے۔

زمین پر چھایا ہوا ہے، دولت جو ہر روز مال لاتی ہے، جو فاتح پیدا کرنے والی زمینیں فتح کرتی ہے وہ دولت جو دشمن کو شکست دیتی ہے۔ (۶: ۲۰: ۱)

"اے دیوتاؤ! ہم ایک ایسے ملک میں آ پہنچے ہیں جو چراگاہوں سے خالی ہے، ایسی سرزمین جو وسیع ہونے کے باوجود ہمیں پرورش کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، اے برہسپتی! مواشی حاصل کرنے کے لئے جنگ میں مدد کر، اے اندر! اس بھجن گانے والے کے لئے ایک راہ نکال، روز بروز وہ ان کی (یعنی آریوں کی) جائے سکونت سے اس سیہ رو مخلوق کو دور بھگا رہا ہے، اس بہادر نے ان کمینے، پھیری پھرنے والے داسوں یعنی وچین اور شامبر کو دریاؤں کے سنگم پر قتل کروا ڈالا۔" (۶: ۴۷: ۲۰-۲۱)

"تیر کمان کی مدد سے ہم مواشی حاصل کریں، تیر کمان کی مدد سے ہم لڑائی جیتیں، تیر کمان کی مدد سے اپنی گھمسان کی لڑائیوں میں فتح مند ہوں، تیر کمان دشمنوں کو غمگین کرتی ہے، اس سے مسلح ہو کر ہم تمام ممالک فتح کریں۔" (۶: ۷۵: ۱-۴) یجروید ادھیائے ۲۹ منتر ۳۹)

"اے اندر! جب میدان جنگ گرم ہو تو ہمارے دشمنوں کو ان فانی لوگوں کو جو ہماری بیحرمتی کرتے ہیں ہلاک کر دے، بدگوؤں کی بددعائیں ہم سے دور رکھ، ہمارے پاس مال و دولت کے جمع کئے ہوئے خزانے لا، ہمارے فانی حریفوں کے ہتھیار توڑ دے، ہمیں عظیم الشان شہرت اور مال و دولت عطا کر، ہمارے حریفوں کو آسانی کے ساتھ مغلوب ہو جانے والا بنا دے، اے بہادر! ہم فتح مند ہوں مال غنیمت حاصل کریں اس طرح اے اندر! قیمتی چیزوں سے ہم کو مطمئن کر، ہم تیری بلند پایہ مہربانی حاصل کریں، ہمارے بہادروں کو بہترین سامان خوراک اور بہادر اولاد حاصل ہو۔"

(۷: ۲۵: ۲- ۳- ۵- ۶)

"اے گھوڑو ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، مال و دولت کی فتح کو آسان کر، تو مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں ہمارا اچھا محافظ بن۔" (۷: ۳۲: ۲۵)

"اے بہادر! ہم تیری دوستانہ معیت میں اس شخص کا مقابلہ کریں جو ہمارے خلاف

غصہ سے بھڑک رہا ہے اور اس قوم کے ساتھ لڑائی میں ثابت قدم رہیں جو کثرت سے گائیں رکھتی ہے (۸: ۲۱: ۱۱)

"تو گھن کھائے درخت کو ریزہ ریزہ کر دے، داسوں کی قوت کا قلع قمع کر دے، ہم اندر کی مدد سے وہ سب خزانے بانٹ لیں جو انھوں نے جمع کئے ہیں (۸: ۴۰: ۶)

"اے اگنی! اے دیوتا! لوگ قوت حاصل کرنے کے لئے تیری حمد کے ترانے گاتے ہیں، تو دشمن کو ڈرا دے دیکر پریشان کر دے: اے اگنی! کیا تو مواشی حاصل کرنے اور دولت فتح کرنے میں ہماری مدد نہیں کریگی" (۸: ۶۴: ۱۰-۱۱)

"ہم جنگ میں ایسے ہو جائیں کہ تیری کرپا کے یقینی مستحق ہوں، دیوتاؤں کے لئے متبرک نذرانوں اور مناجاتوں سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم مال غنیمت حاصل کر سکیں" (وال کھیلہ ۵: ۶)

"اے اندر! خزانوں کے خزانچی! ہم نے خزانوں کی خواہش سے تیرا سیدھا ہاتھ تھام لیا ہے کیونکہ ہم تجھ کو جانتے ہیں، اے بہادر! مویشیوں کے مالک! ہمکو زبردست درخشاں زرومال عطا کر، نامور رشیوں کے ساتھ مضبوط ہو کر ہمارے دشمنوں کو مغلوب کر کے ہمیں زبردست درخشاں زرومال عطا کر، اے اندر! قلعوں کو مسمار کر کے دسیوں کو قتل کر کے ہمکو زبردست درخشاں زرومال عطا کر" (۱۰: ۴۷: ۱-۳-۴)

"ہمارے گرد وہ دسیو ہیں جنکا کوئی دھرم نہیں ہے، عقل سے محروم، انسانیت سے خارج، غیر مانوس قوانین کے پابند ہیں" (۱۰: ۲۲: ۸)

"دشمنوں کو قتل کرنے والے اور تیرا! دسیو کو ہلاک کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا" (۱۰: ۸۳: ۳)

"تو ہمارے دشمنوں کو قتل کر، ان کی جائداد املاک بانٹ دے، اپنی قوت کے کرشمے دکھا، ان لوگوں کو منتشر کر دے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں، اے مینو! ہم سے لڑنے والوں پر غالب آ، توڑ دے جا، قتل کئے جا، دشمنوں کو کچلے جا" (۱۰: ۸۴: ۲-۳)

"لڑ، اے صداقت سے مضبوط ہو کر لڑنے والے، تو لڑائی لڑ اور ہمکو اس دولت سے حصہ دلا، جو ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی ہے" (۱۰: ۱۱۲: ۱۰)

"اے اندر، تو سورما کے ساتھ دشمن قوموں پر غالب آ۔ (۱۰: ۱۰۳)

"مجھکو اپنے ہمسروں میں سانڈ بنا، مجھکو اپنے حریفوں کا فتح کرنے والا بنا، مجھکو اپنے دشمنوں کا قتل کرنے والا، با اختیار حکمراں، مویشیوں کا مالک بنا۔" (۱۰: ۱۷۵)

یجروید (بیض) میں ہمکو جنگ کے متعلق حسب ذیل منتر ملتے ہیں:-

"یہ اگنی ہمکو ویسے مکان، گھر اور آسایش بخشے اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے آگے مار بھگاتی چلے، وہ مالِ غنیمت حاصل کرنے کی جنگ میں مالِ غنیمت لوٹے، وہ اپنی فاتحانہ پیش قدمی میں دشمنوں کو زیر کرے۔" (۱۸: ۶۹)

"اے اگنی! ہماری مزاحمت کرنے والی جماعتوں کو مغلوب کر، ہمارے دشمنوں کو بھگا دے، اے اے اجیت! دیوتاؤں کو نہ ماننے والوں حریفوں کو قتل کر اور اپنے چاہنے والوں کو عظمت و شوکت نصیب کر۔" (۹: ۳۷)

"اے دشمنوں کے حق میں سب سے زیادہ تباہ کن! تجھکو پاتھا نے روشن کیا ہے، تو ہر لڑائی میں مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے۔" (۱۱: ۳۴)

"جو شخص ہمکو نقصان پہونچانے کی فکر کرتا ہے، جو ہمکو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو کوئی ہم پر تہمت لگائے اور ہمیں ایذا دے، اسے تو جلا کر خاک کر دے۔" (۱۱: ۸۰)

"اے اگنی! تو جس کے شعلے تیری طرح تیز ہو رہے ہیں، ہمارے آگے آگے پھیل، ہمارے دشمنوں کو جلا دے۔ اے بھڑکتی ہوئی اگنی! جس نے ہمارے ساتھ بدی کی ہے تو اسکو سوکھی لکڑی کی طرح بالکل بھسم کر دے۔ اے اگنی! ان دشمنوں کو بھگا دے جو ہمارے خلاف رہتے ہیں، اپنی آسمانی طاقت کا مظاہرہ کر۔" (۱۳: ۱۲-۱۳)

"درندے جانور اس کے ہتھیار ہیں، وہ خود (جانور) اس کا بھیتی ہتھیار ہے۔ ان دونوں کو سلام ہو، وہ ہماری حفاظت کریں، وہ ہمیں رتھ عطا کریں۔ ہم اس آدمی کو ان کے ذریعہ زیر کریں جس سے ہم لڑائی کرتے ہیں اور جو ہم سے لڑائی کرتا ہے۔" (۱۵: ۵)

"اے اندر! تو اپنی طاقت کے لئے مشہور ہے، مضبوط ہے، زبردست لڑنے والا ہے، سب سے زیادہ زور و خوبی رکھتا ہے، فتح مند اور ہر ایک کو زیر کرنے والا ہے۔ فتح و کامرانی کا بیٹا

سب کا جیتنے والا ہے، تو آدمیوں اور بہادروں سے نکل کر اپنی فتح کی گاڑی پر سوار ہو، مطلبوں کا کھونے والا، گائیں لوٹنے والا، اس صاعقہ سے مسلح ہے، جو ایک پوری فوج کو شکست دیتی ہے اور طاقت سے اس کو تباہ کر دیتی ہے، بھائیو! اس کے پیچھے پیچھے آؤ، اپنے تئیں بہادروں کی طرح آزاد چھوڑ دو، اور اس اندر کی طرح اپنی شجاعت اور جسارت کا اظہار کرو، ہمارے دشمنوں کے حواس باختہ کر دے، اے اپوشا[1] تو ان کو پکڑ لیجا، ان پر حملہ کر، ان کے دلوں کو آگ پر رکھ کر انھیں جلا دے، اس طرح ہمارے دشمن ہمیشہ تاریکی میں رہیں" (۱۰: ۳۷-۳۸-۴۴)

سام وید کے جن منتروں میں جنگ کا مضمون آیا ہے وہ یہ ہیں:-

"اندر! ہماری مدد کے لئے ایسی کارآمد دولت دے جو ہنرمند ہوشیار لوگوں پر حکومت کرنی والی ہو، ہاں! وہ قوت والا ہمکو اقتدار کی دولت دے، اندر اور پوشن کو ہم دوستی اور خوش حالی کے لئے پکاریں، اور مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے" (حصہ اول ۳: ۱: ۱: ۹)

"ہم شعرا تجھے پکارتے ہیں تاکہ ہم اپنے لئے دولت اور اقتدار حاصل کریں، اے اندر! اے بہادروں کے سردار! لوگ جنگ میں تجھ کو پکارتے ہیں، گھوڑ دوڑ میں تجھکو پکارتے ہیں، عملی آدمی اپنے سچے حلیف پورندھی کے ساتھ مالِ غنیمت حاصل کریگا" (۳: ۱: ۵: ۲-۶)

"جب ہم رس نکالتے ہیں، تو اے اندر! بڑے بہادر! ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں حتی کہ مالِ غنیمت لوٹتے وقت بھی، ہمیں خوش حال بنا، بڑی ہوشیاری کیساتھ ہم خاص تیری حفاظت میں فتح حاصل کریں، اے اندر! ہم تیرا سیدھا ہاتھ پکڑتے ہیں تو کہ دولت کا مالک تو ہی ہے، ہم تجھ سے خزانوں کی خواہش کرتے ہیں، چونکہ ہم تجھکو بہادر، مویشیوں کا مالک جانتے ہیں، ہمکو زبردست درخشاں زر و مال عطا کر، لڑائی اور عظمت و شان کے سپرو! ہمکو مویشیوں کے تھان کا ایک حصہ بخش دے" (۴: ۱۱: ۴۱: ۵-۲)

---

[1] وبائی امراض کی دیوی کا نام ویدک دیومالا میں "اپوا" ہے، یہاں غالباً وہ بیماریاں مراد لی گئی ہیں جو لڑائی کے وقت فوجوں میں پھیلتی ہیں، (گرفتھ کا ترجمہ ریگ وید صفحہ ۱۵۴)

"...دیوتاؤں کے ساتھ گا۔ اس [illegible] جو خوش کرتا ہے جس نے رجسوان کے ساتھ
ملکر کالے غولوں کو بھگا دیا۔" (۴: ۲: ۱۱۴)

"اے بہادر! افراد کے ساتھ گائیں۔ کھلے دل قوم کے خلاف جنگ میں تو ہمارا دوست
ہو۔ اور ہم اس شخص کا مقابلہ کریں جو اپنے غصہ میں ہمپر حملہ کرتا ہے۔" (۵: ۲: ۵)

"غضبناک چمکتے ہوئے اپنی چال میں تھکے بغیر، وہ کالے رنگ والوں کو بھگاتے ہوئے
سانڈوں کی طرح آگے بڑھے۔ اے سوم رس، تو دشمنوں کو شکار کرتا ہوا، بتاتا ہے
عقل اور مسرت بخشنے والا! تو دیوتاؤں کو نہ ماننے والے لوگوں کو بھگا دے۔"
(۶: ۱: ۵-۶)

"گائیوں کے آگے آگے بہادر سپہ سالار مالِ غنیمت تلاش کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے
اس کی فوج خوشیاں مناتی ہے۔" (۶: ۱: ۵)

"مالِ غنیمت لوٹتے وقت ہم پر اس بہترین زر و مال کے دریا بہا دے جسکی سینکڑوں
تمنا کرتے ہیں۔" (۷: ۲: ۱: ۵)

"اس کے ساتھ فتح حاصل کرنے کی کوشش میں ہم دشمن سے تمام مال و دولت لے لیں
ہاں آدم زاد کی تمام عظمت و شان حاصل کریں۔" (حصہ دوم: ۱: ۸: ۳)

"اس سے ہم سامان خوراک سے مالا مال غنیمت کے حاصل ہیں جسمیں سینکڑوں
ہزاروں گائیں ہوں۔" (۱: ۱: ۳: ۳)

"اے دیوتاؤں کے محبوب! اپنے اچھے مسرت بخش رس کے ساتھ اہل بدذات
پاپیوں کو قتل کرتے ہوئے، دشمنوں کو ان کی نفرت سمیت ہلاک کرتے ہوئے، زر و
زور پر کرتے اور مالِ غنیمت حاصل کرتے ہوئے اہل تو گھوڑوں اور گایوں کا حاصل
کرنے والا ہے۔" (۲: ۱: ۵: ۱-۲)

"اندر کی عنایات قدیم ہیں اس کی [illegible] حفاظت بھی بند نہیں ہوتی جب وہ

[illegible] جس سے [illegible] ان سے [illegible] ان سے [illegible] صحبت
[illegible] مقصود ہیں جنکو دس [illegible] سے یاد کیا جاتا ہے۔

اپنے بوجا ریوں کو گایوں سے بھرا ہوا مالِ غنیمت عطا کرتا ہے" (۲: ۱: ۳)

"اے گھوڑو! اے کڑکنے والے! اپنی حیرت انگیز اعانتوں کے ساتھ ہمیشہ کسی گایوں سے بھرے ہوئے باڑے پر لے چل" (۲: ۲: ۱۱: ۲)

"اے چابکدست بہادر! کنوا کے بیٹوں کے ساتھ بے دھڑک ہو کر ہر قدم پر ہزار مالِ غنیمت لوٹ، اے سرگرم کار گھوڑو! پر شوق دعاؤں کیساتھ ہم زرد رنگ کے مال[1] اور گایوں کے ایک بڑے گلے کی تمنا کرتے ہیں" (۲: ۲: ۱۲: ۳)

"ہم رنج و تکلیف کے پل کو عبور کر کے برکت کے پل پر پہونچ جائیں، ہم بے دین داسوں کو زیر کر لیں" (۳: ۱: ۳: ۲)

"سچے دیوتاؤ! ہم تم سے وافر سامانِ خوراک حاصل کریں اور ایک سکونت کی جگہ، اے مترو! ہم تمہارے اپنے ہو جائیں، اے مترو! ہماری حفاظت کرو، اپنی حفاظتوں کے ساتھ ہمیں بچاؤ، اے مشاق محافظو! ہم دسیو کو اپنے ہاتھ سے زیر کر لیں" (۳: ۲: ۸: ۳)

"اے بہادر! اے مالِ غنیمت لوٹنے والے! تو آدمی کی گاڑی کو تیز چلا، اے فاتح! ایک مشتعل جہاز کی طرح بے دین دسیوں کو جلا دے" (۶: ۳: ۲۰: ۳)

"وہ سند جب ہمارے گیت سنتا ہے تو اپنی گایوں کی کثیر دولت کو ہم سے بچا کر نہیں رکھتا، وہ اپنی قوت سے ہمارے لئے گایوں کا باڑھ کھولدے، خواہ وہ کسی کا ہو، جسکی طرف دسیوں کو قتل کرنے والا جاتا ہے" (۸: ۲: ۴: ۲-۳)

"اندر اور اگنی! تم دونوں نے ایک زبردار کارروائی سے، قلعوں کو سر کر لیا، جو داسوں کے قبضہ میں تھے" (۸: ۲: ۱۷: ۳)

اتھروید میں جنگ کا مضمون بکثرت آیا ہے، اس میں سے چند منتروں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے

"اے اگنی! تو یاتو دھانوں[2] کو یہاں باندھ کر لا، اور پھر اندر اپنی کڑک سے ان کے سروں

---

[1] زرد رنگ کے مال سے مراد سونا ہے، عربی میں بھی اکثر سونے اور چاندی کا نام لینے کے بجائے صفراء اور بیضا بولتے ہیں

[2] یہ لفظ کبھی ارواح خبیثہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی غیر آریہ دشمنوں کے لئے، جیسا کہ ڈاکٹر برڈیل لیتھ کہتا ہے، یہ تمیز کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ القاب کس جگہ غیر آریہ دشمنوں کیلئے استعمال کئے گئے ہیں، اور کس جگہ ارواح خبیثہ کے لئے، تاہم انداز بیان سے کہیں کہیں اسکا پتہ چل جاتا

پاسش پیش کرنے (۱۰ : ۷ : ۰)

"اے سوم رس پینے والے! یا تو دھانن کی آل اولاد کو کھینچ لا اور ہلاک کر دے۔ تو ہی گناہگاروں کی دونوں آنکھیں سر سے باہر نکال لے۔" (۱۰ : ۸ : ۳)

"اے مینو! اپنی طاقت سے زیادہ طاقتور ہو کر اور اپنے غضب سے ہمارے تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے۔ دشمنوں اور ویریوں اور دشمنوں کو قتل کرنے والے! تو ہمارے پاس ہر قسم کی دولت اور خزانے لا۔" (۴ : ۳۲ : ۱-۳)

"سچی ساعت بخشتے ہوئے راجہ! اس کو ہلاک کر دے جو ہمکو دکھ دے اور تکلیف دے اور جو ہم سے دشمنوں کا سا سلوک کرے، جو کوئی دکھ پائے بغیر ہمیں تکلیف دے یا دکھ پا کر ہمکو ستائے اس کو میں آگ اور ویس ونا کے دو طرفہ عذاب میں رکھ دوں۔" (۴ : ۳۶ : ۳۰)

"میں پشاچوں کو اپنی قوت سے فتح کروں اور ان کی دولت چھین لوں جو کوئی ہمکو ایذا دے اسے میں قتل کر دوں اور میرے دوست کو کامیابی ہو۔" (۴ : ۳۶ : ۳۱)

"اور تمہاری گردنیں توڑ دے، اے پشاچو! اور تمہاری پسلیاں چور چور کر دے، اے یاتو دھانو! یہاں ہم شان کے ساتھ ہیں، اے ستر وارونا! تو حریص راکشسوں کو مار بھگا۔ ان کو کوئی جائے پناہ اور کوئی اطمینان کی جگہ نہ ملے۔ بلکہ وہ اب چرچٹ کرا کے موت کے منہ میں چلے جائیں۔" (۶ : ۳۲ : ۲)

"ہمارے یہ دشمن بے ہاتھ کے ہو جائیں، ہم ان کے سست بازوؤں کو بیکار کر دیں اور اس طرح، اے اندر! ہم ان کی ساری دولت آپس میں بانٹ لیں۔" (۱۰ : ۲۲ : ۳)

"ان کو بیل کی کھال میں سی دو، ان کو ہرن کی طرح بزدل بنا دو، دشمن بھاگ جائیں اور ان کے مواشی ہمارے پاس آ جائیں۔" (۶ : ۷۰ : ۳)

"ہم اندر کی مدد سے دشمن کے تمام جمع کئے ہوئے خزانہ کو بانٹ لیں۔ وہ ہمارے قانون کے مطابق تیرے غرور اور تیری شرارت کا سر نیچا کریں۔" (۱۰ : ۱۰ : ۰)

لے غضب کا دیوتا۔ ۲ے پشاچ عموماً کچی گوشت کھانے والے جھوٹ بولنے والے [illegible] ہوتا ہے کہ اس لفظ سے انسانی دشمن مراد ہیں۔

"اے آگ کے دیوتا! تو یاتودھانوں کی کھال میں گھس جا، تیرا تباہ کن تیر (یعنی شعلہ)
ان کو بھسم کر ڈالے۔ اے یات وید! ان کے جوڑوں کو کچل ڈال، کچا گوشت کھانے
والا اور گوشت کی تلاش کرنے والا اسکو ہلاک کر دے" (۸: ۳: ۴)

"اے آگ کے راجہ! جہاں کہیں تو کسی یاتودھان کو کھڑے ہوئے یا پھرتے ہوئے
دیکھے یا اس کو جو ہوا میں اڑتا ہے تو غصہ سے مشتعل ہو کر اسے تیر سے چھید ڈال"
(۸: ۳: ۵)

"یاتودھانوں کے دلوں کو تیر سے چھید ڈال اور ان کے بازوؤں کو جو تجھ پر حملہ کرنے
کے لئے اٹھیں توڑ دے۔ ان شیطانوں کے سامنے بھڑک کر، اے اگنی! انھیں مار گرا"
مردار خوار، چتکبرے گدھ اسے کھائیں، اس پلید کو آدمیوں میں سے آدم خور کیطرح
تاک کر اس کے تینوں اوپر کے اعضا کو توڑ ڈال، اپنے شعلوں سے اس کی پسلیوں
کو کچل دے، اے اگنی! اس کے نیچے کے اعضا کو تین ٹکڑے کر دے" (۸: ۳: ۶-۷-۱۰)

"اندر اور سوما! تو خبیث دشمن کو جلا دے، تباہ کر دے، اے دیوتاؤ! جو رنج پر رنج
پہونچاتے ہیں انھیں نیچا دکھا، ان احمقوں کو نیست و نابود کر دے، جلا ڈال، ذبح
کر دے، ہمارے پاس سے دفع کر اور ان مذموم ظلم راکشسوں کو ٹکڑے ٹکڑے
کر دے" (۳: ۴: ۱- رگ وید ۱۰: ۸۷: ۵-۱۰)

"پس اے دیوی گاسے! برہمن پر ظلم کرنے والے، مجرم بخیل، دیوتاؤں کی مذمت
کرنے والے کو اپنی سرگرم ہوں والی بان سے جو استرے کے پھل کی طرح تیز ہے
اور جس کے پر سونے کے ہیں اس کے سر کو کندھوں سے الگ کر دے، اس کے سر کے بال نوچ ڈال
اس کے بدن کی کھال کھینچ لے، اس کے پٹھے کھینچ لے، اس کے ڈھانچ پر سے
گوشت کی بوٹی بوٹی اتار لے، اس کی ہڈیوں کو کچل دے، اس کے سر سے بھیجا
نکال لے اور اس کے سب اعضا اور جوڑوں کو الگ کر دے" (۱۲: ۵: ۶۵-۷۱)

"قلعہ شکن، دولت رکھنے والے، اندر نے دشمنوں کا ناس کر دیا، اور بجلی کی سی
چمک کے ساتھ داسوں کو مغلوب کر لیا، اس نے اپنی قوت، اپنی ہر ایک پرغالب

آنے والی جرات، اپنی حیرت انگیز مہارت فن سے بدیا من دیسیو کو پھل دار بنانے
سونے کے خزانے فتح کئے، اس نے دیسیو کو تمس نہس کر دیا، اور آریہ نسل کے دشمنوں
کو محفوظ کر دیا (۲۰: ۱۱: ۱-۶-۹)

ویدوں کی تعلیم پر ایک نظر اوپر جنگ کے متعلق چاروں ویدوں کے منتر لفظ بلفظ نقل کر دیئے گئے ہیں، اور ان کی اصلی اسپرٹ کو ظاہر کرنے کے لئے ایک ایک مضمون کے کئی کئی منتروں کو نقل کیا گیا ہے، ان کے مطالعہ سے جن اہم نکات پر روشنی پڑتی ہے وہ مختصراً یہ ہیں:-

۱- آریوں کی جنگ ایک ایسی قوم سے تھی جو رنگ، نسل، مذہب، اور وطنیت میں ان سے مختلف تھی، اور یہی اختلاف ان کے درمیان بنائے عداوت و نفرت تھا۔

۲- وہ اس قوم کو بھوت پریت، شیطان اور ارواح خبیثہ میں سے سمجھتے تھے، انھیں داس داس، دیسیو، راکشش، یاتو دھان، اور پشاچ وغیرہ نفرت انگیز ناموں سے یاد کرتے تھے، اور ان کو انسانیت سے خارج عقل و شعور سے عاری، اور آریہ نسل کے مقابلہ میں ذلیل و کمینہ خیال کرتے تھے، انھیں خیالات کے ماتحت انھوں نے اپنے ان دشمنوں کو وہ درجہ دینے سے انکار کر دیا جو برتر بنائے نوع کو دیا جانا چاہیئے،

۳- ان کے پیش نظر جنگ کا کوئی بلند اخلاقی مقصد نہ تھا، انھیں دولت، اور خزانوں کی تلاش تھی، گائے بیل گھوڑے، اور دوسری قسم کے مویشیوں کی فراوانی چاہتے تھے، زیر زمینوں اور آرام دہ مکانوں، اور سامان خوراک سے بھرپور ذخائر کے خواہشمند تھے، وہ چاہتے تھے ان کے مدمقابل قوموں کو مغلوب کرنے، ہم سروں میں شجاعت و بہادری کی شہرت حاصل کرنے، اور ملکوں پر دبدبہ و شوکت کے ساتھ حکمرانی کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی، ویدوں میں کہیں بھی کون مقاصد کے سوا کوئی اور مقصد نظر نہیں آتا،

۴- غیر آریہ قوم کے لوگوں سے ان کی جنگ کسی قابل تصفیہ نزاع پر مبنی نہ تھی، نہ کوئی ایسی نزاع پر مبنی تھی جو فریقین میں سے کسی ایک کے کلیتہً مٹ جانے یا ماتحت و مغلوب ہو جانے کے سوا کسی اور صورت سے ختم نہ ہو سکتی تھی، ان کی جنگ اس بنا پر تھی کہ یہ قومیں آریہ نہیں اور آریوں کے دیوتاؤں کی پرستش نہ کرتی تھیں، پہلی وجہ کا رفع ہونا تو بداہتہً ناممکن تھا کیونکہ

نسل کوئی بدلنے کی چیز نہیں ہے۔ اب رہی دوسری وجہ تو وہ بھی اس لئے رفع نہ ہو سکتی تھی، کہ آریوں کا مذہب تبلیغی مذہب نہ تھا۔ ویدوں سے کہیں اشارۃً بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آریوں نے غیر آریہ قوموں کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دی تھی۔ برعکس اس کے ہمیں اس امر کی بین شہادتیں ملتی ہیں، کہ آریہ ورن کے لوگ غیر آریہ لوگوں کو فطرۃً ذلیل و نجس سمجھتے تھے اور اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی مذہبی عبادت میں شریک ہو سکیں، یا ان کی دینی کتابوں کو ہاتھ لگا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حریفوں کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک ملک کے اصلی باشندوں نے شودر بننا یا جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نکل جانا قبول نہ کر لیا۔

۲۔ ویدوں کے منتروں سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ آریہ حملہ آور اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں فی الواقع کیا سلوک کرتے تھے، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ان لوگوں کو سخت ہولناک عذاب دینے کی خواہش موجود تھی، زندہ آدمی کی کھال کھینچنا، اس کی بوٹیاں کاٹنا، سے آگ میں جلانا، اس کے اعضا کا مثلہ کرنا، اس کو درندہ جانوروں سے پھڑوانا، اسے جانوروں کی کھال میں سی دینا، اس کے بال بچوں تک کو ذبح کر ڈالنا، یہ وہ مرغوب سزائیں ہیں جنکا ذکر بار بار وہ اپنے منتروں میں کرتے ہیں۔

یہ جنگ اصول اور فروع دونوں کے لحاظ سے اسلام کی جنگ کے ساتھ کلی اختلاف رکھتی ہے۔ اسلام بنی نوع انسان میں عقیدہ کی بنا پر امتیاز قائم کرتا ہے، اور ویدیں نسل و رنگ کی بنا پر۔ اسلام نے ہر کافر کے لئے اپنی برادری کے دروازے کھول رکھے ہیں، مگر ویدوں کے مذہبی آریہ نسل ہی نہیں بلکہ "ہند و آریہ" (INDO ARYAN) نسل کو اپنے اندر لیکر باقی سب کے لئے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو صرف حفاظت نفس اور دفع فساد کے لئے جنگ کی اجازت دیتا ہے، اور باقی تمام اغراض کے لئے خوں ریزی کو گناہ عظیم سمجھتا ہے، مگر ویدوں کا مذہب ملک گیری، حصول مال و زر، اور شہرت و ناموری کی دھاک بٹھانے سے زیادہ کسی بلند مقصد سے واقف نہیں ہے۔ اسلام دشمن کے ساتھ جنگ میں ہر قسم کے وحشیانہ سلوک کو ناجائز قرار دیتا ہے، مگر ویدیں اپنے اندر ان اعمال کی جانب خاص رغبت پنہاں رکھتی ہیں۔ اب عقل سلیم خود بہتر فیصلہ کر سکتی ہے کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے۔

گیتا کا فلسفۂ جنگ

ہندو مذہب میں گیتا کو جو عظمت حاصل ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ سری کرشن جیسے ممتاز مذہبی پیشوا کی طرف منسوب ہے۔ مسٹر تلک کے بقول وہ بھاگوت دھرم کا سب سے بڑا گرنتھ ہے۔ اس میں ہندو مذہب کے فلسفہ کو جس وضاحت اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کی مثال پورے سنسکرت لٹریچر میں نہیں ملتی گو اس میں ہندو تصوف کے بیشتر مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن اس کا اصل مرکزی نقطہ جنگ ہی ہے کیونکہ وہ ایک پست ہمت سپاہی کو جنگ پر ابھارنے اور اس کے خوں ریزی سے بیزار دل میں رزم آرائی کا شوق پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

تاریخ ہند کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ جب ہندوستان میں قدیم آریہ تہذیب پورے عروج پر تھی تو ہستناپور کے شاہی خاندان میں دولت و اقتدار کی خواہش نے پھوٹ ڈالدی۔ کورو اور پانڈو دو مقابل فریق بن گئے، اور دونوں کی تائید میں ہندوستان کے بڑے بڑے امرا و اعیان کھڑے ہوئے۔ اول اول سمجھوتے کی کوششیں کی گئیں مگر کامیابی نہ ہوئی، آخر دونوں نے تیغ و شمشیر کو حکم بنایا۔ وہ میدانِ جنگ کی عدالت میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے جمع ہوگئے۔ کرشن جی اس جنگ میں پانڈوؤں کے حامی تھے، پانڈوؤں کا سردار ارجن ان کا چیلا تھا، اور اس کی فوج کو کامیابی کی منزل تک پہونچانے کے لئے انھوں نے خود اس کے ساتھ رتھ کی باگیں اپنے ہاتھ میں لی تھیں۔ جب میدانِ کارزار میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں، اور ارجن نے اپنی آنکھوں سے اپنے دوستوں، عزیزوں اور بھائیوں کو آمادۂ قتال دیکھا تو اس کا دل ٹوٹنے لگا، اور اس نے محبت کے لطیف جذبات سے متاثر ہوکر ارادہ کیا کہ جنگ سے پھر جائے۔ اس پر کرشن جی نے اس کو ایک طویل اپدیش دیا، جو جنگ کے فلسفہ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر حاوی تھا یہی اپدیش بھاگوت گیتا ہے۔

ے میرے پیش نظر گیتا کی دو مستند حل متن شدہ میں ایک مسٹر [illegible] کی مشہور شرح ہے [illegible]
مسٹر شانتی نرائن لاہوری نے کیا ہے، دوسری مسٹر کے ٹی تیلنگ کی شرح جو سیکرڈ بکس آف دی ایسٹ (SACRED BOOK OF THE EAST) میں آکسفورڈ سے شایع ہوئی ہے۔ ۱۲ یہ پیش لفظ اصل انگریزی دیباچہ کا ترجمہ ہے، مصنف نے اس کے عرض تحریر میں آنے اور عام طور پر شایع ہونے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جب کوروؤں کے ساتھ جنگ

اس پدیش کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ جب ارجن کا دل اپنے عزیزوں کو دیکھ کر جنگ سے بیزار ہونے لگا تو اس نے غمزدہ ہو کر کرشن جی سے کہا:-

"اے کرشن! جنگ کرنے کی خواہش سے جو لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں، ان رشتہ داروں کو دیکھ کر میرے اعضا بے حس و حرکت ہوئے جا رہے ہیں، منہ خشک ہو رہا ہے جسم پر لرزہ چڑھ کر میرا رواں رواں کھڑا ہو گیا ہے، کمان میرے ہاتھ سے گری پڑتی ہے ..... ہے کیشو! مجھے تمام نمچن الٹے نظر آ رہے ہیں، اپنے عزیزوں کو مار کر مجھے کوئی بھلائی حاصل ہوتی نظر نہیں آتی، ہے کرشن! مجھے فتح کی خواہش نہیں، نہ راج چاہیئے اور نہ سکھ ہے گووند! راج بھوگ اور زندگی ہی سے ہمیں کیا لطف مل جائیگا جن کے لئے راج کی عیش و عشرت کے ساز و سامان کی، اور سکھ کی خواہش کیجاتی ہے وہی لوگ زندگی اور خوش حالی کی امید چھوڑ کر یہاں جنگ کے لئے کھڑے ہوئے ہیں ..... اگرچہ یہ ہمیں مارنے کے لئے کھڑے ہیں، مگر پھر بھی اے مدھوسودن! تین لوک کے راج کے لئے بھی میں انھیں مارنا پسند نہیں کرتا، پھر اس دنیا کی تو ہستی ہی کیا ہے ..... خود اپنے رشتہ دار کوروؤں کو مارنا ہمارے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہے، کیونکہ اے مادھو! اپنے عزیزوں کو مار کر ہم کس طرح سکھی ہو سکیں گے؟ ..... ہمیں وہ خرابیاں صاف نظر آ رہی ہیں، جو خاندان کی تباہی سے پیدا ہوتی ہیں، اس لئے کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے دل میں اس پاپ سے بچنے کا خیال نہ آئے؟ ..... خاندان کی تباہی سے تمام پرانے خاندانی دھرم تباہ ہو جاتے ہیں، اور خاندان کے ان دھرموں

بیچارے دھرتراشٹر نے بھی آنکھوں سے اپنے خاندان کی تباہی کا منظر دیکھنا پسند نہ کیا، تو ویاس جی نے ایک رتھبان کو جسکا نام سنجے تھا، اس کے پاس مقرر کر دیا، تاکہ وہ جنگ کی مفصل کیفیت من و عن بیان کرتا جائے، اس رپورٹر نے کیفیت جنگ کے سلسلہ میں اس گفتگو کا بھی پورا حال دھرت راشٹر کو سنا دیا، جو پانڈوؤں کے لشکر میں کرشن جی اور ارجن کے درمیان ہوئی تھی، اور وہ پدیش بھی نقل کر دیا جو ارجن کی ہمت افزائی کے لئے کرشن جی نے ارشاد فرمایا تھا، بعد میں یہی سنجے کی روایت مہابھارت کی پوتھی "بھیشم پرب" میں نقل کر دی گئی اور اس کا نام "بھاگوت گیتا" رکھا گیا (دیکھو تیلنگ کا مقدمہ بھاگوت گیتا صفحہ ۳ اور تلک کی شرح گیتا حصہ چہارم صفحہ اول)

کے مٹ جانے سے خاندان پر ادھرم کی دھاک جم جاتی ہے ..... ہے جناردن
ہم ایسا سنتے آئے ہیں کہ جن انسانوں کے خاندانی دھرم غائب ہو جاتے ہیں وہ یقینی
طور پر نرک ہو جاتے ہیں، دیکھو تو سہی ہم شاہانہ عیش کے لالچ سے اپنے عزیزوں
کو مارنے کھڑے ہوئے ہیں، یہ ہم نے بڑا پاپ کرم کرنے کی تیاری کی ہے، اس سے
تو میرے لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ اپنے ہتھیار پھینک دوں، انھیں کچھ روک ٹوک
نہ کروں، اور ہتھیار بند کورو مجھے میدان جنگ میں مار ڈالیں" (ادھیائے ۱، شلوک ۳۶-۴۶)
ارجن کے ان پاکیزہ اور لطیف خیالات کو سنکر کرشن جی نے تعجب کے ساتھ پوچھا:-
"اے ارجن! اس نازک موقع پر تیرے من میں یہ غلط خیال کہاں سے آگیا، جسکی
طرف اعلیٰ انسان نے کبھی توجہ نہیں کی، اور جو ذلیل حالت کو پہونچانے والا و
بدنامی کا باعث ہے؟ اے پارتھ! ایسا نامردانہ پن یہ تیری شان کے شایاں
نہیں، دل کی کمزوری کو چھوڑ اور کھڑا ہو جا" (۲: ۲-۳)
اس پر ارجن نے کہا:-
"ان مہاتما کوروؤں کو مارنے سے اس دنیا میں بھیک مانگ کر پیٹ بھرنا اچھا
ہے، کیونکہ اگر ان مال و دولت کے لوبھی بزرگوں کو میں نے مار لیا تو مجھے ان کے
خون سے رنگے ہوئے سامان عیش و عشرت کو اس دنیا میں استعمال کرنا پڑے گا ....
..... جنکو مار کر پھر ہمیں زندہ رہنے کی خواہش نہیں ہو سکتی، وہی کورو ہمارے سامنے
صف آرا ہیں" (۲: ۵-۶)
ارجن کی اس تقریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خانہ جنگی تھی جسمیں ایک خاندان کے
دو فریق حکومت و بادشاہی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ ارجن کے
ضمیر نے اس برادر کشی و حرص و جاہ کے خلاف ملامت کی، اور اس سرزنش سے متاثر ہو کر
وہ بہادر سپاہی جنگ سے متنفر ہونے لگا۔ مگر کرشن جی نے اس کے ان خیالات کی تردید کی اور
اس کے سامنے ایک جدید فلسفہ پیش کیا، جسے گیتا کے روحی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:-
"ارجن کا شوک نہیں کرنا چاہئے تو انھیں کا شوک کر رہا ہے، اور پھر گیان کی باتیں

ہی کچھ ۔۔۔ ہے ۔ جو نہ چاہے کسی کی جان جائے یا رہے ۔ گیانی اس کا کچھ افسوس نہیں کرتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس طرح جسم میں رہنے والے کو اسی جسم میں بچپن، جوانی، بڑھاپا حاصل ہوتا ہے، اسی طرح آئندہ دوسرا جسم بھی ملا کرتا ہے، اس لئے گیانی لوگ اس بارے میں کچھ موہ نہیں کرتے" (۲ : ۱۱-۱۳)

"جسم کی مالک آتما غیر فانی اور ناقابل ادراک ہے، اور اس کو حاصل ہونے والے اجسام فانی ہیں، اس لئے اے ارجن! تو جنگ کر، جو شخص سمجھتا ہے کہ آتما مارتی ہے یا آتما ماری جاتی ہے، اس کو سچا گیان حاصل نہیں ہے، کیونکہ یہ آتما نہ تو مارتی ہے نہ ماری جاتی ہے، یہ آتما نہ کبھی پیدا ہوتی ہے اور نہ مرتی ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ ایک مرتبہ ہونے کے بعد کبھی پھر نہ ہوتی ہو، یہ کبھی بوڑھی نہ ہونے والی، دائم مسلسل اور قدیم ہے، اس لئے جسم کے مارے جانے سے یہ نہیں ماری جاتی، ہے پارتھ! جس نے یہ جان لیا کہ یہ آتما غیر فانی، دائم، کبھی نہ بوڑھی ہونے والی، اور کبھی نہ مٹنے والی ہے وہ ایک انسان کو کیسے مار ڈالے گا یا مروا دیگا؟ جس طرح کوئی شخص پرانے کپڑوں کو اتار کر نئے کپڑے پہن لیتا ہے، اسی طرح جسم کی مالک آتما بھی پرانے جسم کو چھوڑ کر نیا جسم اختیار کر لیتی ہے، اس آتما کو ہتھیار نہیں کاٹ سکتے، آگ نہیں جلا سکتی، نہ اسے پانی تر کر سکتا ہے، اور نہ ہوا خشک کر سکتی ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے اس آتما کو اس طرح کا سمجھ کر اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں ہے" (۲ : ۱۸-۲۵)

"اگر تو یہ مانتا ہے کہ آتما دائمی نہیں ہے، جسم کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے، مرتی ہے، تب بھی، اے مہابا ہو! اس کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں، کیونکہ جو پیدا ہوا ہے اس کی موت یقینی ہے اور جو مرتا ہے، اس کا پیدا ہونا لابد ہے، اس لئے اس اٹل بات پر افسوس کرنا تیرے شایانِ شان نہیں ہے" (۲ : ۲۶-۲۷)

"سب کے جسموں میں رہنے والی جسم کی مالک آتما کو کبھی نہیں مار سکتا، اس لئے اے بھارت! کسی جاندار کے لئے افسوس کرنا تجھے مناسب نہیں" (۲ : ۳۰)

آگے چلکر کرشن جی نے ایک اور فلسفہ بیان کیا، جس کی تقریر خود ان کے الفاظ میں نقل

کی جاتی ہے :۔

"اگر تو سب پاپیوں سے بھی زیادہ پاپ کرنے والا ہو، تب بھی اس گیان کی کشتی سے ہی تو پاپوں کو پار کر جائیگا جس طرح روشن کی ہوئی آگ تمام ایندھن کو جلا کر خاک کر دیتی ہے، اسی طرح اے ارجن! یہ گیان روپ کی آگ بھی سب کاموں کی نیکی و بدی کی قیود کو جلا ڈالتی ہے" (۴: ۳۶ - ۳۷)

"اے دھنجے! اُس تم گیانی شخص کو کرم اپنی قیود میں نہیں بہن سکتے، جس نے کرم یوگ کے سہارے سے کرموں کی قیود کو ترک کر دیا ہے، اور جس کے سب شکوک و شبہات گیان سے دور ہو گئے ہیں، اس لئے تیرے دل میں اگیان (عدم عرفان) سے جو شبہہ پیدا ہو گیا ہے اسے تو گیان روپ کی تلوار سے کاٹ دے اور کرم یوگ کا سہارا لیکر جنگ کے لئے کھڑا ہو جا" (۴: ۴۱ - ۴۲)

"جو کرم یوگ میں لوگ گیا، جس کا دل پاک ہو گیا، جس نے اپنے من اور اپنے حواس پر قابو پا لیا، اور سب جانداروں کی آتما ہی جس کی آتما ہو گئی، وہ سب کام کرنے کے باوجود کرموں کے عذاب و ثواب سے غیر متاثر رہتا ہے" (۵: ۷)

"جو برہم کے ارپن کر کے اور کرم کے تعلق سے بالاتر ہو کر کام کرتا ہے، اس کو اسی طرح پاپ نہیں لگتا، جس طرح کمل کے پتے کو پانی نہیں لگتا" (۵: ۱۰)

گیتا کے فلسفہ پر نظر: کرشن جی کی اس تعلیم کا ماحصل صاف الفاظ میں یہ ہے :۔

(۱) چونکہ عقیدۂ تناسخ کی رو سے انسان ایک دفعہ مر کر پھر دوسرے جنم میں آجاتا ہے اس لئے قتل کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے، مرنے کے بعد وہ پھر جنم لے لیگا اور اس کی غیر فانی روح پر قتل کا کوئی اثر نہ ہوگا،

(۲) روح کے لئے جسم کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لئے کپڑوں کی ہے، لہٰذا کسی کے جسم و جان کا تعلق قطع کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی کے پرانے کپڑے پھاڑ دے، اس انقطاع کو موت سے تعبیر کرنا اور اس پر رنج کرنا جہالت ہے، اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرتا ہے، تو اسے [illegible]

بلکہ صرف روح پر سے جسم کا لبادہ اُتار دیتا ہے، اور یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے افسوس کی بات تو اس وقت ہوتی جب قتل سے روح پر بھی موت واقع ہوتی،

(۳) جو چیز حادث ہے، اس کا فنا ہو جانا یقینی ہے، پھر جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے، تو اسے مار ڈالنے میں کیا برائی ہے، ؟ جو اٹل بات ہے وہ تو ہو کر رہیگی، خواہ ہمارے ہاتھ سے ہو یا قدرت کے ہاتھ سے،

(۴) جس شخص کو گیان حاصل ہو، اس کے لئے نیکی اور بدی کی کوئی قید باقی نہیں رہتی، اور تمام اعمال مباح ہو جاتے ہیں، اعمال میں نیک و بد کا امتیاز صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو گیانی نہیں ہیں،

اس تعلیم کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے، کہ انسان کے دل میں انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہ رہے، جس کا جی چاہے اپنے دوسرے بھائی کے جسم کو پرانا کپڑا سمجھ کر پھاڑ دے، اور جب باز پرس ہو تو جسم کی فنا پذیری اور روح کی دائمی زندگی کا مسئلہ پیش کر کے قتل کی ذمہ داری سے بری ہو جائے، پھر جو شخص گیانی ہونے کا مدعی ہو، اس کے لئے تو قتل کیا معنی، کوئی جرم، جرم اور کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہتا، اور وہ آزادی کے ساتھ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرے بھی بے جرم و بے قصور رہ جاتا ہے،

ایک طرف گیتا نے اس قدر آزادی کے ساتھ جنگ کی تلقین کی ہے، اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے پورے ۱۸ ابواب میں ایک جگہ بھی اس نے یہ نہیں بتایا کہ جس خوں ریزی پر وہ اس طرح انسان کو تحریض کر رہی ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ اور کن اغراض کے لئے وہ بنی نوع انسان کا خون بہانا یا روح و اجساد کے تعلق کو قطع کرنا جائز سمجھتی ہے؟ جنگ کے مسئلہ میں مقصد جنگ کا سوال درحقیقت ایک بنیادی سوال ہے، کیونکہ اس خطرناک کام کو اگر کوئی چیز مقدس بنا سکتی ہے تو وہ صرف مقصد کی پاکی و طہارت ہی ہے، ورنہ ناجائز مقاصد کے لئے تو خواہ کتنی ہی شرافت کے ساتھ جنگ کیجائے، بہرحال وہ ناجائز ہوگی اور قانون اخلاق کی نظر میں درندگی و بہیمیت کے سوا کچھ نہ ہوگی، لیکن گیتا نے اس بنیادی سوال کو صاف نظر انداز کر دیا ہے، اور اس باب میں انسان کی رہنمائی کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کرشن جی

کے زمانہ میں عالم انسانی کا اخلاقی شعور ترقی کے اس درجہ تک نہیں ہو پہنچا تھا جہاں قتال کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ صرف ضرورت و عدم ضرورت پر نہیں ہوتا بلکہ مقصد کے صلاح و فساد پر منحصر ہوتا ہے،

تاہم بعض اشلوکوں کے انداز بیان سے اتنا ضرور معلوم ہو سکتا ہے کہ مقصد جنگ کے بارے میں گیتا کا نقطۂ نظر کیا ہے، ایک جگہ کرشن جی فرماتے ہیں:۔

"اے ارجن! یہ جنگ ایک سورگ کا دروازہ ہے جو تیرے لئے خود بخود کھل گیا ہے، ایسا موقع خوش قسمت کشتریوں ہی کو ملا کرتا ہے، لہذا اگر تو اپنے دھرم کی پیروی میں یہ جنگ نہ کریگا تو اپنے دھرم اور شہرت کو برباد کر کے پاپ جمع کریگا، بلکہ سب لوگ تیری کبھی نہ ختم ہونے والی مذمت کے گیت گاتے رہیں گے، یہ مذمت و بدنامی انسان کے لئے موت سے بدتر ہے۔" (۲: ۳۲-۳۴)

دوسرے مواقع پر انھوں نے اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"سب مہارتھی یہ سمجھیں گے کہ تو خوفزدہ ہو کر میدان جنگ سے بھاگ گیا ہے، جن کی نظروں میں آج تو نہایت تعظیم کے قابل بنا ہوا ہے، وہ تجھے ناقابل سمجھنے لگیں گے، اسی طرح تیرے زور و طاقت کی مذمت کر کے تیرے بدخواہ اور دشمن ایسی ایسی بہت سی باتیں کہیں گے جو نہ کہی جانی چاہئیں، پھر اس سے بڑھ کر دکھ کی بات اور کیا ہوگی؟ اگر تو مر گیا تو سورگ کو جائیگا اور اگر فتحیاب ہوا تو دنیا کے راج کو بھوگیگا اس لئے جنگ کرنے کا مستقل ارادہ کر کے اٹھ۔" (۲: ۳۵-۳۷)

"علاوہ ازیں اگر تو اپنے دھرم کی طرف بھی دیکھے تو اس وقت تجھے ہٹنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ دھرم کی رو سے حق بجانب جنگ سے بڑھ کر اور کوئی بات کشتری کے لئے بھلائی کی نہیں ہو سکتی۔" (۲: ۳۱)

"میں لوگوں کا خاتمہ کرنے والا اور بڑھا ہوا کال ہوں، یہاں لوگوں کا ناش کرنے آیا ہوں، تو اگر نہ ہو تب بھی فوجوں کی صفوں میں یہ جتنے جنگ آزما کھڑے ہیں سب تباہ ہونے والے ہیں، اس لئے تو اٹھ، نیکنامی حاصل کر اور دشمنوں کو

مغلوب کرکے وسیع سلطنت کا لطف اٹھایا، میں نے انھیں پہلے ہی مار دیا ہے،
(۱۱ : ۳۲ - ۳۳)

یہ خیالات ان عام خیالات سے کچھ بھی مختلف نہیں ہیں جو جنگ کے موقع پر ہمیشہ سپاہیوں کو لڑنے کی ترغیب دینے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، نہ یہ مقاصدِ جنگ، ان مقاصد سے کچھ بلند ہیں، جن کے لئے اہل دنیا اپنے ابنائے نوع کا خون بہایا کرتے ہیں، وہی مال و زر کی خواہش، وہی شہرت و ناموری کا شوق، وہی حکومت و سلطنت کی طلب، وہی شکست کی ذلت و بدنامی کا خوف یہاں بھی جنگ کی تحریک کر رہا ہے، جو عام دنیا پرست لوگوں میں جنگ کا جوش اور قتل و غارتگری کی خواہش پیدا کرتا ہے، اس میں کوئی بلند پایہ تعلیم نہیں ہے، کوئی اعلیٰ اخلاقی ہدایت نہیں ہے، کوئی بہتر نصب العین نہیں ہے، اور حیوانی خواہشات و جذبات سے بلند تر کسی جذبہ و خواہش کی طرف انسان کی رہنمائی نہیں کی گئی ہے، اس کے مقابلہ میں اسلام نے اخلاقی اور قانونی حیثیت سے جنگ کے لئے جو واضح اور مکمل حدود مقرر کی ہیں، ان پر نظر ڈالنے کے بعد کسی صاحب عقل و خرد انسان کے لئے اس سوال کا فیصلہ کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ اس بارے میں اسلام نے انسان کی بہتر رہنمائی کی ہے یا گیتا نے؟

منو[۱] کے احکام جنگ، منو کی دھرم شاستر ہندوؤں کے مذہبی قوانین کا بہترین مجموعہ ہے، اور تقریباً ۱۴ سو برس سے اس کے احکام ہندو قوموں اور سلطنتوں میں معمول بہ ہیں اس کے مصنف کی شخصیت بڑی حد تک تاریکی میں ہے، اس کی تصنیف کا زمانہ بھی متعین نہیں ہے[۲] مگر یہ

---

[۱] میرے پیش نظر منو کے دو انگریزی ترجمے ہیں، ایک سر ولیم جونز کا ترجمہ جو ۱۷۹۴ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شائع ہوا تھا، اور دوسرا ڈاکٹر برنل کا ترجمہ مع شرح جسے پروفیسر ہاپکنس نے ایڈٹ کرکے ۱۸۹۲ء میں شائع کیا، ان میں سے اول الذکر ترجمہ گورنمنٹ کے حکم سے ہوا تھا، اور آج تک نہایت معتبر سمجھا جاتا ہے، [۲] سر ولیم جونز کا خیال ہے کہ اس کی تدوین ۱۲۵۰ء تا ۱۰۰۰ء قبل مسیح کے درمیان ہوئی ہے، پروفیسر مونیر ۵۰۰ء قبل مسیح کا اندازہ لگاتا ہے، جرمن مستشرق یوہانیگن کی رائے میں ۳۰۰ء قبل مسیح اسکی صحیح تاریخ ہے، شلیگل کی رائے ہے کہ ۱۲۰۰ء قبل مسیح کے قریب اسکی تصنیف ہوئی ہے، پروفیسر کروک کہتا ہے کہ وہ ۲۰۰ء عیسوی سے زیادہ پرانی نہیں ہے، مگر ڈاکٹر برنل کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ۱۷۰ء سے ۴۰۰ء تک کسی زمانہ میں مدون ہوئی ہے اور غالباً جالندھر کے خاندان کے کسی راجہ نے اس کو اپنی سلطنت کا دستور العمل بنانے کے لئے لکھوایا تھا،

حقیقت سکھ ہے کہ وہ آریہ قوم کے اس عہد کی تصنیف ہے جب اس قوم میں تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا، اور سلطنتوں کے شعبوں و احوال کی تنظیم کے لئے باقاعدہ مرتب کئے ہوئے دستور العمل کی ضرورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے منو کے علاوہ اور بھی بہت سی شاستروں اور سمرتیاں لکھی گئی ہیں، مگر ان سب پر منو کو ترجیح حاصل ہے، کیونکہ دوسری کتابیں یا تو منو کی خوشہ چین ہیں یا اس سے متقیض واقع ہونے کی صورت میں ہندو علماء نے ان کو رد کر دیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ "جو کچھ منو کہتا ہے وہی صحیح ہے"، اور "جو سمرتی منو کے خلاف ہے وہ معتبر نہیں ہے"۔ پس ہندو مذہب کے قوانین معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

چونکہ یہ مجموعہ ایک ایسے زمانہ میں مرتب ہوا ہے جبکہ ہندوستان میں آریہ قوم کی باقاعدہ سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں، اور تہذیب و تمدن کی ترقی نے اس کو اپنے معاملات کے اجرا میں ایک مخصوص ضابطہ کی پابندی کرنا سکھا دیا تھا، اس لئے ہمکو اس میں جنگ کے تمام ضروری پہلوؤں کے متعلق احکام و قوانین ملتے ہیں، اور ان سے اسلام کے قوانین کا مقابلہ کرکے اس مسئلہ میں دونوں مذہبوں کے طریقوں کا موازنہ کرنا زیادہ آسان ہے۔

جنگ کا مقصد۔ سب سے پہلا سوال مقصدِ جنگ کا ہے۔ منو نے اس پر کچھ زیادہ تفصیل کیساتھ بحث نہیں کی ہے، تاہم حسب ذیل تصریحات سے صاف معلوم ہوتا ہے، کہ وہ کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز رکھتا ہے:-

"روے زمین کے جو حکمراں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے (یا قتل کرنے) کی خواہش سے اپنی تمام قوت کے ساتھ جنگ کرتے ہیں، اور کبھی منہ نہیں موڑتے، وہ مرنے کے بعد سیدھے بہشت کی طرف جاتے ہیں" (۷ : ۸۹)

"جس راجہ کی فوجیں ہر وقت جنگ کے لئے طیار رہتی ہیں، اس سے تمام دنیا خوف زدہ و مرعوب رہتی ہے۔ پس ایسے راجہ کو اپنی مستعد فوج کے ساتھ تمام مخلوق کو اپنا تابع فرمان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے" (۷ : ۱۰۳)

"اس طرح فتح کی طیاری کرنے کے بعد اپنے تمام مخالفین کو یا تو صلح و رضا کے ساتھ اپنا تابع فرمان بنانا چاہیئے یا اگر وہ بخوشی اطاعت قبول نہ کریں تو

ے ذرایع اختیار کرنا چاہئیں یعنی رشوت، توڑ جوڑ اور سیاسی طاقت" (۷ : ۱۰۷)
یبانی کے ان چاروں ذرائع میں سے عقلمند لوگ سلطنت کی توسیع کے لئے
و یعنی دھوکے اور جنگی طاقت کو زیادہ پسند کرتے ہیں" (۸ : ۱۰۹)
س طرح جب راجہ دھرم کے مقرر کئے ہوئے تمام فرائض ادا کرلے تو اس کو
لاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، جو ابھی تک اس کے قبضہ میں نہ
ہوں، اور اپنے مقبوضہ ممالک کی خوب حفاظت کرنی چاہئے" (۹ : ۲۵۱)
دھرم کے مطابق عمل کرنے والے راجہ کا خاص فرض یہ ہے کہ وہ ممالک
کرے اور جنگ سے کبھی نہ ٹلے" (۱۰ : ۱۱۹)

شلوکوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد کے سوال میں منو کی پرواز فکر بھی کرشن جی
دنچی نہیں ہے سلطنت کی توسیع، ممالک کی فتح و تسخیر اور ہمسایہ قوموں اور حریف
نیچا دکھانے کی جہانگیرانہ خواہش سے بلند تر کسی اخلاقی نصب العین تک اس کی بھی سائی
عام دینداروں کی طرح وہ بھی حکومت و بادشاہی کو طاقتوروں کا منتہائے مقصود
ور نہیں ترغیب دیتا ہے، کہ وہ اپنی قوت کو ہر وقت اسی ملک گیری کے کام میں صرف
فرماں روائی کے استحقاق اور قوت کے مصرف کا یہ تصور ہرگز کسی اخلاقی بلند نظری
کا نتیجہ نہیں ہوسکتا، اخلاق کی نظر میں بادشاہوں کی حرص جہانگیری سے انسان کا
کی آزادی، اور ملکوں کا امن و سکون زیادہ قیمت رکھتا ہے، کسی کی حرص و ہوس کو
اخلاق کا مقتضی نہیں ہوسکتا، وہ تو بنی نوع انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کا خواہشمند
ہے جیسے ملک عمل کی اجازت صرف اسی صورت میں دے سکتا ہے جبکہ انسان
جانی اور اخلاقی زندگی کو حرص طاقتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانے کے لئے
کوئی دوسری صورت باقی نہ رہے، لیکن معلوم ہوتا ہے، کہ اس نظریہ تک منو کیا،
غی اور مفکرین کی رسائی نہیں ہوئی، اور جنھوں نے کچھ اونچے اڑنے کی کوشش کی وہ
ہے گذر کر ہندائی سرحد میں پہونچ گئے، جو انسان کی مجموعی صلاح و فلاح کے لئے
کی عملی اجازت سے کچھ کم نقصان رساں نہیں ہے، بلکہ عملاً دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے

یعنی قوموں اور ملکوں کی تباہی اور شریر و مفسد لوگوں کا غلبہ و تسلط

جنگ کے اخلاقی حدود قدیم زمانہ کے مذہبی جنگ کے عملی پہلو میں بہت کچھ ترقی کی ہے اور عمان جنگ کو ایک ضابطہ کے تحت لانے کے لئے ایسی حدود مقرر کی ہیں جو بڑی حد تک سابق کی مقرر کردہ حدود سے بھی جلتی ہیں ذیل میں ہم اس کے احکام لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں :-

"کوئی شخص جو جنگ میں شامل ہو اپنے دشمن کو چھپے ہوئے ہتھیار یا زہر میں بجھے ہوئے یا کانٹے دار تیر سے یا آگ میں گرمائے ہوئے برچھے سے قتل نہ کرے" (۹۰ : ۰)

"نہ گاڑی یا گھوڑے پر سوار ہونے والا پیدل کو قتل کرے نہ زنانے کو نہ اسکو جو ہاتھ جوڑ کر جان کی امان مانگے نہ اسکو جس کے بال کھل گئے ہوں نہ اس کو جو بیٹھا ہوا ہو اور نہ اس کو جو کہے کہ میں قیدی ہوں نہ اسکو جو سوتا ہو نہ اسکو جس کے پاس زرہ نہ ہو نہ اسکو جو ننگا ہو نہ اس کو جو نشہ میں ہو نہ اس کو جو تماشائی و شریک جنگ نہ ہو نہ اسکو جو کسی دوسرے سے گتھا ہوا ہو" (۹۲ : ۰)

"شریف آدمی کے فرض کو پورا رکھتے ہوئے وہ ایسے شخص کو قتل نہ کرے جس کا ہتھیار ٹوٹ گیا ہو یا جو غم زدہ ہو یا سخت مجروح ہو یا دہشت زدہ ہو یا ہوش باختہ ہو یا بیٹھ پھیر دے" (۹۳ : ۰)

"گاڑی گھوڑا ہاتھی چھاتی بکتر سوائے ان چیزوں کے جو اس وقت تک ہوئے ہوں خلعت ہوا تی عورتیں اور ہر قسم کی قیمتی اور بیش قیمت سوائے چاندی سونے کے اس شخص کی جو ملک میں لوٹ مار میں ان کو جیتے" (۹۶ : ۰)

"ان چیزوں میں جو قیمتی شے ہوں ان کے ایک حصہ کو ہوشیاری اور جرأت سے پیش کرے ..... اور جو چیزیں کہ فوج کی ہوں ان میں سے ہر ایک تمام فوج میں تقسیم کر دینا چاہئے" (۹۷ : ۰)

"جب وہ دشمن کا محاصرہ کرے تو خیمہ زن ہونے کے بعد وہ دشمن کے ملک کو تاراج کرے خانہ جنگی کے سامان سے جلا دے اور غلہ و چارہ پانی وغیرہ کو غارت کرتا رہے" (۹۸ : ۰)

"اس کے تالاب، کنویں، اور خندقیں سب کو برباد کر دینا چاہئے، وہ دن اور رات دشمن کو خوف زدہ اور پریشان کرتا رہے" (۷ : ۱۹۶)

"ملک کو فتح کرنے کے بعد وہ دیوتاؤں کی عبادت کرے[1] اور نیکوکار برہمنوں کی بھی، وہ لوگوں میں داد و دہش کرے اور ظلم و زیادتی سے بے خوفی کی عام منادی کر دے" (۷ : ۲۰۱)

"مگران لوگوں کے طرز عمل اور ارادوں کا حال اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد وہ اس ملک میں خود وہیں کے شاہی خاندان سے کسی فرد کو حکمراں بنا دے، اور اس کو باقاعدہ ہدایات دے[2]" (۷ : ۲۰۲)

[1] منوؔ شارح مکتوبہ نے دیوتاؤں سے مراد مفتوح ملک کے دیوتا لئے ہیں لیکن ساتھ ہی لفظ "برہمن" اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ حکم غیر آریہ قوموں کے لئے نہیں ہے۔ تیرہویں صدی میں کیا یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ منو نے آریوں کو غیر آریہ قوموں کے دیوتاؤں اور معبودوں کی پرستش کا حکم دیا ہوگا۔ یہ حکم بھی صرف آریہ قوموں کی (اور صحیح تر یہ ہے کہ ہندو آریہ قوموں کی) باہمی جنگ سے متعلق ہے کیونکہ اشلوک نمبر ۲۰۲ کوئی مستقل اشلوک نہیں ہے بلکہ نمبر ۲۰۱ سے نمبر ۲۰۳ تک ایک مسلسل جملہ کا جزو ہے۔ اس بیان کی تائید دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر ہاکنس لکھتا ہے:-

"یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ منو اور دشنو دونوں کہتے ہیں کہ جب ایک راجہ کسی بیرونی دشمن کو مغلوب کرے تو وہ خود اس ملک کے (نہ کہ اپنے ملک کے) ایک شاہزادہ کو وہاں کا راجہ بنا دے، اسے اپنے دشمن کے شاہی خاندان کو برباد نہ کرنا چاہئے، مگر یہ اس صورت میں جائز ہے جبکہ وہ شاہی خاندان نیچ ذات کا ہو۔" (Cambridge History of India. Vol. I. P. 290)

تاریخ ہند قدیم کا ایک دوسرا ماہر پروفیسر ہیوں (Hoen) جو ہندو تہذیب کا بڑا دلدادہ ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:-

"مختلف آریہ قبائل کے درمیان لڑائیاں، اور آریوں سے غیر آریہ وحوش (داس اور دسیو) کی جنگیں اکثر ہوتی رہتی تھیں، مگر چونکہ مقدم الذکر صورت میں (یعنی آریوں کی باہمی لڑائیوں میں) یہ ایک مقررہ قاعدہ تھا کہ جنگ محض توسیع مملکت کی غرض سے نہ ہونی چاہیے اور یہ کہ ایک مغلوب آریہ راجہ کو معزول نہ کیا جائے بلکہ غالب اسے اپنا باج گذار بنائے، اس لئے قبائلی نزاعات نے آریوں کے اجتماعی نظام کو درہم برہم نہ ہونے دیا۔" (History -

Ali Jaz Zuberi
23-3-50

"اور وہ ان کے قوانین کو جس شان و آن سے بیان کرتے ہیں سننے
قرار دے، اور (اسے راجہ) اور دوسرے امراء کو زر و جواہر کے عطایا سے ممنون
احسان بنائے (۷ : ۲۰۳)

ان احکام میں سے بعض ایسے بھی ہیں جنھیں معرکۂ کارزار میں ملحوظ رکھنا قطعاً ناممکن ہے، مثلاً یہ کہ سوتے پیدل کو قتل نہ کرے، دشمن کے بال کھل جائیں تو اس پر حملہ نہ کیا جائے، دشمن کے پاس زرہ نہ ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے، ننگے یا نہتے یا غمزدہ یا دہشت زدہ کو قتل نہ کیا جائے، دشمن کسی دوسرے شخص سے لڑنے میں مشغول ہو تو اس پر وار نہ کیا جائے۔ اس قسم کے احکام میں اصلاح کے جذبہ پر نمایشی خلاف غالب آگیا ہے، اس لئے ضروریاتِ جنگ اور اخلاقی حدود کا توازن برقرار نہیں رہا۔ ظاہر ہے کہ جب میدانِ جنگ میں گھمسان کی لڑائی ہوتی ہو تو سپاہی ان باتوں کا لحاظ نہیں کر سکتا، اور نہ لحاظ کرے تو لڑ نہیں سکتا۔ دوسری طرف بعض احکام میں منو نے ضروریاتِ جنگ پر اخلاقی ذمہ داری کے احساس کو قربان بھی کر دیا ہے، مثلاً یہ حکم کہ دشمن کے ملک میں پیشقدمی کرتے وقت تباہ کاری و غارتگری کا بازار گرم کر دیا جائے، اور خورد و نوش کے تمام وسائل کو برباد کر کے سارے ملک کو بھوکا مار دیا جائے، کسی طرح شریف تر اخلاقی حیات کے مناسب نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے منو کے یہ احکام بہت مہذب ہیں، اور یہ تربیت یافتہ اخلاقی شعور کا پتہ دیتے ہیں جو عداوت و تصادم کی حالت میں بھی محاربین کے انسانی فرائض کا احساس رکھتا ہے، اور اس بنا اخلاقی تمیز تک پہونچ چکا ہے، کہ انسان پر انسانی حیثیت سے اس کے دشمن کے بھی کچھ حقوق ہیں جنھیں ہر حال میں اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس معاملہ میں عموماً منو کے احکام اسلام سے قریب تر ہیں، اگرچہ وہ اتنے معتدل اور ترقی یافتہ نہیں ہیں۔

مفتوح قوموں کے ساتھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ منو کا قانون اس عہد میں مدون ہوا تھا جب غیر آریہ اقوام کی سیاسی قوت فنا ہو چکی تھی، اور ہندوستان میں ان کی ایک بھی حکومت باقی نہ رہی تھی جس سے آریوں کی جنگ ہوتی۔ اس لئے منو کی دھرم شاستر میں ہمسایہ قومیں کی تین فصلوں سے، جو آریہ اور غیر آریہ اقوام کی جنگ کے لئے مقرر کی گئی ہوں، اس زمانہ میں وہ تمام غیر آریہ قومیں جو ویدوں میں داس، دسیو، رکشس، اور اسی طرح کے نامور سے یاد کی گئی ہیں

[illegible] جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو چکی تھیں، یا مغلوب و مفتوح ہو کر ملک کی آبادی کا جزو بن چکی تھیں، اور مجموعی طور پر ان کا نام "شودر" رکھ دیا گیا تھا۔ پس منو سے ہمکو جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو قانون مفتوح غیر آریہ اقوام کو سوسائٹی میں کیا درجہ دیتا ہے، اور ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ جائز رکھتا ہے۔ اس کے لئے ہمیں شودروں کے متعلق منو کے احکام پر نظر ڈالنی چاہیے۔

(۱) منو شودروں کو فطرۃً ذلیل قرار دیتا ہے، اور اعمال کی بنا پر نہیں بلکہ پیدائش کی بنا پر ان کو سب سے ادنیٰ مخلوق سمجھتا ہے۔

"برہما نے اپنے منہ سے برہمن کو، ہاتھ سے کشتری کو، ران سے ویش کو اور پاؤں سے شودر کو پیدا کیا۔" (۱ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا پہلا حصہ تقدس کو ظاہر کرنے والا ہو، کشتری کا طاقت کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا ذلت کو۔" (۲ : ۳۱)

"برہمن کے نام کا دوسرا حصہ خوشحالی کو ظاہر کرے، کشتری کا تحفظ کو، ویش کا دولت کو اور شودر کا غلامی و خدمت گاری کو۔" (۲ : ۳۲)

"دویج ذاتیں صرف تین ہیں، برہمن، کشتری اور ویش، چوتھی شودر کی ذات کا صرف ایک جنم ہے۔" (۱۰ : ۴)

"ہاتھی، گھوڑے، شودر، قابل نفرت بھٹ لوگ، شیر، تیندوے، اور سور (تناسخ کے) ادنیٰ مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں۔" (۱۲ : ۴۳)

(۲) منو شودروں کو بالذات نجس و ناپاک اور کمینہ سمجھتا ہے اور معاشرت میں دویج یعنی آریہ قوموں کو ان سے کامل پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

"شودر کی لڑکی کو اپنے پلنگ پر بٹھانے سے برہمن نرک میں جاتا ہے۔" (۳ : ۱۷)

"وہ کسی برادری سے خارج کئے ہوئے شخص، یا چنڈال[1]..... کے ساتھ ایک درخت کے سایہ میں بھی نہ ٹھہرے۔" (۴ : ۷۹)

---

[1] چنڈال وہ شخص ہے جو برہمن عورت کے بطن سے اور شودر مرد کے نطفہ سے پیدا ہو۔ وہ (چنڈال) سات ہے (منو ۱۰ : ۱۲)

"جو کوئی شودر کو دھرم کی تعلیم دیتا ہے وہ مذہبی رسم و رواج سکھاتے کے وقت شودر کیساتھ ہی اسم دت نامی جہنم میں جائیگا" (۴ : ۸۱)

"وید شودر کے سامنے وید نہ پڑھے" (۴ : ۹۹)

"وید شودر کا کھانا نہ کھائے" (۴ : ۲۱۱)

"شودر کا کھانا نورانی نور کو زائل کرتا ہے" (۴ : ۲۱۸)

"اگر برہمن بھولے سے شودر کا کھانا کھائے تو تین دن تک روزہ رکھے اور اگر عمداً کھائے تو اس کو وہی کفارہ ادا کرنا چاہیے جو حیض، بچہ یا پیشاب پینے اور کھانے والے کے لئے مقرر ہے" (۴ : ۲۲۲)

"جس شخص نے چنڈال کو چھو لیا ہو وہ صرف نہانے ہی سے پاک ہو سکتا ہے" (۵ : ۸۵)

"شودر کا جنازہ شہر کے جنوبی حصہ سے جائے اور دوجوں کے جنازے مغربی شمالی اور مشرقی سمتوں سے" (۵ : ۹۲)

"اگر کسی برہمن کی اپنی ذات کا آدمی موجود نہ ہو تو اس کی میت کو شودر کے ہاتھ سے نہ اٹھوانا چاہیے کیونکہ جو مرسم تجہیز ایک شودر کا ہاتھ لگنے سے آلودہ ہو جاتی ہے بہشت کی طرف نہیں جا سکتے" (۵ : ۱۰۴)

"شودر مرد سے ویش یا کشتری یا برہمن عورت کے ہاں جو اولاد پیدا ہو وہ مخلوط نسل کی ہوگی۔ ان کے مم علی ترتیب یوگ کشتر اور چنڈال ہیں اور یہ سب ذلیل مخلوق ہیں" (۱۰ : ۱۲)

لہ "اگر کوئی شخص [illegible] کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ یا لاکھ ڈالے جو [illegible] کی عبارت پڑھے تو اس کی زبان کاٹ لینی چاہیے [illegible] دوجوں کو [illegible] (گوتم ۱۲ : ۴-۶) "شودر کا بھوکا [illegible] نہیں ہے (بسشتھ ۱۸ : ۱۳) "اگر کوئی [illegible] آئندہ جنم میں وہ [illegible] (بسشتھ ۱۹ : ۵)

"چنڈال اور سوپاس لوگوں کی سکونت بستی کے باہر ہونی چاہئے، انھیں تابت برتن استعمال نہ کرنے چاہئیں، ان کی جائداد صرف کتے اور گدھے ہوں، ان کو مردوں کے کپڑے پہننے چاہئیں، ان کے کھانے کے برتن ٹوٹے ہوئے ہوں، ان کے زیور لوہے کے ہوں، وہ ہمیشہ خانہ بدوش پھرتے رہیں، جو شخص اپنے دینی و دنیوی فرائض کا پابند ہو وہ ان سے کوئی ربط ضبط نہ رکھے، ان کے تمام تعلقات آپس ہی میں ہوں، اور برابر والوں ہی میں وہ شادی بیاہ کریں، ان کو کھانا ٹھیکروں میں دیا جائے، اگر دینے والا اپنے ہاتھ سے ان کے ہاتھ میں نہ دے، راتوں کو وہ بستیوں میں نہ پھریں، دن کو کام کاج کے لئے آئیں، تو راجہ کے مقرر کئے ہوئے مخصوص نشانات ان کے بدن پر لگے ہوئے ہوں، وہ لاوارث مردوں کو لیجانے کا کام کریں، جنلوگوں کو قانوناً سزائے موت دی گئی ہو انھیں چنڈال قتل کریں، اور وہی مقتول کے کپڑے بچھونا اور زیور لے لیں"۔ (۱۰: ۵۱، ۵۶)

"برہمن، شودر سے کبھی دان نہ لے، اگر وہ اس سے دان لیکر قربانی کریگا تو آئندہ جون میں چنڈال پیدا ہوگا"۔ (۱۱: ۲۴)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا پانی پی لے تو اسے تین دن رات تک کوش گھاس کے ابلے ہوئے پانی کے سوا کچھ نہ پینا چاہیے"۔ (۱۱: ۱۴۹)

"اگر کوئی برہمن شودر کا جھوٹا کھانا کھالے تو وہ سات دن تک آش جو کے سوا کچھ نہ کھائے پیے"۔ (۱۱: ۱۵۳)

(۳) منو شودروں کو دویجوں کی غلامی پر مجبور کرتا ہے، اس کے نزدیک شودر کا پیدائشی اور فطری وظیفہ ہی یہ ہے کہ وہ دویجوں کی خدمت کرے،

"قادر مطلق نے شودر کے لئے صرف ایک فرض رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بے چون وچرا ان تینوں (برہمن، کشتری، اور ویش) کی خدمت کرتا رہے"۔ (۱: ۹۱)

"برہمن کی خدمت میں لگا رہنا شودر کا سب سے بہتر کام ہے، اس کے سوا جو کام وہ کریگا وہ اسے کچھ فائدہ نہ دیگا"۔ (۱۰: ۱۲۳)

"ناحیہ ہر شودر ذات کے آدمی کو دیوجوں کی خدمت کا حکم دے (۸ : ۴۱۰)

"شودر ذات کا ہر آدمی خواہ خریدہ ہو یا ناخریدہ، اسے برہمن اپنی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے، کیونکہ اس کو وجب الوجود نے برہمن کی غلامی ہی کے لئے پیدا کیا ہے" (۸ : ۴۱۳)

"شودر کو گو اس کا آقا آزاد کر دے تب بھی وہ آزاد نہیں ہو سکتا کیونکہ جو حالت اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اس سے کون اس کو نکال سکتا ہے؟" (۸ : ۴۱۴)

(۴) منو شودر کو اس کی اپنی کمائی ہوئی دولت و جائداد پر بھی حقوقِ ملکیت دینے سے انکار کرتا ہے،

"ایک برہمن بلا تامل اپنے شودر غلام کا مال لے سکتا ہے، کیونکہ کوئی مال بھی شودر کی ذاتی ملک نہیں ہے، وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی جائداد اس کا آقا لے سکتا ہے" (۸ : ۴۱۷)

"شودر اگر مال و دولت حاصل کرنے کی قوت رکھتا ہو تب بھی اسے حاصل نہ کرنا چاہیے، کیونکہ جو غلام دولت جمع کر لیتا ہے وہ برہمن کو اذیت دیتا ہے" (۱۰ : ۱۲۵)

(۵) قانون وراثت میں بھی منو نے دیوجوں اور شودروں کے درمیان امتیاز رکھا ہے جس حالت میں وہ شودر کو حقِ میراث سے بالکل محروم کرتا ہے وہ بعض حالات میں دیوجوں سے کمتر درجہ دیتا ہے

"اگر برہمن کی چار بیویاں چار ذاتوں کی ہوں اور چاروں سے اس کے بیٹے پیدا ہوں تو ان کے درمیان تقسیم اس طرح ہوگی کہ شخصی زیور، ماں کے گھوڑے، گاڑیاں، زیورات اور مکان برہمنی کے لڑکے کو ملیں گے، اور ان چیزوں کو الگ کرنے کے بعد جو مال بچے گا اس میں بھی اس کی اسی ذات کے لڑکے کو دوسروں سے اس کا حصہ خاص طور پر زیادہ ہوگا"

"برہمن لڑکا تین حصے میں سے تین سہام لے، کشتری عورت کا لڑکا دو سہام، ویش عورت کا لڑکا ڈیڑھ سہام اور شودر عورت کا لڑکا ایک سہم"

"یا پھر ایک عالم قانون داں آدمی مجموعی طور پر تمام جائداد کو دس حصوں میں تقسیم کرکے اسطرح بانٹے۔ برہمنی کے لڑکے کو چار حصے، چھترانی کے لڑکے کو ۳ حصے، ویشی کے لڑکے کو ۲ حصے اور شودرانی کے لڑکے کو ایک حصہ"

"اس برہمن کے ہاں خواہ پہلی تین ذاتوں کی بیویوں سے بیٹے ہوں یا نہ ہوں، ہر صورت شودرانی کے لڑکے کو ۱/۱۰ سے زیادہ نہ ملے گا"

"شودر عورت کے پیٹ سے برہمن، کشتری یا ویش مرد کا لڑکا باپ کے ترکہ میں سے کوئی حصہ نہ پا سکے گا۔ اس کا باپ جو کچھ اسے دیدے وہی اس کی ملک ہے"

"دویج ذات کے مردوں کی جو اولاد خود اپنی ذات کی عورت سے پیدا ہوئی ہو وہ باہم ترکہ کی مساویانہ تقسیم کرے" (۹ : ۱۴۹-۱۵۶)

(۶) فوجداری قوانین میں منو نے شودروں کے ساتھ انتہائی سختی برتی ہے، وہ ان کی جان و عزت کو قانون کی پناہ دینے میں حد درجہ بخل سے کام لیتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں دویجوں کے حقوق کی تعیین اور تحفظ میں اتنی فیاضی برتتا ہے، کہ شودروں کی آئینی حیثیت بالکل صفر کے برابر ہو جاتی ہے،

"ایک شودر اگر دویج کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی زبان کاٹ دی جائے کیونکہ وہ برہما کے حصۂ اسفل سے پیدا ہوا ہے" (۸ : ۲۷۰)

"اگر وہ ان کا نام اور ان کی ذات کا نام لیکر توہین کرے تو دس انگل لمبی لوہے کی سلاخ آگ میں سرخ کرکے اس کے حلق میں اتار دی جائے" (۸ : ۲۷۱)

"اگر وہ غرور کی راہ سے برہمن کو اس کے فرائض کے متعلق ہدایت دے تو راجہ

لہ اس اشلوک کا مضمون اوپر کے اشلوک سے صریحاً متناقض ہے، اس تناقض کو منو کے شارحین (کلوکا اور میدھاتتھی) نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ شودرانی کے لڑکے کو حصہ ملنے کا انحصار اس امر پر ہے، اگر وہ نیکوکار ہو اور اس کی ماں باپ اس کے نکاح میں آئی ہو تو اسے حصہ مل سکتا ہے،

اس کے منہ اور کان میں جلتا ہوا تیل ڈالنے کا حکم دے" (۸ : ۲۷۲)

"جو ادنیٰ ترین ذات کا آدمی (شودر) اعلیٰ ذات کے آدمی (برہمن) کے برابر بیٹھنے کی جگہ بیٹھ جائے اس کے پچھلے حصہ پر نشان لگا کر راجہ یا تو اس کو ملک بدر کر دے یا اس کے سرین کٹوا دے" (۸ : ۲۸۱)

"اگر وہ برہمن پر غرور سے تھوک دے تو راجہ اس کے دونوں ہونٹ کٹوا دے اگر وہ اس پر پیشاب کرے تو اس کی شرمگاہ کو قطع کرا دے اگر وہ برہمن کی طرف گوز صادر کرے تو اس کی جانے مخصوص کو کٹوا ڈالے" (۸ : ۲۸۲)

"اگر وہ برہمن کے سر کے بال یا اس کے پاؤں یا اس کی ڈاڑھی یا اس کا گلا یا اس کے بیضے پکڑے تو راجہ بلا تامل اس کے ہاتھ کٹوا دے" (۸ : ۲۸۳)

"اگر ایک شودر کسی دوج عورت سے زنا کرے تو اس عورت کے غیر محصنہ ہونے کی صورت میں اس کا وہ عضو کاٹا جائیگا جس سے اس نے ارتکاب جرم کیا ہو اور اس کی تمام جائداد ضبط کیجائیگی اور اگر وہ عورت محصنہ ہو تو وہ اپنی ہر چیز حتیٰ کہ جان سے بھی محروم کر دیا جائیگا"

"برہمن عورت سے زنا کرنے کا جرم اگر ویش سے سرزد ہو تو اسے ایک سال قید اور کل جائداد کی ضبطی کی سزا دیجائیگی اگر کشتری یہ فعل کرے تو اس پر ایک ہزار پن جرمانہ کیا جائیگا یا گدھے کے پیشاب سے اس کی ڈاڑھی موچھ منڈوائی جائیگی اور اگر وہ برہمن عورت غیر محصنہ ہو تو ویش کو ۵۰۰ اور کشتری کو ۱۰۰۰ پن جرمانہ دینا ہوگا اگر ایک برہمن مرد کسی محصنہ عورت سے زنا بالجبر کرے تو اس پر ۱۰۰۰ پن جرمانہ کیا جائیگا اور اگر اس کی مرضی سے کرے تو صرف ۵۰۰ پن" (۸ : ۳۷۴ - ۳۷۸)

"راجہ کسی برہمن کو ہرگز قتل کرنے خواہ وہ کیسی ہی شدید جنایت کا مرتکب ہوا ہو، وہ برہمن مجرم کو اس کی ذات و جائداد سے دنیوی تعرض کئے بغیر صحت جلاوطن کر سکتا ہے دنیا میں برہمن کے قتل سے زیادہ عظیم گناہ اور کوئی نہیں ہے اس سے بادشاہ اپنے دل میں

کا بیان بھی نہ دیا گیا ۔ ۹ : ۳۹ - ۳۸ ۔

"نیچ ذات کا آدمی اگر ارادۃً برہمن کو دکھ پہونچائے تو راجہ اس کو مختلف قسم کی عبرتناک جسمانی سزا دے ۔" (۹ : ۲۴۸)

"ایک کشتری کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے چوتھائی ہے جو برہمن کو قتل کرنے والے کے لیے مقرر ہے ۔ ویش کو قتل کرنے کا کفارہ اس کا آٹھواں حصہ ہے اور شودر اگر نیکو کار ہو تو اس کو قتل کرنے کا کفارہ اس سے سولھواں حصہ ۔" (۱۱ : ۱۲۷)

"اگر برہمن کسی کشتری کو بلا ارادہ قتل کرے تو وہ اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لئے ایک سانڈ اور ایک ہزار گائیں دان دے یا تین سال تک نفس کشی ریاضتیں کرے ۔ اور اگر وہ بلا ارادہ کسی نیکوکار ویش کو قتل کرے تو ایک سال نفس کشی ریاضت کرے ، یا سو گائیں اور ایک سانڈ دان دے ، اور اگر شودر کو بلا ارادہ قتل کر دے تو یہی ریاضت چھ مہینہ تک کرے یا دس سپید گائیں اور ایک سانڈ برہمنوں کو دان دے ۔" (۱۱ : ۱۲۷ ، ۱۲۱)

"اگر برہمن کسی بلی یا نیولے یا چوہے ، یا مینڈک ، یا کتے ، یا چھپکلی یا الو یا کوے کو مار ڈالے تو اس کا وہی کفارہ ہے جو شودر کو مارنے پر مقرر کیا گیا ہے ۔" (۱۱ : ۱۳۲)

یہ احکام اپنی تفسیر و تشریح آپ کر رہے ہیں ، ہندو قانون مفتوح قوموں کو جس ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے ، اور سوسائٹی میں ان کو جو ادنی درجہ دیتا ہے اس کی کیفیت ان احکام سے صاف ظاہر ہو جاتی ہے ، اس کے مقابلہ میں اگر اسلام کے ماتحت غیر مسلم ذمیوں کے حقوق کو دیکھا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا ،

نسلی امتیاز ۔ موجودہ زمانہ کے بعض ہندو اہل قلم نے عہد جدید کے افکار سے متاثر ہو کر یہ دعوی کیا ہے کہ ہندو مذہب میں ذاتوں کی تقسیم پیدائش اور نسل پر نہیں بلکہ گن اور کرم پر ہے ، مگر افسوس ہے کہ ہماری تحقیق میں ان کا یہ دعوی ہندو قانون کے الفاظ اور اسپرٹ دونوں کے خلاف ہے ، ہم نے جہاں تک اس کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب ، اعمال اور خصائل کی

ے اپستمبہ دھرم شاستر سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل ، چوری ، اور ڈاکہ کے شدید جرائم کی پاداش میں برہمن کو صرف اتنی سزا دی جا سکتی ہے کہ اس کا منھ کالا کر دیا جائے ۔ ۲ : ۷ لیکن اگر شودر انھیں جرائم کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے موت کی سزا ہے (۲ : ۲۷ : ۲)

بنا پر فرقِ مراتب کے تخیل سے قطعاً نا آشنا ہے۔ اس میں ذاتوں کی تقسیم کرم پر نہیں بلکہ جنم پر مبنی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جن لوگوں کو داس اور ملیچھ کے خطاب دیئے گئے تھے، اور بعد میں جنھیں شودر قرار دیا گیا، ان کی یہ تذلیل اس بنا پر نہ تھی کہ وہ بد عمل تھے، بلکہ اس بنا پر تھی کہ وہ غیر آریہ نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اوپر قانونِ وراثت، قانونِ تعزیرات اور قوانینِ معاشرت کے جو احکام نقل کئے گئے ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈال لینے ہی سے یہ حقیقت روشن ہو جائیگی۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ نیکوکار شودر کو بھی وہ حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جو بدکار اور شدید جرائم کا ارتکاب کرنے والے برہمن کو حاصل ہیں۔ برہمن کا لڑکا اگر شودر رانی کے پیٹ سے پیدا ہو تو نیکوکار ہونے کے باوجود اس کو خود اپنے اس بھائی کے برابر حقوق نہیں دیئے جاتے جو اس کے باپ کی برہمن بیوی سے پیدا ہوا ہے۔ شودر مرد کی دادا گیر برہمن عورت کے پیٹ سے پیدا ہو تو محض یہ پیدائش ہی سکو چنڈال بنا دیتی ہے اور سکو وہ ذلیل زندگی بسر کرنی ہوگی جو منو نے چنڈالوں کے لئے مخصوص کر دی ہے۔ یہ کس لئے؟ کیا یہ کرم کا پھل ہے؟ کیا شودر کے ہاں پیدا ہونا بھی کوئی بدکرمی اور برہمن کے ہاں پیدا ہونا کوئی نیکوکاری ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ نیکی اور بدی کا نہیں، نسل اور قومیت کا امتیاز ہے، اور ہندو مذہب نے شرافت اور رذالت کو انسان کے ذاتی اعمال و خصائل سے نہیں بلکہ نطفہ اور بطن سے مخصوص رکھا ہے۔ اس باب میں خود منو نے بھی کافی تصریح سے کام لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"جو شخص شریف مرد اور کمینہ عورت سے پیدا ہو وہ اپنے اچھے اعمال سے شریف ہو سکتا ہے۔ مگر جو کمینہ مرد سے شریف عورت کے ہاں پیدا ہو وہ کمینہ ہی رہیگا"۔

(۱۰ : ۶۷)

"جس طرح اچھا درخت صرف اچھے بیج اور اچھی زمین ہی سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح جو شخص شریف مرد اور شریف عورت سے پیدا ہو وہی پورے درجہ کا درجہ حاصل کر سکتا ہے"۔ (۱۰ : ۶۹)

"خود برہمنے دیوجوں کے کرم کرنے والے شودر اور شودروں کے کرم کرنے والے

ودیج کا موازنہ کرکے فیصلہ کیا کہ "دونوں نہ مساوی ہیں اور نہ غیر مساوی" یعنی نہ وہ رتبہ میں مساوی ہیں نہ برے اعمال میں غیر مساوی[1]" (۱۰ : ۵۳)

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندو مذہب میں انسانی برادریوں کی تقسیم نسل پر نہیں بلکہ عمل پر مبنی ہے؟

نئے زمانہ کے ہندو محققین نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ شودر دراصل غیر آریہ دیسی باشندے نہیں تھے، بلکہ خود آریہ نسل کے ادنیٰ طبقات سے تعلق رکھتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ علمی تحقیق کی روشنی میں یہ دعویٰ بھی قابل قبول نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ شودروں میں آریہ نسل کے وہ لوگ بھی شامل کر دیے جاتے تھے، جو ورن آشرم کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے باعث برادری سے خارج کر دیے جاتے تھے[2] مگر اس سے انکار نہیں کیا سکتا، کہ شودروں کا طبقہ بالعموم ان اقوام پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں نکل جانے کے بجائے، آریہ فاتحین کی غلامی میں رہنے کو پسند کر لیا تھا، لسانی اور تاریخی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ شودر دراصل ایک قدیم ہندوستانی قبیلہ کا نام تھا جسے آریوں نے اگر دریائے اٹک کی وادی میں سب سے پہلے مغلوب کیا تھا، اس کے بعد جو ہندی قبائل آریوں کی حکومت کے تابع ہو جاتے، ان کو شودر کے نام سے موسوم کیا جاتا، اور جو قبائل برسر جنگ ہوتے ان کو دسیو اور ملچھ کہا جاتا تھا[3]، تیتریہ برہمن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "برہمن ایک جاتی ہے جو دیوتاؤں سے نکلی ہے، اور شودر ایک دوسری جاتی ہے، جو اسروں یا ارواح خبیثہ سے نکلی ہے[4]" یہ عبارت اس بات کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ شودر انھیں اسلاف کے اخلاف ہیں جنھیں ابتدائی زمانہ میں ارواح خبیثہ کہا گیا تھا،

---

[1] تبہ میں مساوی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی طور پر ودیج اور شودر کا درجہ سوسائٹی میں وہی رہیگا جو ان کے لئے مقرر ہے، البتہ شودر کا اچھا عمل ودیج کے برے عمل سے ضرور افضل ہوگا، یعنی عمل پر عمل کو فضیلت ہوگی، مگر عامل کو عامل پر فضیلت نہ ہوگی،

[2] Vedic Index of Names

[3] Wilson, Indian and subjects 1912 vol. II p. 265 386-391

[4] Muir, Sanskrit Texts, 14 & Caste. vol. I p. 11

تاریخ ہند قدیم کے نامور محققین کی رائے کے موید ہیں۔ ان کے مقولہ پر بحث میں سے
چند کے نتائج تحقیق یہاں نقل کرتے ہیں،

راگوزن لکھتا ہے:۔

"یہ تقسیم آریوں اور دسیوں کے درمیان ہوتی ہے۔ مقدم الذکر کو ہم خوب جانتے ہیں اور
موخر الذکر، سو طبعی مناسبت ہمکو اس نتیجہ کی طرف لیجاتی ہے کہ وہ دسیو باشندوں یعنی غیر آریہ
اقوام کے سوا اور کوئی نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو آریہ مہاجرین نے اس ملک میں پایا اور ایک
طویل دور جنگ و نزاع کے بعد کم و بیش ایک غیر مرغوب انقیاد کی حالت تک پہونچا دیا۔ اسمیں
کسی شک کی گنجایش نہیں ہے کہ یہیں سے ذاتوں کی تقسیم کا ابتدائی سررشتہ ہمارے ہاتھ
لگتا ہے، کیونکہ یہی مجموعی تقسیم اس تقسیم سے مشابہت تام رکھتی ہے جو موجودہ زمانہ میں ویجوں
اور شودروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں جات پات کے لئے آریوں کی زبان میں لفظ
"ورن" استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی "رنگ" کے ہیں۔ اور آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ گورے
فاتحین اور سیاہ رنگ دیسی باشندوں کے درمیان اسی رنگ کے فرق کو ویدک نظموں میں جگہ
جگہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر خود لفظ دسیو بھی ان معنوی تغیرات کے ساتھ جو اس پر گذرے ہیں، ہمارے
سامنے ایک واضح داستان بیان کرتا ہے۔ یہ ایک قدیم آریہ لفظ ہے جسے ایرانی لوگ اس کے
اصلی بے ضرر معنی (قوم اور گروہ) میں استعمال کرتے تھے۔ ..... ہندوستان
اس نے ایک معاندانہ رنگ اختیار کر لیا، وہ دشمن کے معنی میں بولا جانے لگا۔ پھر اس معنی سے
ترقی کر کے ویدک دور کی سرزمین میں اس نے بآسانی بھوت پریت اور روح خبیثہ کا
مفہوم اختیار کر لیا، اور اس سے تاریکی اور قحط سالی کی قوتیں مراد لیجانے لگیں جنسے اندر ہمیشہ
برسرپیکار رہتا ہے، اور جنکو وہ مرد توں، گیروں اور دوسری روشنی کی قوتوں سے مغلوب کرتا ہے۔
یہ تحول جس قدر منطقی اور فطری ہے، اسی قدر وہ ویدوں کے فہم و تعبیر کی مشکلات میں اضافہ
کرتا ہے، کیونکہ جب اندر یا اگنی سے دسیوں کو نکالنے اور ہلاک کرنے کی درخواست کی جاتی ہے
یا جب بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دسیوں کی طاقت کو مٹا دیا تو اکثر اوقات یہ فیصلہ
کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس سے کون سے دشمن مراد ہیں، وہی جنس یا جنس دشمن

اس لفظ میں آخری تغیر معنی خیز ہے، وہ محض خادم اور غلام کے معنی میں بولا جانے لگا، اور ذرا سا لفظی تغیر کرکے اسے داس بنا دیا گیا، اس طرح وہ تکمیل فتح کی خبر دیتا ہے، اور زیادہ جدید لفظ شودر کے قریب جا پہونچتا ہے، پس اس ترتیب کے مطابق ہم یہ صحیح مساوات قایم کرسکتے ہیں:-

آریہ - دسیو، دویج شودر اگر اس امر کا کوئی مزید ثبوت کہ شودر جاتی کو فتح کے ذریعہ سے خادم طبقہ بنایا گیا تھا، درکار ہو تو وہ ہمکو منو کے مجموعۂ قوانین میں ملتا ہے، جسمیں دویج کے لئے ایک شودر کی بیعت ہر حال میں ممنوع قرار دی گئی ہے، خواہ وہ شودر راجہ ہی کیوں نہ ہو، اب ایک شودر راجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے ایک دسیی حکمراں مراد ہے،

اگرچہ آریہ اور دسیو یا داس کے الفاظ اور دویج اور شودر کے الفاظ کا مقابل اصطلاحیں ہونا ایک پوری طرح ثابت اور صریح واقعہ ہے تاہم یہ سمجھنا ایک غلطی ہے کہ دسیو اور شودر کسی خاص قوم کے نام ہیں، دراصل انکا اطلاق ان تمام قوموں پر ہوتا ہے جو آریہ نہیں ہیں، بالکل اسیطرح جیسے قدیم زمانہ میں وہ تمام لوگ "برابرہ" کہلاتے تھے، جو رومی یا یونانی نہ تھے"[1]

پروفیسر رمیسن لکھتا ہے:-

"رگ وید کے شعرا ان محدود معنوں میں جات پات سے واقف نہ تھے، جو اس لفظ نے بعد میں حاصل کرلئے، مگر وہ اتنا جانتے ہیں کہ آدمیوں کے مختلف طبقات ہیں، مذہبی طبقہ یا برہمن اشراف یعنی راجنیہ یا کشتری، زمین جوتنے والے یعنی وش یا ویشیہ اور خدمت پیشہ طبقات یعنی شودر، پہلے تین طبقات اور چوتھے طبقہ کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے، مقدم الذکر آریہ ہیں، اور موخر الذکر محکوم دسیو، ان کے درمیان فرق رنگ (ورن) کا ہے، آریہ مجموعی حیثیت سے گورے رنگ کے لوگ سمجھے جاتے ہیں اور دسیو کالے رنگ کے"[2]

ڈاکٹر بریڈیل کیتھ لکھتا ہے:-

آریوں اور داسوں میں بڑا اور اہم فرق رنگ کا ہے، آریہ ورن اور کالے رنگ کا امتیاز بلاشک وشبہہ ہندوستان کے ورن آشرم (Caste system) کے اہم ترین ماخذ میں سے

---

[1] Cambridge History of Vedic India, P. 282.85

[2] India Vol. I. P84

یک ہے، کالے چمڑے کو مغلوب کرنا۔ در اصل ویدک ہندو کے نہایت اہم اعمال میں سے ہے
..... اگرچہ رگ وید میں زیادہ تر داسوں کے خلاف جنگ و پیکار اور ان سے نئی
نئی زمینیں چھیننے کے لیے دریاؤں کے عبور کرنے کا تذکرہ آتا ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ آریوں
نے اصل باشندوں کو بالکل تہس نہس کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بے شک بہت سے قدیم باشندے
آریوں کے حملوں سے بھاگ کر شمال و جنوب کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گئے، مگر دوسرے
لوگ (جو باقی بچ رہے) غلام بنا لیے گئے۔"

پروفیسر ہاپکنس لکھتا ہے:-

"غلام شودر اور نیچے طبقے کے لوگ اجتماعی عمارت کے جز تسلیم کیے گئے ہیں۔ خود یہ نام
ہی بتاتا ہے کہ شودر اصل میں مفتوح قوم کے لوگ تھے، جس طرح ایتھنز میں لفظ "کارین"
(KARIAN) غلام کا مترادف ہو گیا تھا، اسی طرح شودر بھی غلام کا ہم معنی ہو گیا ہے۔ تاہم شودر
پاریاہ (انسانی جماعت سے خارج) نہیں تھے۔ بلکہ گھریلو زندگی میں شامل کر لیے گئے تھے۔ اور بعض
خانگی رسموں میں حصہ لیتے تھے۔"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"گوتم (۱۲: ۲) نے ایک آریہ عورت سے ایک شودر کے ناجائز تعلقات پیدا کرنے
کے متعلق جو قوانین بیان کیے ہیں ان کو جب ویسشٹھ دھرم شاستر (۲: ۲۶، ۲۰، ۲۷، ۹) سے
مقابلہ کر کے دیکھا جاتا ہے تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ آریہ نسل برتر اور سیاہ رنگ لوگوں
سے ممتاز ہے ..... مسٹر لیتھم نے اپنی کتاب "ہندوستان میں ذاتوں کی تقسیم
کی تاریخ" (ص ۹۰) میں یہ رائے ظاہر کرنے میں بے جا تاسی سے کام لیا ہے کہ آریوں اور
دراوڑوں کے درمیان کوئی نسلی امتیاز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جو لوگ جات
برادری سے خارج کر دیے جاتے وہ پھر آریہ نہیں کہلاتے تھے۔ مگر کوئی شودر بھی آریہ میں سمجھا
گیا۔ آریہ نے رگ وید کے زمانہ سے لیکر بعد تک ہمیشہ نسلی امتیاز ظاہر کیا ہے۔"

[illegible]

ان شہادتوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ہندو قانون میں جنلوگوں کو شودر قرار دیا گیا ہے، وہ دراصل غیر آریہ مفتوح اقوام ہیں، اور ان کے لئے جو قوانین ہندو دھرم شاستروں میں بیان کئے گئے ہیں، وہ ان قوموں کے ساتھ ہندو دھرم کے برتاؤ کو ظاہر کرتے ہیں جو مفتوح ومغلوب ہوکر اس کی حکومت کے تابع ہوجائیں،

یہودی مذہب

یہودی مذہب کے قوانین کی تلاش وتحقیق میں ہمکو وہ دقتیں نہیں پیش آتیں جو ہندو مذہب کے قوانین تلاش کرنے میں پیش آتی ہیں. جس طرح ایک قرآن کو لیکر اسلام کی حقیقت، اسکی تعلیم، اس کے اصول ومبادی، اور اس کے قوانین شریعت سب کچھ معلوم کرلئے جاسکتے ہیں، اسیطرح ایک کتاب توراۃ کو لیکر ہم یہودی مذہب کی تعلیم اور اس کے احکام وقوانین معلوم کرسکتے ہیں اور اس میں یہودیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھا جاسکتا ہے، اگرچہ متاخرین علمائے یہود نے شریعت موسویہ کے قوانین کو مرتب کرنے کے لئے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، جو جزئیات کی تفصیل پر حاوی ہیں. مثلاً عقیبہ بن یوسف کی مشناہ اور ہدراش جو دوسری صدی عیسوی کی تصنیفیں ہیں، اور تالمود جو مشناہ اور گیارا کو ملاکر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کی گئی، اور اسحاق الفاسی کی ہلاخوث جو گیارہویں صدی میں لکھی گئی ہے اور تالمودی قوانین کی بہترین شرح سمجھی جاتی ہے، اور موسیٰ میمونی کی مشنہ توراہ جو بارہویں صدی کے اواخر میں مرتب ہوئی اور یعقوب بن اشہر کی طور جو چودھویں صدی کی یادگار ہے، اور یوسف قارو کی شولخان ارخ جو سولھویں صدی میں لکھی گئی ہے، اور جسمیں یہودی احکام وعبادات کے سارے احکام روایات قدیمہ کے مطابق مرتب کئے گئے ہیں، لیکن ہمارے لئے ان کتابوں سے احتجاج چنداں مفید نہیں ہے، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جو یہودیوں کے تمام فرقوں میں متفق علیہ ہو، اور نہ کسی کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ اسے یہودی مذہب کی اساس وبنیاد قرار دیا جائے. یہی نہیں بلکہ بسا اوقات یہودیوں نے ان کتابوں سے بیزاری ظاہر کی ہے، اور توراۃ کے سوا سب کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے، چنانچہ جولائی ۱۹۰۰ء میں ربیوں

[illegible] خلاف علانیہ اظہار بغاوت کر دیا تھا، لہذا ہم ان سب کتابوں کو نظر انداز کر کے مسئلہ جنگ میں صرف توراۃ کی طرف رجوع کرتے ہیں،

مقصد جنگ، توراۃ میں نہایت کثرت سے لڑائیوں کا ذکر آیا ہے، اور جگہ جگہ جنگ کا حکم دیا گیا ہے، مگر سوائے اس ایک مقصد کے جو استثنا باب ۲۰ اور اعداد باب ۳۳ میں بیان کیا گیا ہے، اور کسی مقصد کا نشان ہمکو نہیں ملتا، یہ مقصد کتاب اعداد میں اس طرح بیان کیا گیا ہے

"اور خداوند نے مواب کے میدانوں میں یردن کے کنارے یریحو کے مقابل موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا، بنی اسرائیل کو خطاب کر اور انھیں کہ جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ دو"

[illegible] یہاں اس مرحلہ پر ضروری ہے کہ توراۃ کے متعلق جو کچھ ہمنے اس توراۃ کے متعلق ہیں ہوگا جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی، بلکہ اس توراۃ سے متعلق ہوگا جو [illegible] کے نام سے دنیا میں موجود ہے، ہماری تحقیق یہ ہے کہ عہد عتیق کی کتب خمسہ ([illegible]) اصلی توراۃ نہیں ہیں اور اصلی توراۃ نیست و نابود ہے، اس نظریہ کی تائید خود عہد عتیق سے ہوتی ہے، اس سے ہمکو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یشوع کی مدد سے توراۃ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا، [illegible] ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو برباد کیا تو وہ صندوق ان تمام کتابوں کے ساتھ مل گیا جو حضرت موسیٰ کے بعد تاریخ موسویہ کے بعد دین نے مرتب کی تھیں، اس تباہی کے ڈھائی سو برس بعد حضرت عزیر نے (بائبل کی روایت کے مطابق) بنی اسرائیل کے کاہنوں [illegible] کر تمام ممالک سے اس کتاب کو [illegible] جس جزو دان جب [illegible] نے اس کے نسخہ کو بھی اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہنے دیا، سنہ مسیحی کی ابتدائی صدیوں میں جب یونانی صورت میں [illegible] اور تراجم کو بھی سیر شرقی دنیا پر بھیل گئے، تو نسخہ ق م میں توراۃ کا تمام [illegible] یونانی [illegible] رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یونانی ترجمہ رائج ہو گیا، یہی آج توراۃ کے نام سے [illegible] اصلی توراۃ حضرت موسیٰ تک نہیں پہونچتی،

اور ان کے سب دیوتاؤں کو ڈھا دو۔ اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو اور وہاں آپ بسو، کیونکہ میں نے وہ سرزمین تمکو دی ہے کہ اس کے مالک بنو" (۳۳: ۵۰-۵۴)

اور کتاب استثنا میں ہے:-

"سو تم اٹھو، کوچ کرو، اور نہر ارنون کے پار جاؤ، دیکھو میں نے حسبون کے بادشاہ اموری سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تیرے ہاتھ میں دیا ہے، سو اس کی میراث لینا شروع کر اور جنگ میں اس کا مقابلہ کر" (۲: ۲۴)

"لیکن حسبون کے بادشاہ سیحون نے ہمکو اپنے ہاں سے گذرنے نہیں دیا کیونکہ خداوند تیرے خدا نے اس کا مزاج کڑا کر دیا، اور اس کے دل کو سخت تاکہ اسے تیرے ہاتھ میں دیوے جیسا آج ہے۔ پھر خداوند نے مجھے فرمایا، دیکھ میں نے سیحون کو اس کی سرزمین سمیت تجھے دینا شروع کیا، تو میراث لینا شروع کر، تاکہ اسکی زمین کا وارث ہو جائے، تب سیحون یہص میں ہمارے مقابلہ کے لئے نکلا، وہ اور اس کی ساری قوم تاکہ ہم سے لڑیں، سو خداوند ہمارے خدا نے اسے ہمارے حوالہ کر دیا اور ہم نے اسے اور اس کے بیٹوں کو اور اس کی سب قوم کو ہلاک کیا اور ہم نے اسی وقت اس کے سارے شہروں کو لے لیا اور مردوں اور عورتوں اور بچوں کو ہر ایک شہر میں حرم کیا (یعنی قتل کیا) اور کسی کو باقی نہ چھوڑا، سوا چارپایوں کے جنھیں ہم نے اپنے لئے غنیمت جان کر پکڑا اور اس مال کے جو ہم نے شہروں میں سے لوٹا" (۲: ۳۰-۳۵)

"تب ہم پھرے اور بسن کی راہ میں چڑھ گئے، اور بسن کا بادشاہ عوج اور اس کی ساری قوم ہمارے مقابلہ کے لئے نکلی، تاکہ ہم سے لڑے، اور خداوند نے اس وقت مجھے فرمایا، اس سے مت ڈر کہ میں اس کو اور اسکی ساری قوم کو اس کی سرزمین سمیت تیرے قبضہ میں کر دوں گا، تو اس سے وہی کر جو تو نے اموریوں کے بادشاہ سیحون سے جو حسبون میں رہتا تھا، کیا"

چنانچہ خداوند ہمارے خدا نے ہمارے بادشاہ عوج کو بھی اس کی ساری قوم سمیت ہمارے قابو میں کر دیا، اور ہم نے انھیں یہاں تک مارا کہ ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، اور ہم نے اسی وقت اس کے سب شہر لے لیے ..... اور ہم نے ان کو یعنی ان کے مردوں اور عورتوں اور لڑکوں کو ہر ایک شہر میں حسبون کے بادشاہ سیحون کی طرح حرم کیا، لیکن سارے مویشی اور شہروں کا مال اسباب کو ہم نے اپنے واسطے لوٹ لیا۔ (۳: ۱-۷)

ان عبارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی جنگ کا مقصد ملک گیری ہے۔ ایک ملک کے باشندوں کو تلوار کے زور سے مغلوب کرنا اور قوت کے حق کی بنا پر ان کے مو ملاک اور خود ان کی جانوں کو اپنے قبضہ میں لے لینا اس کی نگاہ میں جائز ہے اور اس کے نزدیک یہی قہر و تسلط اس وراثت ارضی کا مفہوم ہے جس کے عطا کرنے کا خدا نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید میں بھی "وراثت ارضی" کا ذکر موجود ہے، مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ:۔

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون (۲۱: ۱۰۵) زمین کے وارث تو میرے صالح بندے ہوں گے

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:۔

ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین (۷: ۱۲۸) زمین خدا کی ہے اور اس کا وارث وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بناتا ہے، اور اچھا کار کامیابی صرف پرہیزگاروں کا حصہ ہے۔

لیکن اس وراثت کا تخیل توراۃ کے تخیل سے بالکل مختلف ہے، توراۃ کی وراثت صرف بنی اسرائیل کو دی گئی ہے جیسا کہ عدد (۳۳: ۵۰) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی سے کسی ایک نسل یا قوم کا نہیں بلکہ صالحین کا حق قرار دیتا ہے، اور یہ حقیقت اس بات کے قانون کی تفسیر و تعبیر ہے، جسے تمام دنیا کے ارباب فکر تسلیم کر چکے ہیں کہ توراۃ میں وراثت ارض کا مفہوم یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے گھر بار، ملک [illegible] ملک بن جائے

مگر قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی قوم کو وراثت ارضی دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کے باعث ناکارہ ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے، تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو جو اس سے بہتر اور اصلح ہو اس کی جگہ کھڑا کر دیتا ہے، پھر توراۃ میں میراث زمین حاصل کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا، مگر قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا، کہ فلاں ملک تمہاری میراث ہے، اس لئے تم اسے لڑ کر فتح کر لو، پس توراۃ کی "وراثت ارضی" کھلی کھلی ملک گیری ہے، اور اسلام کے جہاد فی سبیل اللہ کے برعکس اس کی جنگ کا مقصد محض ملک و دولت کا حصول اور دوسری قوموں پر ایک خاص قوم کی برتری قائم کرنا ہے،

حدود جنگ جنگ کے حدود و ضوابط کے متعلق ہمکو توراۃ میں کچھ زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں، تاہم اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دین یہود اپنے پیروؤں کو دشمن کیساتھ کس قسم کا سلوک کرنے کی ہدایت کرتا ہے، اس کے لئے ذیل کے احکام قابل مطالعہ ہیں،

کتاب استثنا میں ہے:-

"اور جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے آ پہونچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور ہے، اور دروازہ تیرے لئے کھول دے، تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے تیری خراج گذار ہوگی، اور تیری خدمت کرے گی، اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے، بلکہ جنگ کرے تو تو اس کا محاصرہ کر اور جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضہ میں دیدے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر، مگر عورتوں اور لڑکوں اور مواشی کو اور جو کچھ اس شہر میں ہو اس کا سارا لوٹ اپنے لئے لے اور تو اپنے دشمن کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھے دی ہے کھائیو" (۲۰: ۱۰ - ۱۴)

"جب تم کسی شہر کو اس ارادہ سے کہ لڑائی کر کے اسے لو، مدت تک محاصرہ کئے رہو تو تبر چلا کر اس کے درختوں کو خراب مت کیجیو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ تو ان کا میوہ کھائے سو تو انھیں محاصرہ کے کام میں لانے کے لئے کاٹ نہ ڈالیو، کیونکہ میدان کے درخت آدمی کی زندگی ہیں،" (۲۰ - ۱۹)

"لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کرنے کو دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس رکھتی ہے جیتا نہ چھوڑیو، بلکہ تو ان کو حرم کیجیو۔" (۲۰ : ۱۷-۱۶)

"اور جبکہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالہ کرے تو انہیں ماریو اور حرم کیجیو نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو۔ تم ان کے مذبحوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ ڈالو اور ان کے گھنے باغوں کو کاٹ ڈالو اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دو۔" (۷ : ۲-۵)

"تم ان سب جگہوں کو جہاں ان قوموں نے جن کے تم وارث ہوگے اپنے معبودوں کی بندگی کی ہے، اونچے پہاڑوں پر اور ٹیلوں پر اور ہر ایک ہرے درخت کے نیچے نیست و نابود کر دیجیو۔ ان کے مذبحوں کو ڈھا دیجیو اور ان کے ستونوں کو توڑیو اور ان کے گھنے باغوں میں آگ لگائیو اور ان کے معبودوں کی گھدی ہوئی مورتوں کو چکنا چور کیجیو اور ان کے ناموں کو اس جگہ سے مٹا دیجیو۔" (۱۲ : ۲-۳)

کتاب خروج میں ہے :-

"آج کے دن جو حکم میں تجھے کرتا ہوں تو اسے یاد رکھیو کہ میں اموریوں و کنعانیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور حوتیوں اور یبوسیوں کو تیرے آگے سے نکالتا ہوں ہشیار رہیو تا نہ ہوئے کہ تو اس سرزمین کے باشندوں کے ساتھ جسمیں تو جاتا ہے کچھ عہد باندھ لیوے، ایسا نہ ہو کہ وہ عہد تیرے درمیان پھندا ہو بلکہ تم ان کی قربان گاہوں کو ڈھا دو اور ان کے بتوں کو توڑ دو اور ان کی سیرتوں کو کاٹ ڈالو۔" (۳۴ : ۱۳-۱۲)

کتاب اعداد میں ہے :-

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے بات کر اور ان سے لے اور تو بعد اس کے بنی قوم کے لوگوں سے مل جائیگا۔ تب موسیٰ نے لوگوں کو فرمایا کہ جنگی قوم میں سے لڑائی کے لیے تیار ہوں ..... سو ہزار چھ بنی اسرائیل میں ہر فرقہ کے ایک ایک ہزار حاضر ہوئے یہ سب جو لڑائی کے ہتھیار باندھتے ۲۰ ہزار ہوئے ..... اور انھوں نے مدیانیوں

سے لڑائی کی جیسے خداوند نے موسیٰ سے فرمایا تھا: اور سارے مردوں کو قتل کیا
..... اور بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور ان کے بچوں کو اسیر کیا
اور ان کے مواشی اور بھیڑ بکری اور مال و اسباب سب کچھ لوٹ لیا، اور ان کے سارے
شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے، اور ان کے سب قلعوں کو پھونک دیا، اور انھوں نے
ساری غنیمت اور سارے اسیر انسان اور حیوان لئے، اور وہ قیدی اور غنیمت اور
لوٹ، موسیٰ اور الیعزر کاہن اور بنی اسرائیل کے پاس خیمہ گاہ میں، مواب کے میدانوں
میں یردن کے کنارے جو یریحو کے مقابل ہے، لائے ..... اور موسیٰ
لشکر کے رئیسوں پر اور ان پر جو ہزاروں کے سردار تھے، اور ان پر جو سینکڑوں کے
سردار تھے، جو جنگ کر کے پھرے تھے، غصہ ہوا۔ اور ان کو کہا کہ کیا تم نے سب عورتوں
کو جیتا رکھا؟ ..... سو تم ان بچوں کو جتنے لڑکے ہیں سب کو قتل کرو، اور ہر ایک
عورت جو مرد کی صحبت سے واقف بھی جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی
صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لئے زندہ رکھو" (۳۱: ۱-۱۸)

کتاب یشوع میں ہے:-

"اور انھوں نے ان سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت، کیا جوان، کیا بوڑھا،
کیا بیل، کیا بھیڑ، کیا گدھا، سب کو یک لخت تہ تیغ کر کے حرم کیا .....
پھر انھوں نے اس شہر کو اس سب سمیت جو اس میں تھا پھونک دیا، مگر روپا اور سونا
اور پیتل اور لوہے کے ظروف خداوند کے خزانہ میں داخل کئے" (۶: ۲۱-۲۵)

"اور انھوں نے عی کے بادشاہ کو جیتا پکڑا اور اسے یشوع پاس لائے اور ایسا
ہوا کہ جب اسرائیل میدان میں اس بیابان کے درمیان جہاں ان کا پیچھا کیا عی
کے لوگوں کو قتل کر چکے اور جب وہ سب تہ تیغ ہو گئے یہاں تک کہ بالکل کھپ گئے،
تو سارے بنی اسرائیل عی کو پھرے اور اسے تلوار کی دھار سے مارا، چنانچہ وہ جو
اس دن مارے گئے مرد اور عورت ۱۲ ہزار تھے، یعنی عی کے سب لوگ، کیونکہ یشوع
نے اپنا ہاتھ جس سے بھالا تھا یا جب تک عی کے سارے رہنے والوں کو حرم

نہ کریا نہ کھیتی۔ سرائیں نے اس شہر کے مقدمہ موشی اور سباب کو اپنے لوٹ
خداوند کے حکم کے مطابق جو اس نے یشوع کو فرمایا تھا۔ (۱۰ : ۲۳ - ۲۸)

ان عبارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین یہود اپنے دشمنوں کو دو قسموں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جنھیں خداوند نے بنی اسرائیل کی میراث میں نہیں دیا ہے۔ اور دوسرے وہ جنھیں اس نے انکی میراث میں دیا ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اس کا معاملہ جدا جدا رنگ کا ہے۔

پہلی قسم کے دشمنوں کے لئے اس کا حکم یہ ہے کہ پہلے انھیں صلح کا پیغام دیا جائے۔ اور اگر وہ اسے قبول کرکے اپنا ملک بنی اسرائیل کے سپرد کردیں تو ان کو باج گذار اور خدمت گذار بنالیا جائے۔ لیکن اگر وہ صلح نہ کریں، تو ان کے ساتھ جنگ کیجائے اور فتح پانے کے بعد ان کے تمام مردوں کو قتل کردیا جائے عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے۔ اور مال اسباب پر قبضہ کرلیا جائے۔ دورانِ جنگ میں وہ باغوں اور کھیتوں اور میوہ دار درختوں کو خراب کرنے کی ممانعت کرتا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ ایک مفسدانہ فعل ہے، بلکہ اس لئے کہ انھیں اسی طرح خراب کردینے سے، فتح حاصل کرنے کی صورت میں فاتح کو کوئی فائدہ نہ پہونچ سکے گا۔

دوسری قسم کے دشمنوں کو وہ تمام انسانی حقوق اور رعایات سے محروم کردیتا ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ان قوموں سے کوئی صلح وسمجھوتہ نہ کیا جائے۔ ان کے خلاف بلا تامل جنگ چھیڑ دی جائے۔ اس میں ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کیا جائے۔ ان کی کھیتیاں، باغات، عمارتیں، درخت گائیں، سب تہس نہس کردی جائیں۔ ان کی عورتیں، مرد، بچے حتیٰ کہ جانور تک تیغ تہ کردیئے جائیں۔ اور روئے زمین سے ان کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ اس جنگ کا مقصد اس نے صرف یہ قرار دیا ہے کہ میراث میں دی ہوئی قومیں کلیۃً نیست و نابود کردی جائیں، کیونکہ وہ ان قوموں کے سامنے کوئی ایسی شرط پیش نہیں کرتا جسے پورا کرنے کے بعد ان کی جان بخشی ممکن ہو۔

اس تعلیم پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں۔ وہ اپنے اوپر آپ تبصرہ کررہی ہے۔

بودھ مذہب

یہاں تک ان مذاہب کا ذکر تھا جن سے اسلام کا اختلاف نفس جنگ کے جواز و عدم جواز میں نہیں بلکہ محض اس کی اعتقادی اور عملی نوعیت میں تھا، اب دوسری قسم ان مذاہب کی ہے جو سرے سے جنگ ہی کے مخالف ہیں اور اسلام سے اس بنا پر اختلاف رکھتے ہیں کہ وہ جہاد بالسیف کی اجازت ہی کیوں دیتا ہے؟ ان مذاہب میں تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پہلا نمبر بودھ مذہب کا ہے، اور ہمیں سب سے پہلے اسی کو تحقیق کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا ہے، کہ اس مسئلہ میں اس کی تعلیمات کس حد تک عقل اور فطرت کے مطابق ہیں،

بودھ مذہب کے ماخذ مسئلۂ زیر بحث میں بودھ مذہب کے طریقہ کی تحقیق کرنے سے قبل یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ آج ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے، کہ فی الواقع بودھ کی تعلیم کیا تھی؟ بودھ نے اپنی زندگی میں کوئی کتاب نہیں لکھی، اور اپنے قائم کردہ مذہب کے عقائد اور احکام کا کوئی ایسا مجموعہ بھی مرتب نہیں کرایا، جس سے اس کی تعلیمات خود اسکی زبان سے معلوم کیجا سکتی ہوں، تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کسی پیرو نے بھی اس کی زندگی میں یا اس کے بعد کسی قریبی زمانہ میں اس کی تعلیمات کو ضبط تحریر میں لانے کی کوشش نہیں کی، بعض روایات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد راج گریہہ میں ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی تھی، جسمیں اس کے ایک دو مخصوص مریدوں نے اس کی تعلیمات پر زبانی تبادلہ خیال کیا تھا، لیکن اول تو خود انھیں روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تبادلوں کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا، دوسرے تاریخی حیثیت سے یہ بھی پوری طرح ثابت نہیں ہوتا کہ آیا یہ کونسل فی الواقع منعقد ہوئی بھی تھی یا نہیں، مہاپرنیبان، سوتر، جو ہمارے پاس بودھ کی زندگی اور اس کے بعد کے حالات معلوم کرنے کا سب سے زیادہ مستند ذریعہ ہے، اس کونسل کے بارے میں بالکل خاموش ہے، اب رہیں موجودہ کتابیں جو اس

Buddhist Suttas. by Rhys Davids. [illegible]

مب کے متعلق ہماری معلومات کا تمام ذریعہ بدھ مت کی بہت بعد کی تصنیفیں ہیں۔ سکے
نقال پر ایک صدی گذر چکی تھی جب ویسالی میں اس مذہب کے اعیان و ائمہ کی ایک کونسل
نعقد ہوئی۔ اور بڑے مباحثہ کے بعد اس کے قوانین اور عقائد و احکام کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔
راس کے متعلق دیپ وسما کا مصنف ہمکو خبر دیتا ہے کہ اس میں بھکشوؤں نے اصل مذہب کے
صول بدل دیئے۔ اس کے عقائد اور احکام میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ کی اور اصل سوتروں کو بدل
رنئے سوتر بنالئے۔ اسی زمانہ سے بودھ مذہب کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ شروع ہوا
ر پہلی صدی عیسوی یعنی ۴۰۰ سو برس تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لیکن آخری زمانہ میں اس مذہب
پھر تحریف سے دوچار ہونا پڑا، یہاں تک کہ اس کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ ابتدائی بودھ مت
ں خدا کا کوئی وجود نہ تھا، مگر اب ایک غیر فانی ہستی کا وجود مان لیا گیا جو تمام کائنات سے برتر ہے
ر جس کا محض ایک مادی ظہور بودھ کی شکل میں ہوا ہے۔ ابتدائی بودھ مت میں جنت اور
زخ کا کوئی تصور نہ تھا، مگر اب اعمال حسنہ کا صلہ جنت اور افعال سیہ کا عوض دوزخ کو تسلیم
لیا گیا۔ ابتدائی بودھ مت میں زاہدانہ زندگی کے قواعد بے انتہا سخت تھے۔ مگر اب ان کو
ل کر ضروریات کے لحاظ سے نسبتہً نرم کر دیا گیا، بودھ مت میں یہ آخری تحریف کنشک کے
انہ میں ہوئی جو پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ماتحت
یر میں جو کونسل منعقد ہوئی تھی۔ اسمیں اسی تحریف و مسخ کے ساتھ بودھ مذہب کے
ین مرتب کئے گئے تھے۔ ان جدید قوانین کو ایک چھوٹے سے فرقہ نے رد کر دیا، مگر پیروان
دھ کے سواد اعظم نے جو اصلاح میں مہایان فرقہ کہلاتا ہے انھیں تسلیم کر لیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ صحیح معنوں میں جس چیز پر "مذہبی کتاب" کا اطلاق ہوتا ہے، وہ
دھ مذہب میں موجود نہیں ہے اور ہم کسی سند کی بنا پر وثوق کے ساتھ یہ معلوم نہیں کر سکتے
ودھ کی اصلی تعلیم کیا تھی۔ زیادہ سے زیادہ اعتماد ان کتابوں پر کیا جا سکتا ہے جو عہد گشتہ
آخری عمل تحریف سے بچ کر ہم تک پہونچی ہیں۔ اور وہ تین ہیں:۔

[illegible]

۱۔ ونای پتک جو زاہدانہ زندگی کے قوانین کا مجموعہ ہے اور ۳۵۰ ق م سے تقریباً ۱۵۰ ق م تک مختلف ایام میں مرتب ہوا ہے، مگر اس کے مصنف یا مصنفوں کا پتہ نہیں ملتا،

۲۔ سُت پتک میں حصولِ نجات کے طریقے یا بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق پر زیادہ تر بودھ کے اقوال جمع کئے گئے ہیں، اس مجموعہ کے مصنف اور زمانہ تصنیف کے متعلق بھی تاریخ میں کسی قسم کی معلومات محفوظ نہیں ہیں،

۳۔ ابھی دھم پتک جو زیادہ تر بودھ مت کے فلسفۂ اخلاق و مابعد الطبعیات پر مشتمل ہے، اس کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں، کہ یہ تیسری صدی قبل مسیح کے خاتمہ سے پہلے موجود تھی[1]،

آئندہ صفحات میں ہم بودھ کے متعلق جو کچھ کہیں گے وہ دراصل اس بودھ کے متعلق ہوگا جسے یہ کتابیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، نہ کہ اس بودھ کے متعلق جس کو ہم نہیں جانتے کہ وہ دراصل کس چیز کی تعلیم دیتا تھا،

انسانی تعلیم، بودھ مت ایک انسانی مذہب ہے، اس میں ہر ذی روح شے کو معصوم قرار دیا گیا ہے، اور انسان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے کیڑے تک ہر جاندار کی عصمت اس معنی میں تسلیم کی گئی ہے کہ اس پر کسی حال پر تجاوز نہیں کیا جا سکتا، بودھ کے احکام عشرہ میں سے پہلا تاکیدی حکم یہ ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو، جو بھکشو عمداً کسی جاندار شے کو اس کی زندگی سے محروم کرے وہ اس کے قانون میں ناقابلِ عفو جرم کا مرتکب ہے[2]، حد یہ ہے کہ وہ بھکشوؤں کو برسات کے تین مہینوں میں گوشۂ عزلت سے باہر نکلنے تک کی ممانعت کرتا ہے، تاکہ زمین پر چلنے سے حشرات الارض نہ کچلے جائیں[3]، ان شدید انسانی احکام کے ساتھ جنگ کی اجازت تو درکنار، اس کا تصور بھی ناممکن ہے، جب جان کا احترام اس کی نگاہ میں اس قدر بڑھا ہوا ہے تو لامحالہ اسے ایک ایسے عمل کو شدید نفرت کی نظر سے دیکھنا چاہئے، جس میں کیڑوں کی نہیں آدمیوں

---

[1] مزید تفصیل کے لئے سلسلۂ کتب مقدسۂ شرق کی گیارھویں جلد کے مقدمہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، جو پروفیسر رہس ڈیوڈز کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ Vinaya Texts by Rhys Davids. Vol [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہیں یہی وجہ ہے کہ بودھ نے ایک بھکشو کے لئے اس کی اجازت بھی نہیں دی ہے کہ وہ میدان جنگ میں تماشائی کی حیثیت سے جانگر خوں ریزی کا نظارہ کرے چنانچہ پکتیہ وغیرہ ۱۰۱ میں ہے:

"جو بھکشو بلا کسی وجہ معقول کے ایک ایسی فوج کو دیکھنے جائے جو جنگ کے لئے صف بستہ ہو تو وہ پکتیہ جرم کا مرتکب ہوگا۔"

اور وقعات ۹۴ و ۵۰ کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر اس بھکھو کے فوج کی طرف جانے کی کوئی معقول وجہ ہو تو وہ صرف دو یا تین راتوں تک وہاں ٹھہر سکتا ہے۔ اگر وہ اس سے زیادہ ٹھہرے تو یہ پکتیہ ہے۔"

"اور اگر وہ وہاں دو یا تین رات کے دوران قیام میں میدان جنگ کی صف آرائی یا افواج کی پسپائی یا قوت حرب کی صف بندی یا معرکہ کے موقع پر جائے تو یہ بھی پکتیہ جرم ہے۔"

بودھ کا فلسفہ ان احکام سے جنگ کے متعلق بودھ کا مذہب صاف معلوم ہوجاتا ہے لیکن اس مذہب کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے صرف ان مختصر احکام ہی کا جان لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس پورے فلسفہ کو سمجھنا ضروری ہے جس کا ایک جز [illegible]

[illegible]

[illegible]

کوشش ہی نہیں کی ہے کہ انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے، اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس لئے قدرتی طور پر وہ اس سوال سے بھی کوئی بحث نہیں کرتا کہ اس دنیا میں اس کے لئے زندگی بسر کرنے کا کون سا طریقہ بہتر ہے، جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی حقیقی فلاح کا موجب ہو اس نے اپنی پوری توجہ صرف اس سوال کے حل کرنے میں صرف کردی ہے کہ انسان کی زندگی میں تغیر و انقلاب کیوں ہوتا ہے؟ بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، پیدائش، موت، رنج، خوشی، راحت، مصیبت، اور اسی قسم کے مختلف تغیرات کی علت کیا ہے؟ اور اس چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ انسان کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کو صرف یہی ایک سوال قابل توجہ نظر آیا ہے، اور تمام دوسرے عملی و اعتقادی مسائل سے اس نے بالکل آنکھیں بند کرلی ہیں۔

اس بنیادی سوال پر کئی سال تک گیان دھیان کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے، جس میں انسان مبتلا ہوگیا ہے، اور پیدائش سے لیکر موت تک اس پر جتنے انقلابات گذرتے ہیں، وہ سب اسی مصیبت کے مظاہر ہیں، اس کے دنیا میں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے، وہ محض عبث اور بیکار پیدا ہوا ہے، یا اگر اس کا کوئی کام ہے تو وہ صرف مصیبت سہنا، اور تکلیف اٹھانا ہے، اس لئے یہ دنیا اس کے رہنے کی جگہ نہیں ہے، یہاں اس کو حقیقۃً کوئی راحت اور مسرت نہیں ہے، کیونکہ ہر راحت کے پیچھے ایک تکلیف، ہر مسرت کے پیچھے ایک رنج، ہر فائدہ کے پیچھے ایک نقصان، ہر شگفتگی کے پیچھے ایک پژمردگی، اور ہر پیدائش کے پیچھے ایک موت لگی ہوئی ہے، اور یہ سب کچھ تحول و انقلاب کے ایک دائمی عمل کے تابع ہے، جو خود ایک مصیبت ہے،

اس مصیبت میں انسان کیوں مبتلا ہے؟ اس کا جواب بودھ یہ دیتا ہے کہ خواہش، احساس اور شعور، اس کو زندگی کی مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، نفس کی انھیں قوتوں کے باعث دنیا سے انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے، اور وہی تعلق اسے بار بار دنیا میں لاتا ہے، وہ بار بار اس کو ایک جون سے دوسرے جون میں، ایک قالب سے دوسرے قالب میں، اور ایک زندگی سے دوسری زندگی میں لئے پھرتا ہے، اور جب تک خواہش کا یہ پھندا اس کی گردن سے نہیں نکلتا اس وقت تک وہ بار بار مرنے اور بار بار زندہ ہوکر کسی نہ کسی شکل میں پھر پیدا ہونے کے سلسلہ سے چھٹکارا نہیں پاسکتا،

پھر اس مصیبت اس زندگی کے چکر سے نجات حاصل کرنے کی کیا صورت ہے؟ اس سوال کو بودھ نے صرف ایک لفظ "نروان" سے حل کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ جب زندگی مصیبت ہے، اور خواہش اس مصیبت کی جڑ ہے، تو انسان کے لئے اصلی راحت صرف نیستی، فنا، اور عدم محض میں ہے، اور وہ خواہش احساس اور شعور کو بالکل مٹا دینے سے حاصل ہو سکتی ہے، انسان دنیا کے تمام علائق سے منقطع ہو جائے، کسی چیز کی محبت، کسی شے کی تمنا، کسی لذت کی چاشنی، غرض اس دنیا کی کسی چیز کی طرف اپنے دل میں انجذاب نہ رکھے، اور اپنے تمام جذبات، احساسات، اور خواہشات کو اس طرح فنا کر دے کہ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ و تعلق باقی ہی نہ رہے، جو سے یہاں دوبارہ آنے کا موجب ہو، اس طرح وہ "وجود" کی قید سے نکل کر "عدم یا فنائے محض" کی حالت میں چلا جائیگا یہی "نروان" ہے اور یہی بودھ کے نزدیک انسان کا منتہائے نظر ہے۔

اب چوتھا سوال یہ ہے کہ نروان تک پہونچنے کی صورت کیا ہے؟ یہاں پہونچ کر بودھ کا مذہب عملی شکل اختیار کرتا ہے اس نے نروان تک پہونچنے کے لئے طریق ہشت گانہ تجویز کیا ہے اور وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے:-

(۱) صحیح عقیدہ، یعنی چاروں بنیادی صداقتوں کو اچھی طرح سمجھنا،

(۲) صحیح ارادہ، یعنی ترکِ لذات کا مصمم فیصلہ اور دوسروں کو تکلیف پہونچانے اور ذی روح ہستیوں کو ایذا دینے سے کامل پرہیز،

(۳) صحیح گفتار، یعنی بدزبانی، یاوہ گوئی، غیبت اور جھوٹ سے احتراز،

نزدیک وہ نفس کی ایک حالت ہے جس میں وہ مصیبت اور خواہش سے پاک دنیوی زندگی سے بے نیاز اور اس کے سکون سے متمتع ہو، لیکن میکس میولر، ہارڈی، سان ہلیر اور رائز ڈیوڈس جیسے محققین اس مبہم تعریف پر قانع نہیں کرتے، بلکہ صاف تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد انسان کا معدوم ہو جانا یا ہستی کی نیست و نابود ہو جانا ہے، یہ چار مسائل یعنی مصیبت، سبب مصیبت، طریق رفع مصیبت اور بودھ مذہب کی صداقت میں حقائق اصلیہ اربعہ کہلاتے ہیں۔

Maya Bhatt

(۴) صحیح کرمانت، یعنی بدکاری، قتلِ نفس اور خیانت سے اجتناب،

(۵) صحیح معیشت، یعنی جائز طریقہ سے روزی حاصل کرنا،

(۶) صحیح کوشش، یعنی دھرم کے احکام کے مطابق عمل کرنا،

(۷) صحیح حافظہ، یعنی اپنے گذشتہ اعمال کو یاد رکھنا،

(۸) صحیح تخیل، یعنی راحت اور مسرت سے بے نیاز ہو کر عدم محض (نروان) کی طرف دھیان لگانا۔

اس طریق ہشت گانہ کو عملی شکل میں لانے کے لئے بودھ نے دس اخلاقی احکام دیئے ہیں جنمیں پانچ موکد ہیں اور پانچ غیر موکد۔ یہ احکام حسب ذیل ہیں[۵]:-

(۱) کسی کی جان نہ لو،

(۲) چوری نہ کرو،

(۳) زنا نہ کرو،

(۴) جھوٹ نہ بولو،

(۵) نشہ آور چیزیں نہ پیو،

(۶) مقررہ وقت کے سوا کھانا نہ کھاؤ،

(۷) کھیل تماشے اور گانے بجانے سے پرہیز کرو،

(۸) پھول، عطر وغیرہ سے پرہیز کرو،

(۹) اچھے اور نرم بستر پر سونے سے پرہیز کرو،

(۱۰) سونا چاندی اپنے پاس نہ رکھو،

یہی طریق ہشت گانہ اور احکام عشر بودھ مذہب کے پورے اخلاقی نظام کی بنیاد ہیں، بودھ نے اپنے پیروؤں کو معیشت و معاشرت کے متعلق جتنی ہدایات دی ہیں، ان سب کا بنیادی پتھر "نفس کشی اور ترکِ دنیا" ہے، چونکہ اس کی منزلِ مقصود "نروان" ہے، اور وہ بغیر نفس کشی کے حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ خودی کو مٹانے کے لئے نہایت سخت ریاضتیں تجویز کرتا ہے، مثلاً داڑھی، مونچھ اور سر کے بالوں کو نوچنا تاکہ غرورِ حسن خاک میں ملجائے، ہمیشہ کھڑے رہنا، کانٹوں

[۵] Vinaya Texts Part I. P. 211 & 213 Buddhism in Translations by Warren. P. 343 on.

یا بیوی کے بستر پر لیٹنا ہمیشہ ایک ہی پہلو پر سونا، دن کو سونا، اور کسی قسم کے دوسرے عمل جو جسم کو انتہائی تکلیف میں مبتلا کرتے ہوں یا مضمحل اور حساس کو باطل کر دیتے ہیں، ان کے علاوہ زندگی بسر کرنے کے عام طریقوں کے متعلق بھی بودھ نے ایسے ہی احکام دیئے ہیں، اس جگہ ان سب کی تفصیل دینا بہت مشکل ہے کیونکہ وہ کئی جلدوں پر محیط ہیں، تاہم مثال کے طور پر چند نقل کیے جاتے ہیں،

چار چیزیں جن سے پرہیز کی سخت تاکید ہے، یہ ہیں، (۱) عورت اور مرد کا فطری تعلق (۲) چوری حتی کہ گھاس کے ایک تنکے کی بھی (۳) کسی جاندار حتی کہ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کو بھی عمداً ہلاک کرنا، (۴) اپنی طرف کسی فوق العادہ کیفیت کو منسوب کرنا،

مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد انسان نئے کپڑے نہ پہنے، کوڑے پر پڑے ہوئے چیتھڑے یا قبرستان سے مردوں کے کفن لیکر ان کی گدڑیاں سی لینی چاہئیں اگر اس قسم کی گدڑیاں بھی ایک وقت میں تین سے زیادہ نہ ہوں،

بسر اوقات کے لئے کوئی پیشہ نہ کرے، ایک لکڑی کا چنبیل لیکر خاموشی کے ساتھ در بدر بھیک مانگتے پھرنا چاہیے،

ے بودھ کی قسموں کی بہت سی [illegible] جن کی تفصیل [illegible]

[illegible] میں لکھی ہے اس میں عام [illegible] کا کوئی امتیاز نہیں ہے، وہ ہی بات میں ایک دوسرا لکھا ہے کہ ایک بھکشو نے مذہبی زندگی اختیار کرنے کے بعد جب اپنی منکوحہ بیوی سے صحبت کا تعلق توڑنا چاہا تو بودھ نے اس فعل سے اس کو سختی کے ساتھ منع کر دیا (حصہ اول صفحہ ۲۰۰) [illegible]

[illegible] 36 ۔ 235 ۔ ۱۰ [illegible] ایک بودھ بھکشو کی روایت میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک عورت کی لڑکی مر گئی تو ایک طویل کے قبرستان میں سے دفن کر دیا، تو ایک نہ دھوبی نے اس کی قبر کھود کر اس کا کفن نکالا، تو یہ [illegible] یہ بھکشو اس کو دھویا اور اپنے ہاتھ سے اس کا ایک کرتا سی کر پہن لیا [illegible]

[illegible] ے خود بودھ اپنے زمانے کے [illegible] بھیک مانگا کرتا تھا اس سے وہ اپنے پیروؤں کو بھکشو اور خود اپنے آپ کو بھکشوؤں میں سب سے بڑا بھکشو کہتا ہے [illegible]

[illegible] Buddhist Legion P 101

رہنے کے لئے کوئی مکان نہ بنائے جنگل میں رہنا چاہئے اور درختوں کے سایہ میں پناہ لینی چاہئے،
بیمار ہو تو کوئی دوا استعمال نہ کرے بیماری کی تحلیل اس کے لئے کافی وسیلۂ علاج ہے[1]،
اپنے جسم کو صاف رکھنے کی کوشش بھی نہ کرے، حد سے حد پندرہ دن میں ایک مرتبہ نہانا جائز ہے[2]،
اپنے پاس روپیہ پیسہ بالکل نہ رکھے، تجارت میں لین دین، خرید و فروخت اور تمام ایسے کاموں سے پرہیز
کرنا چاہئے جنمیں چاندی سونا، استعمال کیا جاتا ہو[3]
اچھی قسم کا بستر بھی نہ رکھے، ایک موٹا جھوٹا کمبل رکھنا چاہئے اور اس ایک کمبل کو کم از کم چھ سال چلانا چاہئے[4]،
بودھ مذہب کی اصلی کمزوری یہ اس مرقع اخلاقی نظام کا خلاصہ ہے جسکا ایک جزو اہنسا کی تعلیم ہے، بلاشبہ اسمیں بعض
نہایت عمدہ اخلاقی ہدایت بھی موجود ہیں، اور نا انصافی ہوگی اگر ہم اس تقوی اور پاک سیرتی کی تعریف نہ کریں
جسکی تعریف بودھ نے دی ہے، اور جسکا ایک مکمل عملی نمونہ خود اس نے اپنی پر عظمت زندگی میں پیش کیا ہے لیکن فروع میں
اپنے اندر بہت سی خوبیاں رکھنے کے باوجود، اصول میں یہ پورا نظام اول سے لیکر آخر تک غلط ہے، اسکی بنیاد ایک غلط
عقیدہ پر ہے، حیات انسانی کے متعلق سکا نظریہ غلط ہے، اس نے ایک غلط مقام سے انسان اور اسکی زندگی پر نظر ڈالی
ہے، ایک غلط مقام کو انسان کی منزل مقصود قرار دیا ہے، اور ایک غلط راستہ اس تک پہونچنے کے لئے تجویز کیا ہے،
بودھ دراصل دنیا کے حوادث و تغیرات اور زندگی کے انقلاب و تحول کو دیکھکر مبہوت ہو گیا ہے، وہ انکی اصلی علت کو سمجھنے انکی
گہرائیوں تک پہونچ کر حقیقت کا پتہ لگانے، اور مردانگی کیساتھ انکا مقابلہ کرکے کسی بلند تر نصب العین کی طرف اقدام کرنے
کے بجائے، ان کا ایک سطحی مطالعہ کرتا ہے، اور ایک سرسری نظر ڈال کر اس نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے کہ انسان کی زندگی عبث ہے
یہ سارا کارخانۂ دنیا بے معنی ہے، اسمیں انقلاب اور گردش کا جو سلسلہ جاری ہے، وہ کسی سبب و علت اور مقصد و منشا کے بغیر صرف
انسان کو دکھ دینے اور ستانے کیلئے چل رہا ہے، انسان کو عقل، احساس، ادراک، شعور، جذبات، خواہشات اور جسمانی قوتیں
جو کچھ حاصل ہیں سب اسے مصیبت میں مبتلا کرنے کے لئے، اور ان کا کوئی اعلیٰ مصرف نہیں ہے، دنیا کی دولت و
ثروت، اسکی تہذیب، اس کا تمدن، اس کی سیاست، اس کی حکومت، اس کی صنعت و تجارت
غرض اس کے سارے کاروبار بے فائدہ ہیں، یہ سب تعلقات کے پھندے ہیں،

---

[1] Vinaya Texts, Part II. P. 44. [2] Vinaya Texts, Part I. PP. 74
[3] " Part I. PP. 36-37
[4] " Part I. PP. 24-25.

جو انسان کو بار زندگی کی تلخی سے بچاتے ہیں اور زندگی کے یک رنگی پر ہمیشہ رنگ بدلتے رہتے ہیں
اس دنیا میں بجز اس کے انسان کا اور کوئی کام نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات کے سوا تمام خارجی تعلقات
سے منقطع ہو جائے، اور اپنی ذات کو بھی ہر قسم کی لذتوں سے محروم کر کے، طرح طرح کی تکلیفوں
میں مبتلا کر کے، اس حد تک مٹا دے کہ وہ ہستی، اور وجود کی قید سے آزاد ہو کر نیستی، و عدم کی سرحد
میں پہنچ جائے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص دنیا کے مصائب سے خوف زدہ ہو کر خود دنیا ہی کو چھوڑ دیتا ہے
اس کے تمام تمدنی و اجتماعی علایق سے الگ ہو کر صرف اپنی نجات کی فکر میں لگ جاتا ہے، اور
اس نجات یا عدم کی منزل تک پہونچنے کے لئے بھی وہ راستہ اختیار کرتا ہے، جو دنیا کے اندر سے
نہیں بلکہ باہر ہی باہر گذر جاتا ہے، اس سے یہ ہرگز امید نہیں کیجا سکتی کہ وہ اپنے خاندان اپنی
قوم، اپنے وطن، اور اپنے بنائے نوع کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی شخصی جدوجہد کرے، اپنے دل
و دماغ کی قوتوں اور اپنے مادی و معنوی مسائل کو دولت عزمی کے ساتھ سوسائٹی کی ترقی و اصلاح
کے کام میں لگائیگا، ظلم و عدوان، فتنہ و فساد، طغیان و سرکشی، اور گمراہی و ضلالت سے جہاد و جنگ
کر کے دنیا میں عدل و انصاف، امن و امان اور حق و صداقت کا علم بلند کریگا، اور ان مشکلات کا
مردانہ مقابلہ کریگا جو قدرتی اسباب کے ماتحت ہر کام میں انسان کو پیش آتی ہیں، یہ جد و جہد یہ
عملی سرگرمی، یہ سرفروشی و جانبازی، یہ میدان جنگ کی مصیبتیں، یہ تیر و تفنگ کی جراحتیں، یہ
سیاست و فرمانروائی کی بوجھل ذمہ داریاں تو وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو اس دنیا کو جائے عمل
سمجھتا ہے، جس کے پیش نظر زندگی کا ایک بلند نصب العین اور عمدہ مقصد ہے جو اپنے آپ کو
ایک اہم خدمت پر مامور اور ایک بار ہستی کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے، اور جس کو یہ یقین ہے
کہ اس دنیا میں وہ جتنا زیادہ عمل کریگا، اتنا ہی زیادہ انجام مستقبل کی دائمی زندگی میں پائیگا، اور
جو غریب پہلے ہی اپنی جان سے بیزار ہو، اپنے عمل کے نتائج سے مایوس ہو، اپنے گرد و پیش
کی مشکلات سے شکستہ خاطر ہو، دنیا کے ہر حادثہ سے ڈر کر ہر مصیبت سے سہم کر ہر انقلاب
سے خوف کھا کر، عدم کی گود میں پناہ لے رہا ہو، اس بزدل، پست ہمت، بیچارہ عزم
انسان سے کب امید کیجا سکتی ہے، کہ وہ ذمہ داریوں کے اس بھاری بوجھ کو اٹھائیگا، اور

وہ خواہ مخواہ اپنی جان کو جہاد و قتال اور سیاست و فرماں روائی کی مصیبت میں مبتلا کریگا؟ اس نے تو پہلے ہی دنیا کے بکھیڑے کو چھوڑ کر موت اور دائمی موت کو اپنی زندگی کا منتہائے نظر بنا لیا ہے، پھر اسے کیا پڑی ہے کہ شمشیر بکف ہو کر میدان عمل میں نکلے، اور اس دنیا کے انتظام میں اپنا وقت ضائع کرے جس کی زندگی کو وہ بیکار، اور جس کے سارے کارخانہ کو بے معنی و بے نتیجہ سمجھتا ہے[1]؟

پس بودھ مذہب جو اہنسا کا قائل ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا اور اس کے معاملات کی ذمہ داریوں کو قبول کرتا ہے اور اس کے باوجود جنگ و خوں ریزی کو غیر ضروری سمجھتا ہے، بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دنیا اور اس کے معاملات سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس کو جنگ و پیکار سے بھی اجتناب ہے، اس نے اہنسا کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ ترک دنیا اور رہبانیت کی زندگی میں تلوار کا کوئی کام نہیں ہے، اور اس نصب العین تک پہونچنے میں اس سے کسی قسم کی مدد نہیں ملتی جو ایک بودھ سنیاسی کا منتہائے نظر ہے،

پیروان بودھ کی زندگی پر اہنسا کا اثر، بودھ مذہب کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں کوئی طاقتور تہذیب قائم نہ کر سکا، اس میں اتنی قوت کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ کسی تہذیب کو شکست دیکر اپنا اثر قائم کرے، جن جن ملکوں میں وہ پہونچا ان کی اخلاقی زندگی میں ایک منفی تغیر پیدا کرنے میں تو اسے ضرور کامیابی ہوئی، مگر ان کے طرز سیاست اور ان کے نظام تمدن کو بدل کر ایک بہتر نظام قائم کرنے میں نہ وہ کامیاب ہو سکا اور نہ اس کی اس نے کوشش کی، بلاشبہہ اس کو دنیا میں بہت اشاعت نصیب ہوئی، شرق اوسط اور شرق اقصیٰ میں اس کو جتنا عروج حاصل ہوا، کسی اور کو نہ ہو سکا، انسانی آبادی نے اس کو اتنی کثرت سے قبول کیا کہ آج بھی اس کے پیروؤں کی تعداد دنیا کے ہر مذہب سے بڑھی ہوئی ہے، لیکن تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ بودھ مذہب کے اثر سے کسی قوم کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب ہوا ہو، یا اس نے دنیا میں کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہو، بخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں اس کا مقابلہ کسی طاقتور تہذیب سے ہوا، اس کو سخت شکست اٹھانی پڑی، ہندوستان جو اس کی جنم بھومی ہے، ایک عرصہ تک اس کا حلقہ بگوش رہا،

---

[1] بودھ مذہب نے ترک دنیا کی جو تعلیم دی ہے اس پر یہاں تبصرہ نہیں کیا گیا، چونکہ آگے چل کر مسیحیت کے باب میں بھی یہی بحث آئیگی ہے، اس لئے یہاں اسے چھوڑ دیا گیا ہے،

پہلی صدی عیسوی میں تقریباً سارا ملک اس کا پیرو تھا تیسری صدی میں بھی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی بودھ مذہب رکھتی تھی، چوتھی صدی میں جب فاہیان ہندوستان آیا ہے تو اس وقت بھی یہاں اس مذہب کا بول بالا تھا، لیکن اس کے بعد جب برہمنی مذہب نے کروٹ بدلی تو اس کو تین صدی کے اندر اندر اس کے لئے میدان خالی کر دینا پڑا، اور اس ملک سے اس کا نام ایسا مٹ گیا کہ آج ۳۲ کروڑ کی آبادی میں مشکل سے تین لاکھ بودھ ملتے ہیں۔ اسی طرح افغانستان میں اشوک کے اثر سے بودھ مذہب کو کافی اشاعت نصیب ہوئی، اور دوسری صدی عیسوی میں تو خود کابل کا بادشاہ مینانڈر (یا ملندا) بودھ مذہب کا پیرو ہو گیا تھا، مگر جب اسلام کی طاقتور تہذیب سے اس کا مقابلہ ہوا تو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ٹھہر سکا، چین میں اس کو جو کچھ ثبات نصیب ہوا وہ صرف تاؤازم (Taoism) کی مساعدت کا نتیجہ تھا، اور نہ کنفیوشس کے مذہب نے تو اس کا خاتمہ ہی کر دیا تھا، جاپان میں بھی شنتو مذہب سے بہت کچھ لے دے کر اسے مصالحت کرنی پڑی حتیٰ کہ اس کے غلبہ میں اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے بنیادی عقائد بھی بدل دینے پڑے، باقی رہے دوسرے ممالک مثلاً سیلون، برما، تبت، وغیرہ تو وہاں کوئی ایسی طاقتور تہذیب ہی نہ تھی جو اس کی مزاحمت کرتی، اس لئے وہ آسانی سے ان پر چھا گیا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس نے کسی زمانہ میں بھی ان ملکوں کی تہذیب و تمدن کی روح نہیں چھوئی، جس طرح پہلے وہ بے جان اور غیر متحرک تھے اسی طرح اس کے عہد میں بھی رہے۔

رستے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ برہمنی مذہب کے پیروؤں نے اسے تلوار سے نہیں مٹایا، مگر اس تاریخی حقیقت کو [illegible] مذہب کی کمزوری پر [illegible] ت کی کمی پر دلالت کرتا ہے، لیکن تلوار کے بغیر محض پر امن مقابلہ [illegible] یہ مذہب معنوی قوت کے اعتبار سے [illegible]

۵ [illegible]

۵ [illegible]

۵ [illegible]

علاوہ ازیں یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ بودھ مذہب نے کسی جگہ حکومت کا مقابلہ کرنے اور سوسائٹی کے بگڑتے ہوئے نظام کو درست کرنے کی جرأت نہیں کی، بودھ کے دستور العمل میں سیاست کو ذرہ برابر دخل نہیں ہے، اس نے حکومت میں حصہ لینے یا اس کو بدلنے کے بجائے ہر حال میں اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے عام اس سے کہ وہ جابر و ظالم ہو یا عادل و منصف[1]، اسی پر بس نہیں بلکہ اس نے شیطانی قوت کے مقابلہ میں عجز و انکسار اور ظلم کے مقابلہ میں مجبورانہ برداشت کی ایسی تعلیم دی ہے کہ اس کا کوئی پیرو سخت سے سخت مظالم پر بھی ان نہیں کر سکتا، اس کا یہ قول ہے کہ انسان پر اس زندگی میں جتنے مصائب نازل ہوتے ہیں، سب ان گناہوں کا نتیجہ ہیں جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں کیے تھے، لہٰذا جب کسی شخص پر کوئی دشمن ظلم کرے تو اسے یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ ظالم قصوروار نہیں ہے، بلکہ میں خود قصوروار ہوں، میں نے گذشتہ جنم میں کوئی ایسا ہی گناہ کیا ہوگا جس کی یہ سزا مجھکو مل رہی ہے[2]، یہ مذہبی عقیدہ بودھ کے پیرووں میں غیرت و انتقام کے جذبات کو ٹھنڈا کر کے ایک ایسی انفعالی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خوشی کیساتھ ہر تذلیل و توہین اور ظلم و جور کو برداشت کر لیتے ہیں،

ظاہر ہے کہ ایک جابر حکومت کے لئے اس سے زیادہ مرغوب چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی، ایسا مذہب اس کے لئے خطرہ ہونے کے بجائے مزید استحکام کا موجب ہوتا ہے، جو رعایا اس قسم کے عقائد پر ایمان رکھتی ہو اسے اطمینان کے ساتھ ہر قسم کے ظالمانہ قوانین اور جابرانہ احکام کا تابع بنایا جا سکتا ہے، اس کو ہر طرح ٹیکسوں اور رشوتوں کے ذریعہ لوٹا جا سکتا ہے، اس کی جان و مال اور عزت و آبرو پر ہر قسم کے حملے کئے جا سکتے ہیں، ایسے ظالم حکمرانوں کی شیطانی خواہشات کے لئے ہر طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بودھ مذہب کو حکومتوں سے بہت کم مقابلہ کی نوبت پیش آئی ہے، بلکہ اکثر ملکوں میں حکومتوں نے اسکی مزاحمت کرنے کے بجائے سرگرمی کے ساتھ تائید و حمایت کی ہے، بودھ کی دعوت شروع ہوتے ہی مگدھ کے راجہ بیمبسار نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کے مذہب کی حمایت میں ایک فرمان شائع کیا[3]، اس کے بعد اس کا بیٹا اجت ستر و بھی بودھ کا معتقد اور اس کے مذہب کا سرگرم حامی رہا، کوسالا کے راجہ پسنادی

---

[1] Vinaya Texts Part I. P 301

[2] Buddha and his Religion PP 150 - 51

[3] Vinaya Texts Part I. PP 136-197

...ئی وقت نے خود اس کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی اس نے مذہب و قبول کیا اور اس سے تعلقات بڑھانے کے لئے شاکیہ خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کرلی اس کے علاوہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورا سینیاس کا راجہ اوشتی پٹ اور ایک دوسرا راجہ اپلیتا بھی بودھ کا مرید اور اس کا معتقد تھا اس دور سے گذر کر تیسری صدی قبل مسیح میں ہم دیکھتے ہیں کہ اشوک نے اس مذہب کی سرپرستی کی اور اپنے تمام شاہانہ وسائل استعمال کرکے نہ صرف اطراف واکناف ہند میں بلکہ دور دور کے ممالک میں بھی پھیلا دیا پھر پہلی صدی عیسوی میں کنشک نے اس مذہب کی سرپرستی کے ساتھ تائید کی اس کے بعد تیسری صدی عیسوی میں ورگا جیت اول نے خود برہمنی مذہب رکھنے کے باوجود بودھ مت کی سرپرستی کی اور اس کو تقویت پہونچائی ساتویں صدی میں پھر ایک طاقتور راجہ ہرش کی حمایت اس کو حاصل ہوئی اور اس نے اتنے زور کے ساتھ اس کی حمایت کی کہ برہمنی مذہب کے شیدائی اس کے قتل کی سازشیں کرنے لگے ہندوستان سے باہر تبت اور منگولیا میں قبلائی خاں نے اس مذہب کی اشاعت میں اپنی ساری قوت صرف کردی یہ مذہب اسی وجہ سے اپنی حکومت کے لئے اس کو مفید سمجھتا تھا چین میں شاہ منگ تی نے خود اس کے مبلغوں کو دعوت دی اور بڑھ کر اس کا استقبال کیا اس کے بعد بھی اکثر بادشاہ اس کی تائید و حمایت کرتے رہے یہی حال دوسرے ممالک کا بھی ہے جنکا حال تاریخ کا تتبع کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے

پس بودھ مذہب کو دنیا میں جو شہرت نصیب ہوئی اور صدیوں کے پیہم انقلابات کے باوجود وہ اکثر ممالک میں زندہ رہا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی طاقتور مذہب تھا یا اس کی قوت بہت مضبوط تھی بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جابر حکمرانوں کے آگے ہمیشہ سر جھکاتا رہا اس نے ظلم کے مقابلہ کی کبھی جرات نہیں کی اور انسانیت دشمن حکمرانوں کے تسلط سے نجات دلانا کیا معنی اس کا خیال تک نہیں کیا اس لئے حکومت نے ہمیشہ اس کی تائید کی اور اس کے بدلے

ف ۱ Buddhist India ... ایضاً ص ۱۰۰

۲ Smith Early History of India ... ۱۹۱

۳ Buddhism & Hinduism ... ۴

۴ ایضاً ص ۱۰۰

کو اپنے غلبہ و قہر کے لئے مفید سمجھا،

اس مختصر تبصرہ سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ جنگ کے معاملہ میں اسلام اور بودھ مذہب کے درمیان کس قسم کا اختلاف ہے، اسلام کے نزدیک دنیا میں انسان ایک بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اور اس کی نجات کا راز اسی دنیا کو بہترین اسلوب سے برتنے میں مضمر ہے، اس لئے وہ انسان کو ہر اس طریق عمل کے اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے جو اس کی اور اس کے ابنائے نوع کی اخلاق و مادی فلاح اور دنیوی زندگی کے بہترین انتظام کے لئے ضروری و مفید ہے، بخلاف اس کے بودھ مذہب کی نظر میں انسان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے، اور اس کی نجات بس اسی میں ہے، کہ اس دنیا اور اس کے تمام تعلقات حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے بھی کنارہ کش ہو جائے، اس لئے وہ اس کو کسی ایسی عملی کوشش یا ذہنی دلچسپی کی اجازت نہیں دیتا جس کی بدولت دنیا کی کسی چیز سے اس کا بالطبع تعلق قایم رہتا ہو، اب عقل سلیم خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ آیا اسلام کا جہاد انسانیت کے لئے زیادہ مفید ہے یا بودھ مذہب کی اہنسا؟

مسیحیت

دوسرا مذہب جو جنگ کے مسئلہ میں اسلام سے اصولی اختلاف رکھتا ہے، مسیحی مذہب ہے، یہودی مذہب کی طرح اس کے متعلق بھی ہماری معلومات کا واحد ذریعہ ایک ہی کتاب ہے، جس کو تمام مسیحی دنیا اپنے مذہب کی بنیادی کتاب تسلیم کرتی ہے، اور وہ انجیل ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم اصل مسئلہ کے متعلق اس سے استفتا کریں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آج وہ جس صورت میں موجود ہے اس سے صرف موجودہ مسیحیت کے معتقدات ہمکو معلوم ہو سکتے ہیں، اور نہ یہ سوال کہ فی الاصل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی، اس سے حل نہیں ہوتا، چونکہ آیندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، اس لئے آگے بڑھنے سے پہلے انجیل صحائف کی تاریخی حیثیت پر ایک نظر ڈال لیجئے،

ماخذ کی تحقیق آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا، لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ حضرت عیسیٰ کا نہیں ہے، جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منزل من اللہ آیات و سور جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اسکے

اس کتاب میں وہ باتیں ہم کو نہیں ملتیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے نکلی تھیں، یعنی وہ مواعظ و نصائح بھی ہمکو خود حضرت عیسیٰؑ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انھوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہونچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں نہ حضرت عیسیٰؑ کا، بلکہ وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جنہیں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق ان کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے،

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر مجہول الاصل ہیں کہ ان پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پہلی کتاب مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے، اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے، متی کی اصل کتاب جس کا نام لوجیا (Logia) تھا مفقود ہے، اور جو کتاب اس کی طرف منسوب کیجاتی ہے اس کا مصنف کوئی گمنام شخص ہے جس نے دوسری کتابوں کے ساتھ لوجیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متی کا ذکر اس میں اس طرح کیا گیا ہے، جیسے کسی غیر آدمی کا ہو۔ بائبل کے جدید محققین اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے، چونکہ اس کی ۶۰۰ آیات میں سے ۶۰۰ بعینہٖ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں، حالانکہ اگر اس کا مصنف متی حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی ملا تھا۔ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ کتاب ۷۰ء میں یعنی مسیح کے ۴۰ برس بعد لکھی گئی ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ ۱۰۰ء کی تصنیف ہے۔

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے، اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود بھی مسیح کا مصنف ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کبھی نہیں ملا، اور نہ ان کا مرید ہوا، وہ دراصل پطرس کا شاگرد تھا، اور متی باب ۹ آیت ۹ میں لکھا ہے:-

"یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو محصول کی چوکی پر بیٹھے"

ظاہر ہے کہ مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔

لوقا کی انجیل کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے نہیں تھا، بلکہ پولوس کا شاگرد تھا، اور اس نے اپنی کتاب میں پولوس کے خیالات کو جمع کیا ہے، یوحنا کی انجیل کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں میں سے نہیں تھا، بلکہ ان کے حواریوں کے شاگردوں میں سے تھا، اور اس نے اپنی کتاب میں ان لوگوں کے خیالات کو جمع کیا ہے، جو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے شاگرد تھے، اس کتاب کے متعلق بھی یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی لکھی ہوئی نہیں ہے،

---

۱ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب ہوتے وقت دوام حیات کی جو حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس کی بھی کوئی ثبوت نہیں ہے،

پیٹر توری (St. Peter) کا مرید تھا اور جو کچھ ان سے سنتا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا، اسی وجہ سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً پطرس کا ترجمان کہا کرتے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب ۶۳ء اور ۶۴ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے،

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے، اور یہ بالکل مسلم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیح کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا، وہ پولوس (St. Paul) کا مرید تھا ہمیشہ اسی کی صحبت میں رہا اور اس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے، لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیح کی صحبت سے محروم تھا، اور مسیحی روایات کے مطابق واقعۂ صلیب کے ۱۰ برس بعد اس مذہب میں داخل ہوا تھا، اس لئے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلۂ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے، انجیل لوقا کی تاریخ تحریر بھی متعین نہیں ہے، بعض اس کو ۷۰ء کی تصنیف بتاتے ہیں، اور بعض ۱۰۰ء کی، مگر ہارنک میگگیفرٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ ۷۰ء سے پہلے نہیں لکھی گئی،

چوتھی کتاب جو یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے، جس کا نام یوحنا تھا، یہ کتاب مسیح سے بہت بعد ۱۰۰ء میں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے، اور ہارنک اس مدت کو ۱۱۰ء تک بڑھا دیتا ہے،

ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مسیح تک نہیں پہونچتا، اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا، اور کیا نہیں کہا تھا، لیکن زیادہ عمیق تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے،

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے حتی کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی، جو مسیحی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متی، مرقس، اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے،

ثانیاً چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات و تاثرات صاف طور پر نمایاں

ہیں متی کے مخاطب یہودی معلوم ہوتے ہیں وہ ان پر تمام تر توجہ کرتا ہے۔ نظریات مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعاوی کی تائید کر رہا ہے۔ یوحنا ان فلسفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف لفظی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں حالانکہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان عبرانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو ضبطِ تحریر میں لانے کی کوئی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ ۱۵۰ء تک عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے اختتام میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا، لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ [illegible] Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجنہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا ہے اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپائے روم کے کتب خانہ میں ہے، چوتھی صدی عیسوی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ امر مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سادساً، اناجیل کو قرآن کی طرح حفظ کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی اشاعت کا انحصار ابتداءً روایت بالمعنی پر رہا جس میں حافظہ کے خطا اور راویوں کے ذاتی خیالات کا اثر آنا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رحم پر تھیں۔ نقل کرتے وقت ہر شخص کے لئے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد کے خلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پائے، بڑھا دے۔

[illegible]

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر ہم وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اناجیل اربعہ میں ہمکو اصلی مسیحیت کی تعلیم ملتی ہے پس آیندہ صفحات میں مسیحیت کے متعلق جو کچھ کہا جائیگا، وہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس کی تعلیم مسیح علیہ السلام نے دی تھی، بلکہ اس مسیحیت کے متعلق ہوگا جس پر آج کل کی مسیحی دنیا اعتقاد رکھتی ہے۔

"محبت" کی تعلیم

انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت جنگ کی سخت مخالف ہے، عام اس سے کہ جنگ حق کے لئے ہو یا غیر حق کے لئے۔ مسیح کے نزدیک مذہب کا سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "خدا سے محبت رکھنے کے بعد اپنے پڑوسی سے محبت رکھو" (متی ۲۲ : ۳۹) اور اس محبت کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ "تو اپنے بھائی پر غصہ نہ کر" (متی ۵ : ۲۲) لیکن وہ صرف محبت کرنے اور غصہ نہ کرنے ہی پر بس نہیں کرتے، بلکہ صاف الفاظ میں ایک سچے مسیحی کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ظلم اور شرارت کے مقابلہ میں سر جھکا دے، اور دوسروں کی حفاظت کرنا تو درکنار، خود اپنے حق کی حفاظت بھی نہ کرے، ان کی تعلیم کا کل سرمایہ پہاڑی کا وعظ ہے، جس پر مسیحی اخلاق کی بنیاد قائم ہے، اسمیں وہ فرماتے ہیں:

"تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ تم شریر کا مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے، اور کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو جوغہ بھی اسے لینے دے، اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لیجائے تو اس کیساتھ دو کوس چلا جا ..... تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت، مگر میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے برکت چاہو، جو تم سے نفرت کریں ان سے اچھا سلوک کرو، جو تمھیں ستائیں ان کے لئے دعا مانگو" (متی ۵ : ۳۸-۴۴)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمن سے محبت رکھو، جو تم سے عداوت

(حاشیہ صفحہ قبل)

Beamnebo wa Commentary on the Holy Bible

Encyclopaedia Biblica, by T. K. Cheyne

Milman's History of Christianity

[illegible] کریں ان کے لئے دعا مانگو جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا بھی پھیر دے جو تیرا چوغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر جیسا تم دوسروں سے برتاؤ چاہتے ہو تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی کرو۔ اگر تم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارا کیا احسان ہے؟ کیونکہ گناہگار بھی اپنے محبت رکھنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ (لوقا ۶: ۲۷-۳۲)

یہ تعلیم مسیحیت کی اصل الاصول ہے، اور اس کا منشا خود اس کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک سچا مسیحی کو اپنی ہر طرح کی کامل [illegible] بننا چاہئے اور جس کا نصب العین خدا سے [illegible] بننا ہو کسی حال میں [illegible] کا مقابلہ قوت سے نہ کرنا چاہئے بلکہ شریروں [illegible] کے سامنے اپنے حقوق سے خود بخود دست بردار ہو جانا چاہئے۔

مسیحیت کا فلسفۂ اخلاق اس تعلیم کے جس [illegible] اور پورا [illegible] تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس تعلیم کو بھی صحیح طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

مسیحیت [illegible] میں تم تک پہنچی ہے اس کا [illegible] سے [illegible] اور [illegible] میں [illegible] مسیحیت [illegible] کے مذہب ہے [illegible] انسان کی [illegible] سے [illegible] مقصد [illegible] مسیحیت کو [illegible] قانون وضع نہیں کیا گیا ہے [illegible] انسان [illegible] اس کے [illegible] اس کی قوم [illegible] اس کے [illegible] اور اس کے [illegible] کیا حقوق ہیں؟ [illegible] کر سکتی ہیں صحیح [illegible] کیا ہے [illegible] انسان [illegible] دی [illegible] جسمانی [illegible] میں ان کا مصرف کیا ہے [illegible] کس [illegible] چاہئے [illegible] ان مسائل سے [illegible] بحث نہیں کرتا [illegible] ایک [illegible] ہے [illegible] انسان [illegible] مسیحیت [illegible] خلاقیات کا [illegible] مسیحیت [illegible] دی ہے [illegible] مقصد [illegible]

لیکن آسمانی بادشاہت، مسیحیت کی نگاہ میں زمین کی بادشاہت کی ارتقائی صورت کا تمام نہیں ہے، وہ ان دونوں کے درمیان بیج اور پھل کا تعلق تسلیم نہیں کرتی، بلکہ ان دونوں میں تضاد اور کلی اختلاف کی قائل ہے، اس کے نزدیک دنیوی بادشاہت اور آسمانی بادشاہت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں بالکل اسی طرح بہم نہیں ہو سکتیں جس طرح آگ اور پانی بہم نہیں ہو سکتے، ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کا راستہ بھی، زمین کی بادشاہت کے راستہ سے بالکل الگ اختیار کرتی ہے، ہر وہ چیز جو زمین کی بادشاہت کے ساز و سامان میں داخل ہے، آسمانی بادشاہت کے ساز و سامان سے خارج ہے، اور صرف خارج ہی نہیں بلکہ اس کا وجود انسان کو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے روکنے والا ہے، اسی لئے مسیحیت قدم قدم پر انسان کو تاکید کرتی ہے، کہ اگر وہ آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو زمین کی بادشاہت کے سر و سامان سے کلی اجتناب کرے، اور اگر اس سے اجتناب نہیں کر سکتا تو آسمانی بادشاہت کی امید نہ رکھے، اسی اصل پر وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے، اور تمدن و تہذیب سے الگ کر کے انسان کو کلیتہً تارک الدنیا بنا دینا چاہتی ہے، اس کی توضیح کے لئے مسیحؑ کے چند احکام نقل کر دینا کافی ہے:-

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور اولاد اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا" (لوقا ۱۴: ۲۶)

"کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں؟ میں تم سے کہتا ہوں کہ نہیں، بلکہ تفریق کرانے، کیونکہ اب سے ایک گھر کے پانچ آدمی آپس میں مخالفت رکھیں گے، تین دو کے خلاف اور دو تین کے خلاف، باپ بیٹے سے مخالفت رکھے گا، اور بیٹا باپ سے، ماں بیٹی سے اور بیٹی ماں سے، ساس بہو سے اور بہو ساس سے" (لوقا ۱۲: ۵۱ - ۵۳)

"تم نے مفت پایا مفت دیدو، نہ سونا اپنے کمیسہ میں رکھو نہ چاندی، نہ پیتل
اپنے سفر کے لئے نہ جھولی لو، نہ دو دو کرتے، نہ جوتیاں اور نہ لاٹھی" (متی ۱۰: ۸-۱۰)

"اے چھوٹے گلے نہ ڈر! کیونکہ تمھارے باپ کو پسند آیا کہ تمھیں بادشاہت
دے، اپنا مال اسباب بیچ کر خیرات کردو، اور اپنے لئے ایسے بٹوے بنواؤ جو پرانے
نہیں ہوتے یعنی آسمان پر ایسا خزانہ جو خالی نہیں ہوتا" (لوقا ۱۲: ۳۲-۳۳)

"اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال اسباب بیچ کر غریبوں کو دیدے اور
میرے پیچھے ہولے، تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا" (متی ۱۹: ۲۱)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل
ہونا مشکل ہے، اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا
آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو"
(متی ۱۹: ۲۳-۲۴)

"اپنے لئے زمین میں مال نہ جمع کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے
..... بلکہ آسمان پر جمع کرو" (متی ۶: ۱۹)

"اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کروگے تو تمھارا آسمانی باپ بھی تمھیں
معاف کریگا، اور اگر تم آدمیوں کے قصور معاف نہ کروگے تو تمھارا باپ بھی
تمھیں معاف نہ کریگا" (لوقا ۶: ۴-۱۵)

"میں تم سے کہتا ہوں کہ نہ اپنی جان کی فکر کرو کہ ہم کیا کھائیں گے یا
کیا پئیں گے، نہ اپنے بدن کے لئے کہ کیا پہنیں گے، کیا جان خوراک سے اور
بدن پوشاک سے بہتر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں
نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے کیا

ت مسیح نے یہ حکم ان شخص کو دیا تھا جو اپنی مرضی سے دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جس شخص نے جھوٹ سے پرہیز کرنا تھا، اپنے ماں باپ کی خدمت کرنا تھا، اور اپنے پڑوسی سے اپنے آپ جیسی محبت رکھنا تھا۔ اسے مسیح نے کہا کہ تو کامل اس وقت ہوگا جب اپنا سارا مال اسباب بیچ کر خیرات کر دیگا۔

تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔ ۲۶ تم میں ایسا کون ہے؟ فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ ۲۷ اور تم لباس کے لئے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کیسے بڑھتے ہیں۔ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ ۲۸ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ ۲۹ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائیگی، ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو ضرور پہنائیگا۔ ۳۰ اس لئے فکرمند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟" (متی ۶: ۲۵-۳۱)

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ آسمانی بادشاہت کی طرف لیجانے کے لئے مسیح کی تعلیم جس ڈھنگ پر انسانی جماعت کی تربیت کرنا چاہتی ہے، وہ تمدن اور تہذیب سے کامل انقطاع پر مبنی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ خاندانی تعلقات تمدنی زندگی کی بنیاد ہیں۔ جماعت سے انسان کا ابتدائی تعلق اپنے رشتہ داروں ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے۔ انھیں کے باہمی روابط سے ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے، اور درحقیقت انسان کے لئے اخلاق کی بہترین درس گاہ بھی یہی ہے۔ مگر مسیح کے تیشہ کا پہلا وار اسی اصل الاصول پر پڑتا ہے اور وہ سب سے پہلے اس رشتہ کو کاٹ دیتا ہے، جو آدمی کو سوسائٹی سے منسلک کئے ہوئے ہے۔ دنیا کو برتنے اور اس کے معاملات میں حصہ لینے کے لئے سب سے پہلے جو شے انسان کو عمل پر مجبور کرتی ہے، وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھانکنے کی فکر ہے، لیکن مسیح اس ابتدائی محرک ہی کو معطل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ آدمی دنیا میں ویسی ہی بے عمل زندگی بسر کرے جیسی ہوا کے پرندوں اور جنگلی سوسن کے درختوں کی ہے۔ انسان کی راحت و آسایش اور انفرادی و اجتماعی فلاح کے لئے مال و دولت حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ مگر مسیح کے نزدیک روحانی ترقی اور آسمانی بادشاہت کے لئے اس کو چھوڑ دینا ضروری ہے۔ دنیا میں نظام امن و عدل کا قیام سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کے قانون پر منحصر ہے، مگر مسیح کہتے ہیں کہ آسمانی باپ اس وقت تک تمہارے قصور معاف نہ کریگا جب تک مکافاتِ عمل کے اس پورے قانون کو لپیٹ کر نہ رکھ دیا جائیگا۔ غرض یہ کہ مسیح کے نزدیک دینداری دراصل ترکِ دنیا کا نام ہے جو شخص دنیا اور اس کے اسباب کو نہیں چھوڑتا، اجتماعی تعلقات کو قطع نہیں کرتا، دنیوی کاروبار

[illegible] ترک نہیں کرتا۔ [illegible] جگہ نہیں ہے۔ انسان بیک وقت ان دونوں بادشاہتوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ دین اور دنیا دونوں کو پالینا اس کے لئے ناممکن ہے۔ مسیح کے ارشاد کے مطابق ہم بیک وقت خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ یہ دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے جو ایک کا طالب ہو اسے دوسرے کی طلب چھوڑنی پڑیگی،

مسیح کی اس تعلیم کو خود مسیحی علما جس رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ریورینڈ ڈوملو کی تفسیر انجیل کے چند فقرات یہاں نقل کر دینا کافی ہے۔ یہ تفسیر ۴۰ سے زیادہ مسیحی علما کی مدد سے طیار کی گئی ہے اور انجیل کی بہترین تفاسیر میں سے ہے۔ اس کے مقدمہ میں ایک مستقل مقالہ "تعلیمات مسیح" کے عنوان پر ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

"مسیح نے انسانی سیرت کے لیے وہ طرز پسند کیا ہے جو بڑی حد تک دنیا کے پسند کئے ہوئے طرز سے مختلف ہے۔ خودداری کے بجائے فروتنی، اپنے حقوق پر جمے رہنے کے بجائے بدی کے آگے سر جھکا دینا، اور وسعت حلمی کی جگہ [illegible] عجز، صبر، ہمدردی، مصیبت میں خوش ہونا اور دوسرے راحت حاصل کرنا۔ یہ دنیا کو مسیحیت کے عطایا ہیں..... مگر ایک مسیحی کے کیرکٹر کی سب سے زیادہ جامع تعریف غالباً یہ ہے کہ وہ ایک نیک سودائی ہوتا ہے۔ وہ ایک پاؤں دنیا میں اور دوسرا دین (چرچ) میں نہیں رکھ سکتا۔ وہ ایک ہی وقت میں خدا اور متاع دنیا دونوں کی خدمت نہیں کر سکتا..... مسیح کے نزدیک دنیا کے پاس انسان کو اپنی خدمت پر مجبور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دولت ہے۔ لہذا ایک مسیحی بننے کے لئے پہلی اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ انسان دولت سے بے تعلق ہو جائے"۔

مسیحی اخلاقیات کا اصلی نقص اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مسیحیت میں نیت، عفو و درگذر، ترک نفس و انکسار کی جو تعلیم دی گئی ہے، وہ ایک ایسے اخلاقی نظام کے اجزا میں سے ہے

جو رہبانیت کی بنیاد پر قایم کیا گیا ہے، چونکہ اس نے اخروی نجات کا راستہ دنیوی کامیابی سے
راستہ سے الگ اختیار کیا ہے، اس لئے وہ دنیوی معاملات کو دنیا داروں پر چھوڑ دیتی ہے، اور
خود اپنے دینداروں کو لیکر الگ ہو جاتی ہے تاکہ گوشۂ عزلت میں بیٹھکر، آسمانی بادشاہت حاصل
کرنے کی تیاری کریں، ایسے مذہب میں جنگ نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دنیا اور اس کے
معاملات کی ذمہ داریاں قبول کرتی ہے اور اس کے باوجود ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قوت
کے استعمال کی ضرورت نہیں سمجھتی، بلکہ دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو دنیا کے معاملات
ہی سے کچھ تعلق نہیں ہے تو قدرتی طور پر جنگ و خوں ریزی سے بھی انکار ہے، وہ یہ نہیں کہتا
کہ فساد کو فرو کرنے کے لئے تلوار کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ خود فساد ہی کو فرو کرنے
کی ضرورت نہیں، وہ نہیں کہتا کہ شرارت کا استیصال جنگ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا
ہے کہ اس کے استیصال کے بجائے تم اس کے قہر و غلبہ کے آگے سر جھکا دو، وہ نہیں کہتا کہ ظلم
و تعدی کے مقابلہ میں حق کی حفاظت خوں ریزی کے بغیر بھی ممکن ہے، بلکہ وہ کہتا ہے، کہ تم حق کی
حفاظت ہی نہ کرو، اگر ظالم تمھارا حق چھینتا ہے تو چھین لینے دو، وہ نہیں کہتا کہ مجرموں کو تشدد کے
بغیر بھی سزا دی جا سکتی ہے، اور مظلوموں کا قصاص قوت کے بغیر بھی لیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ کہتا
ہے کہ تم سرے سے سزا اور قصاص ہی کو چھوڑ دو، اور کوئی "سات دفعہ نہیں سات کے ستر گنے
تک" قصور کئے جائے، تو اسے معاف کرتے رہو، غرض یہ کہ دنیا میں امن قایم کرنا، اس کو بدی و
شرارت سے پاک کرنا، اس میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کرنا، اور انسانیت کو ظلم و فساد کے
تسلط سے نجات دلانا، سب کچھ مسیحیت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اور اس نے اپنے لئے محکومی
و مغلوبی، اور مظلومی و منکوبی کی زندگی پسند کر لی ہے، اس لئے اگر وہ جنگ کی مخالف ہے، اور بلا
تمیز حق و غیر حق نفس جنگ ہی کو برا سمجھتی ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، بلکہ ایسی زندگی کے
لئے یہی زیادہ موزوں ہے،

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تذلل و انفعال کی تعلیم انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون
بننے کی کہاں تک صلاحیت رکھتی ہے؟ اس کا جواب مسیحیت خود اپنے منہ سے دے رہی
جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جنگ سے احتراز کا حکم خود کوئی مستقل قانون نہیں ہے، بلکہ یہ

ورثہ دنیا کے ایک وسیع قانون کی دفعات میں سے ایک دفعہ ہے، جس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کا نفاذ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ پورا قانون نافذ ہو، یعنی خود مسیحیت کی تعلیم کے مطابق اس انفعالی زندگی کو انسان اسی وقت اختیار کر سکتا ہے، جبکہ وہ دنیا کو چھوڑ دے اور اس کی مختلف عمرانی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جائے، اور نہ ان سب ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور پورا کرنے کے ساتھ اس طریقہ کو اختیار کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ خود واضع کے منشا کے مطابق ہے، اب اگر اس کو عالمگیر قانون قرار دیا جائے، تو لامحالہ تمام بنی نوع انسان کو تمدن و تہذیب سے کنارہ کش ہو جانا پڑیگا کیونکہ جب انسان کی منزل مقصود "آسمانی بادشاہت" ٹھہری، اور یہ مان لیا گیا کہ دنیوی زندگی کے تمام معاملات اس بادشاہت میں داخل ہونے سے روکتے ہیں، تو ضروری ہو گیا کہ نوع بشر ساری کی ساری اس منزل تک پہونچنے کے لئے اس روکنے والی چیز سے اجتناب کرے اور راہبانہ زندگی اختیار کر کے نفس کشی و ریاضت میں لگ جائے لیکن ظاہر ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن ہے، تمام دنیا بیک وقت اپنے کاروبار بند نہیں کر سکتی، معاش کی فکر چھوڑ کر "جنگلی سوسن کے درختوں" کی سی زندگی اختیار نہیں کر سکتی، تجارت، صنعت، زراعت، اور تمام دوسرے مشاغل کو ترک کر کے تعطل و بیکاری کی حالت قبول نہیں کر سکتی، حکومت اور اس کے انتظام کو چھوڑ کر خانقاہوں میں نہیں بیٹھ سکتی، اور اگر بفرض محال وہ ایسا کر بھی لے تو ہرگز اس شرف و عزت کی مالک نہیں رہ سکتی جو اس کو اللہ تعالیٰ نے دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں عطا فرمایا ہے بلکہ سچ یوں ہے کہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی، انسانی سوسائٹی کی یہ ایک ایسی حالت ہے جسکا مستحق ہونا ایک شاذ و نادر تخیل کے سوا کسی خارجی عالم میں ممکن نہیں ہے، اور جو خدانخواستہ ممکن ہو بھی جائے تو کم از کم وہ کسی ذی عقل انسان کو مطلوب و مرغوب نہیں ہو سکتی، پس یہ کہنا بالکل مبنی بر عقل ہے، کہ مسیحیت کا قانون خلاف تمام بنی نوع انسان کے لئے ایک دائمی اور عالمگیر قانون ہے کیونکہ عالمگیر اور دائمی قانون صرف وہی ہو سکتا ہے جس پر تمام دنیا کے باشندے بہر حالت میں عمل کر سکتے ہوں،

پھر یہ قانون کسی ایک پوری قوم کے لئے بھی قابل عمل نہیں ہے اگر کوئی قوم من حیث المجموع اس کی پابندی قبول کرے، اور بلا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے اس کی تمام

بریت پر حملہ آور ہونے لگے، تو اس کو سب سے پہلے اپنی حکومت کا سارا نظام معطل کرنا پڑیگا، فوج اور پولیس منتشر کرنی ہوگی، سرحدوں کی حفاظت اور قلعوں کی نگہبانی چھوڑنی پڑیگی، اور جب اس کی کوئی ہمسایہ قوم میدان خالی دیکھ کر حملہ کردے، تو مسیحی تعلیم کے مطابق وہ "شریر کا مقابلہ" نہ کریگی، بلکہ "ایک گال" کے ساتھ "دوسرا گال" بھی، اور "کرتے" کے ساتھ "جوغہ" بھی پیش کردیگی، پھر وہ اپنی ساری دولت، اپنی تجارتی کوٹھیاں، اپنی دوکانیں، حتی کہ اپنے گھروں کا مال اسباب بھی چھوڑ دیگی کیونکہ "دولتمند آسمانی بادشاہت میں داخل نہیں ہوسکتا"، اور حکم ہے کہ "تو اپنا سارا مال بیچ کر خیرات کردے" اس کے بعد وہ کسب معاش کے لئے محنت مزدوری کرنا بھی چھوڑ دیگی، اپنے کارخانے بند کرے گی صنعت، حرفت، خدمت سب کچھ ترک کردیگی، اور اس کے تمام کاروباری آدمی اپنے اپنے کام چھوڑ کر صومعوں میں جا بیٹھیں گے، کیونکہ تم خدا اور دولت دونوں کی ایک ساتھ خدمت نہیں کرسکتے، اور مسیح کا حکم ہے کہ تم اپنی جان کی فکر نہ کرو، آخر میں اس کے لئے صرف ایک یہ ذریعۂ معاش رہ جائیگا کہ زمین کی کاشت کرے اور اپنی خوراک کے لئے غلہ حاصل کرے، لیکن آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کے لئے اسے یہ بھی چھوڑنا پڑیگا، کیونکہ مسیح کا ارشاد ہے کہ "ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے"، اس طرح وہ قوم اپنی حکومت، اپنی زمین، اپنی دولت، اپنی صنعت، تجارت، غرض اپنا سب کچھ ان بیرونی حملہ آوروں کے سپرد کردیگی، اور ساری کی ساری قوم اس کی غلام بن جائیگی، پھر وہ "ایک کوس بیگار میں لیجائیں گے" تو یہ "دو کوس" جائیگی، وہ ظلم کریں گے اور یہ ان کے لئے "دعا مانگے گی"، وہ اس پر "محنت" کریں گے اور یہ ان کے لئے "برکت" چاہے گی، وہ اس کی عزت و حرمت پر حملے کریں گے، اور یہ انھیں خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہیگی، مسیحی نقطۂ نظر سے یہ اس کے اخلاق کا منتہائے کمال ہے اور اس کے بعد کوئی چیز اسکو آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتی، مگر عقل و دانش کے نقطۂ نظر سے یہ ایک قوم کی پستی و تنزل کا انتہائی درجہ ہے، جس کے حصول کی کوشش کو ایک عقلمند آدمی خودکشی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کرسکتا، ظاہر ہے کہ اس معنی میں دنیا کی کوئی قوم بھی مسیحیت کے قانون اخلاق کو اپنا قانون حیات نہیں بنا سکتی، کیونکہ اس کی فطرت اسے اپنے وجود کی حفاظت اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس قانون کی ایک ایک دفعہ کو توڑنے پر مجبور کردیگی اور عملاً

ان کی مخالفت و ناراضی سے [illegible]

اب تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو ایک عالمگیر قانون نہ مانا جائے بلکہ ایک خاص گروہ کے لئے مخصوص سمجھ لیا جائے، جیسا کہ خود مسیح کی نقطہ نجات سے ظاہر ہوتا ہے یہ صورت یقیناً ممکن الحصول ہے، اگر انسانی جماعت کے مختلف گروہ اس کی مختلف ضروریات کو انجام دیتے رہیں کوئی تجارت میں مشغول ہے کوئی صنعت و حرفت کا کام کرے کوئی زراعت کرتا ہے، کوئی سیاسی امور کی تنظیم میں لگا ہے، اور اس طرح تمدن کا کارخانہ برابر چلتا ہے، تو یہ ممکن ہے کہ سوسائٹی اپنے ایک قلیل حصہ کو [illegible] اور جنگلی سوسن کے درختوں کی طرح بے عمل اور بیکار زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دے، اور اس کے جملہ افراد مسیحی اخلاق کے اس نمونے کمال تک پہونچنے کی کوشش میں مشغول ہو جائیں جو آپ نے اپنے حقیقی اخلاق کو اعلیٰ [illegible] اور نفس کشی و خود انکاری سے حاصل ہوتا ہے مگر یہ صورت مخصوص گروہ کے لئے اس قانون کو محدود مان لینے، اور دوسری طرف عام لوگوں کو برحق و بے حد فرحناک نجات تسلیم کرنے کے مترادف معنی یہ ہیں کہ ہم نجات یا آسمانی بادشاہت کو راہبوں اور سنیاسیوں کی ایک مختصر جماعت کا اجارہ سمجھ کر ہیں اور یہ مان لیں کہ اس چھوٹی سی بادشاہت کے تنگ دروازے میں عالم سیاست کے سواد اعظم کو جگہ نہیں مل سکتی جو لوگ نظام تمدن کو چلاتے ہیں حکومت و سیاست کی تدبیر کرتے ہیں، قوم و ملک کی حفاظت میں جان لڑاتے ہیں، اور مختلف انسانی خدمات کو سیاست کے لئے مختلف قسم کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں ان سے اس بادشاہت کے دروازے بند ہیں، کیونکہ مسیحیت کا اصل اصول یہ ہے کہ انسان بیک وقت دنیا اور دین دونوں میں باپ نہیں رکھ سکتا، اور آسمانی بادشاہت کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے جب کہ دنیا چھوڑ کر مسیح کی بتائی ہوئی دینی زندگی اختیار کرے، اس طرح صرف ایک مختصر سے گروہ کو آسمانی باپ کی بادشاہت میں داخل ہونے کا موقع ملتا ہے اور باقی تمام بنی نوع انسان مخلوق حرام کر دیجاتی ہے حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی وہاں جانہیں مل سکتا جو دنیا میں بنی نوع انسان کے ساتھ [illegible] نہیں کرتے زنا نہیں کرتے چوری و جھوٹ وغیرہ معصیت سے پرہیز کرتے ہیں [illegible] کی عزت کرتے ہیں، اپنے پڑوسی سے اپنے تئیں محبت رکھتے ہیں کہ [illegible]

نہیں کر سکتے،

اس نظریہ کو صحیح مان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پھر پہلی صورت کی طرف رجوع کر رہے ہیں، اگر یہ مان لیا جائے کہ "آسمانی بادشاہت" یعنی نجات کی منزل تک پہونچنے کا ذریعہ صرف مسیحیت کا قانون اخلاق ہی ہے، اور جو کوئی اس پر عمل نہیں کرتا وہ اس منزل تک نہیں پہونچ سکتا، تو پھر لازمی طور پر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ نوع انسانی کے لئے وہ ایک عالمگیر قانون ہے، کیونکہ نجات ہر انسان کی منزل مقصود ہے، اور کسی راستہ کو اس تک پہونچنے کا واحد راستہ قرار دینا یہی معنی رکھتا ہے، کہ وہ تمام انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے، اور اس کی طرف سب کو دعوت دینا مطلوب ہے، لیکن یہ بات ثابت ہو چکا ہے کہ اس راستہ پر تمام نوع انسانی کا جمع ہو جانا اور بالاتفاق گامزن ہونا عقلاً و عملاً ناممکن ہے، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیحیت کا بنایا ہوا قانون جس طرح دائمی اور عالمگیر نہیں ہے، اسی طرح برحق اور واحد ذریعۂ نجات بھی نہیں ہے[1]، عالمگیر دائمی اور واحد ذریعۂ نجات صرف وہی قانون ہو سکتا ہے، جس پر حاکم حاکم رہتے ہوئے، تاجر تاجر رہتے ہوئے، کسان کسان رہتے ہوئے اور ہر شخص اپنے اجتماعی و انفرادی فرائض ادا کرتے ہوئے عمل پیرا ہو سکتا ہے، اور جس کی تعمیل میں کسی انسان کیلئے ناقابل عبور مشکلات، ناقابل برداشت خطرات و مصائب، اور مالایطاق تکالیف نہ ہوں، جو قانون ایسا نہیں ہے، وہ نہ حق کا سیدھا راستہ ہے، نہ نجات کا واحد ذریعہ ہے، اور نہ فطرت کا سچا قانون ہے۔

لیکن ہم اس نقطہ پر بھی نہیں ٹھہر سکتے، ہمکو ایک قدم اور آگے بڑھکر کہنا چاہیئے، کہ مسیحیت کا قانون اخلاق اپنی موجودہ شکل میں فطرت کے بالکل خلاف ہے، وہ دراصل اخلاقی فضیلت کے ایک غلط تصور کا نتیجہ ہے، جسمیں بے اعتدالی کے ساتھ بعض فضائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور بعض کو بلا ضرورت معطل کر کے انسانیت کو مفلوج کر دیا گیا ہے، اس نے انسانی اخلاق کی جن خوبیوں پر زور دیا ہے ان کی فضیلت یقیناً مسلم ہے، فروتنی، عجز و انکسار، عفو و درگذر، حلم و بردباری، صبر و تحمل

[1] اس اشکال کو خود مسیحیوں نے بھی محسوس کیا ہے اور اسی لئے یہ مسئلہ پیدا کیا گیا ہے کہ نجات کے لئے مسیحیت کے قانون پر پوری طرح عملدرآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مسیح نے خود صلیب پر چڑھکر تمام اہل ایمان کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اور مسیح ان تمام لوگوں کے نجات دہندہ ہیں، جو ان پر ایمان رکھتے ہیں، مگر اس مسئلہ کی کمزوری ظاہر ہے، اس کو تسلیم کر لینے کے بعد تو مسیحیت کے قانون اخلاق کی کوئی قیمت باقی ہی نہیں رہتی،

کی فضیلت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسان نیکی کی تعمیر [illegible]
ہو سکتا، اگر دنیا سے بدی و شرارت بالکل مٹ جائے، زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتے بسنے لگیں
اور شیطان اپنی ذریات کو لیکر کسی اور کرہ میں چلا جائے، تب تو یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی جسمانی قوت
و شدت کا استعمال کئے بغیر اپنے حقوق، اپنی عزت اور خود اپنے وجود کی حفاظت کر سکے، لیکن جب
دنیا میں نیکی کے ساتھ بدی بھی موجود ہے، یزدان کے ساتھ اہرمن بھی لگا ہوا ہے، اور انسانی فطرت
سے وہ شیطانی ملکات مٹ نہیں گئے ہیں جو ملکوتی فضائل کو مغلوب کرنے کے لئے ہر وقت مستعد
رہتے ہیں، تو ایسی صورت میں نیکی کو نہتا چھوڑ دینا اور اللہ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کی حفاظت
کے لئے استعمال نہ کرنا صرف خودکشی ہی نہیں، بلکہ بدی و شرارت کی بالواسطہ امداد ہے، حقیقت یہ ہے کہ
نیکی ہی نہیں ہے کہ ظالموں کو حملہ کا موقع دیا جائے، اور مفسدوں کو جان بوجھ کر فساد پھیلانے کی
آزادی دیدی جائے، اس کو ہم کمزوری کہہ سکتے ہیں، بزدلی و کم حوصلگی سے موسوم کر سکتے ہیں، مگر خیر و
صلاح اور نیکی و احسان سے تعبیر نہیں کر سکتے، نیکی دراصل صلاح کا دوسرا نام ہے، اور وہ محبت
و غضب دونوں کے معتدل امتزاج سے پیدا ہوتی ہے، اگر بدی کی اصلاح [illegible] صبر و تحمل
اور لطف و رحم سے ہو سکے تو اس سے کرنی چاہئے، اور اگر یہ محبت کی قوتیں اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر سیاست و تعزیر اور قصاص و انتقام کی قوتوں سے کام لینا چاہئے، کیونکہ اصل مقصود اصلاح
ہے، اور انسان کا فرض ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر اس طریقے کو استعمال کرے جو اس مقصد کے
حصول کے لئے مفید اور ناگزیر ہو، انہیں طریقوں کا امتیاز کرنا اور ایک ہی طریقہ پر اس حد تک
اصرار کرنا کہ وہ اصلاح کے بجائے مزید فساد کا موجب ہو جائے، نہ تو عقلمندی ہے اور نہ نیکی،

مسیحیت کا یہ نظریہ کہ دین کا اصل الاصول محبت ہے، اور اس کے سوا انسان کے تمام
جذبات اور اخلاقی خصائص باطل ہیں، جنکو مٹا دینے ہی سے دینداری کو نشو و نما حاصل ہو سکتی ہے،
دراصل ایک غلط تخیل پر قائم ہے، اس نظریہ کے موجدوں کی نظر اس حقیقت تک نہیں پہونچ سکی
کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز عبث نہیں پیدا کی ہے، اس لئے انھوں نے سمجھ لیا کہ غضب
شہوت، و حب نفس وغیرہ جذبات فی نفسہ مذموم ہیں، اور انسانی سیرت میں شجاعت و خودداری
غیرت و نجابت، تدبر و سیاست، عدل و انصاف وغیرہ کا کوئی مصرف نہیں ہے، غافل کہ یہ سب

ب مصرف اور ایک مدعا رکھتے ہیں جس طرح انسان کا کوئی عضو حتی کہ کوئی رونگٹا بھی
یں ہے، اسی طرح انسان کی کوئی ذہنی وجسمانی قوت، اسکا کوئی ظاہری وباطنی ملکہ اور
نفسانی جذبہ ووجیہ بھی بیکار نہیں ہے، فاطر کائنات نے اس کو بغیر کسی مصلحت کے نہیں بنایا
گر یہ قوتیں غلط صورتوں میں ظاہر ہوں اور غلط راستے اختیار کرلیں، تو اس کے یہ معنی ہرگز
یں کہ وہ فی نفسہ غلط اور مذموم ہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان نے انکا صحیح مصرف
ں سمجھا، اور اس کے شعور نے اتنی ترقی نہیں کی کہ اون کے صحیح استعمال کی طرف اس کی رہنمائی
ے، مثال کے طور پر شہوت ایک جذبہ ہے، جس کی بدولت انسان نے اتنے گناہ کئے ہیں
اید کسی اور جذبہ کے اثر سے نہ کئے ہوں گے، مگر اس کی بنا پر یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، کہ اس کو
ں مٹا دینا چاہئے، کیونکہ اس پر بقائے نوع کی بنیاد قائم ہے، حرص ایک جذبہ ہے جو انسان کو
غرض بنا کر بدترین گناہوں پر آمادہ کر دیتا ہے، مگر اس کو بالکل فنا کر دینے کا فیصلہ نہیں کیا
لتا، کیونکہ یہی چیز عمل کی اصلی محرک ہے، غضب ایک جذبہ ہے جس سے دنیا میں بے شمار جھگڑے
م وستم کرائے ہیں، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا، کہ وہ سراسر بدی ہی بدی ہے اور اس میں
فائدہ متصور نہیں ہے، کیونکہ یہی چیز دنیا میں امن وامان کی ضامن ہے، ورنہ بدی وشرارت
قوتیں اس کو تباہ وبرباد کر ڈالیں، بالکل یہی حال ان جذبات وملکات کا ہے، جو لطیف اور
ل سمجھے جاتے ہیں، ان میں بھی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں بہت سی خرابیاں بھی ہیں، نجابت
سے بڑھ جائے تو تہور اور حماقت کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے، دور اندیشی اگر افراط کا پہلو اختیار
ے تو بزدلی ونامردی بنجاتی ہے، رحم اگر اپنی قدرتی حدود میں نہ رہے، تو جرائم ومعاصی کا مددگار
ا ہے، فیاضی اگر حد سے گذر جائے تو اسراف وتبذیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے، کفایت شعاری
زیادہ ہو جائے تو بخل اور کنجوسی سے بدل جاتی ہے، محبت اگر اپنی حدود میں نہ رہے تو انسان کی
ل کو اندھا کر دیتی ہے، مروت اگر بے موقع استعمال کی جائے تو بدکاریوں میں جسارت دلیری کا
ا کر دیتی ہے، علم وبردباری اگر بے محل ہو تو گستاخی اور ظلم کی محرک بن جاتی ہے، فروتنی وانکساری
بے محل ہو تو خودداری وعزت نفس خاک میں ملجاتی ہے، غرض یہ کہ نفس انسانی کو جتنی قوتیں

سانی قوتیں ہیں سب اپنے اپنے دائرہ میں مختص ہیں۔ ان سے بالا ہی ہیں جو ان قوتوں
بھلائی یا برائی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے، ورنہ کسی کے ترک اور کسی کے اختیار کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے
اس طرح ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان کے لئے صرف ہاتھ پاؤں اور قلب و دماغ ہی مفید ہیں آنکھ
ل معدہ و جگر وغیرہ کی ضرورت نہیں محض قوت سامعہ اور لامسہ کافی ہے باصرہ اور شامہ کی
رورت نہیں محض شعور و ادراک کفایت کرتا ہے، حافظہ اور تمیز کی ضرورت نہیں۔ بالکل اسی طرح
یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انسان میں صرف محبت و رحم، عفو و درگذر، عجز و فروتنی ہی کی ضرورت ہے
ر نفرت و غضب، شجاعت و شہامت، خودداری و عزت نفس، غیرت و حمیت وغیرہ کی ضرورت
ں ہے، اگر معدہ کی کمی قلب پوری نہیں کر سکتا اور جگر کی جگہ دماغ کام نہیں دے سکتا۔ تو یقیناً
ب و انتقام کی جگہ محبت و رحم، اور سیاست و تعزیر کی جگہ عفو و درگذر بھی مفید نہیں ہے جس طرح
ان کی صحت کا انحصار تمام جسمانی قوتوں کے اعتدال پر ہے، اور جس طرح صحت عقل اسی وقت
ل ہوتی ہے جب تمام قوائے ذہنی اپنا اپنا کام کرتے رہیں، ٹھیک اسی طرح کمال اخلاق بھی
ت متحقق ہوتا ہے جب جذبات و خواہشات میں اعتدال ہو نفس کی تمام قوتیں اپنے اپنے
قع و محل پر استعمال کی جائیں، اور قدرت کے دیئے ہوئے تمام ملکات کو اپنی اپنی حدود میں
کرنے کا موقع دیا جائے۔ ایک نظری مذہب کا کام اسی اعتدال کی طرف رہنمائی کرنا
نہ کہ ایک بے اعتدالی کے جواب میں دوسری بے اعتدالی اور افراط کے مقابلہ میں تفریط
ا کر دینا،

مسیحیت اس حقیقت کبریٰ کے سمجھنے سے قاصر رہی ہے اسی لئے اس نے انسان کو تارک
اور رہبانیت کی تعلیم دی اور فیصلہ کر دیا کہ انسان محض تزکیہ نفس ہی کو اپنی زندگی
مقصود العمل بنائے مگر یہ تو کمال اخلاق کا کوئی درجہ ہے، اور نہ انسانیت کی کوئی خدمت
سچ یہ ہے کہ یہ انسانیت پر ایک ظلم عظیم ہے کیونکہ اس طریق زندگی کو اختیار کرنے سے ایک
ت اپنی ذات کو ان جائز لذتوں اور آسائشوں سے محروم کر لیتے ہیں جو اللہ نے ان کے
یہ کی ہیں اور دوسری طرف اپنے وجود کو بیکار و متعطل کر کے سوسائٹی کو بھی ان کی خدمت سے
محروم کر دیتے ہیں، مسیحیت نے دنیوی بادشاہت کو آسمانی بادشاہت سے ملک کر دیا ہے

خدا اور دولت دو متضاد قوتیں قرار دی ہیں، اور سچے دینداروں کو حکم دیا ہے کہ وہ دولت کو چھوڑ کر خدا کے ہو جائیں، اور دنیوی بادشاہت سے دستکش ہو کر صرف آسمانی بادشاہت کے ہو رہیں، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دیندار، خدا ترس، ایمان دار اور سچے لوگ تو دنیا کو چھوڑ کر الگ ہو جائیں، اور دنیا کا تمام کاروبار سوسائٹی کے ان ادنیٰ طبقوں کے ہاتھ میں چلا جائے جو خدا ترسی و ایمانداری کے جوہر سے خالی ہوں، حکومت پر ظالموں کا قبضہ ہو، تجارت طماع اور بددیانت لوگوں کے حصہ میں آئے، صنعت و حرفت پر دھوکہ باز اور جعلساز قابض ہو جائیں، اور شر و فساد کی قوتیں سوسائٹی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیں، جب وہ نیکوکار لوگ جو سوسائٹی کو صحیح راستہ پر چلا سکتے ہیں، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے تو یقیناً بدکار لوگ برسر کار آئیں گے، اور ان کی بدکاریوں کی کم از کم آدھی ذمہ داری ان نیکوکاروں پر بھی عائد ہوگی جنھوں نے اپنی کمزوری سے ان کو اس کا موقع دیا،

دعوتِ مسیح کی حقیقت اس بحث سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ مسیحیت میں جنگ اور سیاست و تغلب کا نہ ہونا، اس کے کمال کی دلیل نہیں، بلکہ نقص کی دلیل ہے، اور مسیحیت جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے وہ اتنے نقائص سے بھری ہوئی ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کی پیروی دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی،

لیکن مسیح اور اس کی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے ایک اور حقیقت منکشف ہوتی ہے، جب ہم مسیح کی تعلیمات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عقائد کی موٹی موٹی باتوں کے سوا کچھ نہیں ہے، نہ ان کی کوئی شریعت ہے، نہ کوئی مستقل ضابطۂ قوانین اخلاق ہے، نہ حقوق و فرائض اور معاملات کے متعلق کسی قسم کی ہدایات ہیں، حتیٰ کہ عبادت کا کوئی طریقہ بھی متعین نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ایسا مذہب، کوئی مستقل مذہب نہیں ہو سکتا، عقائد اور چند اخلاقی ہدایات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، بہت سی ایسی چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، جن کے لئے ایک مذہب کے پیروؤں کو اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہدایات کی ضرورت پیش آتی ہے، اور جس مذہب میں یہ ہدایات موجود نہ ہوں، اس میں ایک جداگانہ دینی نظام بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح نے ایسے ہی غیر مکمل مذہب کو ایک مستقل مذہب بنانا

اور کیا مسیح اس حقیقت سے ناواقف تھے کہ یہ مذہب تمام نوع بشری بلکہ کسی ایک قوم کے لئے بھی ہر حالت میں ہر زمانہ میں قابل عمل نہیں ہو سکتا؟ مسیحیت کے متبعین اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، مگر جب ہم مسیحیت کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ان حالات پر نظر ڈالتے ہیں جن میں وہ پیدا ہوئی تھی، اور ان اغراض کی تحقیق کرتے ہیں جن کے لئے وہ وجود میں آئی تھی تو ہمیں اس کا جواب کچھ اور ملتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی مذہب خود کوئی مستقل مذہب نہیں تھا، بلکہ موسوی شریعت کی تکمیل و اصلاح کے لئے پیدا ہوا تھا، موسوی شریعت جس زمانہ میں بھیجی گئی تھی وہ بنی اسرائیل کی ذہنی طفولیت کا زمانہ تھا، ان میں کسی گہری اخلاقی تعلیم کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، اس لئے حضرت موسیٰ نے ان کو ایک سادہ عقیدہ اور ایک سیدھے سے ضابطۂ اخلاق کی تعلیم دیکر چھوڑ دیا تھا جس میں اخلاقی فضائل، روحانی پاکیزگی اور ربانی روح کی بہت کمی تھی چند صدیوں تک بنی اسرائیل اس شریعت کے پابند رہے، مگر بعد کے زمانہ میں جب ان کے معاملات نے وسعت اختیار کی تو وہ کمی جو شریعت میں رہ گئی تھی، رنگ لانے لگی، اور رفتہ رفتہ بنی اسرائیل کی اخلاقی حالت خراب ہوتی چلی گئی، اس فساد اخلاق کا طبیعی نتیجہ اضمحلال قوی کی شکل میں ظاہر ہوا، پہلے ان کی جماعت کا شیرازہ منتشر ہوا، پھر منتشر اجزا میں باہم تصادم شروع ہوا، اور آخر میں غلامی کی لعنت ان پر مسلط ہوگئی جس نے انھیں پستی و تنزل کی انتہا کو پہونچا دیا، مسیح کی پیدائش سے ۶۳۸ برس پہلے شوریوں نے ان کو مغلوب کیا، اور دو صدی تک وہ اور ان کے بعد اہل بابل انھیں پیسنے رہے، پھر ۵۳۸ ق م میں ایرانی آئے، اور دو سو برس تک ان کا دور دورہ رہا، ان کے بعد سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ان کو مغلوب کیا (۳۳۴ سنہ ۳۳۳ ق م) اور سکندر کی وفات کے بعد مصر کے بطالسہ (PTOLEMES) نے ان کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا، اس طرح ایک صدی تک بنی اسرائیل یونانیوں کی غلامی میں رہے، پھر ۱۹۸ ق م میں ایک دوسرے یونانی خاندان سلیوکیڈیا (SELEUCIDIA) نے ان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور جبراً ان میں صنم پرستی کو داخل کیا، دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں یہودیوں کو کچھ آزادی کا احساس ہوا، اور انھوں نے بغاوت کرکے ۱۴۱ سنہ ق م میں ایک آزاد یہودی حکومت قائم کر لی جو تقریباً ۸۰ برس تک زندہ رہی، مگر اس

اخلاق اس قدر بگڑ چکے تھے کہ جماعت کا شیرازہ بندھنا مشکل تھا، اس لئے ان میں پھوٹ پڑی اور انھوں نے خود ہی رومیوں کو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی، چنانچہ مسیح کی پیدائش سے ۶۰ برس پہلے انھوں نے فلسطین پر حملہ کیا اور جب مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی، سات آٹھ صدی تک بابل و نینوہ کے ستارہ پرستوں، ایران کے آتش پرستوں اور یونان و روم کے صنم پرستوں کے ماتحت غلامانہ زندگی بسر کرنے کے باعث، اس کے اندر اخلاق، شرافت، دینداری اور انسانیت کا نام و نشان تک باقی نہ تھا،

خود بائبل کے عہد عتیق میں یہودیوں کے اس اخلاقی و روحانی تنزل کی تفصیلات ہمکو بکثرت ملتی ہیں، ساتویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کے بادشاہ منسی (MANESSAH) نے اہل بابل کے اثر سے ارض مقدس میں جن گمراہیوں کو رواج دیا، اس کی کیفیت ۲ سلاطین باب ۲۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:-

"اس نے ان اونچے مکانوں کو جنھیں اس کے باپ حزقیاہ نے ڈھایا تھا پھر بنوایا اور بعل کے لئے مذبح اٹھائے، اور یسیرت بنائی جس طرح اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے کیا تھا، اور آسمان کی ساری فوج (یعنی اجرام فلکی) کی پرستش کی اور ان کی بندگی کی، اس نے خداوند کے اس گھر میں جس کی بابت خداوند نے فرمایا تھا کہ میں یروشلم میں اپنا نام رکھونگا، مذبح بنائے، اس نے آسمان کی ساری فوج کے لئے خداوند کے گھر کے دونوں صحنوں میں مذبح بنائے، اس نے اپنے بیٹے کو آگ میں گذرانا اور ساعتوں کو مانا اور جادوگری کی، اور دیووں اور افسوں گروں سے یاری کی ..... اس نے یسیرت کی مورت کو عین اس گھر میں نصب کیا جس کی بابت خداوند نے داؤد کو اور اس کے بیٹے سلیمان کو کہا تھا کہ اسی گھر میں اور یروشلم میں جسے میں نے بنی اسرائیل کے سارے فرقوں میں سے چن لیا ہے میں اپنا نام ابد تک رکھونگا"

اس عہد کی اخلاقی حالت کو ہوسیع نبی (۷۸۳ء - ۷۴۱ء ق م) نے اس طرح بیان کیا ہے:-

"اس سرزمین کے لیئے خداوند کا ایک جھگڑا ہے کیونکہ ملک میں نہ راستی ہے نہ شفقت نہ خدا شناسی۔ کوسنے، دروغ بولنے، درخون اور چوری اور حرام کاری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ پھوٹ نکلے ہیں، اور خون پر خون ہوتا ہے۔ اس لئے سرزمین ماتم کریگی اور ہر ایک جو اسمیں رہتا ہے جنگل کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں سمیت ناتواں ہو جائیگا۔" (۴: ۱-۳)

ہوشیع نبی قوم میں یسعیاہ نبی کہتے ہیں:-

"تمام سر بیمار ہے اور دل بالکل سست ہے۔ تلوے سے لیکر چندیا تک اسمیں کہیں صحت نہیں ہے بلکہ زخم اور چوٹ اور سڑے ہوئے گھاؤ ہیں ..... تمہارا ملک اجاڑ ہے تمہاری بستیاں جل گئیں۔ پردیسی لوگ تمہاری زمین کو تمہارے سامنے نگلتے ہیں۔ وہ ویران ہے گویا کہ اسے اجنبی لوگوں نے جا تاراج کیا۔" (۱: ۵-۷)

"وہ بستی جو سراسر پاک دامن تھی کیسی چھنال ہو گئی! وہ تو انصاف سے معمور تھی، راستبازی اس میں بستی تھی پر اب خونی رہتے ہیں۔ تیری چاندی میل ہو گئی تیری مے میں پانی مل گیا۔ تیرے سردار گردن کش چوروں کے شریک ہیں۔ ان میں سے ہر ایک رشوت دوست اور انعام طلب ہے۔ وہ یتیموں کا انصاف نہیں کرتے اور بیواؤں کی فریاد ان تک نہیں پہونچتی۔" (۱: ۲۱-۲۳)

"ان کے جشن کی محفلوں میں بربط اور بین اور دف اور بانسری اور مے کا دور ہے لیکن وہ خداوند کے کام پر غور نہیں کرتے اور اس کے ہاتھوں کی کاریگری کو نہیں دیکھتے اس لئے میری قوم اسیری میں مبتلا ہو گئی کیونکہ وہ علم نہیں رکھتی۔ ان کے عزت والے بھوکوں مرتے اور عوام پیاس سے خشک ہوئے جاتے ہیں۔ اس لئے دوزخ نے وسعت اختیار کر لی ہے اور اپنا منہ بے اندازہ کھول دیا ہے۔ ان کے شان و شوکت والے اور عوام اور تمام فخر کرنے والے اسمیں جا پڑیں گے۔" (۵: ۱۲-۱۴)

"ان پر وا ویلا ہے جو مے پینے میں زور آور اور نشے کی چیز ملانے میں طاقتور ہیں جو رشوت کی خاطر بدکاروں کو صادق ٹھہراتے ہیں اور صادقوں سے ان کا حق چھین لیتے ہیں۔ اسلئے جس طرح

کے بھوسی کو کھا جاتی ہے اور جلتا ہوا پھونس مٹھ جاتا ہے، اسی طرح ان کی جڑ بوسیدہ ہوگی اور ان کی کلی گرد کی طرح اڑ جائیگی، کیونکہ انھوں نے رب الافواج کی شریعت کو ناجائز ٹھہرایا اور اسرائیل کے قدوس کے سخن کو ذلیل جانا" (۵ : ۲۲ - ۲۴)

اسی عہد کے ایک اور نبی حضرت میکاہ کہتے ہیں:-

"اے یعقوب کے سرداروا! اور بنی اسرائیل کے قاضیو! تم جو نیکی سے کینہ رکھتے ہیں اور بدی کو پیار کرتے ہیں، جو لوگوں کا پوست ان پر سے کھینچتے ہیں اور ان کی ہڈیوں تک سے گوشت نوچتے ہیں، اور جو میری قوم کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی کھال ان پر سے کھینچتے ہیں، اور ان کی ہڈیوں کو توڑتے ہیں، اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں" (۳ : ۲ - ۳)

"تم کہ عدالت سے عداوت رکھتے ہو اور ساری راستی کو الٹا دیتے ہو، اس بات کو سنو تم صیہون کو خوں ریزی سے، اور یروشلم کو بے انصافی سے تعمیر کرتے ہو، اس کے سردار رشوت لیکر عدالت کرتے ہیں، اور اس کے کاہن اجرت لیکر تعلیم دیتے ہیں، اور اس کے غیب گو نقد لیکر رمالی کرتے ہیں" (۳ : ۹ - ۱۱)

انبیائے بنی اسرائیل کے ان اقوال سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ اس زمانہ میں یہودیوں سے شریعت کی اصلی روح یعنی ایمان، صداقت، دیانت، عدل، انصاف اور پاکیزگی اخلاق رخصت ہو چکی تھی، حرام خوری، حرص و طمع، ظلم و جفا اور بے حیائی و بدکاری نے ساری قوم کو گھیر لیا تھا، ان کے حاکم ظالم، ان کے پیشوا ریاکار، ان کے سردار خائن، اور ان کے عوام معصیت پیشہ ہوگئے تھے، انھوں نے شریعت کے الفاظ اور ظاہری رسوم و شعائر ہی کو اصل شریعت سمجھ لیا تھا، اور اس معنوی حقیقت کو فراموش کر دیا تھا جو ہر شریعت حقہ کے احکام میں مقصود اصلی ہوتی ہے، اس روز افزوں پستی و ظاہر پرستی کو دیکھ کر مسیح سے بہت پہلے بنی اسرائیل کے انبیا اصلاح کی ضرورت محسوس کر چکے تھے، اور انھوں نے مواعظ و نصائح سے ان کو یہ بھولی ہوئی حقیقت یاد دلانی شروع کر دی تھی کہ خدا محض قربانیوں اور دعاؤں سے خوش نہیں ہوتا، بلکہ صداقت، ترحم اور حسن معاملت سے خوش ہوتا ہے، اور اس کی مہربانی حاصل کرنے کے لئے بھنوو و گداز اور محبت و ایثار کی ضرورت ہے، چنانچہ بائبل میں انبیاء متاخرین کے ایسے نصائح ہم کو بکثرت ملتے ہیں یسعیاہ نبی فرماتے ہیں:-

خدا فرماتا ہے تمھارے دینوں کی کثرت سے مجھے کیا کام ہے میں بکروں کی موٹی
قربانیوں اور فربہ بچھڑوں کی چربی سے سیر ہو چکا ہوں میں بیلوں اور بھیڑوں اور بکروں
کا لہو نہیں چاہتا ..... اب میرے سامنے جھوٹے نذرانے مت لاؤ لوبان
سے مجھے نفرت ہے اور نوچندی اور سبت اور جماعت عید سے بھی کیونکہ میں عید اور
بے دینی دونوں کو برداشت نہیں کر سکتا میرا جی تمھاری نوچندیوں اور تمھاری عیدوں
سے بیزار ہے وہ مجھ پر وبال ہیں میں ان کے اٹھانے سے تھک گیا جب تم اپنے
ہاتھ پھیلاؤ گے میں تم سے اعراض کرونگا جب تم دعاؤں پر دعائیں مانگو گے تو میں نہ
سنوں گا کیونکہ تمھارے ہاتھ تو لہو سے بھرے ہوئے ہیں اپنے تئیں دھو کر پاک
کرو اپنے برے کاموں کو میرے سامنے سے دور کرو بدکاری سے باز آؤ نیکو کاری سیکھو
انصاف کے پیرو ہو مظلوموں کی مدد کرو یتیموں کی فریاد رسی کرو بیوہ عورتوں کے حامی
ہو ..... اگر تم راضی اور فرمانبردار ہو گے تو زمین سے اچھے پھل کھاؤ گے اور
اگر انکار کرو گے اور بغاوت اختیار کرو گے تو تلوار کا لقمہ بن جاؤ گے ۔ (۱ : ۱۰ - ۲۰)

ایک دوسرے موقع پر یسعیاہ نبی عبادات و اعمال کی معنوی روح اور خصوصیت غایت کا درس
اس طرح دیتے ہیں :-

"تم اس مقصد سے روزہ رکھتے ہو کہ لڑائی جھگڑا کرو اور جہالت کے گھونسے مارو اس طرح
کا روزہ جیسا کہ آج کل تم رکھتے ہو مقبول نہیں ہو گا کیا یہی وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے
ایسا دن جس میں آدمی اپنی جان کو فضول دکھ دے اور اپنے سر کو جھاؤ کی طرح جھکائے
اور ٹاٹ اور راکھ کی طرح بچھائے کیا تم اس کو روزہ اور خدا کا مقبول دن کہو گے؟
کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں ہے کہ ظلم کی زنجیریں توڑی جائیں جوئے کے
بندھن کھولے جائیں مظلوموں کو آزاد کیا جائے بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالا جائے
کیا یہ نہیں کہ تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں
پناہ دے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنائے اور تو اپنے ہمجنسوں سے منہ نہ
چھپائے؟ ..... اگر تو اپنے دل کو بھوکے کی طرف مائل کرے اور آزردہ

تب تو میرے تو تیرا نور تاریکی میں طلوع کریگا، اور تیری تیرگی نصف نہار کی طرح چمک اٹھے گی۔" (۵۸: ۴-۱۰)

ایک اور نبی حضرت میکاہ اسی روحانی تعلیم کی اس طرح تجدید کرتے ہیں:-

"میں کیا لے کے خداوند کے حضور میں جاؤنگا، کیونکر خدائے تعالیٰ کو سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور یکسالہ بچھڑوں کو لیکر اس کے آگے جاؤنگا؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلونٹے کو اپنا گناہ کے عوض، اپنے پیٹ کے پھل کو اپنی روح کی خطا کے عوض دے سکوں گا؟ نہیں اے انسان اس نے تجھے وہ راہ دکھادی ہے جو نیک ہے، خداوند تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے، کہ تو انصاف کرے، رحم دلی کو پیار کرے اور اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے پیش آئے۔" (۶: ۶-۸)

یہ تعلیم سات صدیوں تک بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آتی رہی، اور بنی اسرائیل کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی، ان میں جو اخلاقی مفاسد جڑ پکڑ گئے تھے، انھیں دور کرنے کے لئے ایک زیادہ طاقتور مصلح کی ضرورت تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح کو مبعوث فرمایا، اور انھوں نے اسی میکاہ اور یسعیاہ والی تعلیم کو نئے جوش اور نئی روح کے ساتھ پیش کیا، انبیاء سابقین کی طرح ان کی تعلیم بھی شریعت موسویہ کو منسوخ کرنے اور اس کی جگہ کوئی الگ مذہب قایم کرنے کے لئے نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد صرف اس کمی کو پورا کرنا تھا جو موسوی شریعت میں باقی رہ گئی تھی، اور اس اخلاقی فضیلت کی روح کو ملت یہودیہ میں پھونکنا تھا، جس کی وہ ضرورت مند تھی، اس وقت یہودی اخلاق میں راستبازی، دیانت، علم، عفو، زہد، قناعت، سیر چشمی، خداپرستی، رحم، فروتنی اور ایثار کی کمی تھی، وہ حد سے زیادہ طماع، دنیا پرست، بندۂ غرض اور دنی الطبع ہو گئے تھے، ان میں دینداری کی روح باقی نہ رہی تھی، جو انسانیت کی جان ہے، اس لئے مسیح نے اپنی پوری قوت انگیز لقائص کو دور کرنے میں صرف کی اور اصل یہودی شریعت کو برقرار رکھ کر صرف ان چیزوں کا اس میں اضافہ کیا، جن کی اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضرورت تھی، پس دین مسیحی کو ایک

ف اس حقیقت کو [illegible] تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ مانا ہوئے کہ ایک مشہور مسیحی فاضل ڈین انج نے جن کو

[illegible] ہے [illegible] ہے [illegible]

بالکل یہی بات خود انجیل میں حضرت مسیح کی زبان سے ادا کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں :-

"یہ نہ سمجھو کہ میں توراۃ یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں، کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں توراۃ کا ایک نقطہ یا ایک شوشہ بھی پورا ہوئے بغیر نہ ٹلے گا، پس جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا، اور آدمیوں کو ایسا کرنے کی ہدایت کریگا، وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائیگا، لیکن جو ان پر عمل کریگا، اور ان کی تعلیم دیگا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کہلائیگا، پس میں تمہیں کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری راست بازی فقیہوں اور فریسیوں کی راست بازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو سکوگے" (متی ۵: ۱۷، ۲۰، لوقا ۱۶: ۱۷)

ایک دوسری جگہ اپنے پیروؤں کو حکم دیتے ہیں :-

"فقیہہ اور فریسی موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں، پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں، سب عمل میں لاؤ، اور مانتے رہو، لیکن ان کے سے کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں، وہ ایسے بھاری بوجھ جنہیں اٹھانا بھی مشکل ہے، دوسروں کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں، پر آپ انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے" (متی ۲۳: ۲-۴)

یوحنا نے بھی اپنی انجیل میں لکھا ہے کہ :-

"شریعت موسیٰ کی معرفت دی گئی، اور فضل و صداقت یسوع مسیح کی معرفت پہونچی" (۱: ۱۷)

ان اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسیحیت میں موسوی شریعت کے تمام احکام باقی رکھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۲) نیسہ سیب ول کا سب سے بڑا مصنف مسیحی تاریخ جیروم ہے، وہ لکھتا ہے :-

"مسیح نے بھی موسوی تعلیم سے تجاوز نہیں کیا، انکو کوئی نئی تعلیم نہیں دی، موسوی شریعت کی بنیادوں کو مضبوط کیا، اور معجزات میں وہ اگر دوسروں سے بڑھ چڑھ جاتے تھے لیکن بے علم و وقت کی باتوں و جھوٹی قسموں میں اس طرح سے موسوی شریعت سے الگ ہوئے تھے اور مسیح نے صاف یہودیوں کے سے خود کو شریعت موسیٰ کی تعلیم دیں کی۔

سے ہیں، اور ان پر صرف نفسیت و صداقت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مسیحیت میں جنگ نہ ہونے کی وجہ اب یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ مسیحیت میں جنگ، صلح، حکومت، سیاست، تعزیرات وغیرہ کے متعلق وہ تمام احکام باقی رکھے گئے تھے جو توراۃ میں مذکور تھے، اور دین مسیحی ان میں سے کسی کا حق کہ ایک لفظ اور ایک شوشے کا بھی منکر نہ تھا، لیکن مسیح نے ان احکام کی تنفیذ اس لئے نہیں کی کہ جس عہد میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کی تنفیذ کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ مسیح کی بعثت کے وقت ان کی قوم سات آٹھ سو برس سے غیر قوموں کی غلامی میں مبتلا تھی، انکی ولادت سے ۶۰ برس پہلے ہی روم کی فوج نے فلسطین پر حملہ کیا تھا، اور اسے اس سرے سے اس سرے تک پامال کرتی چلی گئی تھی، جس وقت مسیح نے آنکھ کھولی تو ان کی پوری قوم رومیوں کی قید غلامی میں جکڑی ہوئی تھی، خود ان کا وطن یہودیہ ۶ سنہ میں براہ راست رومی صوبہ داروں کے زیر انتظام آگیا تھا جو پروکیوریٹر (Procurator) کہلاتے تھے، جب ان کی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز ہوا تو یہ دستم کا پروکیوریٹر پونتوس پیلاطس (Pontius Pilata) جیسا بے انصاف اور بے ضمیر شخص تھا اور ان بے دین آقاؤں کی غلامی میں بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی حالت اس حد تک خراب ہو چکی تھی کہ وہ کلمۂ حق سننے کے لئے بھی تیار نہ تھے، مسیح کی آنکھوں کے سامنے گلیل کا رئیس ہیرودیس محض ایک رقاصہ کو خوش کرنے کے لئے حضرت یحییٰ (John the Baptist) کو قتل کرا چکا تھا، اور خود مسیح کی قدر و قیمت بھی ان کی قوم میں جیسی کچھ تھی اس کا حال اس سے ظاہر ہے کہ آخر میں انھوں نے برابا نامی ڈاکو کی جان کو مسیح کی جان سے زیادہ قیمتی سمجھا، ایسی حالت میں مسیح کے لئے کیونکر ممکن تھا کہ جنگ کرتے اور آزاد قومی حکومت قایم کرنے کا خیال بھی دل میں لاتے، وہ دیکھ رہے تھے کہ یہودیوں کی رگ رگ سے نکل چکی ہے، ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی اور ان کی قومیت میں کوئی زندگی باقی نہیں ہے، اس لئے ان کا سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اپنی قوم کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے سے نکالتے جس میں وہ گری ہوئی تھی، اور اس میں فضیلت اخلاق کی وہ روح پھونکتے جس کے بغیر کوئی قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور دنیا میں اپنے آزاد وجود کو برقرار رکھنے پر قادر نہیں ہو سکتی، چنانچہ اول اول انھوں نے قومی سیرت کے اسی پہلو کی طرف توجہ کی، اور اپنے اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک ایسی پرامن فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں حکومت وقت سے کسی قسم کے تصادم کا موقع نہ آئے، کیونکہ اگر ابتدا

جی میں حکومت سے مقابلہ شروع ہو جاتا۔ تو حضرت عیسیٰ کی دعا بھی نہ ہوتی اور اس کے بجائے حکومت سے مقابلہ میں بھی ناکامی ہوتی۔ اسی لئے انھوں نے حکومت کی اطاعت کا حکم دیا۔ اور کہا کہ:۔

"جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔ اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو" (لوقا ۲۰ : ۲۵)

انھوں نے حکم دیا کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو۔ جو تم پر ظلم کرے اسے دعا دو۔ اور اس کے لئے برکت چاہو جو تمھیں بیگار میں پکڑے اس کے ساتھ ایک کوس کے بجائے دو کوس جاؤ۔ جو تمھارا کرتہ چھینے اس کو جامہ بھی اتار دو۔ جو تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ ابتداً ان سب احکام کا مدعا یہ تھا کہ حکومت سے تصادم نہ ہو۔ اور قوم میں مصیبت جھیلنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی قوم کو استقامت صبر تحمل۔ اور بے خوفی کی تعلیم دینی شروع کی۔ ان کو مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنے کے لئے طیار کیا۔ اور ان کے دل سے موت کا خوف اور حاکمانہ قوت و طاقت کا ڈر نکالنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ جب تم حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے پیش کئے جاؤ۔ تو تمھیں اور باتیں دی جائیں تو اس وقت ثابت قدم رہنا (مرقس ۱۳) انھوں نے جان کی محبت دلوں سے نکالنے اور مرنے کی آمادگی پیدا کرنے کے لئے کہا کہ:۔

"جو کوئی اپنی جان بچانا چاہے وہ اسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوئیگا وہی اسے بچائے گا" (لوقا ۹ : ۲۴)

انھوں نے حکومت اور اس کی عنایت پر بھروسہ رکھنے کے بجائے خدا اور اس کی رزاقی پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم دی تاکہ غلامی کی دوسری بڑی کمزوری دور ہو جو ایک غلام قوم کو حکام قوم کے تحکم میں گرفتار رکھتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ:۔

"جب تم برے ہو کر اپنے لڑکوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمھارا آسمانی باپ مانگنے والوں کو روح القدس کیوں نہ دیگا" (لوقا ۱۱ : ۱۳)

انھوں نے حکومت کا رعب داب لوگوں کے دلوں سے دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ:

"جو جسم کو قتل کرتے ہیں روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اصل میں ڈرنے کے قابل وہ ہے جو روح اور جسم دونوں کو جہنم میں برباد کر سکتا ہے" (متی ۱۰ : ۲۸)

یہ سب باتیں ایک صدیوں کی غلام قوم میں آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے

ضروری تھیں، اور بعد میں مسیح نے انھیں تک اپنی تعلیم کو محدود رکھا۔ اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد آخری زمانہ میں وہ جہاد و قتال کے مضمون کی طرف بڑھ رہے تھے، اور کبھی کبھی اپنے دشمنوں کو قتل کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:-

"میرے ان دشمنوں کو جنھوں نے نہ چاہا کہ میں ان پر بادشاہی کروں، یہاں لاکر میرے سامنے قتل کرو"

اسی طرح انھوں نے اپنے متبعین کو تلوار رکھنے کا حکم بھی دیا تھا جیسا کہ لوقا نے لکھا ہے کہ:-

"اس نے ان سے کہا کہ اب جس کے پاس بٹوا ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی اور جس کے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔ ..... انھوں نے کہا کہ اے خداوند! دیکھ یہاں دو تلواریں ہیں، اس نے کہا بہت ہیں"

لیکن مسیح کو اپنی قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے صرف ڈھائی تین سال کی مدت نصیب ہوئی اور یہ مختصر مدت ایک پوری قوم کو آزادی کی جنگ کے قابل بنانے کے لئے کافی نہیں تھی، اس عرصہ میں نہ تو ان کے پیروؤں کی تعداد اس حد تک پہونچی تھی کہ وہ رومیوں کے مقابلہ پر ان سے کوئی کام لے سکتے اور نہ خود ان لوگوں کی جو ان کے پیرو ہو چکے تھے، اخلاقی تربیت اس قدر مکمل ہوئی تھی کہ وہ رسول عربیؐ کے صحابیوں کی طرح جرأت و عزیمت کے ساتھ ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرتے، گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر جاتے اور بڑی سے بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں بھی بے خوف ہو کر جانیں لڑا دیتے، ان لوگوں کے ایمان بھی اتنے بھی قوی نہ ہوئے تھے کہ وہ علانیہ اظہار حق کی جرأت کرتے۔ مسیح کے سب سے زیادہ محبوب اور معتمد علیہ حواری پطرس کا یہ حال تھا کہ ان کی گرفتاری کے وقت جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تم بھی مسیح کے پیرو ہو؟ تو اس نے مرغ کے دو دفعہ بانگ دینے سے پہلے تین دفعہ مسیح کا انکار کر دیا، (مرقس ۱۴: ۳۰) ان کے ایک اور حواری یہودا اسکریوتی نے چاندی کے ۳۰ سکوں کے خاطر ان کو گرفتار کرا دیا، (متی ۲۶: ۱۶) اور جب ان کو گرفتار کر لیا گیا تو ان کے سارے شاگرد انھیں چھوڑ کر بھاگ گئے (متی ۲۶: ۵۶) غرض یہ ہے کہ جب ان کے خاص حواریوں اور بھروسہ کے شاگردوں کا یہ حال تھا تو وہ ایسی ناقابل اعتماد فوج کو لیکر جہاد کی جرأت کیونکر کر سکتے تھے، اگر رسول عربیؐ کی طرح ان کو بھی تعلیم و تربیت کا کافی موقع ملتا تو ممکن تھا کہ وہ بھی اپنے حواریوں میں وہی مجاہدانہ روح پیدا کر دیتے جو صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ے پیدا ہی تھی لیکن ان کی سرکش قوم نے ان کی نبوت کو پورے تین سال بھی برداشت نہ کیا اور انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اس کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی بڑا کام کر سکتے۔ اس قلیل مدت میں زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کام ہو سکتا تھا جتنا حضرت مسیح نے کیا۔ خود وہ بھی اسلام علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نبوت کے ابتدائی تین سال پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس میں بھی ہمیں جہاد و قتال کا نشان نہ ملے گا، وہی صبر و تحمل، اثبات و استقامت، خشیۃ و توکل الی اللہ، تزکیۃ النفس و تسویۃ اخلاق کی تعلیمات پائی جائیں گی جو مسیح کی حیات نبویہ میں پائی جاتی ہیں۔

مسیحیت اور موسوی شریعت کا تعلق اس علم و بصیرت کی روشنی میں اگر مسیح کی تعلیمات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہو جائے گی۔

ایک قسم وہ ہے جس میں مسیح نے شریعت موسویہ کی اصلاح کی ہے اور اس میں ضروری اضافے کیے ہیں۔ موسوی شریعت میں رافت و رحمت اور شفقت و محبت کی کمی تھی۔ مسیح نے اس کا اضافہ کیا۔ اس کے قوانین میں لچک بالکل نہ تھی اور اس کی تعمیلات انسانی برداشت سے باہر تھیں۔ ان میں مسیح نے اس کمی کو پورا کیا۔ اور بنی اسرائیل کو تلقین کی کہ انسان کے ساتھ ہمیشہ محبت کرنے کی تلقین کی۔ اس میں انسان کے محض فرائض پر زور دیا گیا تھا اور حسان یا فضیلت اخلاق کے حصہ کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ مسیح نے جب زیادہ سے زیادہ [illegible] اور [illegible] کی تعلیم کی [illegible] کی تعلیم کا [illegible] تھا۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مسیح نے [illegible] اور [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کی

جنگ کی معنوی قوت پیدا کرنے کے لئے صبر، استقامت، بے خوفی و پختگی عزم و ارادہ کی قوت پیدا کرنے کی کوشش کی یہ مسیح کی تعلیم کا یہ دوسرا حصہ بنی اسرائیل کی خاص اسی حالت کے لئے مخصوص تھا جس میں بعثت مسیح کے وقت وہ مبتلا تھے، اس کو کوئی دائمی اور عالمگیر قانون بنانا ہرگز مقصود نہ تھا، خصوصیت کے ساتھ تذلل و انفعال کی یہ تعلیم کہ "شریر کا مقابلہ نہ کر" "جو کوئی تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے اس کے آگے دوسرا گال بھی پیش کر دے" "جو کوئی تیرا کرتہ چھینے اسے چوغہ بھی اتار دے" یہ دراصل غلامی و بے بسی کی ایک مخصوص حالت کے لئے تھی، اس کو کسی آزاد قوم کی سیاسی پالیسی بنانا نہ تو مطلوب تھا اور نہ یہ کسی طرح درست اور معقول ہو سکتا تھا۔

شریعت اور مسیحیت کی علیحدگی۔ لیکن مسیح کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے چند ہی برس بعد ان تمام اصول و قواعد کو یک لخت منہدم کر دیا گیا جن پر انھوں نے اپنے مذہب تجدید و اصلاح کی بنیاد رکھی تھی اور اصل مسیحی مذہب کو ایسا بدل دیا گیا کہ دنیا میں اس کے وجود کا نام و نشان تک نہ رہا، اس عمل تحریف و تسخ کا محرک سینٹ پال (پولوس) تھا، ہم اس کی نیت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے، ممکن ہے، کہ مسیح کی زندگی میں، اور ان کے بعد بھی ۶ برس تک ان کی دعوت کا شدید دشمن رہنے کے باوجود وہ سچے دل سے مسیح کا پیرو اور وکیل بن گیا ہو، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسیح کا صحبت یافتہ نہ تھا، ان کی تربیت میں رہکر اسے مسیحیت کی اصلی روح کو سمجھنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، اور وہ ان حواریوں کے مقابلہ میں جو مسیح کے زیر تربیت رہ چکے تھے مسیحی تعلیمات کو زیادہ سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا اس لئے جب اس نے پطرس جیسے حواریوں کی رائے کے خلاف مسیحیت کی تعبیر و تاویل کی اور اسے اپنی نو ایجاد بنیادوں پر قایم کیا، تو یہ بدنیتی نہ سہی جہل و ناواقفیت کی بنا پر یقیناً ایک کھلی ہوئی تحریف تھی[1]۔

اس سلسلہ میں پولوس نے مسیحیت کے اصول میں جو تحریفات کیں ان میں سب سے پہلی تحریف یہ تھی کہ مسیحیت کو تمام عالم انسانی کے لئے ایک عام پیغام قرار دیا حالانکہ در اصل وہ محض بنی اسرائیل

[1] خود سینٹ پال کے شاگرد لوقا کی کتاب "اعمال" سے ثابت ہوتا ہے کہ مسیح کی زندگی میں اس کو ان کی صحبت اور تربیت سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا، نیز یہ کہ جب اس نے مسیحیت میں تحریف شروع کی تو مسیح کے خاص تربیت یافتہ حواریوں نے اسکی سخت مخالفت کی تھی، پس خود انجیل کی سند پر کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ پال کے ایجاد کردہ اصول نہ صرف مسیحیت کی اسپرٹ کے خلاف تھے بلکہ خود مسیح کی صریح ہدایات کے بھی خلاف تھے۔

کے تھی یہ مسیح نے اپنی زندگی میں جب حواریوں کو تبلیغ و دعوت کے لئے بھیجا تھا تو ان کو یہ حکم دیا تھا کہ:-

"غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں ہی کے پاس جانا" (متی ۱۰: ۵-۶)

خود مسیح نے اپنے پورے عہد نبوت میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غیر اسرائیلی قوموں کو اپنے دین کی طرف دعوت نہیں دی، اور نہ کسی غیر اسرائیلی کو داخل دین کیا۔ سینٹ پال کے ظہور سے پہلے مسیح کے حواری بھی صرف اسرائیلیوں کو دین کی دعوت دیتے رہے۔ مسیحیت کے مبلغ بھی اسرائیلی تھے، اور اس کے مخاطب بھی اسرائیلی، اس وقت تک مسیحی مذہب یہودی مذہب کا ایک اصلاحی فرقہ شمار ہوتا تھا۔ حواریوں میں یہ ایک مسلم مسئلہ تھا کہ انجیل کی منادی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو شریعت موسوی کے پیرو ہیں۔ پیروان مسیح کی جو پہلی عام سنہ ۴۹ء میں بمقام یروشلم منعقد ہوئی تھی اس میں ایک بڑی جماعت اسی رائے کی موید تھی۔ لیکن جب مسیحیت کی حقیقت، مسیح کی تصریحات، حواریوں کے علم و یقین سب کو نظر انداز کر کے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسیح کی دعوت تمام دنیا کی قوموں کے لئے ہے، اور اس فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے یہ دعویٰ کیا گیا کہ مسیح صلیب پر چڑھنے و وفات پا جانے کے بعد اپنے شاگردوں کے پاس آئے اور یہ حکم دیا تھا کہ تم جاؤ سب قوموں کو شاگرد بناؤ (متی ۲۸: ۱۹)

لیکن غیر اسرائیلی قوموں کو موسوی قوانین کا پابند بنانا بہت مشکل تھا۔ بہت سے مسلم و مشرک قبیلے ایسے تھے جن قوموں کو نفرت تھی اس سے وہ کبھی یہ نہیں [illegible] جو ان قوموں کو مسیحیت کی طرف دعوت دیجائے تو موسوی شریعت کی پابندی [illegible] ان باتوں میں مسیح یہ تھیں وہ [illegible] تھے [illegible] ان کو [illegible] نہیں مل سکتا [illegible] ان قوموں کو [illegible]

کی بادشاہت میں وہی داخل ہوسکتا ہے، جو توراۃ کے حکموں پر عمل کرے" ان تصریحات کے بعد کسی سچے مسیحی کے لئے ممکن نہ تھا کہ مسیحیت کو موسوی شریعت سے الگ کرتا، مگر پولوس نے انکے علی الرغم یہ فیصلہ کیا کہ ہر غیر اسرائیلی مسیحی بن سکتا ہے، خواہ شریعت پر عمل کرے یا نہ کرے، چنانچہ وہ تمام غیر اسرائیلی مشرکین جو شریعت موسویہ کے کلی یا جزوی طور پر منکر تھے، مسیحیت میں داخل کر لئے گئے،

اس ترمیم و تنسیخ پر عام ناراضی کا اظہار کیا گیا (اعمال باب ۲۱) اور خود مسیحیت کے اعیان نے بھی اس کی سخت مخالفت کی، مگر پولوس نے سینٹ پیٹرس اور سینٹ برناباس جیسے جلیل القدر حواریوں کو ریاکار اور گمراہ قرار دیا (گلیتیوں ۲: ۱۴) اور علی الاعلان شریعت موسویہ کی مخالفت شروع کر دی، وہ گلیتیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے:-

"ہم یہ جان کر یسوع مسیح پر ایمان لائے کہ آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے برحق ٹھہرتا ہے ..... شریعت کے اعمال سے کوئی بشر برحق نہ ٹھہریگا ..... حمایت اگر شریعت ہی کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا" (۲: ۱۶-۲۱)

"جو لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں سب لعنت کے ماتحت ہیں ..... شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا، کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ..... مسیح نے ہمارے لئے لعنتی بنکر اور ہمیں خرید کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا"

(۳: ۱۰-۱۳)

"شریعت ایمان (یعنی مسیح کی تعلیم) تک پہنچانے کے لئے ہمارا استاد بنی تاکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں، مگر جب ایمان آچکا تو ہم استاد کے ماتحت نہ رہے" (۳: ۲۴-۲۵)

"مسیح نے ہمیں آزاد رہنے کے لئے آزاد کیا ہے، پس قائم رہو، اور دوبارہ غلامی (یعنی شریعت کی پابندی) کے جوے میں نہ جتو ..... تم جو شریعت کے وسیلہ

سے بچوں، بوڑھوں اور سینکڑوں عیسائی عورتوں، مردوں اور بچوں کو روم کے اکھاڑوں میں وحشیانہ کھیلوں کا تختۂ مشق بنایا جانے لگا۔ اسکے میں ٹیٹوس (TITUS) کے زیر قیادت بیت المقدس پر چڑھائی کی گئی، ۹۷ ہزار آدمی گرفتار کرکے غلام بنالئے گئے، گیارہ ہزار آدمیوں کو بھوکا مار دیا گیا، ہزاروں آدمی پکڑ کر روم کے اکھاڑوں اور مختلف تھیٹروں میں جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے یا سپاہیوں کی شمشیر زنی کا تختۂ مشق بننے کے لیے بھیجدیئے گئے۔

نیرو کے بعد مارکوس آریلیوس، سیپٹیموس سیوروس، ڈیسیوس اور والیریان نے مسیحیت اور اس کے پیروؤں کو کچلنے کی کوششیں کیں۔ اور آخر میں ڈایوکلیٹیان نے ظلم و ستم کی حد کردی۔ اس نے عام حکم جاری کردیا کہ کلیسا مسمار کردیئے جائیں، انجیلیں جلا دیجائیں، اور کلیساؤں کے اوقاف ضبط کرلیے جائیں۔ ۳۰۳ء میں خود شہنشاہ نے نیکومیڈیا کے مرکزی کلیسا کو پیوند خاک کردیا، اور مقدس کتابیں جلوادیں۔ ۳۰۴ء میں اس نے عام حکم دیدیا کہ جو شخص مسیحی مذہب پر اصرار کرے وہ قتل کردیا جائے۔ اس کے بعد سختیاں اور بڑھیں یہاں تک کہ جو لوگ مسیحی مذہب چھوڑنے سے انکار کرتے ان کے بدن زخمی کرکے ان پر سرکہ اور نمک ڈالا جاتا۔ اور بعد میں ان کی بوٹی بوٹی کاٹی جاتی تھی۔ بعض اوقات ان کو کنبسوں میں بند کرکے آگ لگادی جاتی اور زیادہ لطف اٹھانے کے لئے ایک ایک عیسائی کو پکڑ کر دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جاتا تھا، یا لوہے کے کانٹے اس کے بدن میں بھونکے جاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ تمام سلطنت میں عیسائی پھیلے ہوئے تھے۔ سلطنت کے بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے عہدے بکثرت ان کے ہاتھ میں تھے اور خود شہنشاہ کے قصر میں عیسائیوں کی ایک کثیر جماعت موجود تھی۔ لیکن مسیحیوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس کثرت و قوت کے زمانہ میں بھی وہی شریر کا مقابلہ نہ کرنے اور ایک گال کے ساتھ دوسرا گال بھی پیش کردینے کی تعلیم واجب العمل ہے، جو اسرائیلیوں کو انتہائی بے بسی و کمزوری کی حالت میں دی گئی تھی۔ اس لئے شام، فلسطین، عراق، مصر، افریقہ، اسپین، گال، سسلی، اٹلی، الیریا، ایشیائے کوچک غرض کہیں بھی کسی عیسائی نے ان مظالم پر دم نہ مارا اور ساری قوم ان تجاوزات کو خود کشانہ بے عملی کے ساتھ برداشت کرتی رہی۔ حالانکہ رسول عربی صلعم کی امت

---

۱ GIBBON VOL. II. CH. 16-EARLY DAYS OF CHRISTIANITY. P. 488-89

۲ CONSTANTINE THE GREAT BY REUGUTTS. P.P. 55-60

ں کو تباہ کی تعلیم دی تھی جب ڈھائی تین سو کی تعداد کو پہونچی تو اس نے تمام عالم کو متحد ہو کا
بلنج دیدیا اور دنیا کو بتا دیا کہ جس قوم میں یہ جانبازانہ اسپرٹ موجود ہو وہ قلت تعداد اور بے سروسامانی
کے باوجود کسی سے دب کر نہیں رہ سکتی۔

یہ تو مسیحیت کی تفریط تھی، اس کے بعد جب قسطنطین اعظم نے اس کو قبول کر لیا اور وہ یکلخت سلطنت کا
مذہب بن گئی تو وہ تفریط کے انتہائی نقطہ سے افراط کے انتہائی نقطہ پر پہونچی پہلی خرابی تو اس سے
پیدا ہوئی تھی کہ پولوسی مسیحیت کو سیاست و تمدن سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کے پیروؤں نے اپنے مذہب
کو یا بندی کرتے ہوئے ایک خالص انفعالی زندگی اختیار کر رکھی تھی، مگر جب اتفاق وقت سے اس
سلطنت کی ذمہ داریاں آن پڑیں تو دوسری اور پہلے سے زیادہ شدید خرابی یہ پیدا ہوئی کہ جہانبانی
حکمرانی کے لئے مسیحیت نے ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی معاملات سلطنت میں تو جنگ بھی ہے، صلح بھی
ہے، سیاست بھی ہے، تدبیر بھی ہے، انتظام بھی ہے، عفو بھی ہے، مگر موسوی شریعت سے جدا ہونے کی وجہ
مسیحیت کے پاس ان میں سے کسی کام کے لئے بھی کوئی ضابطہ قانون اور دستور العمل موجود نہ تھا، اس نے
زندگی کے معاملات کے لئے بجز اس ایک قانون کے کہ شریر کا مقابلہ نہ کرو اور کرتہ چھیننے والے کو چوغہ
بھی اتار دے، اور کوئی قانون نہ بنایا تھا، مگر اس انفعال و تذلل کی تعلیم کے تنگ دائرے میں رہ کر مسیحیوں
کے لئے ناممکن تھا کہ سلطنت کے اہم معاملات کو نبھا سکتے، اس سے وہ اس دائرے کو توڑ کر نکلنے
پر مجبور ہوئے، جب اس سے توڑ کر باہر نکل آئے، تو وہ اپنے نفس کے تخیلی پیمانے میں بالکل آزاد
تھے، کیونکہ اس عملی دنیا میں ان کے لئے کوئی ایسی دینی ہدایت اور دینی روشنی موجود نہ تھی، جو انھیں صحیح
راستہ دکھا سکتی، نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے خدا کی زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کیا، وحدت
میں سرکشی کا ایسا ہنگامہ برپا کیا کہ آج تک سرد نہ ہو سکا۔

قسطنطین کے عہد میں سلطنت کے تقریباً نصف باشندے صنم پرست تھے، اس نے
ان لوگوں پر زیادہ ظلم کرنے کی جرات نہ کی، اور صرف اسی پر اکتفا کیا کہ مندروں کے دروازے
ان کی چھتیں منہدم کر دیں، بتوں کے پرٹے اور زیور توڑ دیے، اور ان کو معبدوں سے باہر نکلوا دیا،
پندرہ سال بعد جب کلیسا کو ملک پر پورا تسلط حاصل ہو گیا تو مسیحیت کے معتقدوں نے وثنیت کو بجز

CUTTS, CONSTANTINE THE GREAT P. 278

بادشاہ تھیوڈوسیس اور مغربی قوانین کے حسب ذیل دو اصول مقرر کئے جن سے غیر مذاہب کو جڑ سے مٹانے کے لئے شاہی احکام مستنبط ہوتے تھے:۔

(۱) جن گناہوں کو مجسٹریٹ منع نہ کرے یا ان پر سزا نہ دے ان کی ذمہ داری میں وہ خود بھی ایک حد تک شریک ہوتا ہے۔

(۲) مصنوعی دیوتاؤں اور حقیقی ارواح خبیثہ کی بت پرستانہ عبادت خالق برتر کی ہتک کے خلاف سخت قابل نفرت جرم ہے۔

ان اصول موضوعہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے رومن سینٹ نے یہ ضابطہ قرار دیا منظور کیا کہ رومیوں کا مذہب جوپیٹر (JUPITER) کی عبادت نہیں بلکہ مسیح کی عبادت ہے۔ اس کے بعد بتوں کی پرستش اور ان پر نذر و نیاز چڑھانا، اور قربانیاں کرنا سب کچھ قانوناً ممنوع قرار دیدیا گیا، اور ان افعال کے مرتکبوں کے لئے شدید سزائیں مقرر کی گئیں شاہی تھیوڈوسیوس نے اپنے فرامین میں ہر قسم کی غیر مسیحی عبادتوں کو خواہ وہ علانیہ کیجائیں یا گھروں میں چھپا کر، حکومت وقت کے خلاف بغاوت، اور جرم مستلزم سزائے موت قرار دیا، اس کے ساتھ ہی اس نے مندروں کو توڑنے ان کی جائدادیں ضبط کرنے اور عبادت کے سامان کو مٹا دینے کا بھی عام حکم دیدیا، اس حکم کے مطابق سب سے پہلے دکر حکومت میں وثنیت کا جبراً خاتمہ کیا گیا، پھر صوبوں میں یہ مشق کی گئی، گال کے صوبہ میں ورسس کے بشپ نے دین دار یا دریوں کی ایک پوری فوج لے کر مندروں معبدوں اور بتوں کو حتی کہ ان درختوں کو بھی جو مقدس سمجھے جاتے تھے پیوند خاک کر دیا، شام میں مسیحیت کے مقدس پیشوا مارسیلوس (MARCELLUS) نے جو حلقہ اپامیا (DIOCESS OF APAMEA) کا بشپ تھا جوپیٹر کے عظیم الشان مندر کو تباہ کر دیا، اور ایک پوری فوج فراہم کی جسے ساتھ لیکر وہ اپنے حلقہ کے مسیحی معابد کو توڑتا پھرتا تھا، اسکندریہ میں مصر کے آرچ بشپ تھیوفیلس (THEOPHILUS) نے سیرا پیس کے مندر کو جو یونانی فن تعمیر کا بے نظیر نمونہ تھا، مسمار کر دیا، اس کے کتبخانہ کو جسمیں خاندان بطالسہ نے علوم و فنون کا بہترین ذخیرہ جمع کیا تھا نذر آتش کر دیا[1]، سرا پیس کے

---

[1] اس کتبخانہ کو تباہ کرنے والے مسیحی تھے یا مسلمان، اس بارہ میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض مورخین کا خیال ہے کہ جب بعد میں مسلمانوں نے اس کتبخانہ کی خالی الماریوں کو دیکھا تو ہر وہ دل سے کلام اور تعریف کے جملے کہے جو ذہبی تعصب سے بالکل سیاہ نہ ہو گیا ہو، یہی کتبخانہ ہے جس کے جلانے کا الزام بعض عیسائی مؤرخوں نے مسلمانوں پر لگایا ہے

مذہب حکام کی پابندی کی وجہ سے زیادہ نرم بن گئے، اور مقاومت کی استطاعت کے باوجود ظلم و ستم کو برداشت کرکے تین سو برس تک اپنی قومیت کو تباہ کراتے رہے، اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ جب زمانہ کے انقلاب نے ان کو قوت بخشی اور سلطنت کی ذمہ داریاں ان پر آپڑیں تو انھیں مسیحیت کے تنگ دائرے سے نکلنا پڑا، اور یہاں مذہب کی ہدایت و رہنمائی نہ پاکر انھوں نے اپنے ابنائے نوع پر ہر قسم کے ظلم و ستم کرنے شروع کئے، اور نفس کی پیروی میں آزادی کے ساتھ جو چاہا کیا، اس میں شک نہیں کہ ظلم و ستم بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی کئے ہیں، جنگ کے وحشیانہ طریقے مسلمانوں کی بھی بعض لڑائیوں میں پائے جاتے ہیں، اور مذہب کے نام پر غیر مذہبی جنگ کرنے کے داغ سے مسلمانوں کا دامن بھی پاک نہیں ہے، مگر دونوں میں اصولی فرق یہ ہے، کہ مسلمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری اسلام پر نہیں آتی، کیونکہ اس نے ان کی تمام فطری ضروریات کے لحاظ سے مکمل قوانین بنا کر دیئے ہیں، جنہیں نہ تو غیر طبعی حدود و قیود ہیں کہ ان کی پابندی ناممکن ہو، اور نہ ایسی بے قیدی اور کھلی ہوئی آزادی ہے، کہ انسان جو چاہے کرے، اس لئے پیروانِ اسلام سے جو نامناسب حرکات سرزد ہوتی ہیں وہ دراصل قانون شکنی کی تعریف میں آتی ہیں جنکی کوئی ذمہ داری قانون پر نہیں آتی بخلاف اس کے مسیحیت نے اپنے پیروؤں کو ان کی عملی زندگی کے لئے کوئی قانون بنا کر نہیں دیا، اس نے نہیں بتایا کہ اگر دوسری قوموں سے صلح ہو تو کن اصول پر ہو؟ جنگ ہو تو کن مقاصد کے لئے ہو؟ میدانِ جنگ میں جائیں تو دشمن سے کیا برتاؤ کریں؟ دشمن پر فتح پائیں تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ غیر مذاہب کے باشندوں سے مراعات کریں تو کس حد تک؟ اور ان پر سختی کریں تو کن امور میں؟ اس لئے پیروانِ مسیحیت نے پہلے اس کے دائرے میں رہکر اور پھر اس کے دائرے سے نکل کر جتنے اخلاقی گناہ کئے ہیں، اس کی ذمہ داری میں خود مسیحیت بھی شامل ہے، کیونکہ اس نے انھیں سیدھی راہ نہیں بتائی، اسلام کی طرح مسیحیت اپنے پیروؤں کے گناہوں سے اس بنا پر تبری نہیں کرسکتی کہ انھوں نے اسکے بتائے ہوئے اصول و قواعد کی پیروی نہیں کی، وہ ان دو صورتوں میں ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہے کہ یا تو ان سب عیسائیوں کو گنہگار قرار دے، جنھوں نے سیاست و حکمرانی کی ذمہ داری قبول کی ہے، خواہ حق کے ساتھ اسے انجام دیا ہو یا غیر حق کے ساتھ، یا پھر اسے ان تمام

جیسا کہ ہوں کہ ہو قوم دین کی پیروی جنگوں سے جہاں تک ان کا تعلق ہے ان کے
امور کو نجام دیا جو اچھی کے ساتھ یا جو حق کے ساتھ تو وہ ان دونوں سے دنیا میں کوئی قیصری حکومت
اختیار نہیں کر سکتی۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں غیر معقول ہیں۔

مذاہب اربعہ کی تعلیم پر ایک نظر

ہم نے یہاں جنگ کے مسئلہ میں دنیا کے چار بڑے بڑے ادیان کے مذاہب بیان کر دیئے
ہیں یہ مذاہب افراط و تفریط کے دو مختلف نمونے پیش کرتے ہیں۔ مقدم الذکر دو مذہب جنگ
کو جائز رکھتے ہیں مگر اس طرح کہ انسان کو ان تمام اغراض کی جانب بڑھنے کی اجازت دیتے ہیں جنکے
لئے ان کا نفس خواہشمند ہو۔ وہ اغراض و مقاصد میں حق و باطل کا امتیاز نہیں کرتے انسان سے
مانگے کوئی بلند نصب العین نہیں پیش کرتے سوائے کسی ذاتی مقصد کی طرف توجہ نہیں دلاتے بلکہ
خالص حیوانی فطرت پر اس کو یہ حق دیتے ہیں کہ اپنے بنائے جنس پر جب چاہے جس طرح چاہے
جس غرض کے لئے چاہے دست درازی کرے اور جو کچھ چاہے ان سے حاصل کرلے۔ ان میں سے
تہذیب کی جانب اگر کچھ پیش قدمی کی بھی ہے تو وہ صرف اتنی کہ اس دست درازی کے کچھ ضابطے
مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے کہ جب بھی وہ اپنے بنائے جنس کا شکار
کرنا چاہیں تو فلاں طریقے سے کریں اور فلاں طریقے سے نہ کریں۔ ان کے ساتھ ہی بعض ایسے
جذباتی نفسی اور اخلاقی اصول پر قسم کیا ہے اور کی خاص نسل سے ان کو بچنے کی ہدایت دی
ہے جن سے باقی تمام بنائے نوع انسان مخدوم ہیں۔ دوسری طرف مقدم الذکر دو مذہب ہیں جو قسمیں
کہ انسان کو خود انسان کا شکار کرنے کی آزادی دینا درست نہیں ہے مگر یہ حواس ان دونوں
صرف انتہائی نقطہ کی طرف بڑھ جاتا ہے وہ جنگ سے جنگ کرتے رہنے کو انسانی فطرت ہی سے
ثابت کرنے لگتے ہیں۔ اللہ نے انسان کی زندگی میں [illegible] قائم رکھنے کے لئے جس
جبلت قوتیں ودیعت کی ہیں، وہ ان میں سے جنس کو [illegible] کر دیا جاتے ہیں۔ وہ جنس کو
[illegible] سارا سیرت پر حاوی کر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان کی

[illegible] مجبور ہوتے ہیں ان کو کسی زمانہ کے کسی شعبہ میں ہدایت کی روشنی نہیں ملتی اور وہ بیچارے خود اپنے [illegible]
میدان کی یہ وہی تقسیم کرکے کبھی ادھر کبھی ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں افراط و تفریط کے ان دو انتہائی نقطوں
کے درمیان اسلام نے توسط و اعتدال کی ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے وہ انسانی فطرت انسانی
ضروریات کے صحیح تقاضا اور رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ انسانیت کی اصلاح کے مقصد کو پیش نظر رکھکر جنگ کو دو
حصوں پر تقسیم کرتا ہے ایک وہ جو ملک و مال جاہ و اقتدار اور نفسانی اغراض کے حصول کیلئے
کیجاتی ہے اور دوسری وہ جنگ جو حق کی حفاظت اور ظلم و جور کو رفع کرنے کے لئے کیجاتی ہے پہلی
جنگ کو وہ فتنہ و فساد سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو ایک بدترین معصیت قرار دیکر اس سے کامل اجتناب
کا حکم دیتا ہے دوسری جنگ اس کے نزدیک اگر خالص حق کے لئے کیجائے اور اس میں کوئی
نفسانی غرض شامل نہ ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے ایک بہترین عبادت ہے ایک مقدس ترین
فرض ہے اور ایک ایسی چیز ہے جس سے زیادہ افضل و احسن انسانی خدمت کوئی نہیں ہے پھر
اس عبادت کے لئے اس نے حدود مقرر کئے ہیں اس کے مواقع بتائے ہیں اس کے مقاصد کی تفصیل
کی ہے اور اس کے طریقے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں تاکہ خدا کے نام سے شیطان
کی عبادت نہ ہونے لگے اور انسان اپنے نفسانی میلانات و خواہشات کی پابندی اختیار کرکے
غلط راستے پر نہ پڑ جائیں یہ ایک ایسا مکمل ضابطہ قانون ہے جس کی نظیر اسلام کے
سوا کسی مذہب اور کسی تہذیب میں نہیں مل سکتی جہاں مناہج عمل موجود ہیں تو مقاصد کار کی تعیین نہیں ہے
کہیں مقاصد کار موجود ہیں تو مناہج عمل کا پتہ نہیں کہیں مقاصد و مناہج کو کسی حد تک مقرر
کیا گیا ہے تو اس میں وہ بلندی و شخصیت نہیں ہے جو اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے پس حقیقت
آج قطعاً ناقابل انکار ہے کہ جنگ کو کامل طریقہ پر کسی قدرتی حدود میں محدود کرنے اور ایک
ظلم سے عدل کے درجہ تک اور معصیت سے نیکی اور فرض کے درجہ تک پہونچانے کی اگر کسی نے
کوشش کی ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور اسی کے قانون کو اختیار کرکے دنیا اس لعنت سے
بھی بچ سکتی ہے جس کا نام "جنگ" ہے اور اس لعنت سے بھی بچ سکتی ہے جسکا نام غلامی تعبد

جنگ تہذیب جدید میں

اب تک جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ تر مذہبی گروہ کی تسکین کے لئے تھا۔ مذاہب و ادیان کے تقابل سے کسی مذہبی قانون کی صداقت وحقانیت کا شمار، صرف انھیں لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتا ہے جو مذہب کو صداقت کا معیار تسلیم کرتے ہوں۔ لیکن دنیا میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس کے نزدیک صداقت کا معیار مذہب نہیں بلکہ تہذیب حاضر ہے۔ یہ لوگ مذہب کو عہد قدیم کی ایک فرسودہ گرانبار یادگار فرض کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں صدیوں پہلے کے فکر و نظر اور احکام و قوانین اب قابل نہیں ہیں کہ انسان کی موجودہ ترقی یافتہ زندگی کا دستور عمل بن سکیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسانی دماغ نے علم و فن کی ترقی اور تہذیب و تمدن کے نشو و نما سے آج جو مناہج تحقیق اور قوانین وضع کئے ہیں وہی صحیح ہیں، اور وہی صحت و درستی کا معیار بن سکتے ہیں۔ اس خیال کے لوگ ہمارے گذشتہ مباحث کو دیکھیں گے تو بلا تامل کہہ دیں گے کہ بیشک اسلام نے اپنے عہد کی تہذیب کی بڑی قابل قدر اصلاح کی، اور جنگ کے لیے مقاصد و مناہج کی طرف انسان کی رہنمائی کی جس سے اس کے ہمعصر تمدن اور ادیان ناآشنا تھے، مگر اتنی صدیوں کی ترقیات کے بعد اب اس کے متعلق انسانی فکر میں جو جوش پیدا ہو گیا ہے، اور اس کی بدولت جو مہذب قوانین عالم وجود میں آئے ہیں ان سے اس عہد کے قوانین و افکار کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جب یہ ان کے قوائے فکریہ بنسبتہ عام طفلی میں تھے؟ اس کے جواب میں ایک دوسرے تقابل کی ضرورت ہے جس میں اسلام اور تہذیب جدید کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے کہ جنگ کے متعلق اس کے مقاصد و مناہج زیادہ صحیح زیادہ مفید اور زیادہ مضبوط ہیں۔ یہی تقابل اس باب کا موضوع سخن ہے۔

قبل اس کے کہ اس تقابل کا سلسلہ شروع کیا جائے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہمیں

پہلے سے متعلق مغربی تہذیب کا عملی قانون معلوم کرنے کے لئے کس چیز کی طرف رجوع کرنا چاہئے ایک مسئلہ میں کسی انسانی جماعت کے عقائد اور طریق کا بالحاظ عموماً تین چیزوں سے معلوم ہوتا ہے ایک مذہب دوسرے ادبیات تیسرے ہیأۃ اجتماعیہ کا تعامل ان تینوں چیزوں میں سب سے زیادہ قطعی و یقینی چیز جو اس جماعت کے اصلی خیالات کی مظہر اور اس کے حقیقی قانون عمل پر بحث بن سکتی ہے مذہب ہے لیکن مغربی اقوام جس مذہب کی پیرو ہیں اس میں سرے سے جنگ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے اور حقیقۃً ان کی پوری تہذیب میں مذہب کا عامل سب سے زیادہ کمزور اور بے اثر ہے اس مذہب کے ذریعہ سے ہم بالکل نہیں معلوم کر سکتے کہ مغربی تہذیب میں جنگ کے جائز و ناجائز مقاصد کے درمیان تمیز کے اصول کیا ہیں، اور جنگ کے واقع ہونے کی صورت میں ان کے طریق عمل کو کس قواعد سے منضبط کیا جاتا ہے؟ اب رہی دوسری چیز یعنی ادبیات، سو اس میں شک نہیں کہ اس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مغرب میں موجود ہے مغربی فقہا اور علمائے اخلاق نے جنگ اور متعلقات جنگ پر بہت کچھ لکھا ہے، اور ہر پہلو سے ان پر بحث کی ہے لیکن اس قسم کے اہل قلم حضرات کے افادات کو اجتماعی افکار کے نشوونما میں خواہ کتنا ہی گہرا اثر حاصل ہوا اور سوسائٹی کے قوانین کی تشکیل میں ان کے خیالات نے کیسا ہی زبردست حصہ لیا ہو مگر وہ خود اپنے اندر کوئی ایسی قوت نہیں رکھتے جس کی بنا پر ان کو کسی انسانی جماعت کے لئے قابل احتجاج قرار دیا جا سکتا ہو، دنیا کے بڑے سے بڑے مصنف کو بھی یہ فخر حاصل نہیں ہے کہ اس کا کوئی قول اس کی قوم کے لئے قانون کی حیثیت رکھتا ہو، یہ ضرور ممکن ہے کہ اس کے اقوال سے متاثر ہو کر اس کی قوم نے اپنے لئے بہت سے قوانین بنا لئے ہوں، مگر وہ قوانین اس قوم پر اس دلیل سے حجت نہیں ہوں گے کہ وہ فلاں مصنف کے اقوال ہیں بلکہ اس بنا پر حجت ہوں گے کہ انھیں اس نے اپنے لئے قانون کے طور پر تسلیم کر لیا ہے، پس جنگ کے مسئلہ میں ہمارے لئے وہ وسیع لٹریچر بھی بیکار ہے جو مغربی زبانوں میں علمائے مغرب کی قابل قدر کوششوں نے مہیا کیا ہے، اب صرف تیسری چیز رہ جاتی ہے، جس سے ہم مغربی تہذیب کے مقاصد و مناہج جنگ معلوم کر سکتے ہیں، اور وہ مغربی اقوام کا تعامل ہے، یہ تعامل دو قسم کا ہے، ایک مدون یا لکھا ہوا (Written) جسے اصطلاح میں بین المللی قانون (Inter national law) کہتے ہیں، دوسرا غیر مدون یا بے لکھا (Unwritten)

جنگ کا اخلاقی پہلو

میں لکھتا ہے :-

"جدید بین الملی قانون ان اخلاقی مسائل سے بالکل ناآشنا ہے، وہ ان کے متعلق کچھ نہیں کہتا، بلکہ انھیں صاف نظر انداز کر جاتا ہے، اس کے نزدیک جنگ خواہ حق بجانب ہو خواہ غیر حق بجانب، منصفانہ ہو یا غیر منصفانہ، بہرحال وہ فریقین کے تعلقات کو متعدد و مختلف صورتوں سے بدل دیتی ہے، اور اس لحاظ سے قانون کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ان تغیر کے حدود اور قانونی صورتوں کو واضح کر دے، وہ ہمکو صرف یہ بتائے گا کہ کس طرح محاربیت (Belligerency) کا تعلق پیدا ہوتا ہے اور محاربین ایک دوسرے کے متعلق اور غیر جانبداروں کے متعلق کیا حقوق و فرائض رکھتے ہیں ..... اخلاقی سوالات بذات خود خواہ کتنے ہی غور و توجہ کے مستحق ہوں، لیکن ایک بین الملی قانون کی کتاب میں وہ اسی قدر بے محل ہیں جس قدر شخصی مراتب کے قانون میں اخلاقیات ازدواج کا سوال ہو سکتا ہے[1]"

ایک جرمن مصنف الیتس باخر (Eltzbacher) لکھتا ہے :-

"بین الملی قانون نے ہمیشہ جنگی اعمال پر صرف اس قسم کی پابندیاں عائد کی ہیں جنکو مقاصد جنگ سے قابل لحاظ حد تک تعرض کئے بغیر مرعی و ملحوظ رکھنا ممکن ہو، اس نے صرف یہ تجویز کرنے پر اکتفا کی ہے کہ حتی الامکان دشمن کو غیر ضروری نقصانات سے معاف رکھا جائے یعنی ایسے نقصانات پہونچانے سے پرہیز کیا جائے جو کسی طرح مقاصد جنگ کے حصول میں مددگار نہیں ہوتے، یا اپنے حاصل کی نسبت سے بہت زیادہ گراں قدر ہوتے ہیں[2]"

پروفیسر نیولڈ لکھتا ہے :-

"اس بنا پر جنگ میں گناہ کا سوال بین الملی قانون کا سوال نہیں ہے، بلکہ

---

[1] Principles of International Law p. 292

[2] Volen und Ueberden Vilkerrecht 112

فعل قیامت کا سوں ہے بین ملکی قانون یک جا زونا جائز جنگ میں تمیز
نہیں کر سکتا کیونکہ جنگ بین الملکی قانون کے نقطۂ نظر سے ہمیشہ قانون کی تعظیم
سمجھی جاتی ہے"

غیر مدون قانون سے استفسار اس سے معلوم ہوا کہ جہاں تک لکھے ہوئے یا مدون بین الملکی
قانون کا تعلق ہے، اس میں حق اور ناحق جائز و ناجائز جنگ کے درمیان کوئی امتیاز قائم نہیں
کیا گیا ہے، اور اس سے ہم یہ نہیں معلوم کر سکتے کہ مغربی تہذیب کن مقاصد کے لئے جنگ کو جائز
رکھتی ہے، اور کن کے لئے ناجائز؟ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر بائی نے کہا ہے ایک بین الملکی قانون
غیر مدون یا بے لکھا بھی ہے اور اصلی قانون وہی ہے، اس لئے اب ہمکو دیکھنا چاہئے کہ اس
بارے میں مغرب کی مہذب ترین قوموں کا عمل کیا ہے؟ وہ قومیں جنکا عمل تہذیب جدید کا معیار
ہے، جن کی حرکات و سکنات تہذیب سازی کا درجہ رکھتی ہیں، اور جن کے کردار و گفتار کے سو
کسی دوسری چیز کو تہذیب جدید سے نتیجہ بھی نہیں کیا جا سکتا، ان کے درمیان جب جنگ
برپا ہوتی ہے، تو کن اغراض و مقاصد کے لئے ہوتی ہے؟ اور کس قسم کی جنگ کو ان کے ہاں
حق و انصاف کی جنگ کہا جاتا ہے؟ اس کے لئے ہم ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے بحث
نہیں کریں گے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں مہذب اور غیر مہذب
قوموں، یا مہذب قوموں کی ایک قلیل جماعت کے درمیان ہوئیں کیونکہ ان میں جو کچھ ہوا
اس کو ہم مغربی تہذیب کا مکمل نمونہ نہیں کہہ سکتے ان سب کو چھوڑ کر ہم صرف بیسویں صدی
کی اس جنگ عظیم پر نظر ڈالتے ہیں جسمیں مغربی تہذیب کے تمام علمبردار شامل تھے یا جسکے
بس کی مجلس عالمہ میں دنیائے جدید کی تمام مہذب قوموں کی نمایندگی ہوئی تھی اس جنگ کی
روداد ہم کو بتا سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کی نگاہ میں جائز و ناجائز جنگ کے معیار کی حقیقت
کیا ہے؟

جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ جنگ عظیم دراصل یورپ کی تین بڑی قوموں
کے درمیان ہوئی تھی، اگرچہ ضمنی طور پر دوسری چھوٹی بڑی قومیں بھی اسمیں شامل ہوتی تھیں

اس کا ایک فریق جرمنی و آسٹریا پر مشتمل تھا اور دوسرا فریق انگلستان، فرانس، روس اور اٹلی پر
یہ دو متقابل جتھے جن قوموں سے مرتب تھے ان میں باہم شدید اور تاریخی عداوتیں تھیں۔ انگلستان
و فرانس میں دشمنی نمایاں تک کہ ۱۹۰۰ء میں مسئلہ سوڈان پر اس کی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی
روس و انگلستان کے درمیان سخت رقابت تھی حتیٰ کہ بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان
پر روسی حملے کا خطرہ ہر وقت انگریزی سلطنت کو آمادۂ جنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح فرانس اور اٹلی کے
درمیان مسئلہ تیونس تقریباً نصف قرن سے عداوت و رقابت کا منبع بنا ہوا تھا۔ اور اسی کی بدولت
حسب اعلان جنگ عظیم تک اٹلی جرمنی کے ساتھ حلیفانہ اتحاد رکھتا تھا لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی
عشرے میں ان معاند قوموں کے درمیان چند ایسے اغراض و مقاصد کا رشتہ پیدا ہو گیا جن کے باعث
وہ سب متحد ہو گئیں اور ایک دوسرے جتھے کے خلاف دوش بدوش جنگ میں شریک ہوئیں
دوسری طرف جرمنی ۱۹۱۴ء تک انگلستان کا دوست رہا۔ اٹلی سے ۱۹۱۲ء تک اس کے حلیفانہ تعلقات
رہے۔ روس ۱۹۱۴ء اس کا دوست تھا بلکہ زار و قیصر کے درمیان جنگ کی ابتدا تک گہرے دوستانہ
تعلقات تھے مگر کچھ دوسری اغراض تھیں جنھوں نے اس دوستی کو دشمنی میں تبدیل کر دیا اور جرمنی کو
ان سب قوموں کے ساتھ متحد ہو کر اپنے ان قدیم دوستوں کے خلاف جنگ کرنی پڑی جو ایک زمانہ
میں اس کے حلیف رہ چکے تھے۔

قوموں کی جتھہ بندی یہ خاص اغراض کیا تھیں، ہر مذہب کا کوئی سوال نہ تھا کہ سب کے سب
عیسائی تھے۔ نہ قومیت کا بھی کوئی سوال نہ تھا، کہ کسی نے کسی پر حملہ نہ کیا تھا حقوق کا بھی
کوئی سوال نہ تھا کہ سب نے اپنے اپنے حقوق سے پوری طرح متمتع ہو رہے تھے پھر کیا چیز تھی جس نے
ان کو ایک دوسرے سے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا؟ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز
سوائے اس کے اور کچھ نہ تھی کہ ہر قوم اپنے حصے سے کچھ زیادہ لینا چاہتی تھی اور ہر فریق کی خواہش
یہ تھی کہ دوسرے فریق کو مرعوب کر کے اس کے منافع سے خود مستفید ہو۔ ان کے درمیان عداوت کا پہلا
بیج ۱۸۷۱ء میں بویا گیا جب جرمنی نے فرانس سے السیس اور لورین کے علاقے چھین لیے باوجودیکہ
السیس کی بیشتر آبادی جرمنی النسل تھی اور لورین کی آبادی کا ایک بڑا حصہ نسلی اور لسانی حیثیت
سے جرمن تھا لیکن فرانس نے اس کو اپنی ایک قومی حق تلفی قرار دیا اور اس وقت سے فرانسیسی

سیاست کا مناسب نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسی قوت حاصل کرے جو اس کے بعد جرمنی کی تجارت و صنعت کی ترقی شروع ہوئی یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اختتام پر وہ دنیا کا ایک عظیم الشان صناع اور تاجر ملک بن گیا۔ ۱۸۷۱ء میں اس نے فرانس کو شکست دی اور تمام یورپ کے تمام وسائل پر انگلستان مسلط ہے اور اس تسلط کو ایک زبردست جنگی بیڑے کے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی بحری قوت کو تیزی کے ساتھ ترقی دینی شروع کر دی۔ اس لئے جو خطرے کو انگلستان نے فوراً محسوس کیا۔ اس نے کوشش کی کہ جرمنی کو دوست بنائے رکھے ۱۸۹۰ء سے ۱۹۰۲ء تک مسٹر چیمبرلین اور سیسل رہوڈس اور دوسرے برطانوی مدبرین یہ چاہتے رہے کہ جرمنی سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے لیکن جرمنی برطانیہ کے بحری اور تجارتی تفوق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا وہ خود دنیا کی تجارت میں بالا دست قوت بننا چاہتا تھا اس سے دونوں حلیف حلیف نہ بن سکے اور دنیا کی سیاست میں دفعتہً ایک انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کا باعث جرمنی کی بحری تعمیر تھی جو انگلستان اور فرانس کے لئے یکساں خطرناک تھی۔ اس کے جواب میں انگلستان نے فرانس پر دوستی کی پیشکش کی اور دونوں ملکوں نے مل کر آئندہ کے لئے اپنی اغراض کے خاطر عہد و پیمان کئے۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں روس بھی اس چکر میں شامل ہو گیا۔ اس سے پہلے روس اور جرمنی مقابلہ پر تھے ایک دوسرے کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ روس کا خیال تھا کہ جرمنی اس کے لئے زبردست خطرہ ہے اور جرمنی کا خیال تھا کہ روس پر قبضہ کر کے وہ اس سے غلہ اور دوسری چیزیں حاصل کر سکتا ہے۔ اس لئے دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ جرمنی کے پیش نظر ۱۸۷۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک ایک ہی مقصد تھا کہ وہ روس کو اپنا دوست بنائے رکھے تاکہ وہ اپنی توسیع مملکت اور توسیع تجارت کی جو بھی اسکیمیں بنائے ان میں روس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہ ہو۔ مگر روس پر قبضہ کرنے کے لئے جرمنی کو انگلستان کے بحری بیڑے کو شکست دینا ضروری تھا۔ اس لئے جرمنی نے ۱۹۰۵ء میں جو سیاسی اور سفارتی انقلاب دنیا میں پیدا کیا اس کی وجہ سے انگلستان کی اغراض کا مخالف رہا۔ لیکن جب اس کو معلوم ہو گیا کہ اس کی مدد سے جرمنی

مارد دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس نے اپنے اس قدیم حریف کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور اسے یقین دلایا کہ کسی مناسب موقعہ پر وہ وانیال اور باسفورس پر قبضہ کرنے میں وہ اس کی مدد کرے گا۔

اس طرح ۱۹۰۰ء تک دو زبردست جتھے بن گئے، ایک جتھے میں انگلستان، فرانس، اور روس تھے، اور دوسرے میں جرمنی اور آسٹریا، پہلے جتھے والوں کے درمیان وجہ اتحاد یہ تھی کہ وہ اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور اپنے تجارتی تفوق کو باقی رکھنے کے لئے جرمنی اور آسٹریا کی مزاحم قوتوں کو دور کرنا چاہتے تھے، اور دوسرے جتھے والوں کو اس خواہش نے متحد کیا تھا، کہ انھیں اپنی سلطنت کو وسیع کرنے اور دنیا کی تجارتی و اقتصادی زندگی پر فوقیت حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد درکار تھی۔ اس جتھہ بندی میں ابھی اٹلی پوری طرح شریک نہ تھا، اور بظاہر وہ جرمنی کے ساتھ ایک معاہدۂ اتحاد سے مربوط تھا لیکن کس طرح وہ اپنے جرمن دوست کو چھوڑ کر فرانسیسی دشمن کے ساتھ مل گیا، یہ ایک عجیب داستان ہے، اٹلی نے دول خمسہ کے ساتھ اپنے تعلقات و معاہدات کچھ اس ڈھنگ پر رکھے تھے کہ جب اس کو ٹیونس کا قبضہ حاصل کرنے کے لئے فرانس کے خلاف جنگ کی ضرورت ہو تو جرمنی سے حصول امداد کا دعویٰ کر سکے، اور جب اسٹریا کے بعض علاقے (جن پر عرصے سے اٹلی کا دانت تھا) چھیننے کے لئے جنگ کی حاجت پیش آئے تو وہ دول حلفا کی اعانت حاصل کر سکے، جنگ عظیم کے آغاز میں جب اس نے دیکھا کہ انگلستان کی عظیم الشان بحری طاقت فرانس کے ساتھ ہے، اور اس کے مقابلہ پر فرانس نے ٹیونس کا علاقہ فتح کرنے میں جرمنی اس کے کام نہیں آسکتا تو اس نے دفعتہً پانسہ دول حلفا کی طرف پھیر دیا، اور حق پرستی کا خرقۂ فریب پہن کر دعویٰ کرنے لگا، کہ ہم جرمنی اور اسٹریا کو باطل پر سمجھتے ہیں، اس لئے ان کا ساتھ نہیں دے سکتے،

جنگ کا آغاز جون ۱۹۱۴ء میں جب آسٹریا کا ولیعہد ایک سربی انارکسٹ کے ہاتھ سے مارا گیا تو فتنہ و فساد کی وہ فصل دفعتہً پک کر کٹنے کے لئے تیار ہو گئی، جس کی تخم ریزی و آبیاری ۴۴ سال سے کی جا رہی تھی، آسٹریا نے سرویا کے سنگ راہ کو ہٹانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا کہ بلقان کی جانب اسکی پیش قدمی میں وہی حائل تھا، جرمنی بھی اپنی تجارتی اسکیم کی تکمیل کے لئے سرویا کا استیصال ضروری سمجھتا تھا، اس لئے وہ بھی آسٹریا کا ہمنوا ہو گیا، دوسری طرف روس سرویا کا اپنا چھوٹا

بھائی سمجھتا تھا، اور حقیقت میں اس کی تمام کوششیں اسی سے وابستہ تھیں لیکن وہ بھی یقینی تھا کہ اگر آسٹریا کو سرویا کے استیصال میں کامیابی ہوگئی تو پھر یقین پھر اس کے تسلط کو کوئی چیز نہ روک سکے گی اس لئے وہ اپنے چھوٹے بھائی کی حمایت پر کھڑا ہوگیا، ادھر فرانس کو خطرہ تھا کہ روس اور سرویا کو مغلوب کرکے جرمنی اور آسٹریا کی قوت اتنی بڑھ جائیگی کہ السیس اور لورین کو واپس لینا تو درکنار خود پیرس پر بھی قابض رہنا ناممکن ہوجائیگا، اس لئے وہ بھی روس کے ساتھ جنگ پر آمادہ ہوگیا ان حلیفوں کے بعد انگلستان کے لئے علیحدہ رہنا ناممکن تھا، اس "حق پرست" نے اپنے ذمہ بہت سی اخلاقی ذمہ داریاں لے رکھی تھیں جنکی انجام دہی کے لئے ضروری تھا کہ جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرے کو ملایا جائے بحری اور تجارتی تفوق کے راستے سے ہمیشہ کیلئے ہٹا دیا جاتا، اس لئے وہ بھی ہتھیار لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور دنیا میں "مہذب قوموں" کی وہ عظیم الشان جنگ برپا ہوئی جس کے سامنے پچھلی غیر مہذب قوموں کی لڑائیاں ہیچ ہوگئیں،

جنگ کے اغراض و مقاصد اس جنگ میں شریک ہونے والی ہر قوم کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ اپنے مقدس حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ پر مجبور ہوئی ہے اور صرف اپنے حقوق کی حفاظت نہیں بلکہ دنیا کی دوسری ضعیف و کمزور قوموں کو آزادی دلانا اور جبر و ظلم کی طاقتوں کو مغلوب کرکے دنیا میں حق و انصاف اور امن و امان کا بول بالا کرنا بھی ان کا عین مقصود ہے لیکن دوران جنگ میں اور اختتام جنگ کے بعد ان حق پرستوں نے جس طرح قوموں اور ملکوں کا سودا دین کیا، اور سلطنتوں کا بانٹ اور حقوق کی تقسیم کا روبار جس دیدہ دلیری سے کیا، اس کی ہیبت دیکھ کر معلوم ہوجاتا ہے کہ مغربی تہذیب میں حق کس چیز کا نام ہے

۱۸۷۰ء میں آسٹریا ہنگری کے شہنشاہ کارل نے کوشش کی تھی کہ اپنے سابقہ حلیفوں سے الگ ہوکر انگلستان فرانس وغیرہ کے ساتھ علیحدہ صلح کرے، اس مقصد کے لئے اس نے بورون کے ہمشیر زادہ [illegible] کی معرفت دول متفقہ سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا تھا، اور اس گفت و شنید کے تمام حالات ظاہر ہونے سے خود اپنے قلموں لکھے ہوئے [illegible] آسٹریا کی تقدیم صلح کے نام سے شائع ہوئے ان مراسلت کے مطالعہ سے اس کاروبار کی پوری کیفیت معلوم ہوتی ہے جو قوموں و قوموں کی جنس [illegible]

فرانس اور انگلستان نے اٹلی کو اس وعدے کے ساتھ شرکت جنگ پر آمادہ کیا تھا کہ اسٹریا کا جنوبی علاقہ اس کے حصہ میں دیا جائیگا اس تقسیم کی بنا پر اٹلی نے اسٹریا کے ساتھ علیحدہ صلح کی مخالفت کی فرانس خصوصیت کے ساتھ یہ چاہتا تھا کہ آسٹریا کو جرمنی سے توڑ لے اس لئے اس نے قبول صلح کیلئے اٹلی پر بہت زور دیا لیکن اٹلی نے اس کی اتنی سختی کے ساتھ مخالفت کی کہ دول حلفا کو یہاں تک اندیشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں وہ "حق" کا ساتھ چھوڑ کر "باطل" (یعنی جرمنی!) کے ساتھ نہ ہوجائے، ایم پال کامبوں جو اس وقت لندن میں فرانس کا سفیر تھا پرنس سکستہ سے ایک ملاقات کے دوران میں کہتا ہے کہ:-

"اٹلی کی حرص اسے ہر قسم کی بدمعاشیوں پر آمادہ کرسکتی ہے"[1]

ایک دوسری ملاقات میں وہ بیان کرتا ہے کہ

"اٹلی نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ جنگ میں محض ان علاقوں کو حاصل کرنے کے لئے شریک ہوا ہے جنکو وہ اسٹریا سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا"[2]

پال کامبوں کا بھائی ایم ژول کامبوں جو پہلے برلن میں فرانس کا سفیر تھا اس گفت وشنید کی مخالفت اس بنا پر کرتا ہے کہ:-

"اگر اسٹریا کے ساتھ صلح کرلی گئی تو بلاشک وریب اس صلحنامہ پر دستخط ہونے کے ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر اٹلی جرمنی کی گود میں ہوگا"[3]

ایک دوسرے موقع پر وہ کہتا ہے کہ:-

"اٹلی ہمارے لئے کچھ نہیں کریگا، وہ صرف ایک ہی خیال رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جنگ کے بعد جب دوسرے حلفا بالکل تھک کر چور ہوچکے ہوں تو وہ اقتصادی جدوجہد میں ان پر سبقت لیجانے کی کوشش کرے"[4]

یہ ان "حق پرستوں" کے اندرونی مقاصد تھے اور یہ خیالات تھے ان لوگوں کے خود ایک دوسرے کے متعلق جو باہم مل کر "حق" کی خاطر جنگ کررہے تھے، آخر جب یہ بات تحقیق ہوگئی کہ اٹلی کسی طرح

---

[1] P 173 Austria's peace offers
[2] P 173
[3] P 173
[4] P 208

توسیع مملکت کے ارادوں کو چھوڑ کر [illegible] سے زیادہ ہمیں سے تو اس کے حق پرست
خلیفوں نے آسٹریا سے کہا کہ تم فرانس سے ان علاقوں کو چھڑا دو جنکی وہ طمع رکھتا ہے اور اس کے
عوض ہم تم کو سلیشیا اور بویریا کے علاقے جرمنی سے چھین کر دلوا دیں گے جیسا کہ معلوم ہے یہ دونوں
صوبے ناخص جرمن نسل کے لوگوں سے آباد ہیں اور جرمنوں کے وطن قومی کے غیر منفک اجزا
ہیں لیکن "حق پرست" اتحادی ان کو بالکل اس طرح آسٹریا کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے گویا
وہ انھیں کی ملک ہیں اور لطف یہ ہے کہ "حق پرست" آسٹریا نے بھی انھیں قبول کرنے سے اس بنا پر
انکار نہیں کیا کہ وہ اس کے دوست جرمنی کے علاقے تھے بلکہ صرف اس بنا پر کیا کہ وہ فی الحال فرانس
کی ملک نہیں تھے اور یہ امر مشتبہ تھا کہ فرانس انھیں چھین کر اس کے حوالے کرنے کی قدرت بھی
رکھتا ہے یا نہیں! اس کے بعد کچھ اور علاقوں کی تلاش شروع ہوئی تاکہ انھیں آسٹریا کے حوالے
کر کے اس کے نقصان کی تلافی کیجائے پہلے طرابلس پر نگاہ دوڑائی گئی مگر اٹلی نے اسے چھوڑنے سے
انکار کر دیا کیونکہ وہ قدیم رومن سلطنت کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کے لیے قرطاجنہ کا پورا
ساحل کہ اسے درکار تھا پھر منصوبہ (Plan) اور سومالی لینڈ پر نظر گئی ان دونوں
علاقوں سے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا تھا اور آسٹریا بھی انھیں قبول کرنے پر راضی تھا لیکن
بعض وجوہ کی بنا پر یہ معاملہ بھی نہ پٹ سکا اور اٹلی کی طمع کی بنا پر دونوں حلقے آسٹریا کے
ساتھ مذاکرات صلح منقطع ہو گئے۔

خفیہ معاہدات اس کاروبار کی داستان کا ایک دوسرا باب وہ خفیہ معاہدات ہیں
جو دوران جنگ میں دول حلفا کے درمیان ہوئے تھے ان معاہدات کو روس کی
انقلابی حکومت نے شائع کر دیا تھا جس نے "حق پرست" اتحادیوں کے ارادوں و منصوبوں
کی اصلی تصویر دیکھ کر دنیا حیران رہ گئی ان کی کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے جس میں مخالف سلطنتوں
کے کسی نہ کسی علاقہ یا ان کی اقتصادی ثروت کے کسی نہ کسی حصے کو دول حلفا نے لینا
طے نہ کیا ہو بلکہ شاید ہی کوئی ایسا معاہدہ تھا کہ جس سے قبل از وقت یہ نہ طے کر دیا جائے کہ باوجودیکہ یہ دونوں
علاقے زیادہ تر جرمنی نسل کے لوگوں سے آباد ہیں اور جغرافی حیثیت سے جرمنی کا حصہ ہیں

کے مقابلہ میں جرمنی سے زیادہ ہے، لیکن صرف اس دلیل کی بنا پر اُن کو فرانس سے ملحق کرنے کی تجویز کی گئی کہ وہ ۱۸۱۴ء سے پہلے فرانس کے قبضہ میں تھے، دوسری بات یہ طے ہوئی کہ دریائے رہائن کے مغرب میں جرمنی کا جتنا علاقہ ہے، سب فرانس سے ملحق کر دیا جائے، اس تجویز کو فرانس اور روس نے خود اپنے حلیف انگلستان تک سے پوشیدہ رکھا، اس کا اظہار اس وقت کیا گیا جب جنگ ختم ہونے کے بعد مجلسِ صلح میں غنائم جنگ کی تقسیم شروع ہوئی، تیسرا فیصلہ یہ تھا کہ مراکو کو جو اب تک فرانسیسی سیادت میں تھا، فرانسیسی مقبوضہ تسلیم کیا جائے، نیز جرمنی کے تمام افریقی مقبوضات اس کے حصے میں آئیں اور ٹرکی کے ترکہ میں سے بھی اس کو کافی حصہ دیا جائے،

یہ تو حق پرست فرانس کا حصہ تھا، اس کے ساتھ ہی اٹلی کو بھی مطمئن کرنا ضرور تھا، کیونکہ وہ بیچارہ محض "حق" کی خاطر "باطل" کا ساتھ چھوڑ کر جنگ میں شریک ہوا تھا، اس کے لئے ٹرینٹو، ٹریسٹ اور جنوبی ٹیرول کے علاقے مخصوص کئے گئے، بحر ایڈریاٹک کے پورے سواحل اور جزائر بھی اس کے حصے میں آئے اور ٹرکی کے مقبوضات میں سے تھے اس کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا گیا،

روس میں ابھی تک انقلاب نہیں ہوا تھا اور "حق" کا سب سے بڑا علمبردار یعنی زار وہاں حکمراں تھا، اس لئے اس کاروبار میں اس کی شرکت بھی ضروری تھی، اس کے ساتھ پہلا سمجھوتہ پولینڈ کے متعلق ہوا جس کا مفاد یہ تھا کہ اسکی روحِ حریت کو فنا کرنے کے لئے روس کو ہر مناسب اور ممکن کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہے، یہ وہی پولینڈ ہے جس کو آغازِ جنگ میں آزادی کی امید دلائی گئی تھی، اور اختتامِ جنگ کے بعد محض بولشویکوں کی ضد پر جس کی پشتیبانی کا فرض دوبارہ فرانس نے اپنے ذمہ لے لیا،

دوسرا عہد نامہ قسطنطنیہ اور آبناؤں کے متعلق تھا، اعلانِ جنگ سے چھ مہینہ پہلے فروری ۱۹۱۴ء ہی میں روس کی کراؤن کونسل نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اب درۂ دانیال اور باسفورس کے الحاق میں زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہے، چنانچہ ابتداءً اسی غرض کے لئے جنگی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں، جب جنگ شروع ہوئی تو روس کو سب سے پہلے اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا، اور ۱۹۱۵ء کے خفیہ عہد نامہ میں اس نے اپنے اتحادیوں سے یہ تسلیم کرا لیا کہ جنگ کے غنائم میں سے اس کو درۂ دانیال، باسفورس، قسطنطنیہ اور ایشیائے کوچک کا مشرقی حصہ ضرور دیا جائے،

سنہ ۱۹۲۶ء کا ایک وسی مورخ ہیرن کا رف [illegible] لکھتا ہے کہ

"اس خفیہ عہد نامے کی رو سے دولت عثمانیہ اور آسٹریا ہنگری غنائم جنگ قرار دیئے گئے جنھیں انھوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس تقسیم میں قسطنطنیہ اور درہ دانیال و باسفورس قطعی طور پر روس کو تفویض کئے گئے تھے"

اب رہ گیا انگلستان جو تمام اہل حق پرستوں کی رہنمائی کر رہا تھا سو اس نے اپنے لئے جرمنی کے افریقی اور ایشیائی مستعمرات کو کافی نہیں سمجھا، اور ایک دوسرا میدان پیدا کیا جو اس کی ہمت مآبی کے شایان شان تھا۔ ترکی سے اعلان جنگ کے دو مہینے بعد مئی سنہ ۱۹۱۵ء میں اس نے فرانس کیساتھ ایک ابتدائی خفیہ معاہدہ کیا جسمیں بلاد عرب کو دو منطقوں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک منطقہ شام دوسرا منطقہ عراق، پہلا منطقہ فرانسیسی نفوذ و اثر کے ماتحت تسلیم کیا گیا اور دوسرے منطقہ پر برطانی سلطنت کے حقوق قائم ہو گئے۔ اس تقسیم کی کامیابی بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ خود اہل عرب میں برطانیہ و فرانس کا ہاتھ بٹاتے، اور اہل عرب کے لئے یہ بہت مشکل تھا کہ اپنے دشمن کی اس تقسیم سے بے خبر ہونے کے بعد اس کی فتح میں خود دشمنوں کے معین و مددگار بنتے قبول کرتے [illegible] یہ چال چلی گئی کہ تقسیم کے ابتدائی معاہدہ کو بالکل خفیہ رکھا گیا، اور عربی پیشواؤں سے [illegible] دلایا گیا کہ اگر انھوں نے دول حلفا کے ساتھ مل کر بلاد عرب میں ترکی حکومت کا خاتمہ [illegible] اس کے عوض ایک آزاد عربی سلطنت قائم کی جائیگی جو جنوبی عراق و لبنان کی ساحلی پٹی سے سوا تمام ممالک عربیہ پر حاوی ہو گی اس آزادی کے خوش نما خواب نے عربوں میں [illegible] نئی روح پھونک دی۔ اور اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء میں انھوں برطانیہ و فرانس کے خفیہ معاہدات سے بے خبر [illegible] انھوں نے سر ہنری میکموہن کی معرفت دول حلفا کے ساتھ ایک معاہدہ [illegible] کر لیا جس کی رو سے ان کی پوری قوت دول حلفا کے ساتھ ہوئی اور اس کے عوض ان کو [illegible] کا یقین دلاتا گیا کہ اختتام جنگ کے بعد عربی ممالک کو ایک مستقل سلطنت بنا دیا جائیگا۔ اس معاہدہ کے بعد جون سنہ ۱۹۱۶ء میں شریف حسین نے ترکی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ [illegible] عراق، شام، اور فلسطین میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی جس سے [illegible] یہ ثابت ہو گئی کہ ممالک عربیہ میں ترکی حکومت نہیں ٹھہر سکتی، اور برطانیہ و فرانس [illegible]

فرد حاصل ہو جائیں گے۔ اس لئے نومبر ۱۹۱۵ء میں دونوں سلطنتوں کے درمیان پھر گفت و شنید ہوئی اور ایک دوسرا خفیہ عہد نامہ طے ہوا جو معاہدہ سائکس پیکو کے نام سے مشہور ہے، اس معاہدہ میں طے ہوا کہ عراق کلیتہً برطانیہ کے قبضہ میں رہے گا، شام بما ماہ فرانسیسی سلطنت کے دائرے میں رکھا جائیگا فلسطین ایک بین الملی علاقہ ہوگا اور حیفا اپنے بندرگاہ سمیت برطانیہ کے تحت میں آئیگا باقی رہے وہ ممالک جو عراق اور سواحل شام کے درمیان واقع ہیں، سوان کو دو حلقوں میں تقسیم کیا جائے گا، ایک حلقہ برطانیہ کے زیر اثر ہوگا اور دوسرا فرانس کے زیر اثر، اس معاہدے میں انگریزی نمایندے سر مارک سائکس نے موصل کو فرانسیسی اثر میں دینے پر اتفاق کر لیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۱۵ء کے ایک خفیہ عہد نامہ کی رو سے یہ طے ہو چکا تھا کہ ارمینیہ مشرقی کردستان اور ٹرکی کے وہ علاقے جو سرحد موصل سے متصل ہیں، روس کے حصہ میں دیئے جائیں گے، اور برطانی سیاست اس امر کی مقتضی تھی کہ اس کی سرحد روس کی سرحد سے نہ ملنے پائے، لہذا اس نے روس کی ہمسائگی کے سیاسی خطرات سے بچنے کے لئے برطانی اور روسی علاقہ کے درمیان ایک فرانسیسی علاقہ کو حائل کر دینا مناسب سمجھا لیکن موصل کے چشمہائے روغن نفت پر ابتدا سے برطانیہ کا دانت تھا، اس لئے جب روسی خطرہ جاتا رہا تو اس نے فرانس کی دوستی کی پرواہ کئے بغیر آخر انھیں حاصل کر کے چھوڑا،

جنگ کے بعد ملکوں کی تقسیم، یہ ارادے اور منصوبے تھے جنھیں لے کر "حق پرست" مغربی قومیں جنگ میں شریک ہوئی تھیں، آیئے اب ہم دیکھیں کہ جنگ کے بعد انھوں نے اپنی "حق پرستی" کا کس طرح ثبوت دیا،

جنگ کے آخری ایام میں دو واقعات ایسے پیش آگئے جنھوں نے اس نقشہ کو بہت کچھ بدل دیا جو ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان خفیہ معاہدوں نے قایم کیا تھا، ان میں سے ایک واقعہ تو امریکہ کا شریک جنگ ہونا تھا، اور دوسرا روس کا انقلاب، امریکہ نے یورپ کے معاملات سے بے تعلق رہنے کی قدیم پالیسی کو چھوڑ کر جنگ میں صرف اس لئے شرکت کی تھی کہ اپنی تجارت کی کامیابی کے لئے وہ امن کا خواستگار تھا، لہذا اس کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ جنگ کے بعد غنایم جنگ کی تقسیم میں ایسی بے اعتدالیاں نہ ہونے پائیں جن سے ایک دوسری جنگ

ں نبیہ دینے والی ہو دوسری طرف روس جس شاہی حکومت کے ماتحت جنگ میں شریک ہو
ا، ۱۹۱۷ء کے آخر میں اس کا تختہ الٹ گیا، اور اس پر بولشویک جماعت کو غلبہ حاصل ہو گیا جو
گلستان فرانس اور اٹلی کی اغراض کے لئے جرمنی سے بھی زیادہ خطرناک تھی، اس لئے غنائم جنگ
ی تقسیم میں روس کا جو حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ سارا کا سارا منسوخ کر دیا گیا، اور حق پرست اتحادیوں
ر ایک نیا نقشہ بنانا پڑا جسمیں امریکہ کے امن خواہانہ جذبات کی رعایت بھی ضروری تھی،

بیان کیا جا چکا ہے کہ ۱۹۱۷ء کے خفیہ معاہدے میں فرانس نے روس کے ساتھ ملکر یہ طے کیا
ا، کہ دریائے رہائن کے مغربی جانب کا تمام علاقہ جرمنی سے چھین کر فرانس کے ساتھ ملحق کر دیا جائے
ں زمانہ میں پرنس سکستہ نے جب صدر جمہوریہ فرانس ایم پوانکارہ سے علاقہ رہائن کو منطقہ حیاد
Neutral Zone قرار دینے کی تجویز کی تھی تو حق پرست فرانس
صدر نے مسکرا کر کہا تھا کہ :-

"آدمی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ دل میں ہو سکو ہمیشہ ظاہر بھی کر دیا کرے
مثلاً میرے خیالات بھی وہی ہیں جو آپ کے ہیں"

اس طرح فرانس نے دوران جنگ ہی میں جرمنی کے ساتھ وہی عمل کرنے کی ٹھان لی تھی
۱۹۱۸ء میں جرمنی نے اس کے ساتھ کیا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ رہائن کے زرخیز علاقہ پر
ریکہ اور انگلستان دونوں کی پالیسی کے خلاف ہے اس لئے اس نے جنگ کے زمانہ میں
ا ارادہ کو پوشیدہ رکھا، اور اختتام جنگ کے بعد صلح کانفرنس میں سے پیش کیا، جسکی
ا امریکہ اور انگلستان دونوں نے اس تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی، صلح کانفرنس میں
یز تیز گفتگوئیں ہوئیں، اور فرانس کے انتہائی اصرار کے باوجود وہ
نی نہ ہوئے، آخر موسیو کلیمنشو نے جو اس وقت فرانس کے رئیس الوزراء تھے، تجویز جس
جرمنی پر جرتاوان جنگ عائد کیا گیا ہے، اس کی ضمانت کے طور پر رہائن کا علاقہ
سیبی احتلال Occupation میں دیدیا جائے، اس تجویز کے
فرانس کے بہت سے سیاسین نہ مجھ سکے اور فرانس کے یورپین مستعمرات میں بیش قیمت

ایکڑوں کا مبصوں اور ایمتارڈیو جیسے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن جب ایم کلیمنشو نے کھڑے ہوکر بتایا کہ ۱۵ سال کی تعیین کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے ہاتھ سے اس کے بہترین علاقے چھین کر اس پر اتنا تاوان ڈالدیا جائے کہ وہ اس کو مدت معینہ کے اندر ادا نہ کرسکے اور ہم پندرہ سال گذرنے کے بعد علاقہ رہائن کو ہمیشہ کے لئے ملحق کرلیں، تو اس پر تمام ایوان مطمئن ہوگیا، موسیو کلیمنشو کی اس تقریر کا ایک فقرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے، جس سے انکی "حق پرستی" کا حال خوب معلوم ہوتا ہے، انھوں نے موسیو پوانکارہ کو خطاب کرکے کہا:-

"جناب صدر! آپ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، ۱۵ سال کے اندر جرمنی کسی طرح معاہدے کی تمام دفعات کو پورا نہ کرسکے گا، اور مجھے یقین ہے کہ ۱۵ سال کے بعد اگر آپ میری قبر پر آنے کی زحمت نہ اٹھائیں گے تو ضرور مجھے خوشخبری دیں گے کہ ہم رہائن پر ہیں اور وہیں رہینگے"

یہ چال کامیاب ہوگئی، فرانس نے اپنے حلیفوں سے اس تجویز کو منظور کرالیا، اور اس کا مقصد پورا کرنے کے لئے جرمنی کو سلیشیا کے کوئلہ کی دولت سے بھی محروم کردیا گیا، تاکہ وہ اس گراں قدر تاوان کو کسی طرح ۱۵ سال کے اندر ادا نہ کرسکے، جو معاہدۂ فرسائی میں اس پر عائد کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی اس نے پولینڈ کی نئی ریاست کا نقشہ اس طرح مرتب کرایا کہ اس سے مشرقی پروشیا، دولت پروشیا کے باقی علاقوں سے بالکل منقطع ہوگیا ہے، اور ایک ایسی مشکل صورت حال پیدا ہوگئی ہے، جس کا حل بغیر اس کے نہیں ہوسکتا کہ جرمنی، جنگ عظیم کے مصائب سے افاقہ پاتے ہی سب سے پہلے پولینڈ کے ساتھ الجھ جائے،

پھر ۱۹۲۲ء میں جب فرانس کو اندیشہ ہوا کہ جرمنی ان تمام باتوں کے باوجود ۱۵ سال کے اندر رہائن کو واگذار کرالینے میں کامیاب ہوجائیگا، تو اس نے اپنے شکار پر ایک اور ضرب لگانے کا فیصلہ کیا، مجلس الوزراء کی مالی کمیٹی کے صدر موسیو دار یک اس سوال پر غور کرنے کے لئے مقرر کئے گئے، کہ روہر کے علاقہ پر قبضہ کرنا کس حد تک مفید ہوسکتا ہے؟ انھوں نے کافی عرصہ تک غور کرنے کے بعد مجلس الوزراء کے سامنے ایک خفیہ رپورٹ پیش کی، جسمیں یہ سفارش کی گئی تھی، کہ روہر کے علاقہ پر صرف عارضی ہی نہیں بلکہ مستقل قبضہ کرلیا جائے، چنانچہ اس سفارش

کے مطابق ۱۹۲۳ء کی ابتدا میں فرانس نے روہر پر اپنی فوجیں بھیج دیں اور جرمنی کو اس علاقہ سے محروم کر دیا جس پر اس کی صنعتی و معاشی زندگی کا تمام تر انحصار تھا۔ مسٹر ہیوور نے اپنی اس رپورٹ میں جن وجوہ کی بنا پر یہ مفروضہ قائم کی تھی وہ بھی خود انھیں کی زبان سے سنئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"۱۹۱۳ء میں تمام جرمنی کی کانوں سے ۱۹۰ ملین ٹن کوئلہ نکلا تھا جس میں سے ۱۵۰ ملین ٹن صرف روہر کا تھا۔ اس میں سے ۴۰ ملین ٹن کے قریب برآمد کیا گیا، اور ۱۰ ملین ٹن میں پیدا کرنے میں اور ۴۰ ملین ٹن دوسرے معدنوں میں استعمال کیا گیا۔ دیگر معادن جو جرمنی میں نکلتے تھے ان میں سے ۲۰ ملین ٹن صرف روہر کے تھے۔ علاوہ ازیں وہ تمام لوہے کے کارخانوں سے ۲۰ فیصدی سٹیل اور ۴۰ فیصدی لوہا روہر سے نکلتا اور اس سے وہ تمام چیزیں بنتی ہیں جو لوہے اور سٹیل سے بنتی ہیں۔ روہر سارے جرمنی سے بڑا تر کارخانے روہر ہی میں ہیں جو دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں جرمنی کے تمام صنعتی اور زراعتی مصنوعات کا ۴۰ فیصدی حصہ روہر سے نکلتا تھا۔ سب سے بڑے جہاز یہیں اور یہ سب کوئلے پر منحصر ہیں۔ جنگ کے بعد سے ان تمام ضروریات کے لئے کوئلہ حاصل کرنے کا ذریعہ جرمنی کے پاس صرف روہر رہ گیا ہے کیونکہ جنگ میں اس نے سارے علاقہ کو کھو دیا جہاں سے ۲۷ ملین ٹن کوئلہ سالانہ نکلتا تھا اور باقی سلیشیا کی کانیں جن سے ۴۰ ملین ٹن کوئلہ نکلتا تھا پس اب سوائے روہر کے جرمنی کے پاس اور کوئی ایسا علاقہ نہیں رہا ہے جو اس کو کوئلہ دے سکے۔

یہی حال دوسری دھاتوں کا بھی ہے جنگ سے پہلے جرمنی میں جتنا لوہا نکلتا تھا اس میں سے ۴۰ ملین ٹن روہر کا تھا۔ باقی سلیشیا کا ہر تھا جس میں سے دونوں علاقے جرمنی سے نکل چکے ہیں

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روہر کے احتلال کا مقصد صرف یہ تھا کہ جرمنی کو اس کے وسائل ثروت سے محروم کرکے بھوکا مار دیا جائے اور فرانس نہ صرف ان وسائل سے مستفید ہو بلکہ اس کے ساتھ ہی تاوانِ جنگ وصول نہ ہونے کے بہانہ سے رہائن کے مغربی علاقے پر بھی دائمی تسلط قائم کرلے،

دوسری طرف اٹلی کے حریصانہ مقاصد پورے کرنے کے لئے اسے نہ صرف ٹریسٹہ اور ٹرنٹینو کے علاقے دیئے گئے، بلکہ جنوبی تیرول (TYROL) کا علاقہ بھی اس سے ملحق کردیا گیا جو زیادہ تر جرمن قوم سے آباد ہے، باقی رہے ایڈریاٹک کے سواحل وجزائر، سو اگرچہ خفیہ معاہدات کی رو سے وہ اٹلی کا حصہ قرار پائے تھے، لیکن اختتامِ جنگ پر سرویا کا ایک نئی سلافی قوت کی شکل میں نمودار ہونا، اس منصوبے کی تکمیل میں حائل ہوگیا، اور ایڈریاٹک کی تقسیم کچھ اس صورت سے کی گئی کہ نہ اٹلی کے مقاصد اس سے پورے ہوتے ہیں اور نہ یوگوسلافیا کے، چنانچہ دونوں قوموں کے درمیان پیہم کشمکش جاری ہے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کب جنگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

یورپ کو اس غیر متناسب نقشہ پر تقسیم کرنے کے خطرات کو خود ان لوگوں نے محسوس کرلیا تھا، جو اس وقت دنیا کی قسمت کا فیصلہ کررہے تھے، چنانچہ ۱۹۱۹ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے صلح کانفرنس کے سامنے ایک یادداشت پیش کی تھی، جسمیں انھوں نے جرمن قوم کے لاکھوں افراد کو دوسری حکومتوں کے تسلط میں دینے کو ایک خطرناک فعل بتایا تھا، اور کہا تھا کہ یہ حرکت یورپ کو دوبارہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا کردیگی، اس یادداشت کے یہ الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہیں،

"یورپ کے ایک سرے سے دوسرے تک عام باشندے موجودہ نظامِ حیات پر سیاسی، معاشی اور اجتماعی، تمام حیثیات سے معترض ہیں"۔۔۔۔۔۔

سب سے بڑا خطرہ جو مجھے اس صورتِ حال میں نظر آرہا ہے، یہ ہے کہ کہیں جرمنی اپنی قسمت بولشوزم کے ساتھ وابستہ نہ کردے، اور اپنے وسائل ثروت، اپنے دماغ اور اپنی زبردست تنظیمی قوت ان انقلابی مجنونوں کے ہاتھ میں نہ دیدے

جو دنیا کو تھوڑے زور سے ہلا شور و غل سے خوب دیکھتے ہیں

میسرز لائڈ جارج کوئی بے بس اخبار نویس نہ تھے، بلکہ اس وقت صلح کانفرنس کے اکابر اربعہ میں سب سے زیادہ با اثر شخصیت کے مالک تھے، اگر وہ چاہتے تو یورپ کو ایسے غیر متناسب طریقہ پر تقسیم نہ کرتے جس کے خطرات وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، لیکن حرص و طمع نے اس "حق پرستی" نے جسکی خاطر دو دل جلفا جنگ میں شریک ہوئے تھے انکو اور ان کے رفقاء کو وہ سب کچھ کرنے پر آمادہ کر دیا جسے خود وہ بھی ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔

یہ "حق پرستی" کا مظاہرہ تو یورپ میں ہوا آؤ اب ایشیا کو دیکھیں کہ یہاں "حق" کی خاطر جنگ کرنے والوں نے لڑائی جیتنے کے بعد کیا کیا، عرب کی تقسیم کے متعلق ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں جو خفیہ سمجھوتے ہوئے تھے، ان کا حال اوپر گذر چکا ہے، ان سمجھوتوں کے متعلق دوران جنگ ہی میں عراق، شام اور فلسطین برطانیہ اور فرانس کے درمیان تقسیم ہو چکے تھے، لیکن جنگ کے آخر تک عربوں کو برابر یقین دلایا جاتا رہا کہ یہ جنگ محض ان کو ترکی کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے اور ان کو ایک مستقل سلطنت بنانے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء میں جب جنرل سر اسٹینلے ماڈ (MAUD) بغداد میں داخل ہوا تو اس نے اہل عرب کے نام ایک عام اعلان شائع کیا جس کے الفاظ یہ تھے:۔

"ہم آپ کے شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل نہیں ہوئے ہیں ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں بلکہ نجات دہندہ ہونے کی حیثیت سے آپ کو آزادی دلوانے آئے ہیں۔ ..... بغداد کے باشندوں کو جان لینا چاہئے کہ ہم ان کے ملک پر حکومت نہیں کرنا چاہتے، ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ان کے علما و فقہا کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہوں، ان کا ملک ایک مرتبہ پھر آزاد ہو، اور اس میں ایسے آئین و قوانین نافذ ہوں، جو ان کی مقدس شریعت اور قومی روایات کے مطابق ہوں"

جنگ کے خاتمہ پر بھی فرانس اور انگلستان کی جانب سے ایک مشترک شذرہ بادعرب میں شائع کیا گیا جسمیں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ یہ دعوی کیا گیا تھا:

یہ جنگ جو دنیا کو جرمنی کے مطامع استعماریہ سے بچانے کے لئے برپا کی گئی تھی اس کے خطرات و مصائب کو مشرق تک وسیع کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ برطانیہ اور فرانس ان تمام قوموں کو جو ایک طویل زمانہ سے ترکوں کے جور و ستم کی تختۂ مشق بنی ہوئی تھیں کامل آزادی دلانا چاہتے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ ایسی وطنی حکومتیں اور ادارات قائم کئے جائیں جو خود ان قوموں کی اپنی رغبت و خواہش پر مبنی ہوں اور جنمیں کوئی دوسرا دخیل نہ ہو،،

لیکن ان لفظی اعلانات کے ساتھ جب عربوں نے اتحادیوں کا عمل یہ دیکھا کہ شام کے سواحل پر فرانس کی فوجیں مسلط ہیں اور عراق و فلسطین میں انگریزوں کا پنجۂ استبداد مستولی ہے تو ان کو معلوم ہو گیا کہ حقیقۃً ان کے ساتھ غدر کیا گیا ہے، اور یہ چال محض ترکوں اور عربوں میں نفاق ڈال کر ملک چھیننے کے لئے چلی گئی ہے، آخر انھوں نے عراق، شام اور فلسطین میں آزادی کی جد و جہد شروع کی اور شام میں امیر فیصل بن حسین کے ماتحت ایک وطنی حکومت قایم کر دی، اسی اثنا میں خود حلفا کے درمیان غنایم جنگ کی تقسیم پر تنافس و تباغض کا سلسلہ شروع ہو گیا، سائکس پیکو کے معاہدہ کی رو سے موصل کا علاقہ فرانسیسی منطقۂ نفوذ میں دیا گیا تھا، مگر وہاں تیل کے چشموں کی کثرت دیکھ کر برطانیہ کے جذبۂ حرص کو حرکت ہوئی اور اس نے خود اس پر قبضہ کر لیا، اسی طرح فلسطین کے متعلق یہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک بین الدولی علاقہ رہے گا اور صرف حیفا پر برطانی حکومت قایم ہو گی، مگر مصر کی شورش نے برطانیہ کو مجبور کر دیا کہ ہندوستان کے راستہ کی حفاظت کے لئے نہر سویز کے دوسری جانب بھی اپنے اقتدار کو مضبوط کرے، اور ممکن ہو تو حیفا سے بصرہ تک ایک دوسرا راستہ اپنے لئے پیدا کرے لہذا فلسطین پر بھی اس نے پورا پورا قبضہ جمانے کا تہیہ کر لیا، دوسری طرف شام پر بھی فرانسیسی نفوذ و اثر برطانیہ کو ناگوار تھا اور وہ اپنی مصلحت کے لئے زیادہ بہتر یہ سمجھتا تھا کہ اس کے زیر اثر کوئی وطنی حکومت وہاں قایم ہو جائے، ان مسائل پر تقریباً ڈیڑھ سال تک دونوں دوستوں میں کشمکش ہوتی رہی، اور لوٹ کے مال کی تقسیم کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا

مگر جب دونوں سلطنتوں نے اس باہمی نزاع کا نتیجہ یہ دیکھا کہ عرب کی وطنی تحریک ترقی کر رہی ہے تو وہ اپنے مشترک فوائد کی خاطر عربوں کے خلاف متحد ہو گئے اور اپریل ۱۹۱۶ء میں بمقام سان ریمو انھوں نے یہ تصفیہ کر لیا کہ عراق و فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں رہیں اور شام بتمامہ فرانس کے قبضہ میں۔ یہ تقسیم کسی طرح اس تقسیم سے مختلف نہ تھی جو ڈاکوؤں کے گروہ میں لوٹ کے بعد کیا کرتے ہیں، مگر یورپ کے مہذب ڈاکوؤں نے اس کو بھی حق اور انصاف کا نام دینے کی کی اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے ظاہر کیا کہ یہ تینوں ملک ان کو جمعیت اقوام کی حفاظت دیئے گئے ہیں، حالانکہ نہ کسی جمعیت اقوام کو یہ حق پہونچتا تھا کہ کسی قوم کو بھیڑ بکریوں کی طرح دوسری قوم کی ملک میں دیدے، نہ اس وقت تک جمعیت اقوام کا کوئی اجتماع ہوا تھا، اور نہ اس سے متعلق کوئی فیصلہ کیا گیا تھا۔ بہرحال اس قرارداد کے مطابق شام فرانس کی ملک بن گیا اور جنرل گورو نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ شامیوں کی قومی حکومت پر حملہ کر دیا اور خنجر اور تلوار کے زور سے اطاعت و بندگی پر مجبور کیا جنھیں چار سال پہلے دوست بنایا گیا تھا۔ ترکوں کو شکست دیکر ملک فتح کیا گیا تھا جنھوں نے دو سال پہلے تک یقین دلایا تھا کہ وہ صرف ملک کو آزاد کرنے کے لئے جنگ کر رہے ہیں، جن سے جنگ کے بعد تک یہ وعدہ کیا جاتا تھا کہ تمھارے ملک پر خود تمھاری حکومت ہوگی!

دوسری طرف اہل عراق کو جو برطانی انتداب کا اعلان سننے ہی جھٹکا لگنے والے تھے تلوار کے زور سے کچلا گیا جس زمین پر چار سو ترکوں نے کبھی ہم سے زیادہ آدمی نہیں بھیجے تھے، اس پر برطانیہ نے ۱۲ ہزار سے زیادہ فوج اتار دی۔ اس زمین پر ظالم ترکوں نے سالانہ دو سو سے زیادہ آدمیوں کو کبھی قتل نہیں کیا تھا، برطانیوں نے ایک ہی موسم گرما ۱۹۲۰ء میں دس ہزار عربوں کو قتل کر دیا۔ اس وقت کیا گیا جب کہ تمھیں عربوں سے یہ کہکر جنگ میں مدد حاصل کی گئی تھی کہ ہم تمھارے دشمن بنکر نہیں آئے بلکہ تم کو آزادی دلوانے آئے ہیں۔ اس طرح عرب کی تحریک انتداب کے خلاف [illegible] جمعیت اقوام کا پہلا عام اجتماع [illegible] جنیوا میں ہوا۔

دو پہنچنے کے بعد برطانیہ نے ایک طرف اپنے مواعید کی ظاہری حرمت برقرار رکھنے کے لئے اور دوسری طرف اس برطانی پبلک کو مطمئن کرنے کے لئے جو عراق میں دس کروڑ پونڈ سالانہ کے بیش اسراف سے سخت ناراض تھی، یہ ضروری سمجھا کہ عراق پر براہ راست حکومت کرنے کے بجائے ایک ایسی نام نہاد وطنی حکومت قایم کردی جائے جو جنرل ماڈ کے اعلان کے برعکس اہل عراق کی نہیں بلکہ اہل برطانیہ کی خواہش کی تابع ہو۔ اس غرض کے لئے اُس نے ۱۹۲۱ء کے موسم بہار میں اعلان کیا کہ اہل عراق کو خود اپنا بادشاہ منتخب کرنے کا اختیار ہے، لیکن اس اعلان کی تعمیل یوں کی گئی کہ اہل عراق کو انتخاب کا کوئی حق نہیں دیا گیا، ان کی خواہش کے برعکس فیصل بن حسین کو جو شام کے تخت سے محروم ہونے کے بعد کسی اور تخت کا خواہشمند تھا، اس شرط پر تخت عراق کے لئے نامزد کیا گیا کہ وہ برطانیہ کے زیر اثر رہ کر کام کریگا، اہل عراق کسی طرح فیصل کی بادشاہت پر راضی نہ تھے مگر برطانیہ نے زبردستی ان کی آواز کو دبایا، عراق کے بااثر لیڈر طالب پاشا (جس نے جنگ کے زمانہ میں برطانیہ کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں) کو گرفتار کرکے لنکا میں قید کردیا، اور عراق کی برحق ہوئی ناراضی کا دف مارنے کے لئے ۲۳ اگست ۱۹۲۱ء کو ایسی حالت میں شاہ فیصل کی تخت نشینی کا اعلان کرادیا جب کہ فی الحقیقت "تخت" تیار بھی نہ تھا، اور شراب کے پیپے رکھکر ایک عارضی "تخت" بنالیا گیا تھا،

اس طرح فیصل کو عراق کا بادشاہ بنانے کے بعد برطانیہ نے اور اسی برطانیہ نے جو عراقیوں کو نجات دلانے کے لئے عراق گیا تھا، تخت شاہی کی قیمت طلب کی، وہ قیمت کیا تھی؟ وہ صرف یہ تھی کہ عراق کو ایک ایسا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا گیا جس کی رو سے وہ بالواسطہ پورے طور پر برطانی اثر و اقتدار کے تحت آجاتا ہے، اور اس کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے برطانیہ کے ہاتھ میں رہتا ہے، یہ معاہدہ عراقی قوم کو ایک لمحہ کے لئے بھی منظور نہ تھا مگر دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے اس پر عراقی قوم کی رضامندی ثبت کرانے کا یہ انوکھا طریقہ ایجاد کیا گیا کہ اسے آدھی رات کو عراق کی مجلس وطنی میں پیش کیا گیا، ارکان مجلس کو بستروں سے اٹھا اٹھا کر پولیس کی معرفت بلوایا گیا، اور جبراً ان سے ووٹ لے کر اعلان کردیا گیا کہ عراقی پارلیمنٹ نے معاہدہ کی تصدیق کردی ہے،

اب رہی ٹرکی کی دوسری تقسیم جس کے متعلق ۱۹۱۷ء میں روس سے سمجھوتہ ہوا تھا، سو اسکو بولشویک انقلاب کے باعث منسوخ کر دیا گیا، اور ایک دوسری اسکیم بنائی گئی جس میں روس کے بجائے یونان کو ٹرکی کے ترکہ کا وارث قرار دیا گیا، اس اسکیم کے مطابق یونان نے مشرقی تھریس اور سمرنا پر حملہ کیا اور ترکوں کو ان کے اصلی وطن کے بھی ایک بڑے حصہ سے محروم کر دیا، اس کے ساتھ ہی برطانیہ، فرانس، اور یونان کی متحدہ فوجوں نے خاص شہر قسطنطنیہ پر بھی قبضہ کر لیا، اور درۂ دانیال و باسفورس کے وہ راستے ترکوں سے چھین لئے جنھیں پہلے روس کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، یہ دوسری تقسیم بعد کو لوزان کانفرنس میں منسوخ ہو گئی لیکن اس تنسیخ میں انصاف پسندی کے جذبہ کو کوئی دخل نہ تھا بلکہ حقیقۃً اس کی ذمہ داری محض ترکی تلوار پر تھی جس نے یونان اور دول حلفا کو ترکی خاک سے نکل جانے پر مجبور کر دیا،

جنگ کے جائز مقاصد، یہ ان قوموں کے جنگی اعمال کی روداد ہے، جو تہذیب مغربی کی علمبردار ہیں، بلکہ حقیقۃً انھیں کی تہذیب کا نام مغربی تہذیب ہے، یورپ کے چند اہل الفکر مصنفین اور عالموں کو چھوڑ کر، جنکا درحقیقت کوئی اثر نہیں ہے، باقی تمام انگلستان فرانس اٹلی، جرمنی اور آسٹریا کی رائے عام ان اعمال کی موید تھی، اور اسی کی پرجوش مدد سے ان سلطنتوں کے مدبرین اتنی بڑی جنگ کرنے میں کامیاب ہوئے، اس سے ان کے تعاون اور طریق کار کو دیکھ کر ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ جنگ سے پہلے جنگ کے دوران میں اور جنگ کے بعد جو جو افعال "حق" اور "انصاف" کے نام سے کئے گئے، وہی درصل مغربی تہذیب میں "حق" اور "انصاف" کے معنی موضوع لہ ہیں، اور ایسے ہی حقوق کی خاطر تلوار اٹھانا مغربی تہذیب جائز رکھتی ہے،

اس معیار کے مطابق جنگ کے وہ مقاصد جو مغربی تہذیب میں جائز سمجھے گئے ہیں، حسب ذیل قرار پاتے ہیں:-

۱- اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے دنیا کی ثروت کا اجارہ حاصل کرنا،

۲- اگر کوئی حریف تجارت و صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہو تو اسکا منہ کچل دینا،

۳- اپنے دور دراز کے مقبوضات کے راستہ میں جو ممالک واقع ہوں انھیں اپنے زیر [illegible]

۴۔ مقبوضہ و مفتوحہ ملکوں کے حصے بخرے کرنا اور کمزور قوموں کو غلام بنانا،

۵۔ اگر کسی قوم سے دشمنی ہو جائے خواہ کسی وجہ سے ہو تو اسے مٹا دینا یا کم از کم اس کا تو توڑ دینا،

ان اغراض کو جنھیں اکثر "مقدس حقوق" سے تعبیر کیا گیا ہے کسی توضیح و تشریح کی روشنی درکار نہیں ہے، ہر شخص کا ضمیر خود ان کے جواز و عدم جواز اور تقدس و عدم تقدس کا فیصلہ کر سکتا ہے ممکن ہے کہ بعض حضرات اس طریق استدلال کو مبالغہ اور غلو پر مبنی قرار دیں، مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مغربی قوموں کے اجتماعی عمل کے سوا مغربی تہذیب اور کس چیز کا نام ہو سکتا ہے؟ مذہب قابل استناد ہو سکتا تھا، مگر نہ تو یورپین قومیں اسکو اپنی سیاست میں دخل دینے کی اجازت دیتی ہیں، اور نہ وہ خود سیاسی امور سے تعلق رکھنا پسند کرتا ہے، قانون کو بھی معتبر سمجھا جا سکتا مگر آپ سن چکے ہیں کہ وہ جنگ کے جائز اور ناجائز مقاصد سے کوئی بحث ہی نہیں کرتا اب دونوں چیزوں کو الگ الگ کر دینے کے بعد ہم مغربی تہذیب کا عقیدہ کس سے دریافت کریں؟ کیا علماء اخلاقیات سے دریافت کریں؟ کیا امن کا وعظ کہنے والے مفکرین سے دریافت کریں؟ کیا ان متقی کے چند مصنفوں اور اخبار نویسوں سے دریافت کریں جن کے قلم سے کبھی کبھی انسانیت اور انسانی اخوت کے دل خوش کن خیالات ٹپک پڑتے ہیں؟ ہمیں ان لوگوں سے استفتا کرنے میں تامل نہیں ہے، مگر ہم کو ان میں سے ہزار دو ہزار نہیں صرف ایک دو ہی ایسے آدمیوں کے نام بتا دیے جائیں جن کا کوئی قول مغربی اقوام کے لئے حجت کا حکم رکھتا ہو، اور جن کے خیالات پر نام اہل مغرب یا ان کی اکثریت کا ایمان ہو، اگر کوئی ایسی متفق علیہ چیز مغرب میں موجود نہیں ہے تو ہمارے پاس مغربی قوموں کے معمول بہ طریقوں کے سوا اور کون سی چیز رہ جاتی ہے جس سے ہم جنگ کے متعلق مغربی قوموں کا اخلاقی عقیدہ معلوم کر سکیں؟

قیام امن اور خلع سلاح کی تجویزیں، جنگ کے مسئلہ میں یورپ کی نیک نیتی کو ثابت کرنے کے لئے ان کوششوں کا ضرور حوالہ دیا جائیگا، جو چند سال سے جنگ کو روکنے، دائمی امن قائم کرنے، آلات و اسلحہ کے استعمال پر قیود عائد کرنے، اور جنگی طاقتوں کو توڑ دینے یا حتی الامکان کم کر دینے کے متعلق کی جا رہی ہیں، لیکن ان کوششوں کی ظاہر فریب صورت سے قطع نظر کر

جب ہم ان کی حقیقت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جنگ کو روکنے کی نہیں بلکہ اسے پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دینے کی خواہش پنہاں ہے۔

تخفیفِ اسلحہ کی تجویز رسمی طور پر سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں پیش کی گئی تھی۔ اگست ۹۸ء میں زارِ روس کی جانب سے بڑی بڑی سلطنتوں کو ایک سرکلر بھیجا گیا تھا جسمیں ایک بین الملی اجتماع کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

"امن و صلح کا تحفظ بین الملی سیاست کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے بڑی بڑی سلطنتوں نے طاقتور اتحاد قائم کر رکھے ہیں۔ اسی امن کی ضمانت کے لئے انھوں نے اپنی فوجی طاقت کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ اس سے پہلے اتنی طاقت کبھی نہ دیکھی گئی تھی، اور وہ اسے برابر بڑھاتی دیے جا رہی ہیں، اور اس کی خاطر کسی قربانی میں تامل نہیں کرتیں لیکن اسکے باوجود وہ شریف تر مقصد یعنی قیامِ امن کسی صرح حاصل نہیں ہوتا۔

روز افزوں مالی مصارف عام رفاہیت و خوش حالی کے منابع کو خشک کئے دے رہے ہیں، قوموں کی ذہنی و جسمانی طاقت ان کی محنت اور ان کا سرمایہ سب کچھ اپنے اصلی مصرف کے بجائے ایسے کاموں میں صرف ہو رہا ہے جن سے کوئی منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ کروروں روپیہ تخریب کے ان آلات کی ساخت میں صرف ہو رہا ہے جو آج چاہے سائنس کے منتہائے کمال ہوں مگر کل اسی میدان میں کسی نئے انکشاف سے اپنی قدر و قیمت ضرور کھو دیں گے۔ اس کی بدولت قومی تہذیب، اقتصادی ترقی اور دولت کی پیدا وار خطرہ میں پڑ گئی ہے یا اس کا نشو و نما رک گیا ہے۔

مزید برآں جس نسبت سے ہر سلطنت کی فوجی قوت میں اضافہ ہوتا ہے اسی نسبت سے اس مقصد کا حصول بعید تر ہوتا جا رہا ہے جسے سلطنتیں حاصل کرنا چاہتی ہیں، اقتصادی مشکلات جو زیادہ تر فوجوں کے ناقابلِ برداشت تک بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور وہ دائمی خطرات جو آلاتِ جنگ کی اتنی کثرت

میں مضمر ہیں، ہمارے موجودہ زمانہ کی ہتھیار بند صلح کو ایک جاں گسل بوجھ کی صورت میں تبدیل کر رہے ہیں، جس کا اٹھانا باشندوں کے لئے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے، پس یہ بالکل ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ صورتِ حال قائم رہی تو وہ لازماً دنیا کو اسی مہلکہ کی طرف لیجائیگی، جس سے بچنا مقصود ہے اور جس کے آلام کا محض تصور ہی انسانی فکر کے لئے بہت ہولناک ہے،،

یہ خیالات آج سے ۳۰ سال پہلے ایک ایسی سلطنت کی جانب سے ظاہر کئے گئے تھے جو خود جنگی طیاریوں اور جنگ آزمائی کے ارادوں میں سب سے پیش پیش تھی جس وقت دنیا میں ان خیالات کی اشاعت ہوئی تو ہر طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، مبارکباد کی صدائیں بلند ہوئیں، اور دنیا کی بہت سی سلطنتوں نے بین الملی کانفرنس کی دعوت پر لبیک کہا، چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۸۹۹ء میں پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے لائحۂ عمل کی سب سے پہلی دفعہ یہ تھی کہ جلد سے جلد بری و بحری قوتوں کی روز افزوں ترقی کو روکا جائے، لیکن جب کانفرنس کے مباحثات شروع ہوئے تو بہت جلدی یہ حقیقت منکشف ہو گئی، کہ سلطنتوں میں تخفیفِ اسلحہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے، مسٹر ہولس جو کانفرنس میں امریکہ کے نمائندے بنکر آئے تھے، اس رنگ کو ابتدا ہی میں سمجھ گئے تھے اور انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہدیا تھا، کہ:-

،،ہر شخص جو بھول پن کی بنا پر خلعِ سلاح کی تجویزوں سے توقعات وابستہ کئے بیٹھا ہے یا یہ امید رکھتا ہے کہ ایک بین الملی عدالت عالیہ ایک بین الملی پولیس کے ساتھ قائم ہوگی اور اس کے فیصلے دنیا پر نافذ کرائے جائیں گے اسکو آخر میں یقیناً مایوس ہونا پڑیگا[1]،،

چنانچہ یہی ہوا، کانفرنس نے پہلے تو خلع سلاح یا تخفیفِ اسلحہ کی تجویز پر غور ہی کرنے سے اعراض کیا پھر جب اس پر زیادہ زور دیا گیا تو ہر سلطنت کی طرف سے اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی آخر اس مسئلہ کو محض ایک ریزولیوشن پاس کر کے ختم کر دیا گیا، جس کے

[1] ٹائمز مورخہ یکم اگست ۱۸۹۹ء،

الفاظ یہ تھے :-

"یہ کانفرنس یہ رائے رکھتی ہے کہ فوجی مصارف کو جو بحالت موجودہ دنیا پر ایک بھاری بوجھ ہیں کم کرنا نوع بشری کی اخلاقی و مادی بہبود کے لئے حد درجہ مطلوب ہے"

اس "رائے" اور "حد درجہ مطلوب" کی جو کچھ قیمت تھی وہ اس سے ظاہر ہے کہ پہلی ہیگ کانفرنس کے بعد سے دوسری ہیگ کانفرنس تک کسی ایک سلطنت نے بھی اس کا لحاظ نہ کیا اور جنگی قوتوں کی کمیت و کیفیت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں جب دوسری ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کے ایجنڈا میں خلع سلاح کا تجویز کا ذکر تک نہ تھا۔ بلکہ تصریح کر دی گئی تھی کہ "ایسے مسائل کو ہاتھ نہ لگایا جائیگا جو بری و بحری قوی کی تحدید سے تعلق رکھتے ہیں" تاہم بعض مصالح کی بنا پر پہلی کانفرنس کے رزولیوشن کا اعادہ کرا دینا مناسب سمجھا گیا، اور اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی بڑھا دیا گیا :-

"اور چونکہ اس وقت (یعنی پہلی کانفرنس) کے بعد سے تقریباً ہر سلطنت کے فوجی مصارف میں کافی اضافہ ہوا ہے، اس لئے یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے کہ یہ امر خاص طور پر مطلوب ہے کہ سلطنتیں اس سوال پر دوبارہ سنجیدگی کے ساتھ غور کریں"

اس قرارداد کا منشا صرف اس قدر تھا کہ سلطنتیں خلع سلاح کے سوال پر نئے سرے سے غور کریں، چنانچہ سلطنتوں نے بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور جس نتیجہ پر پہنچیں وہ یہ تھا کہ جنگی طیاریوں کو اور زیادہ بڑھا دیں۔

جنگ عظیم سے تھوڑے عرصہ پہلے یورپ کے ارباب فکر میں پھر اس سوال پر بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ جنگ کو بجبر روکنے کی مناسب تدبیر کیا ہو سکتی ہیں؟ اور بین الملی قانون کس حد تک ان کی اجازت دیتا ہے؟ لیکن ابھی ان سوالات پر گفتگو ہی ہو رہی تھی کہ جنگ چھڑ گئی، اور دنیا ایک دوسرے اور اہم تر سوال یعنی بقائے حیات کے سوال کو حل کرنے میں منہمک ہو گئی۔ اگرچہ بعض تجویزیں پیش تھیں بھی اپنے گوشہائے عزلت میں بیٹھے خلع سلاح

و ذرائع صنعت، صحہ کی تجویزوں پر کام کیے جا رہے تھے، نہ جنگ کو زبردستی روکنے کے وسائل پر غور کرنے میں مشغول تھے، مگر عملی دنیا میں ہر آن ان کے خیالات کی تردید ہو رہی تھی، اور دنیا کے لوگوں کو ان کے افکار پر غور کرنا تو درکنار ان کو سننے کی بھی فرصت نہ تھی، تاہم ان کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت امریکہ نے سرکاری طور پر اس تحریک کو اٹھانا قبول کر لیا، اور ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو صدر جمہوریۂ امریکہ مسٹر ولسن نے سینٹ کے نام ایک طویل پیغام بھیجا جس میں منجملہ اور امور کے ایک یہ تجویز بھی تھی کہ:-

"فوجوں کے استعمال میں اعتدال کو ملحوظ رکھا جائے جس سے قوائے حرب محض قیام امن کا ذریعہ ہوں نہ کہ حملہ آور خود غرضانہ جبر و تشدد کا آلہ...
..... اگر ہر ملک میں زبردست سامانِ جنگ کی صنعت اور افواج کی ترتیب کا سلسلہ جاری رہے تو دنیا کی قوموں میں سکون و اطمینان کا احساس کبھی پیدا نہیں ہو سکتا، بری و بحری افواج اور آلاتِ جنگ کا مسئلہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے، جو اقوامِ عالم اور نوعِ بشری کی آئندہ قسمت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے"

۱۹۱۵ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جبکہ ایک مغربی سلطنت کی جانب سے خلعِ سلاح کا مسئلہ باضابطہ چھیڑا گیا، لیکن اس مرتبہ یہ آواز پہلے سے بھی زیادہ بے معنی اور لغو تھی، کیونکہ جس سلطنت نے اسے بلند کیا تھا وہ خود جنگ میں شریک ہوئی اور اپنے عمل سے اس نے خود اپنے قول کی تردید کر دی۔

جمعیتِ اقوام جنگ عظیم کے بعد فتحیاب مغربی سلطنتوں نے پریزیڈنٹ ولسن کے مشورہ سے ایک انجمن قائم کی جس کو جمعیتِ اقوام (LEAGUE OF NATIONS) کا خطاب دیا گیا، اس انجمن کا اولین مقصد یہ قرار دیا گیا تھا، کہ جنگ اور اسبابِ جنگ کو ختم کیا جائے، چنانچہ اسبابِ جنگ کے استیصال کے لئے اس نے ایک بین الملی محکمۂ عدلیہ قائم کیا تاکہ وہ سلطنتوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کرے، اور خود جنگ کو روکنے کے لئے سلطنتوں کے درمیان ایک مفاہمت کی جس کا منشا یہ تھا کہ سلطنتیں اپنے باہمی نزاعات کو مصالحانہ طریقوں سے طے کیا کریں، اور اگر کوئی سلطنت اپنی اغراض کے لئے تلوار سے کام لے تو تمام سلطنتیں مل کر اس کو راہِ راست پر لائیں

اس مفاہمت کی دفعہ ۱۶ کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر جمعیت کے کسی رکن نے اس مجموعہ کی دفعہ ۱۰، ۱۱، ۱۵ کو پس پشت ڈال کر جنگ چھیڑ دی، تو اس کا یہ فعل معنی جمعیت کے تمام دوسرے ارکان کے خلاف جنگ کا مترادف ہوگا، اور ارکان جمعیت اس مفاہمت کے مطابق عہد کرتے ہیں کہ وہ فوراً ہی اس عہد شکن سلطنت سے اپنے مالی و تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے اور اپنی رعایا کا بھی اسکی رعایا سے لین دین بند کر دیں گے، نیز وہ کوشش کریں گے کہ اس سلطنت کی رعایا کو دوسری سلطنتوں کی رعایا سے بھی تجارتی مالی یا شخصی تعلقات نہ رکھنے دیں خواہ وہ سلطنتیں جمعیت کی ممبر ہوں یا نہ ہوں"

اس کے بعد دوسرے فقرے میں جمعیت کی مجلس منتظمہ کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس مجرم سلطنت کی مزاج پرسی کرنے کے لئے اپنے ارکان سے جتنی بری و بحری فوج مناسب سمجھے طلب کرے، اور تمام ارکان کا فرض قرار دیا گیا ہے، کہ وہ اپنی مالی و جنگی قوتوں کو اس مجرم سلطنت کے خلاف استعمال کرنے کے لئے [illegible] پر رہیں۔

یہ مجموعہ بظاہر جنگ کو روکنے کا نہایت موثر اور [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی جتھہ بندی کی زیادہ مہذب [illegible] بدولت ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم برپا ہوئی تھی جو کہ [illegible] نتائج دیکھ کر تمام یورپ اس سے متنفر ہو گیا تھا، اور اسی کو اپنے تمام مصائب کا باعث سمجھتا تھا، اس لئے مغربی سلطنتیں اس پرانے طریقے کو چھوڑنے پر [illegible] اغراض کا حاصل ہونا بھی ناممکن تھا، کیونکہ فرد فرد کسی سلطنت کا اتنا [illegible] کو مرعوب کر کے اپنے مطامع حاصل کرے۔ [illegible] کے لئے ضروری ہے کہ بڑی بڑی سلطنتیں متحدہ قوت کے ساتھ دنیا پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کریں۔ اسی لئے انھوں نے اسی جتھہ بندی کو ایک دوسری وضع و شکل میں اختیار کیا ہے جسمیں صلح کا بھی [illegible] اتحاد کے بجائے صلح کوشی و امن پروری کے [illegible] میں وہی خبیثانہ اتحاد و اشتراک کاری روح بھری ہوئی ہے، جہاں تک چھوٹی سلطنتوں کو دبانے کا تعلق ہے جمعیت کا یہ مجموعہ

بہت کا بند ہو سکتا ہے، اگر یونان اور بلغاریہ میں اختلاف ہو یا پولینڈ اور لتھوینیا میں جھگڑا ہو جائے، تو جمعیت اقوام کے بڑے بڑے ارکان ایک دھمکی میں ان کو درست کر سکتے ہیں۔ اس طرح صرف یہی نہیں ہوتا کہ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا سلسلہ بند ہو سکتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جمعیت کے لیڈروں کا رعب و اثر بھی ساری دنیا پر قایم ہو جاتا ہے، اور وہ "خدا فوجدار" بن کر نظام عالم میں ترمیم و تنسیخ کرنے، طاقتوں کو گھٹانے بڑھانے، مرغوب قوتوں کو ممنون کرنے اور غیر مرغوب قوتوں کو خوفزدہ کرنے کی خدمات بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں، لیکن اگر خود بڑی طاقتوں میں سے کوئی جمعیت کے سمجھوتے کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو جمعیت اس پر کسی قسم کی کارروائی کرنا تو درکنار، زبانی باز پرس کی بھی جرأت نہیں کر سکتی، اور اگر وہ اس کی جرأت کرے بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ آج انگلستان جمعیت کی سمجھوتے کی خلاف ورزی کر کے امن عام کے منافی کوئی جرم کرتا ہے، جمعیت کی کونسل اس پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہوتی ہے، تمام ارکان کے اتفاق سے مجرم کو تہدید کیجاتی ہے کہ وہ ارتکاب جرم سے باز آئے ورنہ اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائیگی، مگر مجرم جو دنیا میں سب سے بڑی بحری قوت کا مالک ہے، اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر جاتا ہے۔ آخر جمعیت مجبور ہو کر اپنے ارکان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ دولت برطانیہ سے ہر قسم کے تجارتی، مالی، اور سفارتی تعلقات منقطع کر لیں، اور اپنی جنگی قوت سے اس کو امتثال امر پر مجبور کریں، اب سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کی تمام وہ سلطنتیں جو جمعیت کی رکن ہیں، محض جمعیت کے حکم کی تعمیل میں اس بات پر آمادہ ہو جائیں گی کہ ان بیشمار معاشی، سیاسی، تجارتی اور مالی مصالح کو قربان کر دیں جو انگلستان جیسی عظیم الشان سلطنت سے وہ وابستہ رکھتی ہیں؟ کیا دنیا کی آبادی کے ۱/۱ حصہ سے بقیہ ۴/۵ حصہ کے تعلقات یکلخت منقطع ہو جائیں گے؟ کیا یورپ اور امریکہ کی بڑی بڑی سلطنتیں اپنے مخصوص مصالح کو نظر انداز کر کے محض اس لئے ایک زبردست سلطنت کے مقابلہ میں جنگ کے نقصانات برداشت کرنے پر راضی ہو جائیں گی کہ جمعیت اقوام ان سے ایسا کرانا چاہتی ہے؟ کوئی شخص جو عملی سیاست سے ذرہ برابر بھی مس رکھتا ہو، ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں

دے سکتا اور جب کہ اسکا جواب اثبات میں ہے، تو یہ سوال کہ آیا جمعیت قوموں کو
سلطنتوں کو قابو میں رکھنے سے عاجز ہے، جائز نہیں رہتا کہ من حیث العالم کو اصلی خطرہ انھیں بڑی سلطنتوں کی حرص و طمع سے ہے
یہ محض ایک مفروضہ صورت نہیں ہے، بلکہ گذشتہ ۸ سال میں اس کا پورا تجربہ کیا جا
ہے، جس روز سے جمعیتِ اقوام عالم وجود میں آئی ہے، اس کو ایک مرتبہ بھی یہ جرأت نہیں ہوا
کہ بڑی سلطنتوں میں سے کسی کے ظالمانہ افعال پر باز پرس کرے۔ دمشق میں فرانس نے
علانیہ قتل عام کیا اور جمعیت خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ حالانکہ اسی کی جانب سے شام کا عا
فرانس کو انتداباً دیا گیا تھا، ریف کی چھوٹی سی قوم کو ہسپانیہ اور فرانس نے ملکر ہلاک کر دی
اور جمعیت ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی، اٹلی اور یونان کے مسئلہ میں جمعیت نے دخل
دینا چاہا، مگر اٹلی کی ایک دھمکی اس کا منہ بند کرنے کے لئے کافی تھی، برطانیہ نے عراق میں
خون کی ندیاں بہا دیں، مگر جمعیت نے پلٹ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ جس ملک کو اس کے انتداب
میں دیا گیا ہے، اس کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہا ہے؟ پھر جمعیت کی پنچایت میں آج تک
جتنے ایسے مسائل پیش ہوئے ہیں جو چھوٹی اور بڑی سلطنتوں کے درمیان متنازع فیہ تھے
ان میں بھی ہمیشہ بڑی سلطنتوں کی جیت ہوئی اور کبھی یہ نہ دیکھا گیا کہ کسی کمزور کو طاقتور کے
مقابلہ میں کامیابی نصیب ہوئی ہو۔ موصل کا مسئلہ ابھی بالکل تازہ ہے، اسکو محض برطانیہ کی
اقتصادی حرص کی خاطر جس طرح ترکی سے الگ کرکے عراق سے ملحق کر دیا گیا ہے، اس سے
یہ راز بالکل آشکارا ہو جاتا ہے کہ جمعیتِ اقوام دراصل دنیا کی طاقتور سلطنتوں کا ایک جتھا
ہے جس کو ان سلطنتوں نے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اپنی اغراض حاصل کرنے کے لئے
قایم کر رکھا ہے، اس جتھے کی قوت جن قوموں کے خلاف استعمال کی گئی ہے، اور کی جا رہی
ہے، ان میں ناراضی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے حقوق، بلکہ عین وجود کی حفاظت
کے لئے ایک دوسرا جتھا قایم کرنا چاہتی ہیں تاکہ جب بھی مغربی دول اپنی متحدہ قوت سے
ان کو دبانے کی کوشش کریں تو یہ بھی متحدہ قوت کے ساتھ ان کا جواب دے سکیں۔ یہ خواہش
اگر قوت سے فعل میں آگئی تو وہی دو مقابل کے جتھے پھر بنائیں گے، جو جنگ عظیم سے پہلے بنے
تھے اور دنیا میں پھر ایک عالمگیر جنگ برپا ہوگی جو شاید پہلے سے بھی زیادہ مہلک ہو،

جنگ کے متعلق نئی جدید تجویزیں گذشتہ سات سال سے یورپ اور امریکہ میں خلع سلاح تخفیف
[illegible] اور آئندہ جنگ کے مسائل پر بھی مختلف تجویزیں سرگرمی کے ساتھ زیر بحث ہیں، اور
بہت سے خوش گمان لوگ ان کو یورپ کے حسن نیت کی دلیل سمجھ رہے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے
کہ اس تمام قیل وقال میں بھی حقیقت کا شائبہ تک نہیں ہے، چونکہ مغرب کے عام باشندے لڑتے
لڑتے تھک گئے ہیں، اور ان کو اپنی اجتماعی اور خصوصیت کیساتھ تجارتی وصنعتی زندگی میں سکون کی
سخت ضرورت ہے، اس لئے وہ کم از کم دل بہلانے کے لئے ایسی تجویزوں اور خیالی باتوں کو
سننا پسند کرتے ہیں جن سے سکون نہیں تو سکون کی موہوم توقع ہی قایم ہوجاتی ہے، اور نہ جہاں
تک عمل کا تعلق ہے، اسمیں ان توقعات کے برآنے کا کوئی سامان نہیں ہے، بلکہ گذشتہ سات
آٹھ سال کے اندر مغربی ممالک میں وسائل جنگ کو جو ترقی نصیب ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے
کبھی نہیں ہوئی تھی حتی کہ ۱۹۱۴ء میں بھی نہ تھی جبکہ تمام یورپ جنگ کی تیاریوں میں منہمک تھا،
جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جمہوریہ امریکہ نے اس مسئلہ کو چھیڑا اور اس کی
تحریک سے نومبر ۱۹۲۱ء میں بمقام واشنگٹن ایک بین الملی کانفرنس منعقد ہوئی، اس کانفرنس
کا مقصد بظاہر قوی حربیہ میں تخفیف کرنا تھا، مگر دراصل امریکہ، فرانس، جاپان اور اٹلی یہ چاہتے
تھے کہ کسی طرح برطانیہ کی عظیم الشان بحری طاقت کو کم کیا جائے، کیونکہ ان سب ملکوں کی
زندگی بحری تجارت پر منحصر ہے، اور جب تک برطانیہ سمندر کی لہروں پر حکمراں ہے اس وقت
تک کوئی ملک اپنی تجارت کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا، دوسری طرف برطانیہ کو یہ احساس تھا کہ اس کی
زندگی کلیتہً بحری قوت کے تفوق پر منحصر ہے، اس لئے اس کی خواہش تھی کہ کوئی سلطنت اس کی
برابری تک نہ پہونچ سکے، یہی باطنی کشمکش واشنگٹن کانفرنس کے مباحثات میں جاری
رہی، ہر فریق دوسروں پر پابندیاں عائد کرنا چاہتا تھا، مگر جب خود اس کا اپنا سوال پیش آتا
تو صاف کہدیتا تھا کہ ہماری جنگی یا ایسی دوسروں کے اثر سے بالکل پاک ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ واشنگٹن
کانفرنس اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکی کہ اس نے پانچ بڑی سلطنتوں کے درمیان بحری قوت
کا تناسب مقرر کردیا اور اس کے بعد اسی امریکہ نے جو تخفیف قوی بحریہ کا علمبردار بنکر اٹھا تھا
۵ نئے ڈریڈناٹ تعمیر کرنے اور نہر پانامہ کو جدید ترین آلات جنگ سے آراستہ کرنے کا تہیہ کرلیا

سی واشنگٹن کانفرنس میں تحت البحر کشتیوں کا مسئلہ بھی پیش ہوا۔ ان کشتیوں سے اصلی خطرہ انگلستان کو ہے، کیونکہ اسی کی زندگی سب سے زیادہ بیرونی ممالک کی درآمد پر منحصر ہے اور وہی سب سے زیادہ جنگی و تجارتی جہازوں کا مالک ہے۔ جنگ عظیم میں ان کشتیوں نے اسکی بحری تجارت کو برباد کرکے جس طرح اس پر عرصۂ حیات تنگ کردیا تھا، اس کا سبق برطانیہ کو یاد تھا، اس لئے اس نے واشنگٹن کانفرنس میں اپنی ساری قوت اس کوشش میں صرف کردی کہ تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا جائے۔ دوسری طرف فرانس خصوصیت کے ساتھ اس کا مخالف تھا۔ کیونکہ اسکی بحری قوت کمزور تھی، اور برطانیہ کے مقابلہ میں اسکے پاس اپنی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ یہی تحت البحر کشتیاں تھیں۔ اس کے نمایندوں نے صاف طور پر کہدیا کہ یہ کشتیاں دراصل حملہ کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ مدافعت کا ذریعہ ہیں اور وہ ممالک انھیں استعمال کرنے پر مجبور ہیں جنکی بحری قوت کمزور ہو۔ آخر اس مسئلہ میں امریکہ نے ایک توسط راہ نکالی جس پر فریقین متفق ہوگئے، اور یہ وہ تھی کہ حالت جنگ میں غنیم کی تجارت کو برباد کرنے کے لئے تحت البحر کشتیوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔

ایک اور میثاق زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق بھی طے ہوا۔ اول اول ۱۹۲۲ء کی ہیگ کانفرنس میں زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا تھا جس کی برطانیہ نے سخت مخالفت کی تھی، پھر ۱۹۲۵ء کی دوسری ہیگ کانفرنس میں برطانیہ بمشکل اس پر راضی ہوگیا، مگر امریکہ آخر وقت تک مخالف رہا۔ جنگ عظیم میں جرمنی اور اس کے حریفوں نے آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف ان گیسوں کو استعمال کیا، اور جو کچھ قانونی بندشیں تھیں سب دونوں کے مشترک عمل سے ٹوٹ گئیں۔ اس کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں پھر پچھلی قیود کی تجدید کی گئی مگر دل سے اب بھی کوئی سلطنت انکو قبول کرنے پر راضی نہ تھی چنانچہ کانفرنس کے فرانسیسی مندوب ایم سارائو (M. Sarraut) نے اس پر دستخط کرتے وقت یہ نوٹ لکھدیا کہ:-

"زہریلی گیسوں کے استعمال کو روکنے کی کوشش ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے"

مسٹر بالفور نے بھی برطانیہ کی طرف سے یہ تصریح کرنی ضروری سمجھی کہ:-

"یہ اقرار نامہ قوموں کو اس حفاظت کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کرتا جو ایک شریر دشمن کی جانب سے گیسوں کے استعمال کی صورت میں پیش آتی ہے"

اسی بددلی کا نتیجہ ہے، کہ اب تک کسی سلطنت نے اس اقرار نامہ کی باقا توثیق نہیں کی، اور قانونی حیثیت سے وہ اس وقت ایک بے معنی دستاویز ہے،

واشنگٹن کانفرنس کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مسٹر لائڈ جارج کی تحریک پر جنوا ایک پان یورپین کانفرنس منعقد کی گئی، جس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ آئندہ دس سا کے لئے دول مغربہ ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا عہد کرلیں، اور تمام قومیں مل کر جنگ زد ممالک کی تعمیر جدید کریں لیکن اس کانفرنس میں امریکہ نے شرکت سے انکار کردیا، فرنس نے ابتدا ہی میں اعلان کردیا کہ ہم اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتے، ٹرکی کو سرے سے شرکت کی دعوت ہی نہیں دیگئی، روس کو بلایا گیا تو اس لئے کہ اس دباؤ ڈال کر ان نقصانات کا تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا جائے، جو انقلاب کے زمانہ میں روس حدود کے اندر یورپین سلطنتوں کی املاک کو پہونچا ہے، اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس ناکا ہوئی اور جنگی طیاریوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی،

جنوا کے بعد ہیگ میں ایک دوسری کانفرنس ہوئی، مگر اس کا بھی وہی حشر ہو جو جنوا کانفرنس کا ہوا تھا، پھر ایک اور بین المللی کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی، مگر وہاں برطانیہ اور فرانس کے درمیان اتنا سخت اختلاف برپا ہوا کہ موسیو پوانکارے ترش رو ہوکر کانفرنس سے اٹھ گئے، اور سیدھے پیرس چلدیئے، یہاں تک کہ تصویر کھنچوانے تک کے لئے بھی نہ رکے،!

ستمبر ۱۹۲۵ء میں جمعیت اقوام نے تحدید قوی حربیہ اور تحریم جنگ کے مسئلہ کو اپنے

ہاتھ میں لیا، اور اس کی درخواست پر فرانس نے ایک بین المللی موقر جلسہ کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے ایک مجلس تحضیری (Preparatory Committee) مقرر کی، تاکہ وہ جملہ امور پر غور کرکے بتائے، کہ کس طرح اور کن اصول پر ایسی کانفرنس کو دعوت دیجا سکتی ہے؟ یہ کمیٹی سال بھر تک کوئی کام نہ کرسکی، ۲۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو جمعیت کے اجلاس عام نے کونسل سے سفارش کی کہ وہ کمیٹی کو ۱۹۲۷ء تک اپنا کام ختم کرنے کی تاکید کرے تاکہ آٹھویں اجلاس عام سے پہلے بین المللی کانفرنس کو مدعو کیا جا سکے، مگر اس مدت میں بھی کمیٹی نے کام ختم نہیں کیا، اور آج تک بس اس کے جلسے ہی ہوئے جاتے ہیں چونکہ ابھی تک اس تحریک کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے، اس لئے کوئی رائے دینا قبل از وقت ہوگا، لیکن آثار بتاتے ہیں کہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا، جو پہلے ایسی کوششوں کا ہو چکا ہے۔ اگر دول مغرب میں حقیقۃً خلع سلاح کی کوئی قلبی خواہش موجود ہوتی، تو وہ روس کی ان تجاویز پر بیک کہتے جو اس نے تخفیف قوائے حربیہ کے متعلق پیش کی تھیں، کیونکہ اس مقصد کی جانب عملی اقدام صرف انھیں تجاویز سے ہو سکتا ہے لیکن دول میں سے کوئی ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اور برطانیہ کے نمائندے لارڈ کشنڈن نے تو صاف کہدیا ہے کہ :-

"کامل خلع سلاح قوموں کو غارت گری لوٹ مار اور انقلاب کے خطرے میں مبتلا کردے گا"۔

اس سے ظاہر اور باطن کا فرق صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ زبان سے تو بیشک اس قسم کی باتیں کہی جا رہی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی قومیں جنگ و خوں ریزی سے بیزار ہیں، امن و صلح کی قدر شناس ہیں، اور دل سے چاہتی ہیں کہ اپنے ابنائے نوع کی تباہ کن ترقی کا کھیل چھوڑ کر اپنے قدرتی حدود میں اپنی تعمیر ترقی کے لئے گرم عمل رہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ ان قوموں کے درمیان شدید عداوتیں پرورش پا رہی ہیں، ان کے دلوں میں آتش فشاں مادے پک رہے ہیں، ان کی فوجیں تعداد اور قوت میں بڑھ رہی ہیں ان کے آلات جنگ روز بروز ترقی کر رہے ہیں، اور ہر قوم اس کوشش میں لگی ہوئی ہے

گزشتہ جنگ میں جن حریفوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوا اور تمام مخالف قوتوں کو مٹا کر اپنی برتری کا سکہ بٹھا دے، اس رقابت و مسابقت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ دول مغرب میں امن پسندی کا حقیقی میلان موجود ہے، اور جنگ جوئی سے وہ فی الواقع توبہ کر چکی ہیں؟ ۱۹۱۹ء کے میمورینڈم میں جس کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے، برطانی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج نے لکھا تھا کہ:-

"جمعیت اقوام کی کامیابی کی اولین شرط یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، فرانس، اور اٹلی کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو جائے جس کے مطابق ان سلطنتوں میں جنگی جہازوں کی تعمیر اور فوجوں کی تکثیر و توفیر کی مسابقت بند ہو جائے، جب تک جمعیت کی مفاہمت پر دستخط کرنے سے پہلے یہ نہ ہوگا جمعیت محض ایک اضحوکہ اور ایک سوانگ رہے گی"

اس قول کے مطابق جمعیت اقوام ایک "اضحوکہ" اور ایک "سوانگ" ثابت ہو چکی ہے۔ آج دول کے درمیان توفیر قوی حربیہ کی مسابقت اسقدر تیزی کے ساتھ جاری ہے، کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی، آج مغربی دنیا جنگ و پیکار کے لئے اتنی طیار ہے کہ ۱۹۱۴ء میں بھی نہ تھی، آج مغربی تہذیب نے فوجوں کی کثرت، آلات و ادوات مہلکہ کی ترقی دیو ہیکل جنگی جہازوں کی صنعت، تباہ کن ہوائی جہازوں کی ساخت، زہریلی گیسوں اور غارت گر سامانِ جنگ کی تیاری سے انسانیت کو ہلاک و برباد کرنے کے لئے وہ سامان فراہم کیا ہے، جس کی نظیر سے پوری تاریخ عالم خالی ہے، ان حقائق کو دیکھ کر کون ہے جو امن پسندی کی بناوٹی باتوں اور صلح کوشی کی نمائشی کانفرنسوں سے دھوکہ کھائے گا؟

جنگ کا عملی پہلو

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا تعلق مغربی جنگ کی معنوی حیثیت سے تھا، اس پہلو میں آپ نے دیکھ لیا کہ جہاں تک جنگ کے اغراض و مقاصد کا تعلق ہے، مغربی دنیا اپنی تمام ترقی تہذیب و تمدن کے باوجود اس نقطہ سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھی ہے، جس پر عہدِ تاریک کی غیر متمدن اور وحشی قومیں صدیوں پہلے قائم تھیں، وسائلِ جنگ میں تو بیشک انھوں نے ترقی کے آسمان کو جا لیا ہے، ان کی فوجوں کی اعلیٰ ترتیب، ان کے سپاہیوں کی خوبصورت وردیاں، ان کے ہتھیاروں کی زیبائش مہارتِ فن، ان کے آلاتِ حرب کی دلفریب سجاوٹ دیکھ کر کون ہے جس کی آنکھیں خیرہ نہ ہو جائیں گی، مگر اس جنگ کے اندر جو روح کام کر رہی ہے، وہ اسی عہدِ وحشت کی روح ہے، جس کی درندگی و بہیمیت، آلات و وسائل کی ترقی سے کم نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو گئی ہے، قدیم وحشیوں کی طرح ان جدید وحشیوں کے پیشِ نظر بھی نہ کوئی بلند نصب العین ہے، نہ کوئی اعلیٰ مطمحِ نظر ہے، نہ کوئی ایسا اخلاقی مقصد ہے جس کی بنا پر یہ اُن کے مقابلہ میں کسی سبقت و فوقیت کا دعویٰ کر سکیں، وہی حصولِ جاہ و مال، اور توفیرِ ثروت و توسیعِ اقتدار کی خواہش جو آج سے چار ہزار برس پہلے کسی غیر متمدن قبیلہ کو جنگ پر ابھار سکتی تھی، وہی آج کل کی مہذب قوموں کو بھی مردم کشی و خوں ریزی پر آمادہ کرتی ہے، تہذیب و تمدن کی ترقی سے اخلاقی حالت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، البتہ اگر کوئی ترقی ہوئی ہے تو یہ کہ پہلے ان ادنیٰ اور اسفل مقاصد کے لئے جتنی قوت استعمال کی جاتی تھی، اب اس سے دس ہزار درجہ زیادہ شدید ہولناک اور تباہ کن قوت استعمال کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ جب مقصد شرافت و پاکیزگی سے خالی ہے، تو حریفِ خصوں مقفہ

خواہ کتنا ہی بہتر اور پاکیزہ تر ہو، اس سے کوئی عمل، صحت حیثیت و صواب کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا، تاہم اتمام حجت کے لئے ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ تہذیب مغرب نے اپنے اعمال جنگ کو کن قوانین و ضوابط سے منضبط کیا ہے؟ اور ان قوانین کی معنوی قوت اور عملی حیثیت اسلامی قوانین کے مقابلہ میں کیسی ہے، اہل مغرب کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے پرانے زمانہ کے وحشیانہ طریقوں کو بدل کر جنگ کے نہایت مہذب طریقے اختیار کئے ہیں، اور جنگ کو جو پہلے درندوں کے کھیل سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی، ایک مہذب کشمکش اور شریفانہ زور آزمائی کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے، یہ دعویٰ اس بلند آہنگی کے ساتھ کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ظاہری شان و شوکت کا اتنا سامان ہے کہ ناواقف دنیا اسے سنکر بلا تامل یہ مان لے آتی ہے، مگر ہم اس کو متحدہ سامان کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہتے ہیں، کہ فی الواقع کہاں تک درست ہے؟

بین المللی قانون کی حقیقت مغربی قوموں اور سلطنتوں کے باہمی معاملات اور جنگ و صلح کے تعلقات پر جو قانون حاوی ہے، اسے اصطلاح میں بین المللی قانون (INTER NATIONL LAW) کہا جاتا ہے، علماء قانون نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں، مگر سب سے زیادہ جامع تعریف یہ ہے:-

"وہ ایک رواج ہے، جس کی پابندی مہذب قومیں اپنے معاملات میں اختیار کرتی ہیں"

اس رواج کو کسی بالاتر قوت نے وضع نہیں کیا ہے، کہ اسے اختیار کرنے پر یہ قومیں مجبور ہوں، اور اسمیں ردوبدل کرنے کا انھیں اختیار نہ ہو، بلکہ اس کو خود انھوں نے اپنی آسانی کے لئے وضع کیا ہے، اور واضع ہونے کی حیثیت سے انھیں کو یہ حق پہونچتا ہے، کہ جب چاہیں اسے اپنے حسب منشاء بنائیں، اور جب چاہیں، اسکو چھوڑ کر کوئی اور رواج یا قانون وضع کریں، پس زیادہ صحیح یہ ہے کہ مغربی قومی بین المللی قانون کی پیرو نہیں ہیں، بلکہ بین المللی قانون ان کا پیرو ہے، اپنی آسانی کے لئے جو طریقہ وہ اختیار کریں وہی قانون ہے، اور جس طریقہ کو وہ ترک کر دیں وہ سرے سے قانون ہی نہیں ہے آج

جن اصول کی پابندی پر مغربی قومیں متفق ہیں، وہ آج کا بین الملی قانون ہے، مگر ضروری نہیں ہے کہ وہ کل کا قانون بھی ہو۔ کل اگر یہ اصول بدل کر انھوں نے کچھ دوسرے اصول وضع کر لئے، تو یہ قانون منسوخ ہو جائے گا، اور وہ نئے اصول بین الملی قانون بنجائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ممتاز علمائے مغرب کی رائے میں اس رواج کو لفظ قانون سے تعبیر کرنا ہی غلط ہے۔ آسٹن اپنی کتاب "حدود علم قانون کی تعیین" (Province of Jurisprudence Determined) میں لکھتا ہے:-

"بین الملی قانون کی قوت کا انحصار محض رائے عام کی تائید پر ہے، اس لئے وہ صحیح معنوں میں قانون نہیں کہا جا سکتا ہے"

لارڈ سالسبری کہتا ہے:-

"اس کو کوئی عدالت بزور نافذ نہیں کر سکتی اس لئے اسے لفظ قانون سے تعبیر کرنا گمراہ کن ہے"

۱۸۷۱ء میں امریکہ کے سپریم کورٹ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ تصریح کی تھی کہ:-

"بحری قانون بھی تمام بین الملی قوانین کی طرح مہذب ممالک کی مجموعی رضامندی پر قایم ہے، وہ اگر نافذ العمل ہے۔ تو اس لئے نہیں ہے کہ کسی بالاتر قوت نے اسے وضع کیا ہے، بلکہ صرف اس لئے ہے، کہ اسے عموماً ایک ضابطہ عمل کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے"

لارڈ برکنہڈ اپنی کتاب قانون بین الملل (Inter national Law) میں کہتا ہے کہ اس قانون کا بقاء و استحکام صرف تین چیزوں پر ہے۔

۱- قومی عزت کا لحاظ جو بین الملی رائے عام کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ (اگرچہ وہ اکثر ضروریات وقت کے اثر سے مرجھی جاتا ہے)

۲- اہم ترین قومی مقاصد کے سوا چھوٹے چھوٹے مقاصد کے لئے جنگ کے نقصانات

برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہونا،

۳۔ قوموں کا اس امر کو محسوس کر لینا کہ یہ طے شدہ قوانین ان کی اپنی آسانی کے لئے ہیں اور ان کا بقا انفرادی اطاعت پر منحصر ہے،

ایک دوسری جگہ برکنہیڈ لکھتا ہے:-

"اصولاً بین المللی قانون کے احکام کی پشت پر رائے عام اور حکومت متعلقہ کے خود اپنے اختیاری تطوع سے زیادہ کوئی مجبور کن طاقت نہیں ہے"

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ بین المللی قانون محض چند قوموں کا ٹھہرایا ہوا ایک رواج ہے، جس کی نہ کوئی قانونی قیمت ہے، اور نہ مستحکم بنیاد،

بین المللی قانون کے عناصر ترکیبی اس قانون کی ترکیب میں مختلف عناصر شامل ہیں اور ان عناصر کی ترکیبی قدر و قیمت کے بھی مختلف مدارج ہیں، بعض عناصر وہ ہیں جنھیں وضع قانون میں صرف اخلاقی اثر حاصل ہے، بعض وہ ہیں جنکو اخلاقی اثر کے ساتھ ایک حد تک مادی اثر بھی حاصل ہے، اور بعض وہ ہیں جو صرف مادی اثر رکھتے ہیں، اور بسا اوقات ان کا اثر اخلاقی اثر کے خلاف واقع ہوتا ہے، آیندہ مباحث کو سمجھنے کے لئے بین المللی قانون کے ان ماخذ کی تشریح ضروری ہے،

(۱) پہلا ماخذ علمائے قانون کی آرا ہیں، گروشیوس سے لیکر آج تک بین المللی قانون کے جتنے ماہرین گذرے ہیں، سب کے خیالات کتابوں میں موجود ہیں، اور قانون کی تدوین میں انھوں نے بڑا حصہ لیا ہے، لیکن ان کی آرا کی قانونی قیمت صرف اتنی ہے کہ پیچیدہ بین المللی مسائل میں ان سے مشورہ کر لیا جاتا ہے، باقی رہا فیصلہ تو اس کا ان پر ذرہ برابر بھی انحصار نہیں ہے، لارنس اپنی کتاب اصول قانون بین الملل (Principles of International Law) میں لکھتا ہے:-

"مختلف فیہ امور میں ان کے خیالات کا عزت کے ساتھ حوالہ دیا جاتا ہے، اور ان پر غور کیا جاتا ہے، مگر وہ کسی حیثیت سے بھی فیصلہ کن

نہیں ہیں"

برنہیڈ لکھتا ہے:-

"وہ کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ ہم کو صرف یہ بتاتے ہیں کہ فی الواقع ان سلطنتوں کا عمل کس چیز پر ہے"

جسٹس گرے اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"اس قسم کے مصنفین کی کتابوں سے عدالتوں میں جو حوالے دیئے جاتے ہیں ان کا منشا یہ بتانا نہیں ہوتا کہ قانون کیا ہونا چاہیئے، بلکہ صرف اس امر کی ایک معتبر شہادت پیش کرنا ہوتا ہے، کہ قانون فی الواقع کیا ہے"

چیف جسٹس کوک برن اپنے ایک فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"ان مصنفین کی آرا خود کوئی قانون نہیں بنا سکتیں البتہ مہذب اقوام کی رضامندی ان کو قانون کی حیثیت دے سکتی ہے"

ان مستند اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ قانون بین الملل کے ماہرین نے جو عظیم الشان کتابیں لکھی ہیں ان کو کوئی تشریعی قوت حاصل نہیں ہے،

(۲) دوسرا ماخذ بین الملی معاہدات ہیں۔ ان معاہدات کی دو قسمیں ہیں، ایک تقریری[1] (Declaratory) دوسرے غیر تقریری (Non declaratory)

تقریری معاہدات وہ ہیں جنہیں تمام یا اکثر دول کی باہمی رضامندی سے کوئی مخصوص قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہو جیسے ۱۸۱۵ء کا معاہدہ وائنا ۱۸۵۶ء کا اعلان پیرس ۱۸۶۸ء و ۱۹۰۶ء کے معاہدات جنوا ۱۸۷۱ء کا اعلان لندن ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۷ء کے معاہدات ۱۹۰۹ء کا اعلان لندن اور ۱۹۲۲ء کے معاہدات واشنگٹن یہ معاہدات ان سلطنتوں کے لئے واجب العمل ہیں جو ان پر دستخط کر دیں مگر ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے دیگر شرکائے معاہدہ کو مطلع کر کے ان کی ذمہ داری سے بری ہو جائے۔ ایسے معاہدات

---

[1] یہاں لفظ تقریر محض لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی تقریر کرنا،

سے کوئی عالمگیر قانون وجود میں نہیں آتا، لارنس کے بقول لازمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس قسم کے معاہدات کوئی تشریعی عمل (Legislative act) ہیں، اب رہے دوسری قسم کے معاہدات، سو ان میں وہ مفاہمتیں شامل ہیں جو اقوام عالم کی کسی بڑی جماعت کے درمیان نہیں ہوئی ہیں، بلکہ دو یا زیادہ قوموں نے مل کر اپنے معاملات کی انجام دہی کے لئے انھیں طے کر لیا ہے، لارنس کہتا ہے :-

"یہ دوسری قسم کے معاہدات اس بات کی علامت نہیں ہیں کہ بین المللی قانون کیا ہے بلکہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ بین المللی قانون میں کیا نہیں ہے"

تشریعی اعتبار سے ان دونوں قسم کے معاہدات میں کوئی قوت نہیں ہے، تاہم بعض معاہدات ایسے ضرور ہیں جو اصول قانون وضع کرتے ہیں، مثلاً ہیگ کنونشن جن میں اہل قتال اور غیر اہل قتال کے حقوق و فرائض کو متعین کیا گیا ہے، لیکن ان اصول قانون کا انحصار بھی دول کے متفقہ تعامل پر ہے، اگر کوئی بڑی سلطنت یا چند سلطنتیں مل کر ان کو توڑ دیں تو تمام سلطنتیں توڑ ڈالتی ہیں، اور قانون کی قبا میں ایک تار بھی باقی نہیں رہتا

(۳) تیسرا ماخذ بین المللی پنچایتوں اور عدالتہائے غنایم بحریہ (Precedents) اور بین المللی کانفرنس کے فیصلے ہیں، یہ فیصلے درحقیقت کوئی قانون نہیں بناتے بلکہ صرف موجود الوقت قوانین کو پیش آمدہ حالات سے منطبق کرتے ہیں، اس لئے زیادہ سے زیادہ ان کو بین المللی قانون کی تشریح و تعبیر کہا جاسکتا ہے، اسمیں شک نہیں کہ بعض ایسے فاضل جج بھی گذرے ہیں، جنھوں نے وقتی مسائل کے فیصلوں میں قانون کے عام اصول بھی وضع کر دیئے ہیں، مثلاً لارڈ اسٹوویل، ایم پورٹالیس، اور مسٹر جسٹس اسٹوری، کہ ان کو بین المللی قانون کے واضعین میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن ان کے وضع کردہ اصول بھی آخر میں اپنی تنفیذ کے لئے جس چیز کے رہین منت ہیں، وہ سلطنتوں کی رضامندی ہی ہے،

(۴) چوتھا ماخذ وہ ہدایات ہیں جو مختلف سلطنتیں اپنی فوجوں کو دیتی ہیں، یہ ہدایات

ابتداءً ایک سلطنت کی طرف سے دی گئی تھیں، مگر بعد میں دوسری سلطنتوں نے ان کو پسند کرکے اپنے ہاں رائج کرلیا، اور رفتہ رفتہ وہی ایک بین الملکی دستور العمل بن گئیں، ان ہدایات سے ایک قانون ضرور بنتا ہے، مگر وہ بین الملکی واجبات کی بنیاد پر قایم نہیں ہے، بلکہ سلطنتوں کی انفرادی و اختیاری پسند پر قایم ہے، ہر سلطنت کو حق ہے کہ جب چاہے اس قانون کو بدل کر دوسرا قانون جاری کردے،

بین الملکی قانون کی ناپائداری یہ وہ عناصر ہیں جنکے مجموعی اشتراک و امتزاج سے بین الملکی قانون بنتا ہے، ان میں سے فرداً فرداً کوئی بھی ایسی تشریعی قوت نہیں رکھتا جو اقوام عالم کو پابند بنانے والی ہو، ظاہر ہے کہ جب ستون ہی کمزور ہیں تو جو عمارت ان پر کھڑی کی گئی ہے، وہ بھی بودی ہوگی، ان کی ترکیب سے جس قانون کا قصر تیار ہوا ہے، اس پر ایک تفصیلی نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ اس تعمیر میں خرابی کی بیشمار صورتیں مضمر ہیں، یہیں ہر چیز کو سلطنتوں کے تفاہم پر موقوف رکھا گیا ہے، جس قاعدہ کو تمام یا اکثر سلطنتیں متفق ہوکر مان لیں وہی بین الملکی قانون ہے، اور جس کو وہ نہ مانیں یا کچھ عرصہ تک مانتے رہنے کے بعد چھوڑ دیں وہ سرے سے کوئی قانون ہی نہیں ہے، اس طرح یہ قانون محض سلطنتوں کے سیاسی مصالح اور جہانبانی کے اغراض و مطامع کا آلۂ کار بنکر رہگیا ہے، جسے بنانے اور جسے مٹانے اور جسے کام میں لانے اور حسب ضرورت ادلنے بدلنے کے تمام اختیارات سلطنتوں کے ان مدبرین کو دیدیئے گئے ہیں، جو مطلب براری میں ہر جائز و ناجائز وسیلہ کو استعمال کرنے کے عادی ہیں، پھر اسمیں تاویل و تعبیر کی اتنی گنجایش، اختلاف کے لئے اتنی لچک اور واجبات سے بری الذمہ ہونے کے لئے اتنی کشادگی رکھی گئی ہے کہ ہر سلطنت اپنی اغراض کے مطابق جب چاہے، اسے توڑ دے، اور وہ پھر بھی قایم کا قایم ہے، گویا خود قانون ہی نے اپنے اندر قانون شکنی کے لئے بھی کافی وسعت مہیا کر رکھی ہے،

حقیقت یہ ہے کہ یہ اوہن البیوت آج صرف اس لئے قایم ہے کہ سلطنتیں خود اپنی ضروریات کے لئے اس کو قایم رکھنا چاہتی ہیں ورنہ اگر آج وہ اپنی مختلف و متضاد سیاسی اغراض کے لئے اسکی وسعتوں اور کشادگیوں سے فائدہ اٹھانا شروع کردیں تو بین الملکی

قانون کا فنک بوس قصر آن کی آن میں پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ جائے،

بین الملی قانون کا شعبۂ جنگ، لیکن اس قانون کا جو حصہ قانونِ جنگ سے موسو
کیا جاتا ہے، اسکی بنیاد قانونِ صلح سے بھی کمزور ہے، مغرب کا قانونِ جنگ حقیقۃً کسی اخلا
بنیاد پر قایم نہیں ہے، بلکہ صرف اس بنیاد پر قایم ہے، کہ سلطنتیں، خود اپنے آدمیوں کو وحشیا
اعمال سے بچانے اور خوفناک تکلیفوں سے محفوظ رکھنے کی خواہش مند ہیں، اسی غرض کیلئے
انھوں نے باہم ملکر یہ طے کرلیا ہے کہ جب کبھی ہم ایک دوسرے سے لڑیں گے، تو فلاں
فلاں قواعد کی پیروی کریں گے، مثال کے طور پر ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں انھوں نے
ایک معاہدہ مرتب کیا جسمیں اسیرانِ جنگ کے لئے بیشمار رعایات اور آسائشیں مقرر کی گئی
تھیں، ان وسیع رعایتوں پر سلطنتوں کے متفق ہوجانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ
حسن سلوک کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی تھیں جو ان سے جنگ کرنے کے لئے آئیں بلکہ اس کی
اصلی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں کے لئے اس بات کی خواہشمند تھی کہ
جب وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوں تو ان کو جذبۂ انتقام کی تسکین کا ذریعہ نہ بنایا جائے، اگر
آج کوئی سلطنت اس معاہدہ کو توڑ دے اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ وہی سلوک کرنے لگے جو
چھٹی صدی میں روم و ایران کی سلطنتیں کرتی تھیں، تو شاید کوئی مہذب سے مہذب سلطنت بھی
اس کے جواب میں معاہدات کو بالائے طاق رکھکر اسی وحشیانہ طریقہ کی پیروی میں تامل نہ
کریگی، یہی حال ان قوانین کا بھی ہے جو ہوائی جہازوں کی گولہ باری، پھٹنے والی گولیوں اور
زہریلی گیسوں کے استعمال، جنگی ہسپتالوں اور تیمارداروں کے احترام، اور ایسے ہی دوسرے
جنگی معاملات کے متعلق ہیں، ان کے بارے میں جتنے معاہدات ہیں، ان سب کی علت بھی
یہی ہے، کہ ہر سلطنت خود اپنی فوجوں اور شہری آبادیوں کو تباہی و ہلاکت سے محفوظ رکھنا
چاہتی ہے، ورنہ کسی فریق کی جانب سے خلاف ورزی ہونے کی صورت میں کوئی سلطنت بھی
ان قوانین کی پابندی پر آمادہ نہیں ہے،

جنگی قوانین کی معنوی صورت پس یہ قواعد و ضوابط جنکو جنگ کے مہذب "قوانین"
کہا جاتا ہے، دراصل قوانین نہیں ہیں بلکہ معاہدے ہیں، وہ صرف اس وقت نافذ ہوسکتے

ہیں جب تمام معاہد قومیں ان کو تسلیم کریں، اور ہر سلطنت صرف اسی وقت تک ان کی پابند رہ سکتی ہے جب تک دوسری سلطنتیں بھی ان کی پابند رہیں، جوں ہی کسی بڑی سلطنت یا چند سلطنتوں کے کسی مجموعہ نے ان کی خلاف ورزی کی، اور بس تمام دنیا کی متمدن سلطنتیں ان کی پابندی سے بری الذمہ ہوگئیں، ایسے قواعد کسی طرح قوانین سے موسوم نہیں کئے جا سکتے، قانون کی تعریف یہ ہے کہ ہر فرد فی حد ذاتہ اسکی پابندی پر مجبور ہو، بلا لحاظ اس کے کہ دوسرے افراد اسکی پابندی کریں یا نہ کریں، جس قانون میں ایک فرد کی پابندی دوسرے افراد کی پابندی پر موقوف ہو، وہ درحقیقت قانون نہیں، معاہدہ ہے، اور معاہدہ خواہ کیسے ہی عمدہ قواعد وضوابط پر مشتمل ہو کسی تحسین وستائش کا مستحق نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے قواعد وضوابط معاہدین کی خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ اخلاق فرائض کے احساس پر،

یہ صرف ہمارا ہی خیال نہیں ہے، خود یورپ کے بڑے بڑے اہل دول اور علمائے قانون بھی یہی لکھتے ہیں، سر تھامس بارکلے (Barclay) اپنے ایک مضمون کے آخر میں لکھتا ہے:-

"جنگ کے عمل کو منضبط کرنے کے لئے جو ضوابط بنائے گئے ہیں ان پر بہت زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیئے، جنگی ضروریات، جوش، اور ہیجان جذبات جو ہمیشہ حالت جنگ میں برسر کار آجاتے ہیں، ان بہتر سے بہتر قواعد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جنھیں ڈپلومیسی اپنی انتہائی ذہانت کے ساتھ وضع کر سکتی ہے، تاہم یہ قواعد اس رائے عام کی حالت کو ظاہر کرتے ہیں، جو مہذب قوموں میں وحشیانہ اعمال کے ارتکاب کی روک تھام کرتی ہے"[1]

جنگ عظیم سے کچھ عرصہ قبل جرمنی کے محکمہ جنگ کی جانب سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی جسکا نام "بری جنگ کے لئے جنگی ہدایات کی کتاب" (Kriegsbrauch im Landkriege) تھا اس کے ابتدائی فقرات یہ ہیں:-

[1] [illegible]

"قانونِ جنگ کوئی ایسا واجب العمل دستور نہیں ہے، جسے بین الملی قانون نے پیدا کیا ہو، بلکہ وہ محض ایک مراعات باہمی کا سمجھوتہ اور مطلق آزادیٔ عمل کی ایک تحدید ہے، جسے رواج اور مفاہمت، ہنک طبعی اور ریاکاری نے مل جل کر پیدا کیا ہے، مگر جس کی پابندی کے لئے کوئی مجبور کن قوت بجز ایک قطعی خوفِ انتقام کے نہیں ہے[1]"

یہ خوفِ انتقام درحقیقت یورپ کے قوانینِ جنگ کا پشتیبان ہے، گذشتہ جنگِ عظیم میں جب سلطنتوں کے جوشِ انتقام نے اس خوفِ انتقام کو دلوں سے دور کر دیا، اور بعض طاقتوں نے جوابی کارروائی کے خطرے سے بے پروا ہو کر ہیگ اور جنوا کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی شروع کر دی تو دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ تمام سلطنتیں جنھیں "مہذب قوانینِ جنگ" کے احترام کا دعویٰ تھا، دفعتہً قانون کی پابندی سے آزاد ہو گئیں، ہر گناہ جو ایک فریق نے کیا، اس کے مخالف فریق کے لئے ثواب بنگیا، ہر قانون شکنی جو ایک سلطنت نے کی، اسکی تقلید دوسری سلطنت کے لئے جائز ہو گئی، اور تمام یورپ نے مل کر ان قوانینِ جنگ کی دھجیاں اڑا دیں جنھیں خود یورپ ہی نے سات برس پہلے ہیگ اور جنوا میں وضع کیا تھا، اگر یہ قوانین انفرادی احساس پر مبنی ہوتے تو کیا اسی طرح ان کے چیتھڑے بکھیرے جاتے؟

جنگی ضروریات کا غالب تر قانون اس کے بعد ان قوانین میں جو کچھ جان باقی رہجاتی ہے، اس کو جنگی ضروریات کا غالب تر قانون اور بھی مضمحل کر دیتا ہے، میدانِ جنگ کی وقتی ضروریات ہمیشہ ان قوانین سے ٹکراتی رہتی ہیں، اور ان کے مقابلہ میں کتابوں کے لکھے ہوئے اور صلح کانفرنس کے بنائے ہوئے قوانین کو ہمیشہ شکست نصیب ہوتی رہتی ہے، پروفیسر نیولنڈ لکھتا ہے:-

"قانونِ جنگ کے ضوابط میں قانون بین الملل کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت تناقض و اختلاف بہت زیادہ واقع ہوتا ہے، کیونکہ جنگی قوانین

[1] Kriegs branch. P. 2

اور جنگی ضروریات میں بآسانی تصادم ہو جایا کرتا ہے، اس بنا پر قانون جنگ کو بین الملی قوانین میں شامل رکھنے کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جو بے ثباتی و ناپائداری قانونِ جنگ کو حاصل ہے، وہی عام بین الملی قوانین کو بھی حاصل ہو جائے[1]"

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے :-

"عمومی حیثیت سے جنگ کا چلن ہمیشہ اور ہر موقع پر صرف ضروریات جنگ ہی کے تابع رہے گا نہ کہ کسی اور چیز کے تابع، اس خود امدادی کی حالت میں جو قانونی ضابطے وضع کئے جائیں، انکی تدوین میں کامل اعتدال اور خاص خاص حدود کو ملحوظ رکھنا پڑیگا، اگر ان حدود کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو قرین قیاس یہ ہے کہ قانونی قیود کلیتہ توڑ دیجائیں گی، اس خیال کی صداقت کو جنگ عظیم نے اچھی طرح ظاہر کر دیا ہے، لہذا آئندہ جو قوانین جنگ وضع کئے جائیں، ان میں اس کو ہمیشہ مدنظر رکھنا ضروری ہوگا[2]"

نمائش اور حقیقت کا فرق | جس وقت ہیگ کانفرنس میں قوانین جنگ وضع کئے جا رہے تھے، تو یورپ کے اہلِ سیاست پر نمائشی تہذیب کا اس قدر غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی قوموں کے حقیقی جنگی رجحانات و میلانات اور ان کی جنگی عادات کو نظر انداز کر کے اس قسم کے قوانین بنا لئے جو دیکھنے میں تو نہایت مہذب نہایت شاندار اور حد درجہ انسانیت پرور تھے، مگر فی الواقع ان کے فوجی گروہ ان کی پابندی کرنے کے لئے ہرگز راضی نہ تھے جرمنی کے فوجی نمائندے مارشل بی برسٹائن نے کانفرنس کی ابتدا ہی میں یہ تنبیہ کر دی تھی کہ :-

"جو بین الملی قانون ہم بنانا چاہتے ہیں اسے صرف انھیں دفعات پر مشتمل ہونا چاہیے جنکی تعمیل جنگی نقطۂ نظر سے مخصوص احوال میں بھی ممکن ہو سکے

---

[1] [illegible] [illegible] p. 9

[2] [illegible] p. 282 [3] Ibid. p. 112

لیکن اس وقت اس تنبیہ کی پروا نہیں کی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہیگ کانفرنس کے چار سال بعد پہلی مرتبہ جب طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں میں ان قوانین کی عملی تنقید کا موقع آیا تو ان کی علانیہ خلاف ورزی کی گئی، اور اس کے سال بھر بعد جنگ عظیم کے سیلاب نے تو یکلخت تمام بند توڑ کر رکھ دیئے، یہ حال دیکھ کر یورپ کے اہل سیاست اور علمائے قانون کو عقل آئی اور انھوں نے تسلیم کرنا شروع کیا کہ جنگ کو خیالی قوانین اور نمائشی ضوابط سے محدود کرنے کی کوشش قطعاً بے سود ہے، اس کے بعد سے ان لوگوں نے جس قسم کے خیالات ظاہر کرنے شروع کئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب علمائے قانون کا میلان کس طرف ہے، ایک جرمن عالم میکس ہوبر لکھتا ہے :-

"مستقبل میں بین المللی قانون کے فن کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ تمام خیالی اور مبہم قوانین سے میدان کو صاف کرکے یقینی حدود قایم کرے، بین المللی قانون کی فوری اور وسیع ترقی کی خواہش اور امید سے مغلوب ہوکر ایسا نہ ہو کہ وہ "ناتمامی" اور "غیر یقینیت" سے مطمئن ہوجائے، اسکو سختی کے ساتھ ان تمام ظاہر فریبیوں کو مٹا دینا چاہئے، جنھیں ڈپلومیسی نے محض رائے عام کی تسکین خاطر کے لئے بین المللی قانون کی ترقی کا بے معنی طلسم بنا کر کھڑا کر دیا تھا"[1]

پروفیسر نیولڈ تو اس ناکامی سے یہاں تک متاثر ہوا ہے، کہ قانون جنگ کو بین المللی قانون کی حدود سے کلیتہً خارج کر دینے کا مشورہ دیتا ہے، بلکہ اسے تو یہ بھی تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ جنگ فی الواقع قانون سے کوئی تعلق رکھتی ہے، یا اسکو کسی قانون سے محدود و مقید کرنا درست ہوسکتا ہے، وہ کہتا ہے :-

"بین المللی قانون، مسئلۂ جنگ سے تعرض کرنے میں اب تک اپنی اصلی حد سے بہت تجاوز کرتا رہا ہے، جنگ کو قانونی حیثیت سے تعبیر کرنے کی کوشش میں اسے یہ نظریہ قایم کرنا پڑا کہ جنگ ایک قانونی ارادہ ہے، اور اس نظری بحث میں وہ اکثر اوقات حقایق کی حدود سے بہت دور نکل گیا،

[1] DEVELOPMENT OF INTERNATIONAL LAW. P.113

ان نظریین نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ قانون کبھی جنگ پر حاوی نہیں ہو سکتا، اور نہ تمام حیثیات سے اس کو ضبط میں لا سکتا ہے۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ جنگ فی نفسہ قانون کی نقیض ہے۔ لڑائی میں قانونی ملحوظات نہیں، بلکہ جنگی ضروریات انسان کے لئے محرکِ عمل ہوا کرتی ہیں، اور یہ ایک واقعہ ہے کہ جنگ کوئی قانونی ادارہ نہیں ہے بلکہ قوت سے کام لینے کی کوشش ہے، وہ ایک کشمکش ہے، قوت کا استعمال ہے، اور اس حیثیت سے کہ وہ بجبر اپنا دعویٰ منوانے کے لئے لڑی جاتی ہے، خود امدادی کا فعل ہے۔ فن حرب میں جنگ کی یہی تعریف کی گئی ہے، اور اسی تعریف پر بین الملی قانون کو بھی قناعت کرنی چاہیئے، اس تعریف سے قطع نظر کرنے کے باوجود یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ جنگ بحیثیت مجموعی قانون کی حدود سے خارج ہے، اگرچہ اس کو مختلف صورتوں سے ضابطہ میں لانے کی کوششیں کی گئیں، اور ایک جدید قانونِ جنگ مدون بھی کر لیا گیا، مگر اصل واقعہ جوں کا توں رہا۔"

ایک اور ماہر قانون اے ہورنٹس (A. Hornung) لکھتا ہے:-

"قانون، طبیعتِ جنگ سے اس قدر بے لگاؤ ہے کہ جو بین الملی قانون حالتِ جنگ میں سلطنتوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے، اس کی نوعیت محض بے ضابطہ (Anarchical) ہے۔ بین الملی قانونِ جنگ اپنی عین فطرت کے لحاظ سے صرف ایک قرارداد باہمی کی کوشش ہے اور رہیگا۔"[1]

اسی رائے سے میٹس ہوبز نے بھی اتفاق کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ:-

"جنگ عظیم سے پہلے ہی اس خیال نے جڑ پکڑنی شروع کر دی تھی کہ جنگ عہدِ وحشت کے باقیات میں سے ہے، اور قوانینِ جنگ کی غیر معمولی ترقی ایک قسم کی ڈھٹ بندی اور شعبدہ گری سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ

---

[1] Hall, p. 82 & Holland, p. 382

وہ ہم کو حقیقت جنگ کے بارے میں دھوکہ دیتی ہے، اور سیاست کے اس
اس بنیادی مسئلہ سے غافل کر دیتی ہے کہ ہمیں یا تو پر امن قانونی حالت
قایم رکھنی چاہئے یا جبر و زور کی غیر قانونی حالت میں مبتلا
ہو جانا چاہئے"

ایک دوسرے موقع پر یہی مصنف لکھتا ہے:-

"جنگ کو ایک قانونی ادارہ سمجھ کر اس کی کارروائیوں کو ایک عدالت
کے مقدمہ کی طرح ضابطہ میں لانے کا تخیل بین المللی قانون کی خطا ہے، جو
رومن اور قرون وسطی کے تخیلات میں سے ہے"[2]

یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں، جو یورپ میں بین المللی قانون کے مسلم ماہر ہیں،
ان کو اپنے مایۂ ناز قوانین جنگ کی کمزوری و ہیچ میرزی کا اعتراف کرتے ہوئے یقیناً
اذیت ہوتی ہوگی، مگر جب مغرب کی پہلی بین المللی جنگ ہی نے یہ ثابت کر دیا کہ اتنی
محنتوں سے انھوں نے قانونِ جنگ کا جو عالیشان قصر تعمیر کیا ہے، وہ مکڑی کے جالے
اور پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ ناپائدار ہے، تو انھیں خوف پیدا ہو گیا کہ کہیں بین المللی
قانون کے اس شعبہ کی ناپائداری پورے بین المللی قانون ہی کا اعتبار نہ کھو دے، اس لئے
انھوں نے صاف صاف اعتراف کر لیا کہ جنگ کو کسی ضابطہ اور قانون کے تحت لانا
سرے سے ممکن ہی نہیں ہے، جنگ اور قانون میں ایک فطری تناقض ہے، جنگ
قانون کی عین طبیعت کے خلاف ہے، اور جنگ کا اصلی قانون وہ نہیں ہے جو ہیگ
اور جنوا میں مرتب کیا گیا ہے، بلکہ وہ ہے جسے میدانِ جنگ میں توپیں اور سنگینیں مرتب
کرتی ہیں،

یہ ہے اس قانونِ جنگ کی حقیقت جسے بیسویں صدی کا مہذب قانون
کہا جاتا ہے"

فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف	اس نمائش اور حقیقت کے اختلاف

[1] Development of International law. P. 8
[2] IBID. P. 112

کی اصلی وجہ یہ ہے کہ یورپ میں ابتدا سے دو مختلف خیال کے گروہ ہیں۔ ایک گروہ
قانون اور سیاسی مدبرین کا ہے جو زیادہ تر نمایش و تصنع کی خاطر، اور کمتر لطیف احساسا
سے مغلوب ہو کر جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے اور اسے محض ایک مہذب مقابلہ
صورت میں ڈھال دینے کی کوشش کر رہا ہے، اور دوسرا گروہ فوجی ہے جس کے نزدیک
جنگ ایک خود امدادی (Self help) کا فعل ہے، اور اس کو انسان تمام قانونی
تدابیر میں ناکام ہو کر اختیار کرتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے دشمن کو مغلوب کر
اپنا مقصد حاصل کرے، ان دونوں زوایائے نظر میں اصولی تباین ہے، ایک گروہ
حصولِ مقصد کو اصل کار سمجھتا ہے، دوسرا تہذیب و اخلاق کو غالب رکھنے کا خواہشمند۔
ایک گروہ کی رائے میں قانون کو توڑ کر قانون ہی کی پابندی کرنا بے معنی ہے، دوسرے
گروہ کے نزدیک قانون کی پابندی تہذیب کی خصوصیات سے ہے۔ اس لئے مہذب
انسانوں کو قانون شکنی بھی ایک قسم کی پابندیٔ قانون کے ساتھ کرنی چاہیے لیکن
اصولی اختلاف صرف فکر و خیال ہی کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ دونوں کے دائرۂ عمل
بھی مختلف ہیں۔ قانونی و سیاسی گروہ کو بین الملی کانفرنسوں اور بین الدولی مجلسوں پر قبضہ
حاصل ہے، اس لئے وہ اپنے اثرات سے کام لیکر صفحۂ کاغذ پر جنگ کو ایک خوشنما شکنجہ میں
خوب جکڑ دیتا ہے، مگر عرصۂ جنگ میں اس شکنجہ کی بندش کو قائم رکھنا اس کے بس کا کام
نہیں ہے، فوجوں کی قیادت و رہنمائی، جنگی محکموں کی تنظیم و ترتیب قوی حربیہ کی بہبود
و نگرانی، اور حالتِ جنگ میں عوالِ جنگ کی سربراہی کلیتہً فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہے
اس لئے جب جنگ کا موقع آتا ہے تو وہ اس خوشنما شکنجہ کا ایک ایک تار الگ کر کے
رکھ دیتا ہے، اور قانونی گروہ کے علی الرغم عمل کی دنیا میں وہ سب کچھ کرتا ہے جو بیک
قانون میں ناجائز، مگر ضروریاتِ جنگ کے قانون میں جائز ہے۔

ظاہر ہے کہ اصل، اعتبار قول کا نہیں، بلکہ عمل کا ہے۔ کہنے والا کچھ کہا کرے ہمیں
یہ دیکھنا ہے کہ کرنے والا کیا کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک مغرب کا اصلی قانون جنگ وہ
نہیں ہے جو کاغذوں میں لکھا ہوا ہے، بلکہ وہ ہے جس پر اہل مغرب حالتِ جنگ

ں عمل کرتے ہیں، اس لئے ہم اعتبار کے قابل قانونی گروہ کو نہیں بلکہ فوجی گروہ کو سمجھتے ہیں
بود در اصل واحد با اختیار گروہ ہے، قوانینِ جنگ کے متعلق اس گروہ کے جو کچھ خیالات ہیں،
ن کے مطالعہ سے اہل مغرب کا اصلی میلانِ طبع معلوم ہوتا ہے، اور وہ درحقیقت معلوم
لرنے کے قابل ہے،

یورپ کے مشہور ماہر حربیات کلاؤس وٹس (Clausewitz) اپنی
تاب (Vom Kriege) میں لکھتا ہے :-

"قوانین جنگ محض خود عائد کردہ قیود ہیں، تقریباً ناقابلِ ادراک، اور
مشکل سے قابلِ ذکر، جنھیں اصطلاح میں "مروجاتِ جنگ" کہا جاتا ہے،
اب مجانِ انسانیت کے لئے اپنے خیال میں یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے
کہ دشمن کو کسی بڑی خون ریزی کے بغیر نہتا اور مغلوب کر لینے کا ایک
دانشمندانہ طریقہ موجود ہے، اور یہی فن حرب کا مناسب مقصد ہے، لیکن یہ
خیال خواہ کتنا ہی دل خوش کن معلوم ہو حقیقۃً بالکل غلط ہے اور اس کو
جتنے جلدی دور کر دیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ایسی ایک خوفناک
چیز میں جیسی کہ جنگ ہے، رحم و کرم کی روح کو داخل کرنے سے جو خرابیاں
پیدا ہوتی ہیں، وہ اور بھی زیادہ بری ہیں ..... خود جنگ کے
فلسفہ ہی میں نرمی و اعتدال کے اصول کو داخل کرنا ہی ایک غلطی ہے،
..... جنگ در اصل ایک جبر اور زبردستی کا عمل ہے،
جس کا ارتکاب کسی قسم کے حدود و قیود کی پابندی قبول نہیں کر سکتا"

جرمنی کی کتاب جنگ جسکا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ایک موقع پر ضروریاتِ جنگ کے
انون کو اس طرح بیان کرتی ہے :-

"فوجی سپاہی کو تاریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے، وہ دیکھے گا، کہ ایک قسم
کی سختیاں بہرحال جنگ میں ناگزیر ہیں، اور بسا اوقات سچی انسانیت

Vom Kriege i Kap. (2) ۷

کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کو بے دھڑک استعمال کیا جائے۔"

اسی کتاب میں ایک دوسرے موقع پر ہیگ کے مہذب قوانینِ جنگ اور ایسے ہ
دوسرے سمجھوتوں کو "لطیف و رقیق جذبات کی ایک ایسی لہر" قرار دیا گیا ہے جو خود
جنگ کی فطرت اور مقاصد سے بنیادی تناقض رکھتی ہے۔

امیرالجر آدے (Amiral Aube) اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے:۔

"جنگ کی تعریف ہم اس طرح کرتے ہیں کہ وہ حق کا اپیل ہے اس
قوت کے خلاف جو اس حق سے انکار کرتی ہو۔ اس سے قدرتی طور پر یہ
لازم آتا ہے کہ جنگ کا غالب مقصد یہ ہے کہ دشمن کو ہر ممکن طریقہ سے
نقصان پہونچایا جائے، اور چونکہ ایک قوم کے وسائلِ ثروت در اصل
جنگ کے اعصاب ہیں، اس لئے ہر وہ چیز جو دشمن قوم کی ثروت اور سب سے
زیادہ اس کے وسائلِ ثروت پر ضرب لگاتی ہو، اس کا استعمال نہ صرف
جائز بلکہ واجب ہے، قطع نظر اس سے کہ دنیا اس کو کس نظر
سے دیکھتی ہو۔[2]"

ان اقوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ کے اخلاقیین و سیاسیین نے
دنیا میں اپنی تہذیب کی نمایش کرنے کے لئے جو دلکش اور انسانیت پرور قوانینِ جنگ
وضع کئے ہیں، ان کی عملی تنفیذ کا انحصار جس گروہ کی مرضی اور پسند پر ہے وہ ان قوانین کو
کس قدر لغو اور مہمل سمجھتا ہے، اور ضروریاتِ جنگ کے مقابلہ میں ان کی پابندی سے
کس قدر نفور ہے، ابتداءً قانونی گروہ اس کے خلاف اپنے دعوے تہذیب و انسانیت
کی تائید میں جدوجہد کرتا رہا، مگر جب جنگ عظیم میں فوجی گروہ نے اپنی قدرت و طاقت کو عملاً
ثابت کر دیا، تو آخر اس تخیل پرست گروہ کو تلخ حقایق کے آگے سپر ڈال دینی پڑی، اور اس نے
بھی جنگ کے اسی نظریہ کو قبول کر لیا جسے عملی طاقت کے ساتھ فوجی گروہ نے پیش کیا تھا

[1] Kriegsbrauch, P. 3

[2] Revue des Deux mondes (1882) P. 314

پروفیسر ہولینڈ، ویسٹ لیک وغیرہ علمائے قانون کی زبان سے آپ اس اعترافِ شکست کو سن چکے ہیں۔ آگے چل کر آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ ان مادی حقایق کے زور سے دب کر جزئیاتِ قانون میں کس کس طرح ترمیمیں کی گئیں،

مغرب کے قوانینِ جنگ

جہاں تک اصول کا تعلق تھا، ہم نے تہذیبِ مغربی کے بین الملی قانون اور اس کے شعبۂ جنگ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، یہ قانون کیا چیز ہے؟ بحیثیت ایک قانون کے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ معنوی حیثیت سے وہ کیا وزن رکھتا ہے پھر خود اس کی اپنی نظر میں اس کے شعبۂ جنگ کا کیا مرتبہ ہے؟ اس میں جنگ کو اخلاقی حدود کا پابند بنانے کی قوت کہاں تک موجود ہے؟ اور عملی و نظری حیثیات سے جنگ کو ضبط و نظام کے تحت لانے میں وہ کس حد تک کارگر ہو سکتا ہے؟ ان سوالات کو اوپر کی مختصر بحث نے ایک حد تک صاف کر دیا ہے، اور اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ جس چیز کو مغرب کا قانونِ جنگ کہا جاتا ہے وہ در اصل کوئی قانون ہی نہیں ہے،

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ نام نہاد قانون جیسا کچھ بھی ہے، جنگ کی تحدید و تنظیم میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے؟ اس نے جو حدود و ضوابط مقرر کئے ہیں وہ اسلامی قانون کے مقرر کردہ حدود کے مقابلہ میں کیسے ہیں؟ اس کے نمائشی اور اصلی قواعد میں کیا فرق ہے؟ مسئلۂ جنگ کے سلسلہ میں انسانی افکار کی جو ترقی اس سے ظاہر ہوتی ہے، وہ اسلامی قانون کے ساتھ کیا نسبت رکھتی ہے؟ اور اس نے فی الواقع انسانیت کی کتنی خدمت انجام دی ہے؟

قوانینِ جنگ کی تاریخ، سترھویں صدی کی ابتدا تک یورپ قوانینِ جنگ کے تصور سے بھی خالی الذہن تھا، اصولاً اور عملاً جنگ کو اخلاقی حدود اور قواعد و ضوابط کی پابندیوں سے مستثنیٰ سمجھا جاتا تھا، اور محاربین کو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کا مطلق

ورغیر محدود حق حاصل تھا۔ اس زمانہ کی لڑائیوں کے جو حالات تاریخوں میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دو قومیں آپس میں لڑتی تھیں تو اپنے دشمن کو نقصان پہونچانے کے لئے کسی بڑے سے بڑے ظلم اور ہولناک سے ہولناک جرم سے بھی دریغ نہ کرتی تھیں صرف عملاً ہی نہیں بلکہ اعتقاداً بھی ان کے اندر اہل قتال وغیر اہل قتال کے امتیاز کا کوئی احساس موجود نہ تھا۔ گروٹیوس جیسے اخلاق پرور مقنن کی بھی یہ رائے تھی کہ:۔

"قانون میں ان تمام لوگوں کو قتل کر دینا جائز ہے جو دشمن کے حدود میں پائے جائیں۔ اسمیں عورتوں اور بچوں کا کوئی استثنا نہیں ہے۔ اور وہ اجنبی باشندے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں، جو ایک معقول مدت کے اندر دشمن کے علاقہ کو نہ چھوڑ دیں"۔

یہ غیر محدود حق ۱۶۱۸ء سنہ ۱۶۴۸ء کی جنگ سی سالہ میں اتنی آزادی کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا کہ تمام یورپ تھرا اٹھا، اور اس کے دردناک وقائع نے یورپ کے ارباب فکر میں عام طور پر یہ خواہش پیدا کر دی کہ جنگ کے اعمال پر کسی قسم کے اخلاقی حدود ضرور قایم ہونے چاہئیں۔ اس خواہش سب سے پہلے ہالینڈ کے مقنن گروٹیوس (Grotius) کے ذہن میں راستہ پیدا کیا اور اس سے قانون کی وہ مشہور تاریخی کتاب (De Jure Belli ac Pacis) لکھوائی جو بین الملی قانون کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب ۱۶۲۵ء میں شایع ہوئی اور اس کو ہالینڈ برگ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا گیا۔ جس سے یورپ کے اہل علم میں یک عام ذہنی حرکت پیدا ہو گئی، اور مصنفین و مولفین نے اسی نئی راہ میں مغربی افکار کو ترقی دینی شروع کی گروٹیوس کے تقریباً نصف صدی بعد اس کے شاگرد پوفنڈارف [illegible] نے اپنی کتاب (De jure naturae et gentium) شایع کی اور اس کے بعد کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جس نے اٹھارھویں صدی تک پہونچ کر بین الملی قانون کے ایک پورے نظام کی شکل اختیار کی۔ ۱۷۸۹ء میں انگلستان کے مشہور مقنن جرمی بنتھم (Jeremy Bentham) نے اس فن کا نام "بین الملی قانون" رکھا جس سے آج وہ دنیا میں مشہور ہے۔

[illegible] International Law P 330

عمومی حیثیت سے یورپ کی جنگ پر ان ترقی یافتہ افکار کا پہلا اثر دست فالیا (Fenelon) کی کانگریس میں رونما ہوا جبکہ یورپ کے مدبرین نے جنگ سی سالہ کے خاتمہ پر ۱۶۴۸ء میں گروٹیوس کی اس سفارش کو قبول کر لیا کہ :-

"جنگ میں بطور ایک شریفانہ رعایت کے (نہ کہ بطور ایک قانون کے) بچوں بوڑھوں، عورتوں، پادریوں، کاشتکاروں، تاجروں اور اسیرانِ جنگ کو قتل و غارت سے محفوظ رکھنا چاہئے"[1]

یہ روشنی کی پہلی کرن تھی جو مسیح کی پیدائش کے ۱۶۴۸ برس بعد یورپ کے تاریک مطلع پر نمودار ہوئی، اس کے بعد لڑائیوں میں وحشیانہ حرکات کے ارتکاب کا وہ زور نہیں رہا جو جنگ سی سالہ میں دیکھا گیا تھا لیکن جہاں تک فوجوں کے جنگی اخلاق کی عملی تحسین اور اعمالِ جنگ کی حقیقی اصلاح کا تعلق ہے، دو سو برس تک یورپ نے اس راہ میں کوئی ترقی نہیں کی حتی کہ انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء کے نام نہاد "غدر") کے موقع پر مغربی فوجوں نے وہ ہولناک مظالم کئے جنکے تصور سے بھی انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے، جہاں تک ہمیں معلوم ہے، انیسویں صدی کے وسط تک یورپ میں قوانینِ جنگ کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہ تھا جسکو سلطنتوں نے منظور کیا ہو، یا جسکو یورپین فوجوں میں جنگی قانون کی حیثیت سے رائج کیا گیا ہو، مغربی قوموں میں سب سے پہلے امریکہ نے اس راہ میں اقدام کیا اور ۱۸۶۳ء میں اپنی فوجوں کے لئے ایک ہدایت نامہ (Manual of instructions) مرتب کیا جسکا مقصد جنگ کے زمانہ میں فوجوں کے طریق عمل کو منضبط کرنا تھا، اس کے بعد جرمنی، فرانس، روس، اور انگلستان نے بھی اپنی فوجوں کو اسی قسم کی ہدایات دینے کا سلسلہ شروع کیا اور رفتہ رفتہ یورپ کی تمام قوموں نے وہی طریقہ اختیار کر لیا جو ان سے تقریباً ۱۲ سو برس پہلے عرب کے "وحشی" ملک میں ایک امی پیغمبر اور اس کے امی خلفا نے رائج کیا تھا،

[1] Bernard. Paper on growth of the laws of war in oxford essays for 1856. P.P 100-104

اس کے ایک سال بعد ۱۸۶۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے بمقام جنوا ایک بین الملی اجتماع منعقد کیا جسمیں پہلی مرتبہ بیماروں، زخمیوں، اور معالجوں کے متعلق قوانین تب کئے گئے۔ ۱۸۶۸ء میں ایک دوسری کانفرنس نے ان کے اندر توضیحات و تشریحات کے ساتھ بہت کچھ اضافہ کیا۔ لیکن قوانینِ جنگ کے اس شعبہ میں یورپ اس وقت تک ایک مکمل ضابطہ قانون کا محتاج رہا، جب تک ۱۹۰۶ء میں جنوا کی تیسری بین الملی کانفرنس نے اس ضرورت کو پورا نہ کیا[1]،

تباہ کن آلات و اسلحہ کے استعمال کے بارے میں یورپ ۱۸۶۸ء تک تاریکی میں رہا، اس سال پہلی مرتبہ سینٹ پیٹرس برگ میں ایک بین الملی فوجی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے دولِ مغرب سے سفارش کی کہ پھٹنے والے گولے (Explosive Projec-tiles)، جنکا وزن چار سو گرام سے کم ہو، اور پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں پھیل جاتی ہیں، اور زہریلی گیسیں، جنگ میں استعمال نہ کیجائیں، اس سفارش کے مطابق ۲۹ نومبر ۱۸۶۸ء کو دولِ مغرب (باستثنا اسپین و امریکہ) ایک اقرارنامہ پر دستخط کر دیئے،

اس کے بعد زار روس الگزنڈر دوم کی تحریک پر ۱۸۷۴ء میں بروسلز کانفرنس ہوئی، اور اس میں پہلی مرتبہ بری جنگ کے قوانین مرتب کئے گئے۔ لیکن کسی سلطنت نے ان کی توثیق نہیں کی، بلکہ جرمنی اور انگلستان نے تو ان کو ماننے سے صاف انکار کر دیا،

بروسلز کی تجاویز ۲۵ برس تک بیکار پڑی رہیں، تا آنکہ ۱۸۹۹ء میں زار نکولس ثانی کی تحریک پر پہلی مرتبہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی جسمیں دنیا کی ۲۶ سلطنتوں نے حصہ لیا، اور جنگ کے مختلف شعبوں کے متعلق حسب ذیل سمجھوتے اور اقرارنامے مرتب کئے:-

(۱) بین الملی نزاعات کے مسالمانہ تصفیہ کی تدبیر،

(۲) جنگ کے قوانین و رسوم،

---

[1] Higgins and Colombos, International Law, by Baker, Read p. 207

(۳) بحری جنگ میں مرضیٰ و مجروحین کے متعلق ان قوانین کی ترویج جو ۱۸۶۴ء کے جنیوا کنونشن میں منظور کئے گئے تھے،

(۴) پھٹنے والے گولوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق (یہ صرف پانچ سال کے لئے تھی)

(۵) پھٹنے والی گولیوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق،

(۶) زہریلی گیسوں کے متعلق سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارنامہ کی توثیق،

یہ کانفرنس اپنے کام کو مکمل نہ کرسکی اور ۸ سال تک قوانین جنگ کی مزید تدوین کا سلسلہ رُکا رہا، ۱۹۰۷ء میں امریکہ کے صدر مسٹر روزویلٹ اور زار نکولس ثانی کی تحریک پر دوبارہ ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی، اور اُس کی کوشش سے یورپ کو پہلی مرتبہ ایک مکمل ضابطہ قانون جنگ آیا، اس مرتبہ ۱۸۹۹ء کے سمجھوتوں اور اقرارناموں میں ترمیم و اضافہ کرنے کے علاوہ حسب ذیل مزید سمجھوتے مرتب کئے گئے:-

(۱) قرضوں کی وصولیابی میں قوت کے استعمال کی تحدید،

(۲) جنگ کی ابتدا کرنے کے لئے اعلانِ جنگ کا لزوم،

(۳) بری جنگ میں غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض،

(۴) حالتِ جنگ میں دشمن کے تجارتی جہازوں کی حیثیت،

(۵) تجارتی جہازوں کو جنگی جہازوں میں تبدیل کرنے کے متعلق قوانین،

(۶) ٹھیس لگنے سے خود بخود پھٹنے والی بحری سرنگوں کے استعمال کے متعلق قوانین،

(۷) حالتِ جنگ میں جہازوں کی گولہ باری کے متعلق قوانین،

(۸) بحری جنگ میں جہازوں کی گرفتاری کے متعلق قوانین،

(۹) بین المللی محکمۂ غنائم بحریہ کی تشکیل،

(۱۰) بحری جنگ میں غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض،

یہ کانفرنس اگرچہ ایک نہایت وسیع ضابطۂ قانون وضع کرنے میں کامیاب ہوگئی

مگر اس کا ضابطہ پھر بھی اس قابل نہ ہو تھا کہ مکمل کہا جا سکتا، کیونکہ اس کے بعد گفت و شنید ہوائی جہازوں، اور زہریلی گیسوں کے استعمال کے متعلق مزید قوانین کی ضرورت پیش آئی جسے ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس نے پورا کیا، اور ابھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیندہ پیش آنے والے مسائل کے متعلق اور کتنی کانفرنسوں کی ضرورت ہوگی،

اس مختصر تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی دنیا کو ابھی مہذب قوانین جنگ سے آشنا ہوئے ۶۰ برس سے زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، اور اگر ہم ابتدائی زمانہ تکوین کو چھوڑ کر صرف اس عہد کو لیں جبکہ اس کے قوانین جنگ پایۂ تکمیل کو پہونچے، تو یوں کہنا چاہیے کہ جنگ کی تہذیب سے وہ آج سے ۲۰ سال پہلے تک ناآشنا تھی، اس کے مقابلہ میں اسلام کو دیکھو کہ وہ ساڑھے تیرہ سو برس سے اپنا ایک مکمل ضابطۂ قانون رکھتا ہے، اور جہاں تک اصول کا تعلق ہے، اس میں حذف و ترمیم یا اضافہ کرنے کے لئے آج تک کسی کانفرنس یا سمجھوتے یا اقرارنامے کی ضرورت پیش نہیں آئی، مگر اس کے باوجود اس کے اصول بڑی حد تک وہی ہیں جنکو آج کی مغربی دنیا نے بعد از خرابی بسیار اختیار کیا ہے، اور بعض اصول ایسے بھی ہیں جن تک مغربی دنیا کی ابھی رسائی نہیں ہوئی ہے،

ہیگ کے سمجھوتوں کی قانونی حیثیت اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس کی کارروائی ان تمام سمجھوتوں اور اقرارناموں پر حاوی تھی جو اس سے قبل دو سلطنتوں کے درمیان ہوئے تھے، اس لئے جب مغرب کے قوانین جنگ پر تبصرہ کرنا ہو تو صرف دوسری ہیگ کانفرنس کے وضع اور توثیق کئے ہوئے معاہدات ہی پر تبصرہ کرنا کافی ہے،

لیکن اس تبصرہ کو شروع کرنے سے قبل یہ تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس کانفرنس کی آئینی حیثیت کیا تھی؟ اور اس کے سمجھوتے اور اقرارنامے بحیثیت ایک قانون کے کیا وقعت رکھتے ہیں؟ اس کے لئے ہمیں خود ہیگ کے سمجھوتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی اسی تشریح پر اعتماد چاہیئے جو مغرب کے ماہرین قانون نے کی ہے،

ان سمجھوتوں کی قانونی حیثیت متعین کرنے کے لئے پہلا امر تنقیح طلب یہ ہے کہ دول کس حد تک ان کی پابندی کے ذمہ دار ہیں؟ اس کے متعلق خود سمجھوتوں میں یہ تصریح

کر دی گئی ہے، کہ دول حرف بحرف ان کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں ہیں، بلکہ صرف اس امر کی ذمہ داری لیتی ہیں کہ اپنے قوانینِ جنگ میں ان کو ملحوظ رکھیں گی چنانچہ چوتھے ہیگ کنونشن متعلق بہ قوانین و رسوم جنگ کی دفعہ اوّل کے الفاظ یہ ہیں:-

"متعاقد طاقتیں اپنی مسلح بری فوجوں کے لئے ایسی ہدایات جاری کریں گی جو ان ضوابط سے مطابقت رکھتی ہوں گی جو بری جنگ کے قوانین و رسوم کے متعلق اس سمجھوتے کے ساتھ ملحق کئے گئے ہیں"

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس کا جواب ہیگ کے سمجھوتوں سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ یہ تمام سمجھوتے اور اقرار نامے صرف انھیں جنگوں میں نافذ ہوں گے، جن کے دونوں فریق ان سمجھوتوں اور اقرار ناموں کے متعاقدین میں سے ہوں، اگر کوئی ایک فریق غیر متعاقد ہو یا کسی متعاقد فریق کے ساتھ کوئی غیر متعاقد بھی شریکِ جنگ ہو گیا ہو تو ان سمجھوتوں پر عمل درآمد نہیں کیا جائیگا، اسی چوتھی ہیگ کنونشن کی دفعہ دوم کے الفاظ یہ ہیں:-

"یہ قوانین صرف ان جنگوں میں قابلِ عمل ہوں گے جن کے فریقین اس سمجھوتے کے متعاقدین میں سے ہوں، اگر کوئی ایک فریق متعاقدین میں سے نہ ہو تو ان کا نفاذ نہ ہوگا"

اسی قسم کی ایک دفعہ ہر سمجھوتے کے آخر میں رکھی گئی ہے، جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ تمام مہذب قوانین بطور ایک اخلاقی فرض کے اختیار نہیں کئے گئے ہیں بلکہ محض چند سلطنتوں کے باہمی من سمجھوتے ہیں، جن کی بنیاد صرف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس شرط پر شرافت و انسانیت کا سلوک کرنے کا وعدہ کرتی ہیں کہ ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے،

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ قوانین اپنے اندر وثاقت و لزوم کی قوت کس حد تک رکھتے ہیں؟ اس کے متعلق ہیگ کے سمجھوتے تصریح کرتے ہیں کہ کوئی سلطنت ان کی ہمیشہ پابندی کرنے پر مجبور نہیں ہے، بلکہ ہر وقت انکی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکتی ہے، چنانچہ ہر سمجھوتے کے آخر میں ہمیں اس مضمون کی ایک دفعہ ملتی ہے کہ:-

"متعاقدین میں سے اگر کوئی سلطنت اس سمجھوتے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہے تو وہ نیدرلینڈ کی گورنمنٹ کو اس کی اطلاع دیکر ایسا کر سکتی ہے۔ نیدرلینڈ گورنمنٹ کا فرض ہوگا کہ کسی سلطنت کی جانب سے اس قسم کی اطلاع ملتے ہی تمام متعاقدین کو اسکی اطلاع دیدے، یہ اظہار برات اس سلطنت کے حق میں اس وقت سے قابلِ تنفیذ ہوگا جبکہ نیدرلینڈ گورنمنٹ کو اطلاع پہونچنے پر ایک سال گذر چکا ہو"

ان دفعات کا مفہوم بالکل واضح ہے، لیکن مزید توضیح کے لئے ہم مسٹر جیمز براؤن سکاٹ کی وہ تصریحات یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے "مجموعۂ مفاہماتِ ہیگ" کے مقدمہ میں کی ہیں، مسٹر اسکاٹ کارنیجی کے مشہور وقف بین الملی صلح میں شعبۂ قانون بین الملل کے ڈائرکٹر ہیں، اور امریکہ میں اس قانون کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:-

"ہیگ کانفرنس کو اکثر انسان کی پارلیمنٹ کہا جاتا ہے، مگر یہ کہنا غلط اور گمراہ کن ہے، وہ اصطلاحی معنی میں پارلیمنٹ نہیں ہے اور اس کے اعمال صرف ان سلطنتوں پر اثر کرتے ہیں جنکی نمایندگی اسمیں ہوتی ہے۔ (۱×)

اس وضع کی ایک جماعت جیسا کہ اس کا نام خاہر کرتا ہے، محض ایک کانفرنس ہے، وہ کوئی مجلس تشریعی نہیں ہے اس کے سمجھوتے محض مفاہمات ہیں جو کانفرنس میں حصہ لینے والی حکومتوں سے کی گئی ہیں تاکہ وہ اپنے قوانین کے مطابق ان کو اختیار کرلیں، ..... ہیگ میں کسی اقرارنامے پر کسی سلطنت کے نمایندے کا دستخط کر دینا اس سلطنت کے لئے کوئی قانونی ذمہ داری پیدا نہیں کرتا، البتہ چونکہ نمایندے اپنی سلطنتوں کی طرف سے سرکاری طور پر منتخب کئے گئے ہیں، اس لئے ان کا دستخط کرنا اس امر کی ایک اخلاقی ذمہ داری ان پر عاید کرتا ہے کہ ان اقرارناموں اور اعلانوں کو اپنی حکومتوں کے متعلقہ شعبوں کے پاس بھیجیں اور ان کو باقاعدہ منظور کرکے اپنے ملک میں قانونی قوت عطا کریں، یہ اقرارنامے صرف اسی وقت واجب العمل

ہو سکتے ہیں جب ان کی باضابطہ توثیق ہیگ میں داخل کر دی جائے" (x)
پروفیسر مارگن اپنی کتاب "جنگ، اس کا چلن، اور قانونی نتائج" (War its Conduct and Legal results) میں لکھتا ہے:-

"یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہیگ کی مفاہمتوں کا دائرہ اور ان کی نشریعی قوت ایک حد تک مشکوک وغیر معین ہیں، تاہم جن مفاہمتوں کو تمام متعاقد سلطنتوں نے منظور کر لیا ہے انھیں ہم تقریباً ایک عمومی ضابطۂ قانون سمجھ سکتے ہیں، اور ان کے مطابق متعاقد سلطنتوں کے جنگی اعمال کو مہذب قومیں جانچ سکتی ہیں"

ان تصریحات سے صاف معلوم ہو جاتا ہے، کہ ہیگ کے وضع کردہ قوانین جنگ قانونی نوعیت کے اعتبار سے کسی طرح بھی اسلام کے قوانین جنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اسلام کے قوانین تمام مسلمانوں کے لئے کلیۃً واجب العمل بنائے گئے ہیں، کسی مسلمان کو مسلمان رہتے ہوئے ان کی بندش سے نکلنے کا حق نہیں دیا گیا، یہ ضرور ممکن ہے کہ ایک شخص اسلام ہی کو چھوڑ دے اور اس طرح اسلام کے قانون جنگ کی پابندی سے بھی سبکدوش ہو جائے، مگر یہ جائز نہیں ہے، کہ کوئی شخص مسلمان رہتے ہوئے اسلام کے ان قوانین کی کم از کم اعتقادی اطاعت سے نکل جائے، یا ان قوانین کو اپنے حسب منشا بدل کر یا منسوخ کر کے کچھ دوسرے قوانین وضع کرے اور وہ نئے قوانین اسلام کے قوانین قرار دیئے جائیں، اہل مغرب کے قوانین کی طرح اسلام کے قوانین مسلمانوں کے وضع کردہ نہیں ہیں، بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان کو وضع کیا ہے، اور مسلمانوں کے سامنے صرف اس لئے پیش کیا ہے کہ وہ اسکی اطاعت کریں، اب مسلمانوں کے لئے اسمیں صرف دو راہیں ہیں، اگر وہ مسلمان رہنا چاہیں اور اس بالاتر قوت کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوں تو ان قوانین کو بھی تسلیم کریں، اور اگر ان کو تسلیم نہ کرنا چاہیں تو ناگزیر ہے، کہ وہ اس بالاتر قوت کو بھی تسلیم نہ کریں، اور اسلام کے دائرے سے نکل جائیں، اس کے سوا کوئی تیسری راہ مسلمانوں کے لئے نہیں ہے، بخلاف اس کے مغربی قوانین جنگ کے واضع خود اہل مغرب ہیں اس لئے ان کو حق ہے کہ جب تک چاہیں

اپنے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کریں اور جب چاہیں ان کو منسوخ کرکے دوسرے قوانین کو
کریں، اصولِ قانون کے لحاظ سے جب کبھی وہ ایسا کریں گے تو پہلا قانون بحیثیت ایک قانون
کے مردہ ہوجائے گا، اور دوسرا قانون اس کی جگہ لے لیگا، لیکن اگر مسلمان قومیں اسلام سے
بغاوت کرکے دس ہزار قوانین بھی وضع کرلیں تو ان میں سے کوئی بھی اسلام کا قانون نہ بن سکیگا
بلکہ اسلام کا قانون وہی رہے گا جو اللہ اور اس کے رسول نے وضع کردیا ہے،

ایک دوسری حیثیت سے بھی اسلام کے قوانینِ جنگ، مغربی قوانین پر اصولی فوقیت
رکھتے ہیں، اسلام نے اس قسم کی کوئی شرط نہیں رکھی ہے، کہ اس کے قوانین پر صرف اسی
حالت میں عمل کیا جائے جبکہ دوسرا فریق بھی ان کی پابندی کرے، جس زمانہ میں یہ قوانین
وضع کئے گئے تھے، اس وقت تو غیر مسلم سلطنتوں سے اس قسم کا کوئی سمجھوتہ ممکن ہی نہ تھا، بلکہ
اس کے برعکس غیر مسلم محاربین ہمیشہ مسلمانوں کے مقابلہ میں وحشیانہ طریقہ سے جنگ کرتے تھے
اور ان حرکات پر اس بات نے ان کو اور بھی زیادہ جری کردیا تھا، کہ مسلمانوں کا مذہب انکو
جواب میں ویسے ہی وحشیانہ افعال سے روکتا تھا، پس ان تمام حیثیات سے اسلام کا قانون
مغرب کے قانون پر بمراتب فوقیت رکھتا ہے، اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار
نہیں کیا جاسکتا،

اب ہم اصولی مباحث چھوڑکر فروعات کی طرف توجہ کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم یہ
دیکھنے کی کوشش کریں گے، کہ مختلف جنگی امور کے متعلق بیگ میں کیا قوانین مقرر کئے گئے ہیں
اور مغربی قومیں ان کو کس حد تک قابلِ عمل تسلیم کرتی ہیں،

اعلانِ جنگ، جنگی مسائل میں پہلا مسئلہ یہ ہے کہ جنگ کس طرح شروع کیجائے؟ ابتدائی زمانہ
میں یہ عام طریقہ تھا کہ جنگ شروع کرنے سے قبل نقیبوں اور ایلچیوں کی معرفت دشمن کو اطلاع
دیدیجاتی تھی، اس زمانہ میں بین المللی قانون کے مصنفین بھی اعلان و انذار کی ضرورت پر بہت
زور دیتے تھے، بلکہ بعض کی تو یہ رائے تھی کہ اعلان کے بغیر حملہ کردینا درست نہیں ہے لیکن بعد
میں ماہرینِ قانون کا میلان اس طرف ہوگیا کہ رسمی اعلانِ جنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے،

Lawrence P. 299

چنانچہ سلطنتوں نے بالعموم یہ دستور اختیار کرلیا کہ اعلانِ جنگ کے بغیر ہی مخاصمانہ کارروائیاں شروع کردیتی تھیں، تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۰۰ء سے ۱۸۷۰ء تک یورپ میں ۲۰ لڑائیاں ہوئیں جن میں سے صرف دس لڑائیوں میں رسمی اعلانِ جنگ کیا گیا، ان میں بعض لڑائیاں ایسی ہیں جو سفارتی تعلقات منقطع ہونے سے بھی قبل چھیڑ دی گئیں، مثلاً ۱۸۱۲ء میں انقطاعِ تعلقات سے قبل امریکہ نے ان تمام انگریزی جہازوں کو گرفتار کرلیا جو اس کے بندرگاہ میں موجود تھے، اور بلا اطلاع کینیڈا پر حملہ کردیا، اسی طرح ۱۸۵۴ء میں برطانیہ نے بحرِ اسود کے روسی بیڑے پر حملہ کرکے اسکو سباسٹوپول کی طرف بھگا دیا، حالانکہ اس وقت تک دونوں جانب کے سفرا واپس بھی نہ ہوئے تھے، اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر میں یورپ نے پھر پہلے طریقہ کی طرف رجوع کیا، اور جنگ سے قبل عام طور پر اعلانِ جنگ کیا جانے لگا، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس، ۱۸۷۷ء کی جنگ ترکی و روس، ۱۸۹۸ء کی جنگ امریکہ و اسپین اور ۱۸۹۹ء کی جنگ بوئر میں رسمی اعلان سے جنگ کی ابتدا ہوئی تھی، لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں روس اور جاپان کی جو جنگ ہوئی اسمیں کوئی اعلانِ جنگ نہیں کیا گیا، اور بلا اطلاع جاپان نے روس پر حملہ کردیا،

اس طرح یورپ میں بیسویں صدی کی ابتدا تک جنگ شروع کرنے کے متعلق کوئی متعین قاعدہ نہیں تھا، سلطنتیں خود اپنی مرضی کے مطابق جب چاہتی تھیں دشمن پر اچانک جا پڑتی تھیں، اور جب ضرورت ہوتی تو پہلے سے اعلانِ جنگ بھی کردیتی تھیں، ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں پہلی مرتبہ اسکی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس کے متعلق ایک قاعدہ مقرر کردیا جائے، چنانچہ ایک سمجھوتہ کیا گیا جسکی دفعات یہ ہیں:-

دفعہ اوّل، دول متعاقدہ عہد کرتے ہیں کہ ان کے درمیان جنگ کی ابتدا اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک اس سے قبل ایک صریح تنبیہ نہ کردیجائے، یہ تنبیہ خواہ اعلانِ جنگ کی صورت میں ہو، جسمیں وجوہِ جنگ بتائی گئی ہوں، یا الٹی میٹم (= بلاغ اخیر) کی شکل میں جسمیں

Hostilities without declaration of War by Maurice P. 44, 45, 66.

مشروط اعلانِ جنگ کیا گیا ہو۔

دفعہ دوم، حالتِ جنگ کے وجود میں آنے کی اطلاع جتا تاخیر غیر جانبدار حکومتوں کو پہنچائی اور جب تک ان کے پاس سے اس اطلاع کی رسید نہ آجائے جو ہمیشہ تار برقی سے ہو اس وقت تک غیر جانبداروں کے بارے میں جنگی قوانین نافذ نہ ہوں تاہم غیر جانبد حکومتوں کو اطلاع نامۂ جنگ ہی کا انتظار نہ کرنا چاہئے جب کہ انھیں قطعی طور پر جنگ کے وقوع میں آنے کا علم ہو چکا ہو[1]۔

یہ مہذب قانون آج سے صرف بیس اکیس سال قبل یورپ میں وضع ہوا ہے، اور یہ بھی صرف آپس کے سمجھوتے کے شرکاء کے لئے ہے؟ لیکن اسلام میں ساڑھے تیرہ سو برس سے ایک ایسا ہی قانون موجود ہے کہ:-

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ (۸:۵۸)

اگر تجھیں کسی قوم سے خیانت و بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھکر ان کی طرف پھینک دو۔

یہ قانون نہ تو متعاقدین کے ساتھ مخصوص ہے، نہ اسکی ذمہ داری سے کسی مسلمان کو عہد برات کا حق دیا گیا ہے، اور نہ اس کے واجب العمل ہونے سے کسی مسلمان کو کسی حال میں انکار کی جرات ہو سکتی ہے۔

اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال۔ دو قوموں میں حالتِ جنگ قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محارب قوم کے افراد سے کس قسم کا سلوک کیا جائے؟ بیسویں صدی تک یورپ محارب (Belligerent) اور مقاتل (Combatant) کے فرق سے ناآشنا تھا، اس کے نزدیک ہر محارب مقاتل تھا، اس لئے اس کا قتل اور اس کی املاک کا سلب و نہب جائز تھا، عام اس سے کہ وہ عورت ہو بچہ ہو، بڈھا ہو، بیمار ہو یا دوسرے غیر مقاتل طبقات سے تعلق رکھتا ہو، اس کے بعد سے ہوئے

[1] Plague Convention (1907) III

[2] تشریح کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم عنوان "اعلانِ جنگ"۔

اور اٹھارہویں صدی میں بین الملی قانون کے جو مصنفین پیدا ہوئے، انھوں نے مقاتلین
اور غیر مقاتلین کے درمیان طبقات کے اعتبار سے فرق کرنے کی کوشش کی، لیکن کوئی
ایسی جامع تقسیم نہ ہوسکی جس پر سب کو اتفاق ہو، اور جسے حالتِ جنگ میں ملحوظ رکھا جا
ہو، انیسویں صدی میں اس سوال کو اس طرح حل کیا گیا کہ جو لوگ جنگی کارروائیوں میں حصہ
لیتے ہیں، وہ مقاتل ہیں، اور جو اسمیں حصہ نہیں لیتے، وہ غیر مقاتل ہیں، لیکن یہ حل اس وقت
مجمل تھا کہ جزئیات و تفصیلات میں اس کا قائم رہنا مشکل تھا، اس کے بعد پھر یہ اصول قا
دیا گیا کہ صرف غنیم کی باقاعدہ افوج مقاتلین میں شمار کیجائیں گی، اور باقی سب طبقات غیر
مقاتلین میں داخل ہوں گے، لیکن اس سے چند اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے، ڈاکٹر لوید
( ) کے بقول "ایک ملک کے باشندوں کا یہ حق کہ وہ اپنے آبائی وطن
کی مدافعت کریں کسی معقول دلیل سے رد نہیں کیا جاسکتا"، اس لئے قدرتی طور پر یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے وطن کو بچانے کے لئے عام طور پر ہتھیار
لے کر کھڑے ہوجائیں اور بغیر کسی ضبط و نظام کے غنیم سے جنگ شروع کردیں، تو ان کی
حیثیت کیا ہوگی؟ آیا ان کو مقاتلین میں شمار کرکے وہی حقوق دیئے جائیں گے جو دشمن کی با
فوج کے لئے مقرر ہیں، یا انھیں غیر مقاتلین میں شمار کرکے قانونِ جنگ کے مطابق لٹیرو
اور قزاقوں میں شمار کیا جائیگا؟ مغربی جنگ کا قانون یہ ہے کہ غیر مقاتل (Non Comb
atant) اگر جنگی کارروائی میں حصہ لے تو اسکو نہ مقاتلین کی رعایات حاصل ہوں گی
اور نہ غیر مقاتلین کی یعنی وہ قید ہوگا تو قتل کیا جائیگا، زخمی ہوگا تو معالجہ اور تیمارداری سے
محروم رہے گا، اور اس کے ساتھ جنگ میں کسی قسم کے جنگی آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں گے
اس قانون کی رو سے مقاتلین و غیر مقاتلین کے امتیاز کا یہ اُصول ان قوموں کے لئے غیر
بربادی و مصیبت کا موجب ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کے لئے یا اپنے وطن کی مدافعت
کے لئے محض جذبۂ حبِ وطن سے متاثر ہوکر لڑنے کھڑی ہوجاتی ہیں، اور کسی باقاعدہ
جنگی نظام میں منسلک نہیں ہوتیں،

۱۸۷۰ء کی جنگ میں جب فرانس نے اپنی عام آبادی کو بے ضابطہ جماعتوں

(Levée en masse) کی صورت میں بھی آزاد شروع ہے
ان کو مقاتلین کے حقوق دینے سے انکار کر دیا تو بین الاقوامی قانون کے سامنے یہ مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ آگیا، اور ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس میں اس پر زبردست بحث کی گئی، آخر مقاتلین وغیر مقاتلین کے درمیان ایک قطعی امتیاز قائم کیا گیا، جس کی رو سے صرف وہی لوگ اہل قتال قرار دیئے گئے جو:-

(الف) ایک ایسے قائد کے زیر فرمان ہوں جو اپنے ماتحتوں کے افعال کا ذمہ دار ہو،

ب۔ ایسے مقرر امتیازی نشانات اپنے بدن پر لگائیں، جنھیں فاصلہ سے پہچانا جاسکتا ہو،

ج۔ کھلم کھلا ہتھیار اٹھائیں،

د۔ جنگ میں قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں[1]۔

اسی وجہ امتیاز کو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنسوں میں تسلیم کیا گیا، اور ہیگ کے ضوابط (Regulation) کی دفعہ دوم وسوم میں اس امر کی بھی تصریح کر دی گئی کہ:-

"اگر کسی غیر مفتوح علاقہ کے باشندے دشمن کی آمد پر اپنے وطن کی حفاظت کے لئے بلکہ کسی تنظیم کے ہتھیار لے کر کھڑے ہو جائیں، تو انکو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے، بشرطیکہ وہ علانیہ ہتھیار اٹھائیں، اور قوانین و رسوم جنگ کی پابندی کریں،

محارب فریقین کی مسلح فوجیں مقاتلین وغیر مقاتلین دونوں پر مشتمل ہو سکتی ہیں غنیم کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی صورت میں دونوں کو اسیران جنگ کے حقوق حاصل ہوں گے"

اس طریقہ سے ایک سوال تو بیشک حل ہو گیا لیکن دوسرا سوال پھر بھی باقی رہا، ہتھیار اٹھانے کی ضرورت صرف آزاد قوموں کو ہی پیش نہیں آتی، بلکہ بعض اوقات

[1] 57 - 57 (1875) PP 252 - 57 Parliamentary Papers, No. 1

یم آزاد اور غلام قوموں کو بھی اپنے غصب شدہ حقوق حاصل کرنے کے لئے پیش آیا کرتی ہے
آزادی و استقلال کے لئے جنگ کرنا ہر قوم کا حق ہے، اور اگر وہ ایک طاقتور دشمن سے خلاصی
حاصل کرنے کے لئے تلوار کی مدد حاصل کریں تو کسی دلیل سے ان کو مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا
پس سوال یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے جنگ کرے تو کیا اس کے
تمام افراد مجرم قرار دیئے جائیں گے؟ کیا ان کو اہل قتال کے حقوق نہیں دیئے جائیں گے؟
کیا ان کو قزاقوں اور لٹیروں کی طرح پکڑ پکڑ کر قتل کیا جائے گا؟

ان سوالات کو ہیگ کانفرنسوں نے حل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے اور عملاً دول
غرب کا میلان اسی طرف ہے کہ ایسی قومیں نہ مقاتلین کے حقوق سے متمع ہو سکتی ہیں، اور نہ
غیر مقاتلین کی رعایات سے، ان کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ انھیں توپوں اور بندوقوں
لقمہ بنایا جائے، ان کی آبادیوں کا قتل عام کیا جائے، اور ان کے افراد کو پکڑ پکڑ کر قتل
ردیا جائے، ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد میں برطانیہ نے، ریف میں ہسپانیہ نے، اور
ٹام میں فرانس نے ہماری آنکھوں کے سامنے جو ہولناک مظالم کئے ہیں وہ اس بات
ثبوت ہیں کہ مغربی تہذیب کا قانون کسی قوم کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ وہ حصول
ستقلال کے لئے جنگ کرے،

اہل قتال و غیر اہل قتال کے درمیان امتیاز کا یہ قاعدہ اس لحاظ سے بھی غلط ہے کہ
میں ان تمام لوگوں کو غیر اہل قتال قرار دیا ہے، جو جنگ میں ہتھیار نہیں اٹھاتے، اگرچہ
ب مغرب کو ایک عرصہ تک اس بات پر فخر رہا کہ انھوں نے دشمنی و مخاصمت صرف فوجوں
ث محدود کر دی ہے، اور غیر فوجی جماعتیں جنگ کے اثرات سے بالکل مستثنیٰ کر دی گئی ہیں،

مغربی سیاسیین نے غیر فوجی طبقوں کو جنگ کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی ضرورت پر جو اس قدر زیادہ زور
ہے، اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی تجارت بہت زیادہ عزیز ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ ہر حالت میں اسکا سلسلہ
ی رہے چنانچہ ۱۸۷۰ء کی ہیگ کانفرنس نے بالفاظ صریح اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ سلطنتوں کو جنگ کے دوران میں اس امر کی
ی کوشش کرنی چاہئے کہ محاربین کے درمیان صنعتی و تجارتی تعلقات بدستور قایم رہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ خواہش نہ پوری ہو سکتی ہے اور نہ کبھی
ک کسی جنگ میں پوری ہوئی ہے، جنگ عظیم کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ خود یورپین سلطنتیں اسکو پورا کرنے پر قادر نہیں ہیں،

لیکن آج خود وہی تسلیم کر رہے ہیں کہ فوجیت و غیر فوجیت کی بنا پر مقاتلین و غیر مقاتلین کا فرق کرنا
اصولاً غلط ہے، اور عملاً ناممکن ہے، اس بارہ میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنے کی بجائے میں
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ان یورپین مصنفین کے قول یہاں نقل کر دیئے جائیں جنھوں نے
جنگ عظیم کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس امر کو محسوس کر لیا ہے کہ مقاتلین و غیر مقاتلین کی
تفریق جس پر اب تک ان کو اس قدر ناز تھا کتنی بے بنیاد ہے۔

پروفیسر نیولڈ لکھتا ہے:-

"جدید تجارت نے ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ تجارتی عہد میں جبکہ ہمارے کروڑوں آدمی
غیر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں اور ادھر سے اُدھر گردش کرتے رہتے
ہیں، یہ بالکل ناممکن ہے کہ جنگ محض متعلقہ حکومتوں کے فوجی اشخاص کی باہمی
لڑائی قرار دیجائے، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ صرف محارب ممالک ہی میں
نہیں، بلکہ غیر محارب غیر جانبدار دنیا میں بھی کوئی شخص کسی نہ کسی صورت میں
ایک بڑی جنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، مختلف اشخاص و افراد کے
درمیان آج زندگی کے تمام شعبوں میں ایسے پیچ در پیچ تعلقات پیدا ہوئے
ہیں کہ کوئی شخص ایسی جنگ کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، ان اثرات
کو محدود رکھنے اور روکنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہو چکی ہیں، لہذا یہ نظریہ
ایک بے معنی نظریہ ہے کہ جنگ محض سلطنتوں کا ایک معاملہ ہے اور جنگ کا
تمام کاروبار صرف فوجی اشخاص ہی سے تعلق رکھتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ نئی
تجارت کے عہد میں جنگ دراصل قوموں کا معاملہ ہے، جو اپنی تمام جسمانی
اور اقتصادی قوت سے پیدا کی جاتی ہے[1]"

آگے چل کر یہی مصنف کہتا ہے:-

"جنگ کا مقصد سلطنت کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا
اس لحاظ سے بیشک اس ضرر رسانی کا سلسلہ بند ہونا چاہیے، جو اس مقصد

[1] A Treatise of Int. Pro. Vol. II p. 114

کے لئے مفید نہ ہو۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سلطنت صرف سپاہیوں سے آباد نہیں ہوتی، بلکہ عام باشندوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے، اسی بنا پر مولٹکے (Moltke) نے اس نظریہ سے اختلاف کیا ہے، کہ "جنگ کا کام محض غنیم کی فوجی قوت کو ضعیف کرنا ہے"، وہ کہتا ہے "برسرِ جنگ سلطنت کو اپنے تمام ذرائع، اپنے مالیات، ریل کی سڑکیں، غدر کے وسائل، حتیٰ کہ اپنا اخلاقی اثر بھی جنگ میں استعمال کرنا چاہیئے، اگر دشمن کے ارادہ کو زبردستی جھکانا ہی جنگ کا مقصد ہو تو یہ ضروری ہی نہیں بلکہ جائز ہو جاتا ہے، کہ وہ اپنے فوجی ذرایع نہ صرف مخالف فوج کے خلاف بلکہ غنیم کی تمام اقتصادی قوتوں کے خلاف بھی استعمال کرے..... اب چونکہ ایک سلطنت کی اقتصادی قوت، اشخاص و افراد کی قوت سے مرکب ہوتی ہے، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ افراد کی ذات و جائداد اور ان کے اقتصادی مفاد کو بھی اس حد تک جنگ کا ہدف بنایا جائے، جس حد تک کہ وہ جنگ کا مقصد حاصل کرنے کے لئے ضروری اور مفید ہو"[1]

ایک دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے:-

"سلطنتوں کو اقتصادی جنگ میں بھی اسی طرح ضروریاتِ جنگ کی پیروی کرنی چاہیئے، جس طرح وہ فوجی جنگ میں کرتی ہیں، دونوں صورتوں میں تمام وہ ذرایع جن سے غنیم کو مغلوب کرنے کی توقع ہو، استعمال کئے جانے چاہئیں، لہٰذا اقتصادی جنگ صرف مزاحمت فی التجارۃ تک ہی محدود نہ رہنی چاہیئے، بلکہ اس کو غنیم کی اقتصادی زندگی پر ایک مہلک ضرب لگانے کی کوشش کرنی چاہیئے، اور اس لحاظ سے اسمیں پرائیویٹ اشخاص (یعنی غیر مقاتلین) پر بھی ضرب پڑنی ناگزیر ہے"[2]

پروفیسر نیمیر (Neimeyer) اپنی کتاب "بحری جنگ کے قوانین و اصول"

[1] NIPPOLD. P. 121 [2] IBID. P. 122

میں لکھتا ہے :-

"بحری جنگ میں دشمن قوم پر ہر ممکن ذریعہ سے حتی کہ انتہائی وحشیانہ ذرائع سے بھی زندگی دوبھر کر دینی چاہیے[1]"

برک ہارٹ (Burckhardt) لکھتا ہے :-

"یہ خوش آیند اصول کہ جنگ محض مسلح افواج کے درمیان کشمکش کا نام ہے، جس کا سول آبادی کے پرامن روابط پر کوئی اثر نہیں پڑتا اپنے آپ کو ایک خیالی بہشت ثابت کر چکا ہے، فوج نہ اپنے تئیں قوم سے جدا کر سکتی ہے اور نہ سلطنت سوسائٹی سے الگ ہو سکتی ہے، تمام نظریات کے علی الرغم جنگ ہمیشہ قوموں کے درمیان ہوا کرتی ہے کیونکہ آبادی کے تمام طبقات اس میں حصہ لیتے ہیں، اگرچہ ان سب کے ہتھیار مختلف ہوتے ہیں۔ جہاں تک سلطنت سے ان کا گہرا تعلق ہے، سلطنت اور اہل ملک میں کوئی شے قائم نہیں کیا جا سکتا، لہذا جنگ جس طرح دو فوجوں کے درمیان ایک فوجی کشمکش ہے، اسی طرح وہ دو قوموں کے درمیان ایک اقتصادی کشمکش بھی ہے[2]"

ایک دوسرے موقع پر بھی یہی مصنف لکھتا ہے :-

"سمندر کی تہ میں تجارت کو غرق کر دینا، آدمیوں کو ڈبو دینے سے بدرجہا زیادہ انسانیت پرور طریقہ جنگ ہے، بلکہ زیادہ گہرا تجزیہ کرو تو دشمن کی فوجی قوت کو مغلوب کرنے کی کوشش ایسی حالت میں بالکل بے کار معلوم ہوگی، جبکہ دشمن کی اقتصادی قوت اتنی مضبوط ہو کہ وہ اسے ہتھیار رکھنے پر مجبور نہ ہونے دے، اسی وجہ سے یہ ناگزیر ہے، کہ ہر محارب فریق اپنے دشمن کی اقتصادی قوت برباد کر دینے کی کوشش کرے .....

---

[1] Prinzipien der seekriegsrecht P 17

[2] Nippold P 114

ایک سلطنت کی عسکری قوتِ دفاع اس کی اقتصادی قوت کے ساتھ اس طرح گتھی ہوئی ہے کہ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کی صنعتی زندگی جنگ جاری رکھنے میں اس کے لئے اتنی ہی مفید ہوتی ہے، جتنی اس کے سپاہی کی زندگی ہو سکتی ہے، اس لئے کوئی محارب قوت دشمن کے اقتصادی وسائل پر حملہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتی، دشمن کی عام آبادی کو بھوکا مار دینا خواہ کتنا ہی بے رحمی کا فعل ہو، مگر میری رائے میں یہ کوئی ممنوع طریق جنگ نہیں ہے[1]"

آگے چل کر مصنف پھر لکھتا ہے:-

"جنگ کو کلیۃً فوجی طبقہ تک محدود رکھنا بہت سے تخیل پسندوں کا مطمحِ نظر ہے، وہ چاہتے ہیں کہ خشکی اور تری دونوں پر شخصی املاک محفوظ رہیں، محاربین تک میں اموالِ تجارت کا لین دین جاری رہے، اور جنگ محارب فریقین کی فوجی قوتوں کے درمیان ہو، نہ کہ محارب سلطنتوں کی عام رعایا کے درمیان لیکن آج کوئی عملی آدمی اس تخیل کا پرستار نہیں ہے، صرف اسی بنا پر نہیں کہ وہ حقیقت واقعیہ سے بہت دور ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ صراحۃً ایک مصنوعی اور غیر فطری حالت ہے، صرف یہی نہیں بلکہ قدرتی طور پر جنگی کارروائیوں سے متصل یا ہمسایہ ملکوں کی باہمی تجارت کو ضرب لگتی ہے، بلکہ ویسے بھی یہ بات عقل و خرد کے بالکل منافی معلوم ہوتی ہے، کہ ایک طرف ایک سلطنت اپنے ہزاروں نوجوانوں کو جنگ کی آگ میں جھونک رہی ہو، اور دوسری طرف دشمن کو چین سے تجارت بھی کرنے دے، ایک طرف وہ دشمن کے بندرگاہوں پر گولہ باری کرنے میں اپنی جان و مال قربان کر رہی ہو، اور دوسری طرف اسکی درآمد و برآمد کا سلسلہ بھی جاری رہنے دے[2]"

ایک اور مصنف ایلنز باخر (Ellis Bracher) لکھتا ہے:-

[1] Neptold P. 133 [2] Neptold P. 122

"چونکہ دشمن کی فوجی قوت کی تخریب دشمن قوم کی تباہی نہیں ہے بہت کم ہی
جمی ہوئی ہوتی ہیں، اس لئے اس قوت کو تمام ممکن ذرائع سے پہلے ذلیل و خوار کرنا
ہے، اسی طرح ایک دشمن فوج کے خلاف جو جنگ شروع کی جاتی ہے، وہ اس
پوری دشمن قوم کے خلاف جنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور جب جنگ
اس منزل پر پہونچ جاتی ہے تو بین الملی قانون اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہو جاتا
ہے، پہلے زمانہ میں جو یہ اصول تسلیم کر لیا گیا تھا، کہ جنگ محض دشمن کی مسلح فوجوں
کے درمیان محدود رہنی چاہیئے، اور محاربین کی عام آبادی تک چند مخصوص و
متعین صورتوں کے سوا اس کے شدائد کو وسیع نہ ہونا چاہیئے، اس پر آج
تمامی عارض ہو چکی ہے، موجودہ زمانہ کی جنگ نے اسکو دور پھینک دیا ہے
وہ صرف انفرادی واقعات ہی میں نہیں توڑا گیا بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے درکنار
توڑ دیا گیا ہے، آیندہ جنگوں میں اسکا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے گا، کیونکہ ماضی
ساتھ فنا ہونے والی چیز کا پھر اعادہ نہیں ہوا کرتا"[1]

ان طویل اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے، کہ جنگ میں تمام غیر فوجی طبقوں کو غیر اہل قتال
قرار دینا، ان کو جنگی کارروائیوں سے محفوظ رکھکر آزادی سے کاروبار کرنے دینا، اور انھیں ان
تمام رعایات سے جو غیر اہل قتال کے لئے مخصوص ہیں مستفید کرنا نہ صرف عملاً ناممکن ہے بلکہ
اصولاً بھی غلط ہے، اسمیں شک نہیں کہ جنگ میں غیر فوجی طبقوں کو خاص طور پر ہدف بنانا اور
ان کی اقتصادی زندگی برباد کرنیکی اس حیثیت سے کوشش کرنا کہ وہ بھی جنگ کے مقاصد میں سے
ہے، یقیناً ایک زیادتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ ان تمام لوگوں
کو غیر اہل قتال کے حقوق دیئے جائیں، جو دشمن کی جنگی طاقت کو تقویت پہونچانے میں اتنا ہی حصہ
لیتے ہیں، جتنا فوجی طبقے لیتے ہیں،

اس لحاظ سے مغربی قانون نے اہل قتال و غیر اہل قتال کے درمیان تفریق کا جو خط
کھینچا ہے، وہ کسی حیثیت سے بھی مستقیم نہیں ہے، ایک طرف وہ بہت سے ان جماعتوں

[1] Ibid, PP. 133-34

جن قتال کے حقوق سے محروم کر دیتا ہے جو درحقیقت ان کے مستحق ہیں، اور دوسری طرف
ہے ان طبقات کو غیر اہلِ قتال کی رعایت دیتا ہے جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں ہیں
اس افراط و تفریط کے درمیان اسلام نے ایک مستقیم خط کھینچ دیا ہے، جو اہلِ قتال و غیر
اہلِ قتال کو ان کے پیشوں کے لحاظ سے تقسیم نہیں کرتا، بلکہ ان کی قابلیتِ جنگ کے اعتبار
سے تقسیم کرتا ہے، اس نے محارب قوم کو "مقاتلہ" کے اصول پر تقسیم کیا ہے، جو لوگ عملاً مقاتلہ
کرتے ہیں، یا فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت رکھتے ہیں، وہ سب اہلِ
قتال ہیں، اور جو فطرت اور عادت کے اعتبار سے مقاتلہ کی قدرت نہیں رکھتے، (مثلاً
عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور اور فقرا وغیرہ) وہ سب غیر اہلِ قتال میں داخل ہیں، اور
قوم کا ہر فرد جو مسلمانوں سے لڑنے آئے گا خواہ وہ باقاعدہ فوج سے تعلق رکھتا ہو یا نہ رکھتا
ہو، اسے بہر صورت مقاتل سمجھا جائیگا، اور وہ تمام حقوق اسے دیئے جائیں گے جو مقاتلین
کے لئے مخصوص ہیں، (بشرطیکہ وہ غدر و عہد شکنی کا عادی مجرم نہ ہو) اسی طرح ہر وہ شخص جو
جنگ پر قادر ہوگا اہلِ قتال میں شمار کیا جائے گا، اور اسے ضروریاتِ جنگ کے ماتحت
(نہ کہ لازماً) شدائدِ جنگ سے دوچار ہونا پڑیگا، یہ ضرور ہے کہ اگر وہ امان مانگے تو اسے امان
دیجائے گی، اگر وہ دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان پر امن طریقہ سے تجارت کرنی
چاہے، تو مصالحِ جنگ کی رعایت سے اسکی بھی اجازت دیدیجائے گی، اگر وہ جنگی کارروائیوں
سے محترز رہکر اپنے کاروبار میں مشغول رہے، تو اسکو غیر اہلِ قتال کی طرح مصئون و مامون بھی
رکھا جا سکے گا، لیکن نوعیت کے اعتبار سے وہ اہلِ قتال ہی کے طبقہ میں شمار ہوگا، اور غیر
مقاتلین کے حقوق محض رعایۃً دیئے جائیں گے، اہلِ قتال اور غیر اہلِ قتال کے درمیان
تفریق کی یہی ایک قدرتی صورت ہے، اور ان دونوں انتہائی نقطوں کے درمیان اسی
ایک متوسط نقطہ پر جنگی اور قانونی گروہوں کا اجتماع ممکن ہے،

مقاتلین کے حقوق و فرائض محاربین کی یہ دو بڑی اقسام، یعنی اہلِ قتال و غیر
اہلِ قتال اپنے حقوق و فرائض کے اعتبار سے مختلف قوانین کے تابع ہیں، اس لئے
ہم ان دونوں سے الگ الگ بحث کریں گے، ان میں ترتیب کے اعتبار سے اہلِ قتال

مقدم ہیں،

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یورپ میں اہلِ قتال کے حقوق کا کلی احساس انیسویں صدی کے دورِ آخر کی پیداوار ہے، اگرچہ اس سے بہت پہلے نظری حیثیت سے ان پر بحث و کلام کی ابتدا ہو چکی تھی اور شعورِ اجتماعی کی ترقی کیساتھ ساتھ بعض حقوق عملی دنیا میں بھی تسلیم کئے جا چکے تھے، لیکن کامل طور پر ان حقوق کے تسلیم و اعتراف کا دور بہت بعد شروع ہوا ہے، ۱۸۶۱ء تک سلطنتیں اس بارے میں کسی متعین قانون کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھیں اور خود اپنے آپ کو اس امر کے فیصلہ کا مختار سمجھتی تھیں کہ کن محاربین کو وہ اہلِ قتال کے حقوق دیں اور کن کو نہ دیں، چنانچہ امریکہ کی خانہ جنگی (American Civil War) میں امریکہ نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ:-

"ایک قوم خود ہی اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ کب وہ محاربین کو اہلِ حرب کے حقوق دے، عام اس سے کہ وہ محاربین اس قوم سے ہوں جو اپنے آپ کو ایک ایسی حکومت سے آزاد کرانا چاہتی ہو جسے وہ ظالم سمجھتی ہے یا وہ آزاد اقوام ہوں اور باہم ایک دوسرے سے برسرِ جنگ ہوں۔"

لیکن ہر قوم کا خود اپنے افعال کے لئے جج بن جانا کسی حال میں بھی متعین حقوق و فرائض پیدا نہیں کر سکتا، اور عملاً اس کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ سرے سے اہلِ حرب کے حقوق و فرائض ہی فنا ہو جائیں، اس مشکل کو اہلِ مغرب نے آخر محسوس کیا اور رفتہ رفتہ یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ محاربین کو ہر حال میں حربیت (Belligerency) کے حقوق دیئے جائیں گے، اور اس کا فیصلہ خود فریقین کے اختیارِ تمیزی پر نہ چھوڑا جائے گا۔

سب سے پہلے سینٹ پیٹرسبرگ میں ایک قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے:-

"جنگ میں سلطنتوں کو صرف اسی ایک جائز مقصد کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ دشمن کی فوجی قوت کو کمزور کر دیں، اور اس مقصد

Parliamentary Papers of America 1872. (No. 2) P. 17

کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ اس کے آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ ممکن تعداد
بیکار کر دیجائے، اس سے بڑھکر ایسے اسلحہ استعمال کرنا جن سے بیکار کئے ہوئے
آدمیوں کی تکالیف میں غیر ضروری اضافہ ہو، یا ان کی موت ناگزیر ہو جائے،
اس مقصد پر تعدی کے حکم میں داخل ہوگا"

یہ ابتدائی قاعدہ تھا جو ۱۸۷۴ء میں وضع کیا گیا، اس کے چند سال بعد بروسیلز کانفرنس
میں کچھ حقوق و فرائض بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن انیسویں صدی کے خاتمہ تک اس
موضوع پر کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکا، جس کو تمام مغربی طاقتوں نے تسلیم کر لیا ہو،
اس صدی کے اختتام پر جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو اس نے یہ جامع اصول
وضع کیا کہ:-

"محاربین کا ایک دوسرے کو نقصان پہونچانے کے ذرائع استعمال
کرنے کا حق غیر محدود نہیں ہے"

اس کے ساتھ ہی اس نے اہلِ قتال کے حقوق و فرائض بھی متعین کئے جنکو ضوابطِ ہیگ
کی دفعہ ۲۳ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

"مخصوص سمجھوتوں میں جن امور کی ممانعت کی گئی ہے ان کے علاوہ حسب ذیل
امور خصوصیت کے ساتھ ممنوع ہیں:-

(الف) زہریا زہریلے اسلحہ استعمال کرنا،
(ب) محارب قوم یا فوج کے کسی شخص کو دغا سے قتل یا زخمی کرنا،
(ج) ایسے دشمن کو قتل یا زخمی کرنا جس نے ہتھیار ڈال کر یا مدافعت کے
تمام وسائل سے محروم ہو کر حریف کے اختیار تمیزی کے آگے اپنے تئیں
تسلیم کر دیا ہو،
(د) یہ اعلان کرنا کہ کوئی امان نہیں دیجائیگی،
(س) ایسے اسلحہ یا اشتعال پذیر مادے یا سامان استعمال کرنا جو حد سے زیادہ نقصان

Hague Regulations Art 22

پہونچانے والے ہیں،

(س) صلح کے پرچم، یا دشمن کے قومی پرچم، یا فوجی علامات یا وردی یا مفاہمت جنیوا کے مقرر کئے ہوئے امتیازی نشانات ناجائز طریقہ سے استعمال کرنا،

(ش) دشمن کی املاک تباہ کرنا بغیر اس کے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ایسا کرنا ناگزیر ہو،

اس اجمالی بیان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اہلِ قتال کے حقوق و فرائض کی تعیین کب اور کس طرح ہوئی، اس کے بعد اب ہم خاص خاص حقوق و فرائض کا الگ الگ تذکرہ کریں گے،

قواعدِ حرب کی پابندی، اہلِ قتال کا سب سے بڑا فرض جس پر دوں کو بڑا اصرار رہا ہے یہ ہے کہ وہ فوجی ضبط و نظام کے پابند ہوں، اور قواعدِ حرب کو ملحوظ رکھیں جو محاربین سے ضابطہ جنگ کرتے ہیں، ان کے حقوقِ حربیت کو تقریباً تمام سلطنتوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، جرمن قانون میں ان کے لئے کم سے کم دس سال کی قید، زیادہ سے زیادہ موت کی سزا مقرر ہے، امریکہ کے قانون کی ضمن چہارم دفعہ ۲۰ میں ان کو قزاق و رہزن کو قرار دیا گیا ہے، اور ان کے لئے وہی سزا تجویز کی گئی ہے جو اس قسم کے مجرموں کو دی جاتی ہے حربیت کے حقوق تو درکنار ان لوگوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق دینے سے بھی انکار کیا گیا ہے، چنانچہ ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں برطانیہ نے سخت مخالفت کی کہ غیر مہذب وحشی قوموں کے مقابلہ میں ڈم ڈم کی گولیاں استعمال کرنے کی ممانعت ہونی چاہئے، اور نیسلڈوچ نے جو برطانیہ کی نمایندگی کر رہے تھے، اپنی تقریر کے دوران میں برٹش ہندوستان کی ۱۸۹۷ء کی جنگ چترال میں معمولی قسم کی گولیاں وحشی دشمن کے ہجوم کو روکنے میں ناکافی ثابت ہوئی تھیں اور ڈم ڈم کی گولیاں ان لوگوں کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہونچاتی تھیں جو وحشی ہوں، ڈم ڈم کی گولیاں ہیں جن کے ذکر سے ایک یورپین کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے، جن کے مہذب قوموں

Phillimore, Int. Law, III, P. 222

کے خلاف استعمال کرنا کسی کو گوارا نہیں ہے، لیکن بے ضابطہ جنگ کرنے والی غیر مہذب قوموں کے خلاف اسی خلافِ انسانیت ہتھیار کو استعمال کرنا اس قدر ضروری اور جائز سمجھا جاتا ہے کہ ایک مہذب ترین یورپین سلطنت ہیگ کے اقرار نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیتی ہے، اور دستخط کرتی ہے تو اس وقت جبکہ اس اقرار نامہ کو صرف متعاقد کی باہمی جنگوں تک محدود کر دیا جاتا ہے،

امان، اہلِ قتال کا پہلا اور بنیادی حق یہ ہے کہ جب وہ دشمن سے امان مانگیں تو انھیں امان دیجائے، سترھویں صدی تک یورپ میں امان دینے کا طریقہ مفقود تھا، انگلستان کی خانہ جنگی میں پارلیمنٹ نے آئرش لوگوں کو امان دینے سے قطعی انکار کر دیا تھا، اٹھارھویں صدی کے آخر تک محاربین کو حق تھا کہ ایک دوسرے کو امان دینے سے انکار کر دیں، چنانچہ ۱۷۹۴ء میں فرنچ کنونشن نے اعلان کر دیا تھا کہ انگریزی سپاہیوں کو امان نہیں دیجائے گی، لیکن انیسویں صدی میں اہلِ قتال کا یہ حق تسلیم کر لیا گیا کہ جب وہ امان طلب کریں تو ان پر کسی قسم کی دست درازی نہ کیجائے، اور ان کو اسیرانِ جنگ کے حقوق دیئے جائیں،

مگر یہ قانون صرف انھیں لوگوں کے لئے ہے جو میدانِ جنگ میں دشمن سے پناہ مانگیں[1]، باقی رہے وہ محاربین جو حالتِ جنگ شروع ہوتے وقت دشمن کے قبضہ میں ہوں، ان کے متعلق ابھی تک کوئی متعین قاعدہ موجود نہیں ہے، اٹھارھویں صدی تک عام قاعدہ تھا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور معمولی مجرموں کی طرح اختتامِ جنگ تک قید رکھا جاتا تھا، ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ انگلستان نے فرانس کے ساتھ یہ رعایت کی کہ جنگ کے آغاز میں جتنے فرانسیسی اسکی حدود میں موجود تھے، ان کو اس شرط پر امان دیدی کہ وہ ایمانداری کے ساتھ ناطرفدار رہیں، اسی طرح ۱۸۹۸ء میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوا کہ ان کی باہمی جنگوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کے آدمیوں کو اسی طرح امان دیا کریں گے، مگر ۱۹۰۳ء میں معاہدہ امینس (Amiens) کے ٹوٹنے پر نپولین نے پھر بھی

[1] موجودہ قانون نے میدانِ جنگ کی امان اور حالتِ جنگ کی امان میں فرق کیا ہے، مگر میں نے اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے ان دونوں کا یکجا ذکر کرنا زیادہ مناسب سمجھا،

طریقہ کا اعادہ کیا، اور ان تمام انگریزوں کو گرفتار کر لیا جو فرانسیسی علاقہ میں موجود تھے۔ انیسویں صدی میں ایک دوسرا طریقہ اخراج کا بھی اختیار کیا گیا، اور ان تینوں طریقوں پر باوقات مختلفہ عملدرآمد ہوتا رہا۔ ۱۸۵۴ء کی جنگ کریمیا، ۱۸۹۸ء کی جنگ ترکی و یونان، ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانسیسی و اسپین میں فریقین نے ایک دوسرے کے آدمیوں کو امان عطا کی۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس میں تمام جرمن فرانسیسی علاقے سے نکالدیئے گئے۔ ۱۸۷۷ء کی جنگ بلقان میں فریقین کی دونوں جمہوریتوں نے انگریزوں کو حدود بلاد سے خارج کر دیا۔ اس سے بعد انیسویں صدی میں بھی اس کے متعلق کوئی قاعدہ نہ بن سکا۔ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں ۱۹۱۲ء کی جنگ ترکی و اطالیہ میں (کچھ عرصہ تک) فریقین نے امان عطا کرنے کے طریقہ کی پابندی کی۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے دشمن کے ان تمام فوجی لوگوں کو جو ان کی حدود میں موجود تھے ایک خاص مدت کے اندر نکل جانے کا حکم دیدیا، اور جو لوگ نہ نکلے انہیں نظر بندی میں رکھا۔ جرمنی اور آسٹریا نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو مستثنیٰ کرکے سب کو نظر بند یا پھر نکال نے غیر فوجی عمر کے لوگوں کو نکال باہر کیا، اور فوجی عمر کے لوگوں کو نظر بند کر دیا۔ اور مریضہ نے سب کو امان عطا کر دی،

اس کے متعلق ابھی تک کوئی قانون نہیں بنا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں بین المللی قانون کا عام رجحان یہ ہے کہ غیر فوجی عمر کے لوگوں کو ملک چھوڑ کر چلے جانے کی مہلت دیجائے اور فوجی عمر کے لوگوں کو روک لیا جائے۔ بخلاف اس کے سابق میں سارے یہ دونوں سے یہ عام قانون موجود ہے کہ اہل حرب میں سے کوئی شخص اگر وہ سابق میں امان پانا رہنا چاہے یا آنا چاہے تو اسے امان دینی چاہیے، اور اگر وہ اپنے ملک کی طرف جانا چاہے تو اسے بخیریت پہونچا دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ سابق نے جن مستامن کو جو وسیع حقوق دیئے ہیں، ان کی گرد تک بھی ابھی مغرب کا بین المللی قانون نہیں پہونچ سکا ہے[1]،

---

[1] Birkenhead P. 197-98 تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب عنوان "صلح و امان"،

اسیرانِ جنگ — اسیرانِ جنگ کے متعلق یورپ کے قوانین بہت مکمل ہیں، مگر پروفیسر ولسن کے بقول ان کے مکمل ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں تمام سلطنتوں کے مفاد مشترک ہیں، ہر سلطنت خود اپنے سپاہیوں اور افسروں کی آسایش چاہتی ہے، اس لئے وہ محض مبادلہ کے طور پر مخالف کے سپاہیوں اور افسروں کو بھی آسایش پہونچانے پر راضی ہو جاتی ہے[1]۔

لیکن یہ مہذب قوانین بہت قریبی عہد کی پیداوار ہیں، سترھویں صدی تک یورپ میں اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کا دستور تھا، گروشیوس نے اس طریقہ کے خلاف آواز بلند کی، اور عیسائی اقوام کو مشورہ دیا کہ وہ ایک دوسرے کو غلام بنا کر بیچنے کی بجائے اسیرانِ جنگ کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا کریں، مگر ایک صدی تک اسکی سفارشات بے اثر رہیں، اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں فدیہ اور مبادلہ اساری کا طریقہ جاری ہوا، اور صدی کے اختتام تک سلطنتیں اس پر کاربند رہیں، ۱۷۱۳ء میں فرانس اور انگلستان کے درمیان مبادلہ اور مفادات کے متعلق جو معاہدہ ہوا تھا، اسمیں ایک سپاہی کی قیمت ایک پونڈ، اور ایک امیر البحر یا مارشل کی قیمت ۶۰ پونڈ یا ۲۰ سپاہی قرار دی گئی تھی، انیسویں صدی میں یورپ نے مفادات کا طریقہ بھی چھوڑ دیا، اور صرف مبادلہ کا طریقہ باقی رکھا، لیکن تہذیب کے اس شباب کے زمانہ میں بھی اسیرانِ جنگ کو قتل کرنے کا طریقہ بالکل موقوف نہیں ہوا تھا، چنانچہ ۱۷۹۹ء میں مہذب یورپ کے سب سے بڑے جنرل نپولین بوناپارٹ نے یافا کی چار ہزار ترکی فوج کو جس نے جان بخشی کا وعدہ لیکر اطاعت قبول کی تھی، صرف اس عذر کی بنا پر قتل کرا دیا کہ وہ انھیں کھلانے کے لئے خوراک مہیا نہیں کر سکتا اور نہ مصر بھیجنے کا انتظام کر سکتا تھا[2]، اس کے تقریباً ایک صدی بعد مغربی دنیا میں پھر اسی جرم کا ارتکاب کیا گیا جس کو ابھی تیس برس سے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گذرا ہے، ۱۸۹۶ء میں کیوبا کے ہسپانوی کمانڈر جنرل ویلر (WEYLER) نے اسیرانِ جنگ کو باغی قرار دیکر قتل کرا دیا تھا، اور ہزاروں نہتے باشندوں کو پکڑ کر اس طرح قید کر دیا تھا کہ وہ مکھیوں اور مچھروں کی طرح بھوکے پیاسے مر گئے۔

---

[1] Wilson's History of War in its Conduct & Treaties of Europe III, XXV

بہرحال یہ ایک واقعہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کے متعلق بضابطہ قواعد [illegible] وضع کئے گئے، ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے ان کی توثیق کی، اور ۱۹۰۷ء کی دوسری ہیگ کانفرنس نے ان کو مکمل کرکے ایک بین الملی قانون بنادیا، یہ قانون ہیگ نمبر ۴ کے ملحق ضوابط میں ملتے ہیں، جنکا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"دفعہ ۴، اسیرانِ جنگ محارب حکومت کے قبضۂ اختیار میں ہوں گے نہ کہ ان اشخاص کے قبضہ میں جنھوں نے ان کو گرفتار کیا ہو، ان سے انسانیت کا سلوک روا رکھنا چاہئے۔ ان کے پاس اسلحہ گھوڑوں اور جنگی کاغذات کے ماسوائی جو اشیا موجود ہوں وہ انھیں کی ملک رہیں گی،

دفعہ ۵، اسیرانِ جنگ کو عموماً نظر بند رکھنا چاہئے لیکن اگر تحفظ کے لئے ناگزیر ہو تو قید بھی کیا جا سکتا ہے،

دفعہ ۶، قید کرنے والی حکومت اسیرانِ جنگ سے ان کے درجہ کو ملحوظ رکھکر کام لے سکتی ہے، (افسر ہر حال میں اس سے مستثنیٰ ہیں) بشرطیکہ وہ کام حد سے زیادہ نہ ہو اور جنگی اعمال سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، انھیں اس کام کا معاوضہ دیا جائے گا جو اسی شرح کے مطابق ہونا چاہئے جس پر خود اس حکومت کے اسی درجہ کے آدمیوں کو دیا جاتا ہو،

دفعہ ۷۔ اسیرانِ جنگ جس حکومت کے قبضہ میں ہوں وہی ان کے گزارہ کی ذمہ دار ہوگی، خاص صورتوں کے ماسوائی ان کے قیام کا بندوبست اسی پیمانہ پر ہونا چاہئے جس پر خود گرفتار کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کے لئے کرتی ہو،

دفعہ ۸، اسیرانِ جنگ ان قوانین کے تابع ہوں گے جو قید کرنے والی سلطنت میں نافذ ہوں، نافرمانی کا ہر فعل ان کے حق میں ایسی سختیوں کو جائز کردیگا جو اس کے لئے ضروری ہوں، بھاگنے والے قیدی اگر اپنی فوج تک پہونچنے سے پہلے گرفتار ہوجائیں تو تادیبی (Disciplinary) سزا کے مستوجب ہوں گے، اور اگر اپنی فوج میں پہونچنے سے پہلے دوبارہ گرفتار ہوں تو ان کو گذشتہ جرم کی سزا نہ دیجائے گی،

دفعہ ۹، ہر اسیرِ جنگ کا فرض ہوگا کہ اگر اس سے اس کا نام وغیرہ دریافت کیا جائے

تو وہ ٹھیک ٹھیک بتادے، نہ بتانے یا غلط بتانے کی پاداش میں اسکی آسایشیں کم کردی جائینگی،

دفعہ ۱۰۔ اسیرانِ جنگ کو یہ وعدہ لے کر رہا کیا جا سکتا ہے کہ وہ جنگ میں پھر حصہ نہ لیں گے اگر کوئی اسیر اس طرح رہائی حاصل کرے تو اس کا فرض ہوگا کہ اپنا عہد پورا کرے، اس کی حکومت اسکو عہد شکنی پر مجبور نہ کریگی،

دفعہ ۱۱، کسی اسیر جنگ کو مشروط رہائی حاصل کرنے کیلئے مجبور نہ کیا جائیگا، اور نہ کوئی حکومت اس پر مجبور ہوگی کہ ہر حال میں کسی اسیر کی درخواستِ رہائی قبول کرلے،

دفعہ ۱۲۔ اگر کوئی اسیرِ جنگ مشروط رہائی حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اسی حکومت کے خلاف لڑنے آئے تو اسے اسیرانِ جنگ کے حقوق حاصل نہ ہوں گے، اور گرفتار ہونے کی صورت میں اس پر مقدمہ چلایا جائیگا،

دفعہ ۱۳۔ جو غیر مقاتل لوگ کسی فوج کے ساتھ باضابطہ تعلق کے بغیر شامل ہوں، مثلاً نمایندگانِ جرائد وغیرہ ان کو گرفتار کرکے اسیرانِ جنگ کے طور پر رکھا جا سکتا ہے،

دفعہ ۱۴۔ دورانِ جنگ میں ہر سلطنت ایک محکمۂ اطلاعات قائم کرے گی، جو ہر قیدی کے متعلق سوالات کا جواب دیگا، تمام اسیرانِ جنگ کے متعلق ضروری معلومات فراہم رکھے گا، اور ان کی قومی حکومت کو وقتاً فوقتاً ان کے حالات سے مطلع کرتا رہے گا،

دفعہ ۱۵۔ اسیرانِ جنگ کی امدادی سوسائٹیاں جو اپنے ملک کے قانون کے مطابق قایم کی گئی ہوں، محارب فریقین کی جانب سے ہر قسم کی آسانیوں کی مستحق ہوں گی، ان کو اور ان کے ایجنٹوں کو نظر بندی اور قید کی حالت میں اسیروں تک پہونچنے اور اپنے فرایض انجام دینے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ مقامی حکام کی ہدایات کے مطابق عمل کریں،

دفعہ ۱۶۔ محکمۂ اطلاعات ڈاک کے محصول سے مستثنیٰ ہوگا، خطوط، منی آرڈر، اور قیمتی اشیاء، اور پارسل جو اسیرانِ جنگ کے نام یا ان کی جانب سے بھیجے جائیں ڈاک کے خرچ سے دونوں ملکوں میں مستثنیٰ ہوں گے، ان پر کسی قسم کی چنگی بھی نہ ہوگی اور

نہ ریلوے کا محصول لگایا جائیگا۔

دفعہ ۱۷۔ گرفتار شدہ افسروں کو اسی شرح سے تنخواہ دیجائیگی جو قید کرنے والی حکومت اپنے اسی درجہ کے ملازموں کو دیتی ہو، یہ رقم آخر میں خود ان کی حکومت ادا کردے گی۔

دفعہ ۱۸۔ قیدیوں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی ہوگی، بشرطیکہ وہ ان قواعد کے تحت جو ضبط و نظام کی خاطر مقرر کئے گئے ہوں اپنے مذہب کے کلیسا میں جا سکیں گے۔

دفعہ ۱۹۔ اسیرانِ جنگ کی وصیتیں اسی طرح پوری کی جائیں گی جس طرح قومی فوج کے سپاہیوں کی کیجاتی ہیں۔ وفات پانے کی صورت میں ان کی تجہیز و تکفین اسی عزت کے ساتھ کیجائے گی جو ان کے ہم رتبہ قومی فوج کے ملازموں کی تجہیز و تکفین میں ملحوظ رکھی جاتی ہے،

دفعہ ۲۰۔ صلح ہونے کے بعد جہاں تک جلد ممکن ہوگا اسیرانِ جنگ کا مبادلہ کیا جائے گا[۲]۔

ان قواعد کو اگر ضابطہ کی جزئیات سے مجرد کرکے محض اصول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اسلام کے مقرر کئے ہوئے اصول پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے۔ مغربی قانون اسیرانِ جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہ آسائشیں بہم پہونچانا چاہتا ہے جو ایک سلطنت خود اپنے اسی درجہ کے سپاہیوں اور افسروں کو بہم پہونچاتی ہے، مگر پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ان کے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا طرزِ عمل یہ ہے کہ انھوں نے اسیرانِ جنگ کو اپنے سے بہتر کھانا کھلایا اور اپنے سے بہتر کپڑا پہنایا، حالانکہ دشمنوں کے ہاں ان کے اسیرانِ جنگ کو روٹی کپڑا تو درکنار انتہائی جسمانی اذیتیں نصیب ہوتی تھیں۔ مغربی سلطنتیں اسیرانِ جنگ کے خرچ کا ایک بڑا حصہ خود ان کی اپنی قوم سے وصول کرتی ہیں، مگر اسلام ایک جبہ بھی اس سے طلب نہیں کرتا۔ مغربی سلطنتیں ان کو صرف مبادلہ کی صورت میں رہا کرنے پر آمادہ ہوتی ہیں، مگر اسلام مبادلہ کے بغیر ہی ان کو بطریق احسان رہا کردینا افضل سمجھتا ہے۔ تاہم بعض چیزیں ان میں اسلام سے زائد بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کے متعلق کوئی رائے قایم کرتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز

---

[۱] یہ قوانین صرف فوجیوں کے لئے ہیں ابھی یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا نظریۂ بیرونی فوجیوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے یا نہیں۔

[۲] مقابلہ کے لئے دیکھئے اس کتاب کا باب پنجم، عنوان "اسیرانِ جنگ"۔

نہ کرنا چاہئے کہ ہر سلطنت دوسری سلطنت کے سپاہیوں کو یہ تمام رعایات اس معاہدہ کی بنا پر دینے کے لئے راضی ہوئی ہے، کہ اس کے سپاہیوں کو بھی ایسی ہی رعایات دیجائیں گی، بخلاف اس کے اسلام نے کسی معاہدہ اور سمجھوتہ کے بغیر ایسی حالت میں اسیرانِ جنگ کو وہ رعایات دی تھیں جبکہ اسے اپنے مخالفوں سے کسی قسم کی رعایت حاصل ہونے کی امید نہ تھی، اس نے غزوۂ بدر کے قیدیوں پر اس زمانہ میں لطف و احسان کیا تھا جبکہ کفارِ قریش کے قبضہ میں بیسیوں مسلمان قیدی تپتی ہوئی ریت پر لٹائے جاتے تھے، آج کی طرح اس وقت ایسا کوئی سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن نہ تھا، اس لئے اسیرانِ جنگ کو زیادہ سے زیادہ وہی رعایات دیجا سکتی تھیں جو اسلام نے دیں، لیکن آج جبکہ اس بارے میں سمجھوتہ اور معاہدہ ممکن ہے، اسلام پچھلے قوانین پر ہرگز اصرار نہ کرے گا، وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہر ایسے معاہدہ کی اجازت دیتا ہے جسمیں مساوات کے ساتھ مراعات کا مبادلہ کیا گیا ہو،

مجروحین، مرضیٰ اور مقتولین، فوج کے مجروحوں اور بیماروں کے لئے سترھویں صدی تک یورپ میں کوئی خاص انتظام نہ تھا، غالباً سترہویں صدی میں پہلی مرتبہ جنگی ہسپتال قایم کرنے اور میدانِ جنگ میں فوری امداد کے لئے طبیب اور جراح رکھنے کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن دشمنوں کے مجروحوں اور بیماروں کا احترام اور اس کے ہسپتالوں اور معالجوں کی مامونیت کا تخیل انیسویں صدی تک یورپ میں ناپید تھا، مجروح اور بیمار لوگ بسا اوقات قتل کر دیئے جاتے اور اکثر اوقات ان کو نہایت خستہ حالت میں مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا، ہسپتالوں کو فوجی حملوں سے مستثنیٰ نہ رکھا جاتا تھا، معالجوں اور تیمارداروں کو اسیرانِ جنگ میں شمار کیا جاتا اور عام مقاتلین کی طرح وہ بھی قید کر لئے جاتے تھے، انیسویں صدی کے وسط تک بین الملی قانون کے ماہرین کے درمیان اسی مسئلہ میں اختلاف تھا کہ ڈاکٹروں اور تیمارداروں کو اسیرانِ جنگ میں شمار کیا جائے یا نہیں[1]، امریکہ کی خانہ جنگی میں ریاستہائے متحدہ نے یہ امر جائز قرار دیا تھا کہ اگر غنیم کے ڈاکٹروں کی خدمات درکار ہوں تو انھیں پکڑ کر کام لیا جا سکتا ہے، غرض یہ کہ ۱۸۶۴ء تک یورپ مجروحوں اور مریضوں اور معالجوں کے متعلق مہذب قوانین سے ناآشنا تھا، اور پہلی مرتبہ اس وقت آشنا ہوا جب سوئٹزرلینڈ کے ایک مشہور محبِ انسانیت ہنری دونان (Henri Dunant) نے اس کو مہذب قوموں کے وحشیانہ اعمال پر متنبہ کرنے کے لئے ایک دردناک آواز بلند کی، جون ۱۸۵۹ء میں فرانس اور سارڈینیا کی

[1] Lawrence. P. 348.

متحدہ افواج، اور اسٹریا کی فوج کے درمیان سول فرینو (Solferino) کے مقام پر ایک زبردست معرکہ پیش آیا تھا، جسمیں علاوہ اور وحشیانہ حرکات کے مجروحین جنگ کے ساتھ اس قسم کا بیدردانہ برتاؤ کیا گیا کہ اس سے تمام دنیا میں انسانیت کے لطیف جذبات متحرک ہوگئے، ہنری ڈونان نے اس پر ۱۸۶۲ء میں ایک کتاب (A Souvenir of Solferino) کے نام سے شایع کی جس سے یورپ کی سلے عام کو ان بے [illegible] پر آمادہ کردیا، اور اکتوبر ۱۸۶۳ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے ایک غیر سرکاری کانگریس بمقام جنوا منعقد کرکے اس امر پر غور کیا کہ آیندہ کے لئے جنگ میں زخمیوں اور بیماروں کی حفاظت کا کیا بندوبست کیا جاسکتا ہے، اس کانگریس کے تجویز کردہ خطوط پر دوسرے سال جنوا میں ایک باضابطہ بین الملکی کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس نے بحث و مباحثہ کے بعد ایک سمجھوتہ تیار کیا جس پر ۲۲ اگست ۱۸۶۴ء کو تمام دول (باستثنائے امریکہ) دستخط کردیئے، اس سمجھوتہ میں فوجی ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کو ناطرفدار قرار دیا گیا، ان کو جنگی قیدی بنانے یا ان کے شفاخانوں کو جنگی اعمال کا ہدف بنانے کی ممانعت کردی گئی، اور بیماروں اور زخمیوں کے علاج اور تیمارداری کے کام میں مزاحمت کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا، نیز اس میں زخمیوں اور بیماروں سے متعلق ہر چیز کے لئے سفید زمین پر سرخ صلیب کا نشان تجویز کیا گیا تاکہ دور سے اسکو دیکھ کر امتیاز کیا جاسکے، اور کسی ایسی چیز کو جنگی کارروائی کا نشانہ نہ بنایا جائے جس پر وہ نشان لگا ہوا ہو، اس کے ساتھ ہی ہر محارب فریق پر فرض کیا گیا کہ وہ اپنے زخمیوں کی طرح دشمن کے زخمیوں کا بھی علاج کرائے اور آرام ہوجانے کے بعد یا تو ان سے جنگ میں دوبارہ حصہ نہ لینے کا وعدہ لیکر انھیں رہا کردے یا بطور اسیران جنگ کے روک لے،

یہ سمجھوتہ متعدد حیثیات سے ناقص تھا، اور اسمیں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کو قابل سزا جرم قرار دینے کی کوئی سفارش نہیں کی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۱۸۶۸ء میں دوبارہ جنوری میں ایک اور کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس کا ایک ضمنی سمجھوتہ مرتب کیا جو نو دفعات پر مشتمل تھا، پانچ دفعات بری جنگ کے متعلق اور ۹ دفعات بحری جنگ کے لئے، اس کانفرنس نے دول سے سفارش کی کہ وہ اپنے قوانین جنگ میں اس سمجھوتہ کی دانستہ خلاف ورزی کو جرم مستلزم سزا قرار دیں لیکن سلطنتوں نے اس سفارش کو قبول کیا اور نہ اس سمجھوتہ کی توثیق کی اس لئے دوسری جنوا کانفرنس بالکل بے کار ثابت ہوئی،

۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس نے پھر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا مگر اسکی سفارشات کا حشر بھی وہی ہوا جو دوسری جنوا کانفرنس کا ہوا تھا، اس کے ۲۵ سال بعد ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس میں دول نے یہ بات محسوس کی کہ انھیں مجروحوں اور بیماروں کے متعلق ایک مکمل ضابطۂ قانون کی ضرورت ہے، چنانچہ انھوں نے سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے سفارش کی کہ وہ ایک تیسری جنوا کانفرنس منعقد کرکے اس کام کی تکمیل کرے[1]

اس سفارش کے مطابق ۱۹۰۱ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء میں سوئٹزرلینڈ کی حکومت دولِ مغرب کو پیہم دعوتیں دیتی رہی مگر کسی طرف سے ہمت افزا جواب نہ ملا، آخر خدا خدا کرکے ۱۹۰۶ء کے موسم گرما میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی، اور اس نے ۶ جولائی کو وہ سمجھوتہ مرتب کیا جو آج مغربی سلطنتوں کا معمول بہ قانون ہے،

اس کے بعد ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اسی سمجھوتہ کی بنیاد پر ایک اور سمجھوتہ کیا جس میں انھیں قوانین کو بحری جنگ پر منطبق کیا تھا، مگر کانفرنس میں شریک ہونے والی ۴۴ سلطنتوں میں سے، اس نے اس نے توثیق نہیں کی جنمیں برطانیہ، اٹلی، یونان، بلغاریا، اور سرویا شامل ہیں، اس لئے یہ سمجھوتہ عملاً بے کار رہا اور اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں ہسپتالی جہاز آزادی کے ساتھ غرق کئے گئے[2]

ان تمام سمجھوتوں کا اصل الاصول صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ جو دشمن جنگ سے معذور ہو چکا ہو، اور جسکو زخم یا بیماری نے بے کار کر دیا ہو، اسے کسی قسم کی ایذا پہونچانا انسانیت کے خلاف ہے، اسی اصل سے وہ فروعی قواعد نکلتے ہیں، جو ہسپتالوں اور ان کے کارکنوں کے متعلق جنوا اور ہیگ کے سمجھوتوں میں وضع کئے گئے ہیں، بلکہ ان کا ایک بڑا حصہ محض عملی جزئیات پر مشتمل ہے، جو ظاہر ہے کہ حالات اور طریقوں کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے، اس لئے دیکھنے کی چیز صرف وہ اصل الاصول ہی ہے جسکو مغربی دنیا نے تو آج دریافت کیا ہے، لیکن اسلام ساڑھے تیرہ سو برس قبل دریافت کر چکا ہے، ظہورِ اسلام کے وقت ہسپتالوں اور شفاخانوں کا وہ نظام موجود نہ تھا جو آج ایک مکمل ادارہ کی صورت اختیار کر چکا ہے، اس لئے قدرتی طور پر وہ

---

[1] Hague Convention Vol
[2] Oppenheim, International Law vol II p 205

تفصیلات وضع نہیں کی گئیں جو ارتقاے تمدن کے ساتھ ساتھ تدریجاً پیدا ہوتی اور بدلتی رہتی ہیں،
لیکن اس نے لا تجھہ ت علی جریح (زخمی پر دراز دستی نہ کرو) کا اصول دینا کو بتا دیا ہے اور
یہ تعلیم دی ہے کہ ہر محارب کو دوسرے فریق کے اچھے یا برے عزعمل سے بے نیاز ہو کر خود اپنے
کے طور پر زخمیوں اور ان تمام لوگوں کا احترام کرنا چاہیے جو زخمیوں کی طرح معذور ہوں۔

مہلک اشیاء کا استعمال جب سے جدید علوم حکمت نے جنگ کے لئے نئے نئے مہلک آلات و ادوات
اختراع کرنے شروع کئے ہیں، یورپ میں ایک مسئلہ یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ ان ہلاکت با چیزوں کا
استعمال روک دیا جائے، زہریلی گیسیں، پھٹنے والی گولیاں، آتش گیر مادے، اور ایسی ہی دوسری
چیزیں انسانی اجسام پر جو ہولناک اثر پیدا کرتی ہیں، ان کو دیکھکر یورپ کا ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے
اور انسانیت پرور اخلاقیین کا ایک گروہ رائے عام کو بھڑکا کر ارباب سیاست پر دباؤ ڈالتا ہے کہ
جنگ میں ایسے وحشیانہ آلات و ادوات استعمال نہ کریں مگر فوجی گروہ کو مقاصد جنگ کے حصول میں
یہ چیزیں جو مدد دیتی ہیں، وہ اسے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کا استعمال ترک کر دیں
ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک عرصہ سے کش مکش برپا ہے، اور اسکا علاج سیاسی مدبرین نے
یہ سوچ رکھا ہے کہ اخلاقیین کو تو وہ بین الملی کانفرنسیں منعقد کرکے اور ان میں انسانیت پرور قرارداد
تیار کرکے مطمئن کر دیتے ہیں، اور فوجی گروہ کو آزادی کے ساتھ نہ صرف ان تمام چیزوں کے استعمال
کی بلکہ ایسی ہی دوسری نئی نئی چیزیں ایجاد کرکے رائج کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں،

ان مہلک اشیاء میں سے بعض چیزیں جو بظاہر زیادہ وحشیانہ صورت رکھتی ہیں، ان کو تو یورپ
نے ایک عرصہ سے چھوڑ رکھا ہے، زہر کے بجھے ہوئے اسلحہ کا استعمال خلاف شعار ہیں، صدی سے بندوق
اور کانٹے، شیشے کے ٹکڑے، چاقو کے پھل، اور ایسی ہی دوسری چیزیں توپ میں بھر کر چھوڑنی بھی ایک صدی

لے فقہ اسلامی میں استنباط احکام کا ایک متداول طریقہ یہ بھی ہے کہ خاص احکام کی علت پر قیاس کرکے ان کو ان
تمام صورتوں پر عام کر دیا جاتا ہے جنمیں وہ علت پائی جاتی ہے، مثلاً شراب میں حرمت کی علت سکر ہے، اس لئے
ایسی ہر چیز حرام ہے، جسمیں سکر موجود ہو، اسی قاعدہ کے مطابق چونکہ زخمی پر دست درازی نہ کرنے کا حکم اس لئے
دیا گیا ہے، کہ وہ مقاومت سے معذور ہے، اس لئے اس سے یہ عام حکم نکلتا ہے، کہ ایسے دشمن پر جو مقاومت سے
معذور ہو، دست درازی نہ کرنی چاہیے،

سے ممنوع ہو چکی ہیں لیکن، دوسری چیزیں جو اصلیت کے اعتبار سے ان کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ وحشیانہ ہیں، آج تک برابر استعمال ہو رہی ہیں، اور یورپ کی مہذب ترین سلطنتیں ان کے استعمال پر سب سے زیادہ مصر ہیں، ۱۸۶۸ء ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنسوں میں تمام سلطنتوں نے یہ اصول تسلیم کیا کہ دشمن کو ایسا جسمانی نقصان نہ پہونچانا چاہیے جو جنگ کے مقاصد میں کسی قسم کی مدد دیئے بغیر اسکی تکالیف میں غیر ضروری اضافہ کرتا ہو، چنانچہ اس اصول کے مطابق حسب ذیل اشیاء کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا،

۱۔ اشتعال پذیر اور آتش گیر مادہ (Explosive or incendiary Projectiles) جنکا وزن ۱۴ اونس سے کم ہو،

۲۔ پھٹنے والی گولیاں جو جسم میں داخل ہو کر پھیل جاتی ہوں،

۳۔ زہریلی اور دم گھونٹنے والی گیسیں،

۴۔ بیلونوں اور ہوائی جہازوں سے پھٹنے والے گولے (Projectiles and Explosives)

ان میں سے نمبر ۴ کی قید کو تو دو سلطنتوں کے سوا کسی نے قبول نہیں کیا، اور وہ گویا پیدا ہوتے ہی مر گئی، نمبر ۳ کی قید ابتداءً صرف امریکہ اور انگلستان نے نامنظور کی تھی، مگر بعد میں تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے اسکی خلاف ورزی کی، یہاں تک کہ جنگ عظیم میں سب نے مل کر اس کے پرزے اڑا دیے، جنگ کے بعد واشنگٹن کانفرنس میں دوبارہ اس بندش کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی، اور ایک جدید میثاق لکھا گیا لیکن آج تک کسی نے اس کی توثیق نہیں کی، دوسری قید کے متعلق ابھی تک ماہرین حرب میں اسی امر پر اختلاف ہے کہ پھٹنے والی گولی کی صحیح تعریف کیا ہے، پھر جب مسمّیٰ کی تعیین ہی نہیں ہوئی تو اسم کی ممانعت کیا معنی؟ اب رہی پہلی قید، سو وہ صرف کاغذ ہی کی زینت ہے، اور عملی دنیا میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے، جنگ عظیم میں جملہ اقسام کے اشتعال پذیر اور آتش گیر مادے جس آزادی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں اسکے بعد کوئی شخص ہیگ کانفرنس اور سینٹ پیٹرسبرگ کے اقرارناموں کو یاد دلا کر اپنے تئیں سامانِ مضحکہ بنانے کی جرأت نہیں کر سکتا،

اس معاملہ میں اسلامی قانون نے کسی قسم کی تصریح نہیں کی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی خاص قسم کے ہتھیار یا سامانِ جنگ کے استعمال کو ممنوع قرار دینا محاربین کے باہمی سمجھوتے پر منحصر

اگر ایک محارب فریق ایک مہلک چیز استعمال کرتا ہے تو دوسرے فریق کو بھی اس چیز کو استعمال نہ کرنے، اس پر ایسی کوئی پابندی عائد کرنا اس کے حق میں شکست کا یقینی فیصلہ کر دینا ہے۔ اس لئے اسلام نے مسلمانوں کو ایسے ہتھیار، و طریق جنگ اختیار کرنے کی اجازت دی ہے جو ان کے زمانہ میں رائج ہوں، اور اس کے ساتھ ان کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر غیر قوموں سے کوئی ایسا سمجھوتہ ممکن ہو جس سے کسی خاص طریقہ پر یا وسیلہ کو مساویانہ اصول پر ترک کیا جا سکتا ہو تو وہ اپنے وقتی مصالح کو دیکھکر اسے منظور کر لیں،

جاسوس، جاسوس کو کسی قانون نے پناہ نہیں دی ہے، دوسرے قوانین کی طرح مغربی قانون بھی کسی کو قانونی حیثیت تسلیم نہیں کرتا، صنوالطہ ہیگ کی دفعہ ۲۰ میں اس نے جاسوس کو صرف یہ رعایت دی ہے کہ اسے مقدمہ چلائے بغیر سزا نہیں دیجا سکتی، اور دفعہ ۳۱ کی رو سے اسکو دوسری رعایت یہ دی گئی ہے کہ اگر وہ جاسوسی کر کے اپنی فوج میں واپس پہونچ جائے اور اس کے بعد گرفتار ہو تو اسے پہلی جرم کی بنا پر کوئی سزا نہیں دیجائے گی، ان دو رعایتوں کے ساتھ ہیگ کے ضوابط فوجی حکام کو پورا اختیار دیتے ہیں، کہ جس شخص پر جاسوسی کا جرم ثابت ہو، اسکو جو چاہیں سزا دیں،

اس معاملہ میں اسلامی قانون بھی مغربی قانون سے مختلف نہیں ہے، دونوں صرف اس حربی کو جاسوس قرار دیتے ہیں، جو خفیہ طریقہ سے دشمن کے علاقہ میں گھس کر اس کے اسرار کا تجسس کرتا ہے، اور جو شخص بغیر کسی دھوکہ اور فریب کے کھلم کھلا دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لئے جائے، اسکو دونوں جاسوس شمار نہیں کرتے، البتہ اسلامی قانون نے جاسوس کو دو رعایات نہیں دی ہیں جو مغربی قانون اس کو دیتا ہے، مگر یہ رعایات دراصل مراعات ہیں جو فریقین باہمی سمجھوتہ سے ایک دوسرے کے جاسوسوں کو دیتے ہیں، چونکہ تمام سلطنتیں جاسوسوں سے کام لیتی ہیں، اور کوئی سلطنت نہیں چاہتی کہ اپنے ایسے جاں نثار آدمیوں کو بالکل دشمن کے رحم پر چھوڑ دے، اس لئے انھوں نے مضابطت کے ساتھ انھیں، کچھ رعایات عطا کر دی ہیں، اور یہ ایسی رعایات ہیں جو اگر مسلمانوں کے جاسوس دشمن کو حاصل ہوتی ہوں، تو اسلام بھی ان کے عوض محاربین کو یہی رعایات دے سکتا ہے،

خدع فی الحرب، جنگ میں خدع و فریب جائز ہے، فریڈرک عظم کہتا ہے:-

"جنگ میں ایک شخص کبھی شیر کی کھال اوڑھتا ہے، اور کبھی لومڑی کی چالاکی

اکثر وقات اس جگہ کامیاب ہوتی ہے جہاں محض قوت ناکام ہوتی ہے"

مگر خدع اور دغا میں فرق ہے، کمین گاہوں میں بیٹھنا، دشمن کو بے خبر رکھکر خطرے کی جگہ کھینچ لا غلط اطلاعات سے اس کو دھوکہ دینا، دکھاوے کی پیش قدمی اور دکھاوے کی پسپائی سے اس کو غلط فہمی ڈالنا، اس کو پسپائی کا دھوکہ دیکر اچانک جا پڑنا، یہ اور ایسی ہی تمام جنگی چالیں خدع میں داخل ہیں، اور ہر دشمن کا خود اپنا فرض ہے کہ ان کے مقابلہ کے لئے مستعد رہے، بخلاف اس کے دشمن کو خطرہ کی علا دکھاکر قریب تر بلانا اور اس پر حملہ کردینا، صلح کی گفت وشنید کے بہانے سے سفید پرچم بلند کرنا اور پھر اس پر لوٹ پڑنا، فوجوں کی قیام گاہ اور میگزینوں پر ریڈ علم نصب کرنا جو ہسپتالوں کے لئے مقرر ہیں، عورتوں اور بچوں کو آگے کھڑا کردینا اور ان کے پیچھے سے گولہ باری کرنا، یہ اور ایسی ہی دوسری حرکات دغا ہیں، اور ان کا ارتکاب کسی فوج کے لئے جائز نہیں ہے، لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جن کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دغا کے حکم میں داخل ہیں یا خدع کے حکم میں، مثلاً دشمن کا قومی پرچم یا اسکی فوجی وردی استعمال کرنا، بین الملی قانون کے علمائے جائز رکھا ہے، مگر فوجی گروہ اسکو ناجائز قرار دیتا ہے، جرمنی کے قانون میں یہ ایک ممنوع طریق جنگ ہے، اور امریکہ کا قانونِ جنگ اسے ایک ایسی "بے ایمانی" سے تعبیر کرتا ہے جسکا ارتکاب دشمن کو کسی رعایت کا مستحق نہیں رہنے دیتا، پس درحقیقت خدع وفریب کے متعلق کوئی ایسا قانون نہیں بن سکتا جو جزئیات پر حاوی ہو، یہ سوال ایک قوم کے سپاہیانہ اخلاق سے تعلق رکھتا ہے اور ہر قوم اپنے احساسِ شرافت کی بنا پر خود ہی فیصلہ کرسکتی ہے، کہ کون سے اعمال اسکی شجاعت وبہادری کے منافی ہیں، اور کون سے نہیں ہیں، اسی لئے ہیگ کے ضوابط میں خدع کی کوئی تشریح نہیں کی گئی صرف یہ لکھدیا گیا کہ خدع فی الحرب (RUSES OF WAR) اور دشمن کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے وسائل کا استعمال جائز ہے[1]،

اس مسئلہ میں بھی اسلام کا قانون مغرب کے قانون سے متفق ہے، اس نے بھی خدع فی الحرب کو جائز قرار دیا ہے، اور تفصیلات کو علمائے عصر پر چھوڑ دیا ہے[2] تاکہ وقتی حالات کے مطابق وہ خود فیصلہ کریں کہ کون سی چیزیں خدع کی تعریف میں آتی ہیں، اور کون سی نہیں آتیں،

---

[1] WARFARE BRANCH-A.L. OXFORD P. 423

[2] امریکہ کی جنگی ہدایات دفعہ ۵۴ ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۴

انتقام ہیگ کے قوانین اور اس سے قبل یا بعد کے قوانین میں جن انتقام سے متعلق کسی قسم کی قید نہیں کی گئی ہے، ہمیں مغربی سلطنتوں کے تسلیم کردہ قوانین میں سے کوئی یہ نہیں بتاتا کہ دشمن کی جانب سے تعدی ہونے کی صورت میں انتقام لینا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو کس حد تک؟ غالباً ہیگ کانفرنسوں میں اس نقطہ سے دانستہ اعراض کیا گیا ہے، کیونکہ فوجی گروہ اس کے متعلق تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے، شخصی طور پر بین المللی قانون کے بعض ماہرین نے اس کے حدود مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصیت کے ساتھ پروفیسر ہالینڈ کی تجویز کردہ حدود اربعہ قانونی گروہ میں بہت مقبول ہیں، جن کا مفاد یہ ہے:-

۱- جس جرم کا انتقام لینا ہو اس کی پہلے کافی تحقیق کر لی جائے،

۲- اس جرم سے جو نقصان پہونچا ہو اسکی تلافی کسی اور صورت سے ممکن نہ ہو، اور نہ اصلی مجرم کو سزا دینی ممکن ہو،

۳- مخصوص حالات کے سوا، ہر انتقامی کارروائی فوج کے سپہ سالار اعظم کی اجازت سے کیجائے،

۴- انتقام کسی حال میں اصل جرم کی نسبت سے زیادہ نہ ہو[1]۔

لیکن یہ سب علمائے قانون کی شخصی آراء ہیں، جنکو جنگی گروہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا، بخلاف اس کے جنگ عظیم کا تجربہ یہ بتاتا ہے، کہ اس مسئلہ میں بین المللی تعامل یہ ہے کہ وہ ہر زیادتی جو ایک فریق کی طرف سے کیجائے، دوسرے فریق کے لئے بھی ویسی ہی زیادتیوں کو جائز کر دیتی ہے، مثال کے طور پر اسیران جنگ کو اذیت پہونچانا، ہسپتالی جہازوں پر حملہ کرنا، تجارتی جہازوں کو غرق کرنا، غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری کرنا، زہریلی گیسیں، اور پھٹنے والی گولیاں استعمال کرنا قوانین جنگ کی رو سے جائز ہے، مگر جنگ عظیم میں ہر فریق نے دوسرے فریق پر یہ الزام رکھکر ان تمام حرکات کا ارتکاب کیا، کہ انکی ابتدا اور اصل اسکی طرف سے ہوئی ہے،

اس مسئلہ میں اسلام کا قانون بالکل صاف ہے، وہ کہتا ہے:-

جزاء سیئۃ سیئۃ مثلہا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ انہ لا یحب الظالمین،	بدی کا بدلہ بدی ہے اسی کے مثل، اور جو معاف کرے، اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ

[1] Hallam, Laws of war on land P. 61

(۲۲:۱۶)

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خيرٌ للصابرين (۱۶:۱۲۶)	ظالموں کو پسند نہیں کرتا، اگر تم سزا دو تو اتنی ہی سزا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہے، اور صبر کرو تو یہ صابروں کے لئے زیادہ بہتر ہے،
فمن اعتدى عليكم فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدى عليكم واتقوا الله (۲:۱۹۴)	جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے، مگر اللہ سے ڈرتے رہو،
قاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين (۲:۱۹۴)	اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، مگر حد سے نہ بڑھ جاؤ، کیونکہ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

ان آیات میں اول تو انتقام نہ لینے اور صبر کرنے کو زیادہ بہتر قرار دیا گیا ہے، اور مجبوری کی حالت میں اسکی اجازت بھی دی گئی ہے، تو اس شرط کے ساتھ کہ انتقام اسی حد تک ہو جس حد تک زیادتی کی گئی ہے اور اس میں تقویٰ کو ملحوظ رکھا جائے اور کسی حال میں شریعت کی حدود سے قدم نہ بڑھایا جائے تقویٰ اور عدم اعتدیٰ سے مراد یہ ہے کہ جو افعال شریعت میں فی نفسہٖ حرام و ناجائز ہیں، ان کا ارتکاب کسی حال میں نہ کیا جائے. مثلاً اگر دشمن کے سپاہی ہمارے ملک میں گھس کر ہماری عورتوں کی بے حرمتی کریں یا ہمارے مقتولوں کا مثلہ کریں تو ہمارے لئے اس کے جواب میں ان کی عورتوں سے زنا کرنا اور ان کے مقتولوں کا مثلہ کرنا جائز نہیں ہے، یا مثلاً وہ دورانِ جنگ میں ہماری عورتوں بچوں بڈھوں، ذمیوں، اور بیماروں، کو قتل کریں تو ہمیں ان کے اس فعل کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے بخلاف اس کے اگر وہ ہمارے خلاف زہریلی گیسیں استعمال کریں، یا ہم پر پھٹنے والے بم پھینکیں، تو ہمیں پورا حق ہے، کہ اسی طاقت اور خاصیت کے آلاتِ جنگ ان کے خلاف استعمال کریں،

غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض، مقاتلین کے باہمی معاملات کا ذکر ہو چکا اب ہم ان قوانین کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مقاتلین اور غیر مقاتلین کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں،

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، یورپ میں غیر مقاتلین کے حقوق کا احساس بہت بعد میں پیدا ہوا ہے. نظری حیثیت سے تو اسکی ابتدا ۱۸ ویں صدی میں ہو گئی تھی، لیکن عملی حیثیت سے انیسویں صدی کے وسط تک کوئی ایسا قانونِ جنگ موجود نہ تھا، جو ان کے احترام کی تاکید کرتا ہو

الجزائر میں فرانس نے غدر دہلی میں انگلستان نے، اور جنگ جزیرہ نما (Eth... war) میں افواج متحدہ نے جس آزادی کے ساتھ غیر مقاتلین کا قتل عام کیا، اس سے عہد وحشت کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ یوں تو علمائے قانون گروشیوس کے عہد سے ان کے حقوق کی تعیین پر زور دے رہے ہیں، مگر عملاً یہ کام پہلی مرتبہ ۱۸۷۴ء میں بروسلز کانفرنس نے شروع کیا، ۱۸۹۹ء کی ہیگ کانفرنس نے اس میں اضافہ کیا، اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس نے اسکو مکمل کیا۔ لہذا غیر مقاتلین کے متعلق مغربی تہذیب کے قوانین کی عمر زیادہ سے زیادہ ۵۰ سال قرار دی جا سکتی ہے۔

اس حدیث العہد قانون نے غیر مقاتلین کے حقوق و فرائض کی تعیین نہایت وسیع پیمانہ پر کی ہے اور جزئیات و فروع کے احاطہ میں بہت کافی غلو سے کام لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یورپین جنگ کے جو جدید طریقے اور اصول پیدا ہوئے ہیں، انکی بدولت مقاتلین و غیر مقاتلین کے درمیان فرق و امتیاز تقریباً ناممکن ہو گیا ہے، اور یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں ہے کہ آج کل کی جنگ غیر مقاتلین کے حق میں عہد وحشت کی جنگ سے زیادہ خطرناک ہے، اس حقیقت کو خود یورپ کے ماہرین فن تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ لارڈ برکن ہیڈ اپنی کتاب "بین الملی قانون میں لکھتے ہیں:-

"بدقسمتی سے گذشتہ جنگ عظیم جس طریقہ پر لڑی گئی ہے، وہ بلاشبہ ریب یہ ظاہر کرتا ہے کہ عوام آبادی اور مسلح افواج کے درمیان تمیز کرنے کا ترقی یافتہ اصول اب نیست و نابود ہونے کے خطرہ میں ہے[1]"

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ فرق و امتیاز جن قوانین کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، وہ خود ہی بے بنیاد ہیں، جیسا کہ گارنر اپنی کتاب "بین الملی قانون اور جنگ عظیم" میں لکھتا ہے:-

"۱۹۰۷ء کے ہیگ کنونشن کی دفعات کو جب ہم ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے واقعات سے مقابلہ کر کے دیکھتے ہیں تو ہمیں اس امر واقعہ کو یاد رکھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ جنگ عظیم کے تمام شرکاء نے اس کنونشن کی توثیق نہیں کی تھی، لہذا یہ امر بہت مشکوک تھا کہ آیا اس کنونشن کے وضع کردہ قوانین سب کے لیے واجب العمل ہیں یا نہیں[2]"

---

[1] International Law P. 205

[2] International law and the World war PP 16-18

لیکن اس کی اصلی وجوہ کچھ اور ہیں جنھیں پروفیسر روپن ہائم نے اپنی عالمانہ کتاب "بین الملی قا
میں بیان کیا ہے، اسکی تحقیق کے مطابق موجودہ عہد کی جنگ میں مقاتلین اور غیر مقاتلین کے امتیاز
کے مٹ جانے کی علت چار چیزوں میں پوشیدہ ہے:-

(۱) جبریہ بھرتی کے طریقہ کی اشاعت، اور ایک قوم کی پوری آبادی کا جنگی خدمت میں
اس طرح شریک ہونا کہ مضبوط جسم کے لوگ میدان پر چلے جائیں، اور ان کی جگہ عورتیں
اور کمزور مرد، سامانِ جنگ بنانے اور دوسرے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہوجائیں،

(۲) ہوائی جہازوں کا استعمال، جو صرف قلعوں اور جنگی استحکامات ہی پر نہیں، بلکہ
مواصلت اور حمل ونقل کے خطوط کو بھی برباد کرنے کے لئے کیا جاتا ہے،

(۳) شوروی حکومتوں کا ان لوگوں کی رائے کی پابندی سے آزاد ہونا جو دراصل
ان کو منتخب کرتے ہیں،

(۴) دشمن پر اقتصادی دباؤ ڈالنے اور اس کے وسائلِ ثروت برباد کرنے
کی جنگی اہمیت[1]،

پس موجودہ زمانہ کی "تہذیب" جنگ میں غیر مقاتلین کے حقوق محفوظ نہ رہنے کی وجہ صرف
یہی نہیں ہے کہ مغرب کے قوانینِ جنگ کی بنیاد کمزور ہے، بلکہ اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی جنگ
جن وسائل اور جن طریقوں سے لڑی جاتی ہے، ان میں غیر مقاتلین کو مقاتلین سے ممتاز کرنا، اور
ان کے امتیازی حقوق کا احترام ملحوظ رکھنا ناممکن ہوگیا ہے،

تاہم ان اصولی نقائص کے باوجود ہمیں دیکھنا چاہئے کہ مغربی قانون نے غیر مقاتلین کے لئے کیا
حقوق وفرائض مقرر کئے ہیں، اور وہ بذات خود کیا قیمت رکھتے ہیں؟

غیر مقاتلین کا اوّلین فرض، غیر مقاتلین کا اولین فرض جس کا ہر محارب دشمن مطالبہ کرتا ہے،
یہ ہے کہ وہ جنگی کارروائیوں میں کسی قسم کا حصہ نہ لیں، جس وقت ان کے سامنے دشمن نمودار ہو تو ان کو
فیصلہ کرلینا چاہئے کہ آیا وہ جنگ میں حصہ لیں یا نہ لیں، اگر وہ جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ کریں تو ان کو
اپنی قومی فوج میں باقاعدہ شریک ہوجانا چاہئے، اور اگر وہ حصہ نہ لینا چاہیں تو اپنے کاروبار میں برابر

[1] Lawrence P. 345

طریقہ سے مشغول رہنا چاہیے، ان میں سے جو لوگ کسی ایک بات کا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں یا جو
طریقہ سے جنگ میں حصہ لیں گے انکو نہ تو مقاتلین کے حقوق حاصل ہوں گے اور نہ غیر مقاتلین کے،
یعنی انکے ساتھ رحم کا برتاؤ نہیں کیا جائیگا، انکو کسی حال میں امان نہیں دیجائیگی، اور انھیں گرفتار ہونے کی
صورت میں اسیرانِ جنگ کا رتبہ بھی نہیں دیا جائیگا[1]

اسی مسئلہ میں اسلامی قانون اس حد تک تو بین الملی قانون سے متفق ہے کہ جو غیر مقاتلین جنگ
میں حصہ لیں گے انھیں وہ حقوق حاصل نہ رہیں گے جو غیر مقاتلین کے لئے مخصوص ہیں لیکن اسلام
اس سے متفق نہیں ہے کہ ان کو مقاتلین کے حقوق بھی نہ دیئے جائیں، وہ ہر اس شخص کو جو مقاتلہ کے
مقاتلین کے حقوق دیتا ہے، البتہ ایسی حالت میں وہ ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا جب کہ
وہ مقاتلہ کے ساتھ غدر اور دغا بھی کرتے ہوں مثلاً کوئی عورت اگر خفیہ طریقہ سے مسلمانوں کے پانی
میں زہر ملائے تو وہ یقیناً قتل کی جائے گی، یا کوئی شخص مسلمانوں کی پناہ میں آکر انھیں دھوکہ سے
نقصان پہونچائے تو اس پر ہرگز رحم نہ کیا جائے گا، قبائل عکل و عرینہ کے لوگوں نے یہی کیا تھا کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ میں آکر رہے اور دھوکہ سے آپ کے چرواہے کو قتل کرکے اونٹ
ہانک لے گئے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مقاتلین و غیر مقاتلین دونوں کے حقوق سے
محروم کردیا، اور انھیں ڈاکو اور رہزن قرار دیکر سخت عبرتناک سزا دی،

غیر مقاتلین کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ جب دشمن کی فوج ان کے علاقہ سے گذر رہی ہو، اور ان سے
رہنمائی کا مطالبہ کرے تو وہ اس کو صحیح راستہ بتائیں، اگر وہ وسائل حمل و نقل طلب کرے تو وہ نفس
کی خدمت کے لئے دیدیں، اور اس کے جنگی اعمال میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں، اس کے خلاف عمل کی
صورت میں حملہ آور فوج کو سخت سزا دینے کا حق حاصل ہے[2]

اس مسئلہ میں اسلامی اور مغربی قوانین متفق ہیں،

غیر مقاتلین کی عصمت ان فرائض کے مقابلہ میں غیر مقاتلین کا ایک بنیادی حق یہ ہے کہ
ان کو جنگ میں قتل و غارت سے محفوظ رہنا چاہیئے، اگرچہ حالت جنگ میں بعض اوقات ان کا بھی
ان کی زد میں آجانا ناگزیر ہے، مثلاً ایک جنگی مقام پر گولہ باری ہو رہی ہو، اور وہیں عورتیں اور
بھی ہوں تو ان کا بچنا غیر ممکن ہوگا، یا مثلاً ایک ریل گاڑی میں مقاتلین اور غیر مقاتلین سفر کر رہے ہوں

---

[1] Lawrence p 345

دشمن پر آپڑے تو وہ محاصرہ کچھ غیر مقاتلین بھی مارے جائیں گے لیکن اس طرح نادانستہ اور اضطراری جنگ کی زد میں آجانے سے ان کی صیانت کے بنیادی اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا، قانون کی رو سے حملہ آور فوج کا یہ فرض ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنی جنگی کارروائیوں کا رخ غیر مقاتلین کی طرف نہ پھیر دے، اور جہاں تک ممکن ہو ان کو بچانے کی کوشش کرے[1]،

اس معاملہ میں بھی اسلامی قانون اور مغربی قانون باہم متفق ہیں، اسلامی قانون نے غیر مقاتلین پر محض دانستہ حملہ کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی رہی یہ صورت کہ جنگی اعمال کے دوران میں نادانستہ ان پر بھی ضرب لگ جائے، سو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، چنانچہ طائف کے محاصرہ میں جب دبابہ اور منجنیق وغیرہ قلعہ شکن آلات استعمال کئے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی سنگ باری سے شہر کے غیر اہل قتال کو بھی نقصان پہونچنا ممکن ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنا پر ان کے استعمال کو جائز رکھا، کہ اس کا اصل مقصد تحصیل توڑنا تھا، غیر مقاتلین کو ہدف بنانا مقصود نہ تھا،

غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری، غیر مقاتلین کا حق مامونیت تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق جنگ میں کس طرح ملحوظ رکھا جائے؟ اس مسئلہ میں جنگی اور قانونی گروہوں کے درمیان بہت بڑا اختلاف ہے، اور اب خود قانونی گروہ کی رائے بھی جنگی گروہ کی رائے سے مغلوب ہوتی جارہی ہے، اگر لڑائی دست بدست ہو، یا دو مقابل فوجوں کے درمیان ہو تو غیر مقاتلین کو تلوار کی زد سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے، لیکن جہاں میلوں کے فاصلہ سے گولہ باری ہو رہی ہو، اور خصوصیت کے ساتھ جہاں غنیم کے کسی شہر کو فتح کرنا مقصود ہو، وہاں غیر مقاتلین کو ہلاک جنگ سے محفوظ رکھنے کی کیا صورت ہے؟ اس سوال کا جواب قانونی گروہ یہ دیتا ہے کہ گولہ باری کے حق پر قیود عاید کرنی چاہئیں، اور جنگی گروہ کہتا ہے، کہ کسی قسم کے قیود عاید نہ کرنی چاہئیں، انیسویں صدی کے وسط میں ان کی حفاظت کا یہ طریقہ وضع کیا گیا تھا کہ گولہ باری سے قبل غیر مقاتلین کو مہلت دینی چاہئے کہ وہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں، ۱۸۷۰ء کی جنگ میں جرمنی نے ایک دو مقامات پر اس تجویز کی تعمیل بھی کی، مگر بعد میں فوجی گروہ نے بالاتفاق فیصلہ کیا، کہ اس قسم کی مہلت دینا جنگی مصالح کے بالکل خلاف ہے، چنانچہ جب جرمن فوجوں نے پیرس پر گولہ باری کی شروع کی، تو غیر مقاتلین کو نکلنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ بالفاظ صریح یہ کہہ دیا کہ اس موقع پر شہر میں غیر مقاتلین کا

[1] Lawrence P. 345

موجود رہنا ہی مطلوب ہے، تاکہ غنیم فاقہ کی مصیبت میں مبتلا ہو کر شہر کو ہمارے حوالہ کر دے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد امیر البحر اوبے (M. le. Comte Amiira Aube) کا وہ مشہور مضمون شائع ہوا جس نے فوجی گروہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس نے جنگ میں غنیم کے وسائل ثروت کو برباد کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا، اور یہاں تک لکھدیا کہ:۔

"آئندہ جنگ میں ہمیں توقع رکھنی چاہیئے کہ مسلح بیڑے اپنی قوت تخریب کا رخ ساحلی شہروں کی طرف پھیر دیں گے، خواہ وہ شہر قلعہ بند ہوں یا نہ ہوں خواہ وہ دسائل مدافعت رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، وہ ان کو جلائیں گے، تباہ کریں گے اور کم از کم اتنا ضرور کریں گے کہ پوری بے دردی سے ان سے فدیہ وصول کریں گے"

اس کے چند سال بعد ۱۸۸۸ء میں انگلستان کے بحری بیڑے کی مصنوعی جنگ ہوئی جس میں منجملہ اور کارروائیوں کے ایک یہ بھی تھی کہ ساحلی آبادیوں پر حملے کئے گئے، اور ان سے فدیہ وصول کیا گیا، اس پر پروفیسر ہالینڈ نے سخت اعتراض کیا، اور لندن ٹائمز میں مسلسل مضامین لکھے جس سے یہ سوال پھر چھڑ گیا کہ آیا شہری آبادیوں پر گولہ باری کرنی جائز ہے یا نہیں؟ قانونی گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ فعل ناجائز ہے، مگر امارت بحریہ کے اعلیٰ افسروں نے اس کو بالکل جائز قرار دیا اور ۱۸۹۰ء میں امیر البحروں کی ایک کمیٹی نے بالاتفاق اس کے حق میں رپوٹ کی[1]

۱۸۹۹ء میں جب پہلی ہیگ کانفرنس منعقد ہوئی تو یہ مسئلہ از سر نو پیش ہوا۔ اس وقت کانفرنس پر قانونی گروہ کا غلبہ تھا، اور جنگی گروہ بھی سلطنتوں کے سیاسی مصالح کا لحاظ کر کے خاموش ہو گیا تھا، اس لئے بری جنگ کے ضوابط میں گولہ باری کے حق پر قیود عاید کی گئیں۔ اور ۱۹۰۷ء کی کانفرنس میں بحری جنگ پر بھی ان قیود کو وسیع کر دیا گیا۔ یہ قیود حسب ذیل ہیں:۔

"ایسے شہروں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر گولہ باری کرنا یا کسی دوسرے ذریعہ سے حملہ کرنا ممنوع ہے، جو غیر محفوظ ہوں (ضوابط ہیگ، دفعہ ۲۵)

ایک حملہ آور فوج کے امیر پر لازم ہے، کہ گولہ باری شروع کرنے وقت مخصوص

---

[1] Revue des Deux Mondes 1892 PP. 314-46

[2] Birkenhead, International Law P. 228

آبادی کے حکام کو متنبہ کر دینے کے وہ تمام ذرائع استعمال کرے جو اس کے اختیار میں ہوں، الا اس صورت میں کہ فوری حملہ ناگزیر ہو (دفعہ ۲۶)

گولہ باری اور قلعہ گیری کے موقع پر تمام ممکن طریقوں سے ایسی عمارتوں کو جو مذہبی یا علوم و فنون یا خیراتی اغراض کے لئے وقف کی ہوئی ہوں، اور تاریخی یادگاروں، ہسپتالوں اور ایسے مقامات کو جہاں زخمی اور بیمار رکھے گئے ہوں، بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے، بشرطیکہ وہ عمارات اس وقت جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیجا رہی ہوں (دفعہ ۲۷)

اسی طرح بحری جنگ کے قوانین کے متعلق دوسری ہیگ کانفرنس کی مفاہمت نمبر ۹ میں گولہ و قلعہ گیری پر حسب ذیل قیود عائد کی گئیں :-

دفعہ اوّل، غیر محفوظ شہروں، بندرگاہوں، قریوں، بستیوں، اور عمارتوں پر قوائے بحریہ کا گولہ باری کرنا ممنوع ہے، کسی بندرگاہ پر صرف اس وجہ سے گولہ باری نہیں کیجا سکتی کہ اس کے پاس خود بخود تصادم سے پھٹنے والی تحت البحر سرنگیں (Automatic Submarine contact mines) لنگر انداز ہیں[1]،

دفعہ دوم، فوجی کارخانے، فوجی یا بحری محکمے، اسلحہ خانے، سامانِ جنگ کے گودام، ایسے کارخانے یا انجن جو غنیم کی فوج یا بیڑے کے کام آسکتے ہوں، اور بندرگاہ میں ٹھہرے ہوئے جنگی جہاز اس ممانعت میں داخل نہیں ہیں، بحری قوت کا کمانڈر ابتداءً نوٹس دینے اور کافی عرصہ انتظار کرنے کے بعد ان کو برباد کر سکتا ہے، اگر دشمن خود ان کو برباد نہ کر دے، ایسے حالات میں اگر کچھ ناگزیر نقصان پہونچے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے، اگر جنگی اسباب کی بنا پر فوری کارروائی ضروری ہو، اور دشمن کو کوئی مہلت نہ دیجا سکتی ہو تو شہر کے غیر محفوظ حصہ کی حرمت ملحوظ رکھنی چاہیئے، اور کمانڈر کو کوشش کرنی چاہیئے کہ شہر کو کم سے کم ممکن نقصان پہونچے،

[1] اس دفعہ کے آخری فقرہ سے برطانیہ، فرانس، جاپان اور جرمنی نے اختلاف کیا ہے،

دفعہ سوم، اگر مقامی حکام کسی بحری قوت کے [illegible] سامانِ رسد و ما یحتاج مہیا نہ کریں تو انکو مناسب مہلت دینے کے بعد غیر محفوظ بندرگاہ شہر، گاؤں، بستی، یا عمارت پر گولہ باری کیجا سکتی ہے،

دفعہ چہارم، مالی نذرانہ ادا کرنے کی پاداش میں کسی غیر محفوظہ مقام پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی،

دفعہ پنجم، جب کوئی بحری قوت کسی شہر پر گولہ باری شروع کرے تو اس کے کمانڈر کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو مقدس عمارات و عمارات موقوفہ برائے علوم و فنون و امور خیریہ، اور تاریخی یادگاروں و ہسپتالوں، و جہاں مریض و زخمی اور بیمار رکھے جاتے ہوں خبر نہ ہونے پائے، بشرطیکہ انہیں جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیا جا رہا ہو، اس شہر کے باشندوں کو چاہیئے کہ ان قسم کی عمارات کو ایسی مرئی علامات سے ممتاز کریں جو بڑے بڑے مستطیل اضلاع پر مشتمل ہوں و جنمیں بشکل ترددرنگ کے مثلث بنائے جائیں، اوپر کا مثلث سیاہ اور نیچے کا سفید،

دفعہ ششم، اگر فوجی حالات اجازت دیں تو گولہ باری کرنے سے قبل حملہ آور قوت کے کمانڈر کو چاہیئے کہ مقامی حکام کو متنبہ کرنے کی پوری کوشش کرے،

یہ قیود فی نفسہ نہایت ناقص ہیں، ان کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ ان میں غیر محفوظہ مقام کی کوئی تعریف و تحدید نہیں کی گئی، ان سے بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ ایک مقام کن علامات سے محفوظ قرار دیا جائیگا، اور کن چیزوں کے موجود نہ ہونے کے باعث وہ غیر محفوظ سمجھا جائے گا، دوسرا نقص یہ ہے کہ گولہ باری کرنے سے قبل اہل شہر کو متنبہ کرنے کا معاملہ کلیۃً حملہ آور فوج کے کمانڈر [illegible] ہے، یہاں تک کہ اسکو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر چاہے تو متنبہ نہ کرے، تیسرا نقص یہ ہے کہ ایک طرف تو مقدس عمارات اور علمی و تاریخی یادگاروں کی حرمت کی تاکید کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ شرط بھی لگادی گئی ہے کہ وہ جنگی اغراض کے لئے استعمال نہ کیجا رہی ہوں، اس سے ایک حملہ آور فوج کا کمانڈر ہر وقت یہ بہانہ کر سکتا ہے کہ اس کے علم میں وہ عمارات جنگی اغراض کے لئے استعمال کی جا رہی تھیں لہذا وہ ان پر گولہ باری کرنے کا مستحق تھا، لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ

ان میں حملہ آور فوج کو ایسی حالت میں غیر محفوظ آبادیوں کو تباہ کرنے کا حق دیدیا گیا ہے، جبکہ ان باشندے اس کے لئے سامانِ رسد و مایحتاج مہیا کرنے سے انکار کردیں، اس ایک بات نے ا تمام قیود کو بے معنی کردیا ہے، کیونکہ ایک حملہ آور فوج کے لئے یہ بالکل آسان ہے کہ جب وہ کسی محفوظ" آبادی پر حملہ کرنا چاہے تو اس سے اتنا سامانِ رسد طلب کرے جسے وہ کسی حال میں ادا کرسکتی ہو اور جب وہ ادا نہ کرے تو اس پر گولہ باری شروع کردے، اگرچہ مفاہمت نمبر ۹ کی دفعہ سو کے دوسرے فقرے میں یہ توضیح بھی کردی گئی ہے کہ سامانِ رسد کا مطالبہ اس مقام کے وسائل کی مناسبت سے ہونا چاہئے، مگر سوال یہ ہے کہ مقامی وسائل کی "مناسبت" کا فیصلہ کون کریگا؟ اگر حملہ آور فوج کی رائے میں ایک خاص مقدار کا مطالبہ اس مقام کے لئے مناسب ہو اور مقامی حکام کے نزدیک وہ مناسب نہ ہو تو ایسی صورت میں کون سی عدالت یہ فیصلہ کرنے آئے گی کہ فریقین میں کس کا قول صحیح ہے؟

لیکن ان نقائص کے باوجود فوجی گروہ نے ان قیود سے علانیہ اختلاف کیا ہے، گولہ باری سے قبل دشمن کو متنبہ کرنے اور مہلت دینے کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ایسا کرنا "قیمتی وقت کو کھودینے کا ہم معنی ہے[1]"، سامانِ رسد کا مطالبہ مقامی وسائل کی مناسبت ملحوظ رکھکر کرنے کی جو شرط لگائی گئی ہے، اس کے متعلق یہ گروہ کہتا ہے کہ وہ "نظری حیثیت سے بہت خوب ہے، مگر اس پر عمل کرنا ناممکن ہے[2]"، سب سے زیادہ یہ کہ اس گروہ کے نزدیک گولہ باری کے موقع پر غیر مقاتلین کی رعایت کرنا صرف یہی نہیں کہ غیر ضروری ہے، بلکہ انکو خاص طور پر ہدف بنانا جنگی مصالح کے عین مطابق ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ:-

"گولہ باری کے وقت محصورین میں عورتوں، بچوں، اور دوسرے غیر مقاتلین کا موجود ہونا ہی جنگی نقطۂ نظر سے مطلوب ہے، کیونکہ صرف اسی صورت سے معاصر فوج محصورین کو خوف زدہ کرکے تسلیم پر جلد سے جلد مجبور کرسکتی ہے[3]"

یہ خیالات صرف زبان و قلم ہی سے ظاہر نہیں کئے گئے بلکہ عمل میں بھی ہیگ کانفرنس

---

[1] Kriegsbranch, P. 62 [2] Kriegsbranch, P. 19
[3] Kriegsbranch P. 21

کی مقرر کردہ قیود کا تار و پود بکھیر دیا گیا، ۱۹۰۰ء کی ہیگ کانفرنس کے بعد یورپ میں پہلی جنگ اٹلی اور ترکی کے درمیان ہوئی، اور اس میں اٹلی نے شہر بیروت پر گولہ باری کرکے غیر محفوظ شہری آبادی کے ایک حصہ کو تباہ کر دیا، اس کے بعد دوسری جنگ دول متحدہ بلقان اور ترکی کے درمیان ہوئی تو اور تھریس و مقدونیہ میں غیر مقاتلین کو علانیہ قتل و غارت کیا گیا۔ انہا مغربی تھریس کے متعلق تحقیق ہوا ہے کہ وہاں ..... ۲۴ مسلمان غیر مقاتلین تلوار کے گھاٹ اتارے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے درمیان جنگ عظیم برپا ہوئی تو یہ تمام قیود بے طرح توڑ دی گئیں گویا کہ وہ قایم ہی نہیں ہوئی تھیں۔ برکن ہیڈ اپنی کتاب بین الاقوامی قانون میں لکھتا ہے کہ:-

"جنگِ عظیم سے قبل محفوظ اور غیر محفوظ آبادیوں کے درمیان جو امتیاز قایم کیا گیا تھا جنگِ عظیم نے اس کا تار و پود بکھیر دیا ہے، اب سرے سے محفوظ و غیر محفوظ کی تعریف و تحدید ہی میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اور جنگ کے بعد سے آج تک ان کے درمیان حد بندی و نشانِ امتیاز قایم کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی ہے[۲]"

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہیگ کی قیود کو مٹانے میں حصہ لیا ہے وہ ہوائی جہازوں کا جنگی استعمال ہے، ہوائی جہاز دراصل اس معنی میں کوئی آلہ جنگ ہی نہیں ہے جو جنگ کے مقصد کی طرف کوئی اقدام ہوتا ہو، جنگ کا اصلی مقصد غنیم کی فوجی قوت کو توڑنا اور غنیم کے علاقہ سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کر لینا ہے، لیکن ہوائی جہاز یہ دونوں کام نہیں کر سکتا۔ البتہ وہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ فضائے آسمانی سے عام آبادیوں پر بلا امتیاز گولے برسائے، عورتوں، بچوں، بیماروں اور بے ضرر رعایا سمیت سب کو برباد کر دے، شہروں اور قصبوں کو بم برسا کر تہس نہس کر دے، اور دشمن قوم کے عوام کو اس حد تک خوف زدہ اور پریشان کر دے کہ وہ جنگ سے جی چرانے لگیں۔ اور اس طرح اپنے دشمن کی معنوی قوت توڑ دے، جنگِ عظیم سے قبل قانونی گروہ اس طریق جنگ کو حرام و ناجائز سمجھتا تھا، جب

---

[۱] "بمبئی کرانیکل" مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۲۲ء میں مسٹر جھنڈ کے مقالہ کا خلاصہ

[۲] Birkenhead. P. 226

میں جب یہ ایک عام اور معمول بہ طریق جنگ بن گیا، تو خود قانونی گروہ کے نقطۂ نظر میں بھی تغیر واقع ہوگیا۔ اور وہ اس کو ایک ناگزیر طریقہ سمجھنے لگا، چنانچہ ایلنز باخر اپنی کتاب (Von Landes Bender, Völkerrecht) میں لکھتا ہے کہ:-

"جنگی کارروائی کی بہت سی اقسام ایسی ہیں، جو صرف اس بنا پر جائز ہیں کہ ان کا مدعا غنیم کی قوت جنگ کی معنوی بنیاد کو پراگندہ کرنا ہوتا ہے، (غیر محفوظ مقامات شہروں پر گولہ باری بھی اسی قسم کی جائز کارروائیوں میں سے ہے، کیونکہ اس سے غنیم کی اقتصادی زندگی پریشان ہوجاتی ہے، اور اس کے علاوہ دشمن کی رعایا میں ایک خاص قسم کی خوف زدگی پیدا ہوجاتی ہے)..... اسی دلیل کی بنا پر ہوائی جہازوں سے بم گرانے پر بھی کوئی پابندی عائد نہ ہونی چاہیئے، ان حملوں کے مسئلہ میں مستحکم یا محفوظ مقامات اور غیر مستحکم یا غیر محفوظ مقامات کے درمیان کوئی امتیاز قائم کرنا بے سود ہے، کیونکہ اکثر حالات میں کسی مقام پر بم اس لئے نہیں گرائے جاتے کہ اسے فتح کیا جائے، بلکہ ان سے محض دشمن کی اقتصادی زندگی کو پراگندہ کرنا، اور دشمن قوم میں ہراس اور جنگ سے بیزاری پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، اور یہ مقصد انھیں گولوں سے حاصل ہوتا ہے جو غیر مستحکم مقامات پر گرائے جاتے ہیں[1]"

جنگِ عظیم کے بعد خاص طور پر ہوائی جہازوں کی گولہ باری کے لئے حدود مقرر کرنے کا سوال پیدا ہوا، اور یورپ و امریکہ کی رائے عام نے زور دیا کہ اس کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے جائیں، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کانفرنس نے اس غرض کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، بالینڈ، جاپان اور امریکہ کے نمایندے شامل تھے، انھوں نے بہت کچھ غور و خوض کے بعد ۱۹۲۳ء میں چند سفارشات پیش کیں جنکا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) ہوائی جہازوں سے گولہ باری کرنا صرف اس صورت سے جائز ہے کہ ان کے ہدف فوجی مقامات ہوں، فوجی مقامات سے مراد ہیں، قواے حرب، جنگی کارخانے، جنگی گودام، جنگی محکمے اور عملے، آلات و ادوات جنگ بنانے والے کارخانے، خطوط

[1] Von Landes Bender, Völkerrecht

دریا میں ہوں جو بھی اعتراض کے لئے مستعمل ہوں۔

(۲) ان فوجی مقامات پر بھی ایسی حالت میں گولہ باری نہیں کرنی چاہیے جبکہ وہ ایسی جا وقوع میں ہوں جہاں شہری آبادی کو نقصان پہونچائے بغیر ان پر ضرب نہ لگائی جا سکتی ہو،

(۳) ایسی بستیاں اور عمارتیں جو عین علاقۂ جنگ میں واقع ہوں، اور جن کے متعلق یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہو، کہ ان میں اجتماعِ افواج ہوا ہے، ہوائی گولہ باری کیلئے جائز ہدف بن سکتی ہیں، مگر علاقۂ جنگ سے باہر کسی آبادی پر گولہ باری نہیں کی جا سکتی اس لحاظ سے ہر وہ گولہ باری جس کا مقصد شہری آبادیوں کو پریشان کرنا اور شخصی املاک کو برباد کرنا ہو، ممنوع ہے،

(۴) جو ہوائی جہاز راں آلۂ ہبوط (Parachute) کے ذریعہ جان بچا رہا ہو اس پر حملہ کرنا ممنوع ہے[۱]۔

مگر یہ قوانین اب تک محض زیبِ قرطاس ہی ہیں کسی سلطنت نے ان کو قبول کر کے اپنی کتابِ آئین میں داخل نہیں کیا ہے[۲] اور صرف یہی نہیں بلکہ ابھی یہ بھی مشکوک ہے کہ جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے، یا نہیں؟ چنانچہ برکن ہیڈ لکھتا ہے:-

"ان مجوزہ قوانین پر جن کا مقصد ہوائی گولہ باری کو منضبط کرنا ہے ان کی فیاضانہ روح کے باعث بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے، یہ بات نہایت مشکوک ہے کہ اگر ان کو منظور کر لیا جائے تو آیا کسی ایسی جنگ میں ان کی پابندی کی بھی جا سکتی ہے جسمیں اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہوائی قوتیں استعمال کی جائیں جسکا تصور ۱۹۱۸ء کے خاتمہ پر کیا جا سکتا تھا"[۳]۔

اس مفصل بحث سے یہ بالکل صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ موجودہ قانون جنگ میں محفوظ و غیر محفوظ آبادیوں کا جو امتیاز قایم کیا گیا ہے، وہ غیر محفوظ آبادیوں کے لئے جو حقوق مقرر کئے ہیں

[۱] Birkenhead P. 226-227 [۲] Birkenhead P. 225

[۳] Birkenhead, P. 227

وہ محض ایک فریب نظر ہیں، اور عملاً مغربی قانون اپنے دامن میں اس ایک نظریہ سے زیادہ کوئی تر
نہیں رکھتا کہ "غیر مقاتلین کی جان و مال قابلِ احترام ہے"، رہا اس کا حقیقی احترام، تو وہ آج اسی قدر مفقو
ہے، جس قدر گروشیوس کے زمانہ میں تھا،

عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کا حکم غیر مقاتلین کے حقوق کی بحث میں ایک دوسرا اہم سوال یہ ہے
کہ جب کوئی شہر پوری طرح مقابلہ کرنے کے بعد بزورِ شمشیر فتح ہو تو اس کے باشندوں کے ساتھ کیا سلو
کیا جائیگا، قدیم زمانہ میں ایک فوج کا یہ قدرتی حق تھا، کہ جس شہر کو وہ عنوۃً فتح کرے اسکے باشندوں کو
تہ تیغ کردے، یورپ میں بھی زمانۂ قریب تک یہ دستور موجود تھا، چنانچہ اسپین کے خلاف متحدہ نیدرلینڈس
(United Netherlands) کی بغاوت اور اس کے بعد تک آنے والی مذہبی لڑائیوں
میں فریقین نہایت آزادی سے ایک دوسرے کے شہروں میں گھس کر قتل عام کرتے تھے، اگرچہ جنگ
سی سالہ کے بعد اس فعل کو یورپ کے ضمیر نے ظلم سے تعبیر کرنا شروع کردیا تھا، لیکن انیسویں صدی کے
وسط تک وہ ممنوع نہ تھا، چنانچہ ڈیوک آف ولنگٹن کی رائے میں کسی شہر کے محافظین اگر عنوۃً مغلوب
ہوں تو انھیں امان کا حق نہ تھا، جنگ جزیرہ نما میں فرانس نے متعدد مرتبہ محصور شہر کے لوگوں کو دھمکی
کہ اگر انھوں نے مزاحمت جاری رکھی، تو ان کا قتل عام کیا جائے گا، چنانچہ کیوڈاڈ روڈریگو (Ciudad Rodrigo
اور باڈاجوس (Badajoz) اور سان سباستیان (San Sebastian) کی فتح کے بعد فی الواقع فرانسیسی فوجوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا، ۱۷۹۹ء
کی جنگ ترکیہ و روس میں جب روسی فوجیں اسمٰعیل میں داخل ہوئیں، تو انھوں نے بھی مقاتلین و
غیر مقاتلین سب کو تلوار کے گھاٹ اتارا، ۱۸۳۰ء میں جب فرانس نے الجزائر کا دارالحکومت
قسطنطینہ فتح کیا تو تین دن تک اسکی فوجیں قتل و غارت میں مشغول رہیں، ۱۸۵۷ء میں جب انگریزی
فوجوں نے دلی فتح کیا تو آزادی کے ساتھ شہر میں قتل عام کیا، اور مفتوح شاہی خاندان کے افرا
کا بھی احترام ملحوظ نہ رکھا، اس زمانہ تک یورپ میں کوئی ایسا قانون نہیں تھا، جسمیں اس فعل کو
ممنوع قرار دیا گیا ہو، ۱۸۷۴ء کی بروسلز کانفرنس نے بیشک یہ قرار دیا تھا کہ کسی کو فتح کرنیکے بع

Bernard, growth of the Despatches and Serial
laws of war P. 111, Note 1898-99

فوجوں کو لوٹ مار کے لئے آزاد نہیں چھوڑنا چاہئے، مگر جیسا کہ معلوم ہے، اس کا فرانس کے مقرر کردہ قوانین کی کسی سلطنت نے توثیق نہیں کی، اس لئے اس کو دول یورپ کی کتاب آئین میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہی نہیں ہوا، پس یورپ میں پہلی مرتبہ اس فعل کو جس نے ممنوع قرار پایا ۱۹۱۴ء کے عظیم جنگ میں جنکی دفعہ ۴۶ عنوۃً فتح ہونے والے شہروں کو لوٹنے اور غارت کرنے کی ممانعت کرتی ہے، گو یہ عمل اب بھی یہ طریقہ بند نہیں ہوا ہے، چنانچہ ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء میں یورپ کی مہذب ترین سلطنتوں کے زیر کمان یونانی فوجوں نے سمرنا اور تھریس میں داخل ہو کر غیر مقاتل شہری آبادیوں کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا، وہ ثابت کرتا ہے کہ بیسویں صدی کے عہد تہذیب میں بھی عہد وحشت کی یہ یادگار ابھی تک باقی ہے، تاہم جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے، اہل یورپ کو آج سے صرف ۳۰ سال قبل فاتحانہ داخلہ کا وہ مہذب طریقہ دریافت کرنے کی توفیق ہوئی ہے، جسے آج سے ۱۳۴۰ سال قبل رسول عربی افضل البشر نے فتح مکہ کے موقع پر پیش کیا تھا،

احتلال اور اس کے قوانین

احتلال ایک جدید اصطلاح ہے، اور اس کا تخیل بھی جدید ہے، عہد قدیم میں تو جب ایک سلطنت کسی ملک پر قابض ہو جاتی تھی، تو وہ ملک اس کی جائز ملک ہو جاتا تھا، اسلامی قانون میں بھی کسی ملک کا مفتوح ہو جانا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دار الاسلام بنگیا، اور اسکی رعایا کو ذمیوں کے حقوق حاصل ہو گئے، لیکن جدید بین الملی قانون کی رو سے ایک ملک کا غنیم کے تصرف میں آجانا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ باضابطہ اسکی سیادت میں آگیا، بلکہ جس وقت تک حکومت سابقہ سے باقاعدہ صلحنامہ ہو کر اس کے حقوق ملکیت فاتح کو منتقل نہ ہو جائیں، اس وقت تک وہ صرف اس کے انتظام میں رہتا ہے، اور اس کو اصطلاح میں [illegible] سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس احتلال کے تحت جو علاقہ واقع ہوتا ہے اس کے باشندے، نہ تو عملاً اپنی سابقہ حکومت کی رعیت ہوتے ہیں، نہ اصولاً اپنی موجودہ حکومت کی رعایا بنتے ہیں، بلکہ وہ ایک غیر قانونی فوجی حکومت کے تحت مغلوب و مقہور قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرتے ہیں، ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۰ء کے ضوابط ہیگ نے اس مقہوریت کی حدود مقرر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے، اور نہ یہ طے کیا ہے کہ حکومت محتلہ اپنے حاکمانہ اختیارات کس حد تک [illegible] پر وسیع کر سکتی ہے، اور کس حد تک نہیں کر سکتی، البتہ اس نے چند قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ علاقہ محتلہ میں

حکومت و رہاشندوں کے حقوق و فرائض کیا ہیں، ذیل میں ہم ان قوانین کو نقل کرتے ہیں:۔

(۱) جبکہ لشکرِ احتلال کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات باقاعدہ منتقل ہو جائیں تو وہ اپنے تمام ممکن وسائل سے امن عام کو محفوظ رکھنے اور قایم کرنے کی کوشش کریگا اور حتی الامکان ان قوانین کو ملحوظ رکھے گا، جو اس ملک میں پہلے سے نافذ ہونگے"

(دفعہ ۴۳)

یہ دفعہ حکومتِ احتلال کے لئے صرف ایک عام پالیسی وضع کرتی ہے، اور در اصل ایک بے معنی دفعہ ہے، سابقہ قوانین کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کے لئے "حتی الامکان" کی جو حد اس نے مقر کی ہے، وہ بالکل مبہم ہے، اور اس سے حکومت احتلال کو اختیار حاصل ہو جاتا ہے، کہ وہ علاقہ محتلہ میں بالکل اسی طرح اپنے قوانین نافذ کرے جس طرح باضابطہ سیادت قایم ہونے کی صورت میں وہ کرے گی، کیونکہ وہ بآسانی کہہ سکتی ہے، کہ سابقہ قوانین برقرار رکھنا ہی اس کے "امکان" میں نہیں ہے، پس اس دفعہ سے احتلال، اور باضابطہ سیادت میں بہت کم فرق باقی رہجاتا ہے

(۲) ایک محاربِ فریق کے لئے ممنوع ہے کہ اپنے زیر احتلال علاقہ کے باشندوں کو دوسرے فریق کی فوج یا اس کے ذرایع و وسائل کے متعلق معلومات بہم پہونچانے پر مجبور کرے" (دفعہ ۴۴)

اس دفعہ کو جرمنی، جاپان، روس، اور اسٹریا ہنگری نے اسی وقت مسترد کر دیا تھا فوجی گروہ کو اس پر سخت اعتراض ہے کیونکہ وہ جنگی مصالح کے لئے اپنے وسائل استخبار پر کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لئے طیار نہیں ہے، جرمنی کی "کتابِ جنگ" میں اس پر جو تنقید کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ایک ملک کے باشندوں کو خود اپنی قومی فوج، اسکی جنگی حرکات، اس کے وسائل اور اس کے فوجی اسرار کے متعلق معلومات بہم پہونچانے پر مجبور کرنا یقیناً ایک نہایت سخت کارروائی ہے، اس قسم کی کارروائی کو تمام قوموں کے مصنفین کی ایک بڑی اکثریت قابلِ ملامت قرار دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی جنگی

قانون ہمیشہ اس سے احتراز کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتا۔ بیشک وہ جب کبھی اس پر عمل کرے تو افسوس کے ساتھ کرے گا، مگر جنگ کی دلیل بسا اوقات اس کو اس ذریعہ سے استفادہ کرنے پر مجبور کر دیگی۔[1]

آگے چل کر پھر لکھا ہے:-

"ایک شخص کو خود اپنے ملک کی ضرر رسانی اور خود اپنی قومی فوج کی شکست میں آسانی پیدا کرنے پر مجبور کرنا، انسانی حیات کے لئے خواہ کتنا ہی تکلیف دہ ہو مگر کوئی محارب فوج، جو غنیم کے ملک میں پڑی ہوئی ہو، اس ذریعہ استنجار سے اجتناب نہیں کر سکتی۔[2]"

یہ خیالات صرف جرمن محکمۂ جنگ ہی کے لیے نہیں ہیں بلکہ تمام یورپ کا فوجی لٹریچر یہی رکھتا ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے آج تک کسی جنگ میں ضوابط ہیگ کی دفعہ ۲۳ پر عمل درآمد نہیں کیا گیا،

(۳) ایک محارب سلطنت کے لئے ممنوع ہے کہ وہ اپنے دشمن کی رعایا کو خود اس کی اپنی قوم کے خلاف جنگی اعمال میں حصہ لینے پر مجبور کرے خواہ وہ جنگ سے قبل اس کے ملازم ہی کیوں نہ رہ چکے ہوں" (دفعہ ۲۳)

پروفیسر مارگن کے بقول یہ دفعہ صرف ایک "عمومی بیان اصول" ہی کی حیثیت رکھتی ہے اور جزئیات و تفصیلات میں حکومتوں کو خود یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیتی ہے کہ جس طرح چاہیں پالیسی وضع کریں[3] اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں حکومتوں کو یا دراصل ان کی فوجوں کو آزادی عمل دیدی جائے وہاں اس قسم کا "عمومی بیان اصول" بالکل بیکار ثابت ہوتا ہے، اور فوجیں وہی عمل کرتی ہیں جو جنگی ضروریات کے لحاظ سے وہ اپنے لئے ضروری سمجھتی ہیں، چنانچہ جنگ عظیم میں اس آزادی عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا اور محارب سلطنتوں نے ایک دوسرے کی رعایا کو نہ صرف مواصلات ہی میں کام کرنے پر مجبور نہیں کیا بلکہ خندقیں کھودنے اور فوجوں کے عقب میں سامان

[1] Hegatranch P. 48

[2] Wariis Conduct and legal results

[3]

شیہ رہنے کا کام بھی بزور سنگین لے لیتی۔

(۴) علاقۂ مفتحہ کے باشندوں کو دشمن سلطنت کی وفاداری کا حلف اٹھانے پر مجبور کرنا ممنوع ہے (دفعہ ۴۵)

(۵) خاندانی اعزاز و حقوق، اور جان و مال اور مذہبی عقائد کا احترام ملحوظ رکھنا لازمی ہے، اور شخصی املاک کو ضبط کرنا ممنوع ہے (دفعہ ۴۶)

(۶) غارت گری حسب ضابطہ ممنوع ہے، (دفعہ ۴۷)

یہ تینوں دفعات ایک "عمومی بیانِ اصول" کی حیثیت رکھتی ہیں، اور درحقیقت ان کی تشریعی قیمت نہیں ہے۔

(۷) اگر علاقۂ مفتحہ میں حکومتِ احتلال وہ محصولات و واجبات اور محاصل راہداری وصول کرے جو حکومت کے نفع کے لئے عائد کئے جاتے ہیں، تو اسکو حتی الامکان وہاں کے رائج الوقت قواعد تشخیص اور شرح کے مطابق ایسا کرنا چاہئے، نیز علاقۂ مفتحہ کے نظام حکومت کا خرچ اسی پیمانہ پر ادا کرنا اسکا فرض ہے، جو وہاں کی جائز حکومت ادا کرتی تھی۔ (دفعہ ۴۸)

(۸) اگر ان محصولات کے علاوہ حکومتِ احتلال علاقۂ مفتحہ کے باشندوں پر کچھ اور مالی نذرانوں کا بوجھ ڈالے تو یہ صرف فوج یا اس علاقہ کے نظم و نسق کے لئے ہونا چاہیے (دفعہ ۴۹)

(۹) کسی نذرانہ کی تحصیل ایک تحریری حکم کے بغیر نہیں کیجا سکتی، جو ایک کمانڈر انچیف کی ذمہ داری پر جاری کیا گیا ہو، اس قسم کے نذرانے صرف اس صورت سے وصول کئے جا سکتے ہیں کہ وہ اس ملک کے قواعد تشخیص و شرح محصولات کے مطابق ہوں، ہر ایسے نذرانے کے لئے ایک باقاعدہ رسید دیجانی چاہیے (دفعہ ۵۱)

(۱۰) میونسپلٹیوں اور عام باشندوں سے عملی خدمات یا اجناس کی شکل میں

Birkenhead, P. 225

رسد طلب نہیں کیجا سکتی، سوائے اس کے کہ فوج احتلال کے لئے اسکی ضرورت
ہو، یہ مطالبہ ملک کے وسائل کی نسبت سے متناسب ہونا چاہیے، اور وہ
اس نوع کا نہ ہونا چاہیئے کہ اسکو پورا کرنا اس ملک کے باشندوں کے خود
اپنے وطن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کا ہم معنی ہو، جہانتک ممکن ہو ایسے نذرانوں کی نقد قیمت وصول کرنی چاہیئے
اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایک رسید دینی چاہیئے اور بعد میں جسقدر جلد ممکن ہو یہ رقم ادا کر دینی چاہیئے۔ (دفعہ ۵۲)
(۱۱) ایک فوج احتلال صرف ان املاک پر قبضہ کر سکتی ہے جو دشمن ریاست
سے تعلق رکھتی ہوں، اور جنگی اغراض کے لئے استعمال کی جا سکتی ہوں، البتہ
تمام آلات و ادوات جو خشکی یا تری یا ہوا میں خبر رسانی یا نقل و حرکت کے لئے
استعمال کیجاتی ہوں، اور تمام اسلحہ خانے اور سامان جنگ کے گو وہ خود وہ
شخصی ملک ہی کیوں نہ ہوں، بے تکلف ضبط کئے جا سکتے ہیں، مگر صلح ہونے
کے بعد انھیں واپس کر دینا ضروری ہے۔ (دفعہ ۵۳)

ان تمام دفعات میں حکومت احتلال کے حقوق قبض و تصرف اور استثمار و استغلال
پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور علاقہ محتلہ کے باشندوں کو جہاں تک فوجی
دست برد سے محفوظ کر دیا گیا ہے، لیکن فوجی گروہ بالاتفاق ان تمام قیود کو قبول کرنے سے انکار
کرتا ہے، اور اپنی جنگی ضروریات کے مطابق مفتوح علاقہ سے تمام ممکن فوائد حاصل کرنے
پر مصر ہے، اس گروہ کے خیال کی ترجمانی جرمنی کی "کتاب جنگ" میں اس طرح کی گئی ہے:

"جنگی ضرورت کے موقع پر ہر قسم کی ضبطی، ہر قسم کی مستقل یا عارضی استحصال، ہر قسم
کا استعمال، ہر قسم کی ضرر رسانی اور تخریب جائز ہے"[1]

ملک کے وسائل اور اس کی قوت برداشت کو ملحوظ رکھنے کے متعلق اس کی رائے
یہ ہے کہ:-

"یہ تناسب کا نظریہ بس نظریہ کی حیثیت سے تو بہت خوب ہے، مگر اسکو
عمل میں لانا بہت مشکل بلکہ محال ہے"[2]

---

[1] Kriegs Brauch P. 53 [2] [illegible] 52

اس معاملہ میں کلاؤسوٹز (Clausewitz) کی رائے جنگی گروہ میں بہت مقبول ہے، وہ فوجوں کی ضروریات کے لئے ہر ایسی چیز کو بے چون وچرا استعمال کرنا جائز رکھتا ہے، جو مفتوح ملک میں ہاتھ آئے، اور اس کے لئے صرف مقامی حکام پر دباؤ ڈالنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ عام آبادی کو خوف زدہ کرکے اسے ہر مطلوب چیز حوالہ کر دینے پر مجبور کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے:-

"اس وسیلۂ استغلال کی کوئی حد نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مفتوح ملک بالکل مفلس اور قلاش ہو جائے، اور اس میں ایک حبہ ادا کرنے کی بھی قوت نہ رہے[1]"

یہاں بھی فوجی گروہ کی رائے حسب معمول قانونی گروہ کی تدابیر پر غالب آگئی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ کسی جنگ میں ہیگ کے مہذب قوانین احتلال پر عملدرآمد نہیں ہوتا،

(۱۲) کسی قسم کی عام تعزیر خواہ وہ مالی ہو یا دوسری قسم کی، ایسے اعمال پر عاید نہیں کی جا سکتی، جن کا ارتکاب پرائیویٹ اشخاص نے انفرادی طور پر کیا ہو" (دفعہ ۵۰)

جنگِ عظیم میں یہ قید بھی کالعدم ہو گئی، کیونکہ محاربین نے اپنے زیر تصرف و احتلال علاقوں میں نہایت آزادی سے پوری پوری آبادیوں پر تعزیری جرمانے عائد کئے اور ایسے مواقع پر اس طریق تنبیہ و تادیب کو اکثر استعمال کیا گیا، جبکہ خاص مجرم کا سراغ نہ مل سکا[2]،

غارت گری و تباہ کاری، سترہویں صدی تک یورپ میں عام دستور تھا کہ جب ایک فوج دشمن کے ملک میں پیش قدمی کرتی تھی، تو ہر چیز کو تباہ کرتی چلی جاتی تھی، دشمن کا حق غارت گری و تباہ کاری اس زمانہ میں غیر محدود تھا، انیسویں صدی کے وسط تک ہمیں اس حق کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے کینیڈا کے متعدد گاؤں جلا دیئے، اور اس کے جواب میں ۱۸۱۴ء میں انگریزوں نے واشنگٹن

[1] Oppenheim vol II. P. 170 [2] Vom Kriege IV. Kap 14 Pt 3

کی عمارتوں کو تباہ کیا، ۱۸۳۷ء میں فرانسیسی فوجوں نے الجزائر میں عام تباہی پھیلائی، ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوجوں نے کان پور، لکھنؤ اور دلی کے علاقوں میں آتش زنی، لوٹ مار، اور قتل و غارت کا عام بازار گرم کیا، اور جنگ کریمیا سے قبل روس اور ترکی کی صلیبی جنگیں ہوئیں، ان میں روسی فوجیں ہمیشہ ترکی علاقہ میں پیش قدمی کرتے وقت عام تباہی پھیلاتی رہیں، تاہم نظری حیثیت سے اس حق کو محدود کرنے کا تخیل سترہویں صدی میں پیدا ہو چکا تھا، چنانچہ گروشیوس نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا تھا کہ :-

"صرف اس حد تک تباہ کاری جائز ہے جس سے ایک قلیل عرصہ میں دشمن صلح کی درخواست کرنے پر مجبور ہو جائے"[1]

اس کے بعد اٹھارہویں صدی میں واٹل (Vattel) نے یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا کہ دشمن کے ملک میں عام تخریب و تباہ کاری تین صورتوں میں جائز ہے :-

۱- جبکہ ایک ظالم اور وحشی دشمن کے وحشیانہ اعمال کا سلسلہ بند کرنا مقصود ہو

۲- جبکہ اپنے سرحدی خط کو محفوظ کرنے کے لئے ایک سدِ راہ بنانی مقصود ہو،

۳- جبکہ ایک میدانی کارروائی یا محاصرہ کے لئے اسکی ضرورت ہو[2]

انیسویں صدی کے اواخر میں مغربی افکار نے تہذیب کی جانب کچھ اور ترقی کی، اور یہ عام اصول وضع کیا گیا کہ :-

"صرف اسی قدر تباہ کاری جائز ہے جس قدر جنگی ضروریات کے لحاظ سے ناگزیر ہو"[3]

لیکن بیسویں صدی کے یورپین مصنفین اور ماہرین جنگ کا بیان اس طرف ہے کہ جنگی ضروریات کے لحاظ سے ہر قسم کی تباہ کاری جائز ہے، اور جس تباہ کاری کا مقصد محض تباہ کاری ہو وہ حرام ہے۔ لارنس اپنی کتاب "اصول قانون بین الملل" میں لکھتا ہے :-

"قوانین جنگ ایک شہر کے مضافات کو تباہ کر دینا جائز رکھتے ہیں، اگر یہ مقصد

---

[1] De [illegible] Expounded by Lawrence

[2] [illegible] Oppenheim II Pp 187-8

کو ان میں پناہ لینے سے روکا جائے۔ یا توپ خانے کی کارروائی کے لئے میدان صاف کیا جائے۔ اس غرض کے لئے عمارتیں توڑی جا سکتی ہیں، درخت کاٹے جا سکتے ہیں۔ بلکہ پیادہ کے لئے رستہ صاف رکھنے کی غرض سے گاؤں بھی جلائے جا سکتے ہیں مگر یہ کارروائی صرف اس صورت میں ہونی چاہیے جبکہ فوری اغراضِ جنگ کے لئے ایسا کرنا بیحد ضروری ہو۔[1]

پروفیسر ویسٹ لیک (Westlake) لکھتا ہے:-

"غنیم کے ملک میں عام تباہی صرف اس وقت جائز ہے، جبکہ زیرِ عمل جنگی کارروائی کی کامیابی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو۔[2]"

جرمنی کی کتاب جنگ اس مسئلہ میں یہ فیصلہ دیتی ہے کہ:-

"بلا ضرورت تو ذرہ برابر تباہ کاری بھی ناجائز ہے، لیکن اگر ضرورت آپڑے تو بڑی سے بڑی تباہ کاری بھی جائز ہے[3]"

یہاں آکر مغربی قانون ایک حد تک اسلامی قانون سے مل جاتا ہے، اسلامی قانون بھی یہی ہے کہ کسی شہر کی تسخیر یا کسی اور فوجی کارروائی کے لئے تخریب کی ضرورت ہو تو وہ جائز ہے مگر صرف اس حد تک کہ ایسا کرنا اس کارروائی کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہو،

اسکی تفصیل اس کتاب کے باب پنجم عنوان "تباہ کاری کی ممانعت" میں گذر چکی ہے لیکن مسئلہ کے ایک پہلو میں اسلام اور مغربی قانون کے درمیان اختلاف ہے، اسلام مہذب اور غیر مہذب دشمن میں کوئی تمیز نہیں کرتا، اس کے نزدیک غیر مہذب دشمن کی فصلیں تباہ کرنا اور بستیاں اجاڑنا بھی ویسا ہی ظلم ہے، جیسا کہ مہذب دشمن کی بستیوں اور کھیتوں کو غارت کرنا ہے، بلکہ درحقیقت اسلامی قانون جس زمانہ میں وضع ہوا تھا اس زمانہ میں "مہذب دشمن" کا تو کہیں وجود ہی نہ تھا، ہر طرف غیر مہذب ہی غیر مہذب تھے، مگر مغربی قانون ان دونوں

---

[1] Chapters on the Principles of International Law p 441

[2] Principles of International Law p 230

[3] Birkenhead p 26

قسم کے دشمنوں میں امتیاز کرتا ہے، اس کے نزدیک تباہ کاری کے لئے جس نہ وہ ت کی ضرورت ہے "مہذب" دشمن کے لئے ہے، رہا بیچارہ "غیر مہذب" تو اس کو تباہ و برباد کرنے کا حق مہذب قوموں کے لئے محدود ہے، پروفیسر لارنس صاف تصریح کرتا ہے:-

"وحشی یا نیم وحشی قوموں سے جنگ کرتے وقت واٹل (Vattel کے پہلے استثنا پر عمل کیا گیا ہے، عام طور پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وحوش و درندہ کے مواشی کو ہانک لیجانا، ان کی فصلوں کو تباہ کر دینا، ان کے چھپروں اور جھونپڑیوں میں آگ لگا دینا، ان کے نفوس پر نہایت وسیع اثر پیدا کرتا ہے، اگر یہ تباہ کاری شل (گولوں) کے ذریعہ کیجائے، اور اس کے ناگہانی نتیجہ کے طور پر بہت سے باشندے بھی ہلاک ہو جائیں تو اس سے ایسا گہرا اور پائدار اثر پیدا ہوگا کہ اس قوم کے بقیۃ السیف افراد کے دلوں میں سفید فام انسان کے عدل و طاقت کے برقرار رہنے والے احساس کا نشو و نما پانا یقینی ہے[1]"

غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض، اب مغربی قوانین جنگ میں صرف ایک غیر جانبداری کا قانون رہ گیا ہے، جس کا ذکر کرنا باقی ہے، اس پر تبصرہ کرنے کے بعد ہم اس حصہ کو ختم کر دیں گے،

غیر جانبداری کی تاریخ، مغربی اقوام میں غیر جانبداری کا تصور بہت قریبی عہد کی پیداوار ہے اب سے دو صدی قبل تک ان کے ذہن میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا، یا اگر تھا تو وہ غیر مکمل تھا، یعنی مغربی زبانوں میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ بھی موجود نہ تھا، گروشیوس اس کو لفظ نیوٹر (Medii) سے ادا کرتا ہے، اور بنکر شوک اس کے لئے لفظ غیر معاند (Non Hostes) وضع کرتا ہے، سترہویں صدی کے آخر میں جرمن اور انگریزی زبانوں میں لفظ نوسٹرل (Neutral) اور نیوٹرل (Neutrals) سے پہلی مرتبہ آشنا ہوئیں، اور اٹھارہویں صدی کے وسط میں واٹل نے اسکو بین الملی قانون میں رواج دیا، سولھویں اور سترہویں صدی تک یورپ میں غیر جانبداری کی حالت کو ناممکن اور خطرناک سمجھا جاتا تھا، اور عملاً اس کا کوئی

[1] Lawrence, P. 241-42

صحیح مفہوم ہی نہ تھا۔ فلارنس کا مدبر میکیاویلی (Machiavelli) ایک حکمراں کے لئے ضروری قرار دیتا ہے، کہ جب اس کے ہمسایوں میں کبھی لڑائی ہو تو وہ ایک نہ ایک فریق کے ساتھ شریک ہو جائے، اس کے ایک صدی بعد گروٹیوس بھی یہ مشورہ دیتا ہے، کہ ایک حکمراں کو محارب فریقین میں سے اس کا ساتھ دینا چاہیئے، جسکو وہ حق پر دیکھے، اور اسکی مخالفت کرنی چاہیئے جو ناحق پر ہو، البتہ جب یہ تمیز مشکل ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، تو اس صورت میں اسکو دونوں سے یکسان سلوک کرنا چاہیئے، عملی حیثیت سے بھی اٹھارہویں صدی کے خاتمہ تک غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض کچھ نہ تھے، محارب قوتیں لڑتے لڑتے ان کے حدود میں بے تکلف تجاوز کر جاتی تھیں، اور غیر جانبدار طاقتیں بھی جس فریق سے ہمدردی رکھتیں اسکو امداد پہونچانے میں دریغ نہ کرتی تھیں، قانون کے اس شعبہ میں حقوق و فرائض اور حدود و قیود مقرر کرنے کی ابتدا ۱۷۹۸ء سے ہوئی جبکہ امریکن کانگریس نے پہلی مرتبہ امریکن رعایا کے لئے ان محاربین کی جنگی خدمت کرنا ممنوع قرار دیا جس سے حکومت امریکہ برسر جنگ نہ ہو، اس کے بعد اس شعبہ میں قانون سازی کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ ۱۸۱۸ء میں غیر جانبداروں کا ایک پورا ضابطہ قانون وضع ہو گیا، ۱۸۱۹ء میں برطانیہ عظمیٰ نے امریکہ کی تقلید کی، اور کانگریس کے بنائے ہوئے قوانین اپنی کتاب آئین میں منتقل کر لئے، اس کے بعد دوسری سلطنتوں نے بھی اسی قسم کے قوانین اپنے ہاں رائج کئے، اور انیسویں صدی کے اندر تمام مغربی سلطنتوں میں غیر جانبداری کے قوانین بن گئے، تاہم صحیح معنوں میں غیر جانبداری کا بین المللی قانون ۱۹۰۷ء کی ہیگ کانفرنس میں وضع کیا گیا، کیونکہ اسی میں پہلی مرتبہ دول مغرب نے مل کر غیر جانب داروں کے حقوق و فرائض متعین کئے۔

موجودہ زمانہ میں غیر جانبداروں کی حیثیت، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بیسویں صدی میں غیر جانبداری کا قانون پایۂ تکمیل کو پہونچا اور بیسویں ہی صدی میں اس پر سکرات موت بھی طاری ہو گئی، دوسری ہیگ کانفرنس کو قانون سازی کا کام ختم کئے ابھی سات سال بھی نہ ہوئے تھے کہ یورپ میں عالمگیر جنگ شروع ہوئی، اور اس نے غیر جانبداری کے پورے

Lawrence, P. 472-76

قانون کی دھجیاں اڑادیں، ۱۸۱۲ء کی جنگ عظیم میں غیر جانبداروں کا کوئی حق ایسا نہ تھا جسکے ساتھ پامال نہ کیا گیا ہو، انکی زمینوں پر تجاوز کیا گیا، ان کے جہاز ڈبوئے گئے، ان کی تجارت برباد کی گئی، ان کی تلاشیاں لی گئیں، ان کو گرفتار کیا گیا، غرض یہ کہ ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا گیا، جو محاربین کے ساتھ کیا جاتا ہے، حتی کہ یہ امر بھی مشکوک ہوگیا کہ آیا فی الواقع غیر جانبداروں کا کوئی حق بھی ہے یا نہیں، پھر اسی پر بس نہیں خود غیر جانبداری کی حقیقت بھی بڑی حد تک مشکوک ہوگئی، چونکہ جنگ اب صرف فوجی جنگ نہیں رہی ہے، بلکہ اس سے زیادہ اقتصادی جنگ ہوگئی ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ جو طاقت دشمن کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتی ہو، اسکو ما یحتاج بہم پہونچاتی ہو، اور اسکی اقتصادی زندگی کے لئے بقا و استحکام کے وسائل فراہم کرتی ہو، کیا وہ فی الواقع غیر جانبدار ہے؟ اور کیا وہ جائز طور پر اپنے اس کام کے لئے آزادانہ حقوق کا مطالبہ کرسکتی ہے؟ اس مسئلہ نے غیر جانبداری کی عین بنیاد پر ایک کاری ضرب لگائی ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ بین المللی قانون اب تک یہ فیصلہ نہیں کرسکا ہے کہ ان جدید مسائل کی روشنی میں غیر جانبداروں کے کیا فرائض مقرر کرے، اور ان کو کیا حقوق دلوائے۔

یہ حالات کا ایک مبالغہ آمیز تخمینہ نہیں ہے، بلکہ ٹھیک یہی خیالات ہیں جو بین المللی قانون کے علماء کو پریشان کئے ہوئے ہیں، پروفیسر ہولینڈ نے اپنی کتاب "بین المللی قانون کا ارتقاء جنگ عظیم کے بعد" میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے، اور اکابر علمائے قانون کے خیالات سے استشہاد کیا ہے، ذیل میں ہم اس سے ایلنز باخر کے خیالات نقل کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"موجودہ جنگ نے غیر جانبداروں کی حیثیت بہت زیادہ خراب کردی ہے، ان کے بہت سے حقوق پر اس کثرت سے ساتھ دست درازی کی گئی ہے کہ اب مشکل ہی سے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ وہ فی الواقع قانون میں موجود بھی ہیں یا نہیں؟ چونکہ اب وہ ضرورت سے زیادہ پامال ہوچکے ہیں، اس لئے آئندہ جنگوں میں انکو زیادہ عرصہ تک تسلیم نہیں کیا جائیگا، حق اور انصاف کے نئے عقائد نے پرانے حقوق کو الگ پھینکدیا ہے، اور جو رخنہ پڑگیا ہے وہ [illegible] تلافی ہے، پہلے قوانین، اور خصوصاً اقرار نامۂ پیرس کے قانون بحری کی دفعہ ۲

کو بین الملی قانون میں جو پوزیشن حاصل تھی، اس پر اب ایک انقلابی تشکیل جدید کے عمل نے ایک نئے غیر نوشتہ قانون کو مسلط کر دیا ہے، اور یہ ایسا قانون ہے جو غیر جانبدار حکومتوں کی زندگی پر بہت زیادہ گہرے حملوں کو جائز رکھتا ہے[1]"

آگے چل کر یہ مصنف پھر لکھتا ہے:-

"دنیا میں عالمگیر جنگوں کا دور شروع ہو چکا ہے، اور ہر بڑی طاقت کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ان میں ضرور کھینچی جائیگی، بین الملی قانون، آخر الامر بڑی قوموں کی خواہش ہی پر قایم ہے، کیونکہ ان کی مدد کے بغیر بین الملی قانون کا کوئی حکم قائم نہیں رہ سکتا، لہذا ایسے زمانہ میں جبکہ غیر جانبداروں کا ناقابل تعدی ہونا، بڑی قوموں کی اکثریت کو ایک ناگوار قید معلوم ہو رہا ہے، اگر بین الملی میں بھی غیر جانبداروں کی پوزیشن روز بروز خراب ہوتی جائے تو کچھ جائے تعجب نہیں ہے[2]"

اس بیان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مغربی قانون میں حیادت و غیر جانبداری کی حیثیت کیا ہے، اب ہم غیر جانبداری کے قانون کی تفصیلات و جزئیات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ یہ قانون من حیث ہو، قانون کس حد تک مکمل اور پائدار ہے، اور اسلامی قانون کے مقابلہ میں اسکی کیا حیثیت ہے،

محاربین کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق، ہیگ کی مفاہمت ۵ اور ۱۳ کی رو سے بری اور بحری جنگ میں غیر جانبداروں کے متعلق محاربین کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) غیر جانبدار سلطنت کے حدود میں کسی قسم کی جنگی کارروائی نہ کیجائے،

(۲) محاربین کے لئے ممنوع ہے کہ اپنی فوجیں یا سامانِ جنگ و سامانِ رسد غیر جانبدار علاقہ سے گزار کر لیجائیں،

(۳) غیر جانبدار علاقہ کو جنگی تیاریوں کے لئے "قاعدہ" (Base) نہیں بنایا جا سکتا

[1] Ibid. P. 146 [2] Niemeyer. P. 145

وہاں فوجوں کو آراستہ کرنا یا جنگی قوتوں کو مرتب کرنا یا ایسی ہی دوسری کارروائیاں کرنا ممنوع ہے

(۵) غیر جانبدار علاقہ یا پانی میں گھس کر دشمن کو گرفتار کرنا یا اس پر حملہ کرنا حقوقِ غیر جانبداری پر تعدی ہے، جس سے احتراز واجب ہے،

(۶) محاربین کا فرض ہے کہ ایک غیر جانبدار سلطنت اپنے فرائضِ غیر جانبداری ادا کرنے کے لئے جو قوانین وضع کرے انکی وہ پابندی کریں،

(۷) اگر کبھی دانستہ یا نادانستہ کسی غیر جانبدار سلطنت کے حقوق پر تعدی ہوجائے تو تعدی کرنے والے فریق کا فرض ہے کہ اسکی تلافی کرے،

یہ تمام فرائض فروع ہیں، اس ایک اصل کی کہ غیر جانبدار سلطنت کے حدود مقدس و ناقابل اعتدا ہیں، اور یہ اصل بعینہٖ اسلام میں موجود ہے، اسلامی قانون کے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس قوم سے دولت اسلامیہ کی مسالمت ہو، اور جو جنگ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کا حصہ نہ لے اس کے حدود پر کسی قسم کا تجاوز نہیں کیا جاسکتا، اگر دشمن لڑتے لڑتے اس کے ملک میں جا پہونچے تو اسکا تعاقب نہیں کیا جاسکتا، دشمن کے جو افراد اس کے ملک میں مقیم ہوں ان پر کوئی حملہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ مجموعی طور پر دورانِ جنگ میں اس کے افراد سے یا اس کے حدودِ سلطنت سے ہر قسم کا تعرض قطعاً حرام ہے[1]،

غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق

جدید بین الاقوامی قانون غیر جانبداروں پر محارب فریقین کے متعلق جو فرائض عاید کرتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) کسی محارب فریق کو جنگ میں مسلح امداد نہ دینا، اور فریقین کے ساتھ یکساں سلوک کرنا،

یہ غیر جانبداری کا بنیادی فرض ہے، اور اس کے عین مفہوم میں اسطرح داخل ہے کہ غیر جانبداروں کا تصور اس چیز کے تصور کے بغیر ذہن میں قائم ہی نہیں ہوسکتا،

(۲) محاربین میں سے کسی کو یا دونوں کو آلاتِ جنگ اور روپیہ فراہم نہ کرنا،

اس کا مطلب یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں ایک غیر جانب دار سلطنت کو کسی محارب کے ہاتھ اسلحہ و آلاتِ جنگ فروخت نہ کرنے چاہئیں، اور نہ اسے قرض دینا چاہیئے، لیکن یہ امر مشکوک

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان "غیر جانبداروں کے حقوق"،

ہے کہ اس فرض کے حدود عمل کیا ہیں؟ اسلحہ و آلاتِ جنگ کی فروخت کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ایک سلطنت خاص طور پر ایک محارب فریق سے معاملہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ذخائرِ حرب کا عام نیلام کرے جسمیں دوسرے خریداروں کی طرح محاربین کے ایجنٹ بھی ہوں، پہلا طریقہ تو بالاتفاق ممنوع ہے لیکن دوسرے طریقہ کے ممنوع ہونے میں اختلاف ہے اور ایسی نظائر موجود ہیں کہ بڑی بڑی سلطنتوں نے اسکو جائز رکھا ہے، چنانچہ ۱۸۷۰ء کی جنگِ جرمنی و فرانس کے زمانہ میں حکومت امریکہ نے اپنے ذخائرِ حرب کا نیلام کیا اور اس میں سے حکومتِ فرانس کے ایجنٹوں نے ایک بہت بڑی مقدار خرید کر فرانس بھیجدی جو جنگ میں کام آئی، اس پر جب اعتراض اٹھا تو امریکہ کی مجلس السٹیٹ نے تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، اور اس کمیٹی نے یہ رپورٹ کی کہ "اگر خود حکومت فرانس کا رئیس بھی خریداروں میں موجود ہوتا تو اس کے ہاتھ سامان بیچنا ناجائز نہ ہوتا، کیونکہ نیلام، عام تھا اور محاربین کے درمیان کوئی امتیاز نہ تھا" اس فیصلہ سے جائز اور ناجائز میں بہت ہی کم فرق رہجاتا ہے، اور وہ فائدہ باقی نہیں رہتا جس کے لئے غیر جانب داروں پر یہ فرض عاید کیا گیا ہے،

اس فرض کا دوسرا حصہ جو روپیہ کی امداد سے متعلق ہے اسکی بھی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ سلطنت خود کسی محارب فریق کو قرضہ یا عطیہ دے، دوسری صورت یہ ہے کہ غیر جانبدار سلطنت کی رعایا اسکو امداد دے، پہلی صورت بالاتفاق ممنوع ہے، مگر دوسری صورت میں اختلاف ہے اور عام تعامل یہی ہے کہ غیر جانبدار سلطنتوں کے صرافہ سے محاربین نہایت آزادی کے ساتھ روپیہ حاصل کرتے ہیں، ۱۸۹۴ء کی جنگ چین و جاپان، ۱۹۰۴ء کی جنگ روس و جاپان، ۱۹۱۱ء کی جنگ اٹلی و ترکی اور ۱۹۱۲ء کی جنگِ بلقان میں فریقین نے غیر جانبدار سلطنتوں کی رعایا سے نہایت آزادی کے ساتھ قرضوں اور عطیوں کی صورت میں امداد حاصل کی، ۱۸۲۳ء میں حکومت انگلستان نے ماہرین قانون بین الاقوام سے یہ سوال کیا تھا کہ آیا ایک غیر جانبدار سلطنت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی رعایا کو محاربین کی مالی اعانت سے باز رکھے؟ اس کے جواب میں لارڈ لینڈہرسٹ (Lyndhurst) نے لکھا کہ "مصنفین کا اجماع اس پر ہے کہ

[1] Wharton, International Law of the United States p 391

یہ حق غیر جانبداری کے نواقض میں سے نہیں ہے[1]، اس طرح بین المللی قانون نے قوم اور حکومت میں امتیاز پیدا کر کے حکومت کو تو غیر جانبداری کے احترام کا مکلف قرار دیا ہے مگر قوم کو پوری آزادی دی ہے کہ محاربین میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ جنگ میں تعاون کرے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت سے یہ فرض بالکل بے معنی ہو جاتا ہے، کیونکہ ایک سلطنت کے مالی و اقتصادی وسائل جب محاربین کی خدمت کے لئے وقف ہوں تو غیر جانب داری کا عدم و وجود برابر ہے،

(۳) محاربین کی فوجوں کو اپنے علاقہ سے نہ گذرنے دینا،

یہ فرض بہت بعد کی پیداوار ہے، سلطنتوں کا عمل اور مصنفین کی آرا دونوں کا میلان سترھویں صدی تک اس جانب رہا ہے کہ محاربین کو راستہ دینا جائز ہے، سترھویں صدی کا مصنف گروٹیوس لکھتا ہے کہ "محاربین کو غیر جانبدار علاقہ سے فوج گذارنے کا حق پہونچتا ہے، اور اگر یہ حق دینے سے بلا کسی معقول وجہ کے انکار کیا جائے تو اسے بزور بھی حاصل کیا جا سکتا ہے" اٹھارہویں صدی کا مصنف واٹل لکھتا ہے کہ "محارب اپنے غیر جانبدار ہمسایہ سے اپنی فوجوں کے لئے راستہ مانگ سکتا ہے، لیکن شدید ضرورت کے بغیر اسکو جبراً حاصل نہیں کر سکتا" وہیٹن (WHEATON) جس کی کتاب "بین المللی قانون" ۱۸۳۶ء میں شایع ہوئی ہے، اس حق کو تسلیم کرتا ہے، مگر غیر جانبدار سلطنت کی مرضی کے خلاف اسے حاصل کرنے کو جائز نہیں رکھتا[2]، مینگ (Manning) جس کی کتاب "قانون اقوام" ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی ہے اس قسم اجازت دینے کو غیر جانبداری کے نواقض میں شمار نہیں کرتا، بشرطیکہ دونوں فریقوں کو یکساں اجازت دیجائے[3]، البتہ ہال (Hall) جو ۱۸۸۰ء کا مصنف ہے اسکو ناجائز قرار دیتا ہے، اور اس کے قریب العہد مصنفین بھی اس کے عدم جواز کے قائل ہیں یہی حال سلطنتوں کے تعامل کا ہے، ۱۸۱۵ء میں آسٹریا نے جنوب مشرق فرانس پر

---

[1] Hallleck, International Law P. 110, 195-197

[2] International law P 497 [3] Lawrence, P. 525

[4] Law of Nation, ch. II

حملہ کرنے کے لئے سوئزرلینڈ کے علاقہ سے زبردستی راستہ حاصل کیا[1]، ۱۸۷۶ء میں میکسیکو کی فوجوں نے امریکہ کے علاقہ میں گھس کر اپنے دشمنوں سے جنگ کی[2]، اسی سال جنگ ترکی و روس میں حکومت روس نے حکومت رومانیا سے سمجھوتہ کیا کہ وہ روسی فوجوں کو یورپین ٹرکی پر حملہ کرنے کے لئے رومانوی علاقہ سے گذرنے کی اجازت دیدے، چنانچہ دورانِ جنگ میں تقریباً پانچ لاکھ روسی فوج رومانوی علاقہ سے گذری اور اس نے رومانیہ کی ریلوے، اور خطوط مواصلات کو آزادی کے ساتھ استعمال کیا[3]، سب سے بڑی روشن مثال ہمارے موجودہ عہد کی ہے، ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جرمنی نے بلجیم سے زبردستی راستہ حاصل کیا، اور حکومت بلجیم کی مزاحمت کے باوجود جرمن فوجیں بلجیکی علاقہ سے گذریں، اگرچہ اس آخری فصل کو غیر جانبداری کے حقوق پر صریح اعتداء سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن واقعات کی رفتار بتا رہی ہے کہ آیندہ جنگ میں جب بھی طاقتور سلطنتوں کے سامنے موت وحیات کا نازک مسئلہ پیش ہوگا تو وہ کمزور ہمسایہ سلطنتوں کو راستہ دینے پر ضرور مجبور کریں گی، اس لئے یہ قیاس غلط نہیں ہے کہ بین الملی قانون اب پھر اس نظریہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے، جو حال سے پہلے کے مصنفین پیش کرتے رہے ہیں،

(۴) محاربین کو اپنے حدود میں جنگی مہمیں طیار کرنے یا جنگی جہاز آراستہ کرنے کی اجازت نہ دینا،

یہ فرض غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے، اور غالباً پہلی مرتبہ ۱۸۷۱ء کے معاہدۂ واشنگٹن سے پیدا ہوا ہے، اس سے قبل غیر جانبدار سلطنتوں کے حدود میں جنگی طیاروں کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں،

(۵) اپنی رعایا کو محاربین کی فوج میں بھرتی ہونے سے روکنا،

یہ فرض بھی غیر جانبداری کے ضمنی فرائض میں سے ہے، اور اس کے مفہوم میں داخل ہے، لیکن مغرب میں اسکا تصور بہت قریبی عہد سے تعلق رکھتا ہے، ۱۷۹۳ء کی جنگ انگلستان

---

[1] Wheaton, International law P.P 418 - 419

[2] Wheaton International law of the U.S.A. PP 397

[3] Lyon Le Modern Europe; III; 497

دفرانس میں امریکہ کے باشندے بکثرت فرانسیسی فوج میں جاجاکر بھرتی ہوئے، جرمنی کی جنگ ستمبر میں لارڈ بائرن کی زیر قیادت سینکڑوں انگریزوں نے ترکی کے خلاف جاکر جنگ کی ۱۸۷۶ء کی بغاوت سرویا میں روسی رعایا کے ہزارہا افراد ترکی کے خلاف لڑنے گئے، سوئٹزرلینڈ تو ۱۸۵۹ء تک باقاعدہ بھرتی کا میدان بنا رہا، اور محارب سلطنتیں ہمیشہ اس سے رنگروٹ حاصل کرتی رہیں، انیسویں صدی کے آخری ایام میں غیر جانب داری کے قانون کا یہ شعبہ پایۂ تکمیل کو پہونچا اور ماہرین قانون بین الملل نے بالاتفاق یہ فتوی دیا کہ اس قسم کی بھرتی کی اجازت دینا غیر جانبداری کے لئے ناقض ہے،

یہ ان فرائض کا خلاصہ ہے جو بین الملی قانون غیر محاربین پر عاید کرتا ہے، ان کی تفصیلات میں جو کچھ کمزوریاں ہیں، وہ صفحات بالا میں بیان کی جاچکی ہیں، تاہم ان سب کا اصل الاصول صرف ایک فرض ہے اور وہ یہ کہ "غیر جانبدار قوم کو جنگ میں کسی فریق کی معاونت نہ کرنی چاہئے، اور نہ ایسا فعل کرنا چاہئے جو معاونت کی حد تک پہونچتا ہو" یہ اصل الاصول بعینہ اسلام کے قانون میں موجود ہے، اسلامی قانون میں غیر جانبدار کی تعریف یہ ہے کہ الذی لم یظاھر علینا احدا ولم ینقصنا شیئا، یعنی وہ ہمارے خلاف کسی کی مدد نہ کرے اور نہ ہمارے (حق میں) کوئی کمی کرے[1]، اس اصل سے فروع خود نکالی جاسکتی ہیں، ہر وہ فعل جو "مظاہرہ" اور "نقص" کی تعریف میں آتا ہو، غیر جانبداری کیلئے ناقض ہے، اور اس سے احتراز کرنا غیر جانبدار کا فرض ہے،

آخری تبصرہ

یہ باب اُمید سے زیادہ طویل ہوگیا ہے لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ پچھلے مباحث پر ایک آخری تبصرہ کرکے واضح کردیا جائے کہ اسلامی قانون کس حیثیت سے مغربی قوانین پر ترجیح کا حق رکھتا ہے، اگر گذشتہ اوراق آپکے ذہن میں محفوظ ہیں تو مباحث کو دوبارہ نقل کرنے کی حاجت نہیں صرف وجوہ ترجیح کی طرف اشارا کردینا کافی ہے،

اولاً، بین الملی قانون فی الحقیقت کوئی "قانون" ہی نہیں ہے، وہ اپنے اصول و فروع

[1] تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب پنجم، عنوان: غیر جانبداروں کے حقوق۔

کے لحاظ سے کلیتہً سلطنتوں کی مرضی کے تابع ہے، وہ جس طرح چاہتی ہیں اپنے مصالح و اغراض
کے مطابق اسکو بناتی اور بدلتی ہیں، اور جس چیز کو سب یا چند بڑی سلطنتیں پسند نہیں کرتیں، وہ آخرا
قانون ہی نہیں رہ سکتی، اس طرح در اصل قانون یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ دول کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے
بلکہ دول خود یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ قانون کیا ہونا چاہیے؟ بخلاف اس کے اسلام کا قانون صحیح
میں ایک "قانون" ہے، اسکو ایک بالاتر قوت نے وضع کیا ہے مسلمانوں کو اسمیں حذف و ترمیم
کوئی حق نہیں دیا گیا، وہ صرف اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ جو اسلام کے متبع ہوں وہ اسکی بے چون
چرا پابندی کریں، اور جو اسکی پابندی نہ کریں وہ قانون شکن اور نافرمان قرار دیئے جائیں، اہلِ مغرب
اگر اپنے بین المللی قانون کی خلاف ورزی کریں تو وہ سرے سے قانون ہی نہیں رہتا، لیکن مسلمان
اگر سب ملکر بھی اسلام کے خلاف عمل کریں تب بھی اسلامی قانون بجائے خود قایم رہتا ہے،

ثانیاً، بین المللی قانون کا وہ شعبہ جس کو قانونِ جنگ کہا جاتا ہے، اصل بین المللی قانون
سے بھی زیادہ ناپائدار اور ناقابلِ اعتماد ہے، ضروریاتِ جنگ سے اسکا ہر وقت تصادم ہوتا
رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ اسکو مغلوب کرتی رہتی ہیں، پھر فوجی اور قانونی گروہوں کے اختلافات
اسکو اور بھی زیادہ کمزور کر دیتے ہیں، ایک چیز جسکو قانونی گروہ قانون میں داخل کرتا ہے، فوجی گروہ اسی کو
خارج کر دیتا ہے، ایک مہذب قاعدہ جسکو قانونی گروہ وضع کرتا ہے، فوجی گروہ اسی کو قبول کرنے سے انکار
کر دیتا ہے، اور چونکہ عمل کی تمام قوتیں فوجی گروہ کے ہاتھ میں ہوتی ہیں اسلئے کتابوں میں لکھا ہوا قانونِ جنگ کتابوں میں
دھرا رہتا ہے اور عملی قانونِ جنگ وہ ہوتا ہے جسکو فوجیں خود اپنے عمل سے میدانِ جنگ میں وضع کرتی ہیں، اسکے
مقابلہ میں اسلام کا قانونِ جنگ پورے اسلامی قانون کی طرح ایک پختہ اور ناقابلِ تغیر قانون
ہے، اسمیں جنگی ضروریات کی رعایت ملحوظ رکھکر جو قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہیں انکو اب
کوئی نہیں بدل سکتا، کسی اسلامی فوج یا جنرل کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ اسمیں کسی قسم کی ترمیم و
تنسیخ کرے، یا اسکی کسی چیز کو ماننے سے انکار کرے،

ثالثاً، بین المللی قانونِ جنگ کی بنیاد لڑنے والوں کی باہمی مفاہمت پر رکھی گئی ہے، چند
سلطنتیں آپس میں ملکر طے کر لیتی ہیں کہ جب ہم آپس میں لڑیں گے تو فلاں فلاں قواعد کی
پابندی کریں گے، اس مفاہمت میں جو قومیں شریک نہیں ہیں ان سے جنگ ہونے کی صورت

میں اس قانون پر عمل نہیں ہوگا، جو قومیں اس مفاہمت سے الگ ہو جائیں، وہ بھی اس قانون کے حدود سے نکل جائیں گی، اور انھیں بھی مہذب قوموں کے مہذب سلوک کا استحقاق باقی نہیں رہیگا، یہی نہیں بلکہ خود مفاہمت کے شرکا میں سے بھی اگر کوئی مفاہمت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو باقی شرکا اس سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں، اور آخر الامر اس قانون شکنی سے خود قانون ہی بدل جاتا ہے، اس طرح یہ قانون کسی اخلاقی فرض کے احساس پر قائم نہیں ہے، بلکہ محض مبادلہ اور باہمی مراعات پر قائم ہے، ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ سے اس لئے مہذب سلوک نہیں کرتا کہ اسے بذاتِ خود ایسا کرنا چاہئے، بلکہ اس شرط کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ مہذب سلوک کیا گیا تو وہ بھی مہذب سلوک کریگا، اور اگر نہ کیا گیا تو نہیں کریگا یہ مفاہمت اسلام میں نہیں ہے، اس نے جو قوانین وضع کئے ہیں، انکی پابندی پر مسلمان ہر حال میں مجبور ہیں، خواہ غیر مسلم اس کے معاوضہ میں انکے ساتھ مہذب سلوک کریں یا نہ کریں، اسلامی قانون کسی مسلمان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی حال میں انکی پابندی سے بری الذمہ ہو جائے جسے مسلمان رہنا ہے اسکو بہر حال اس قانون کی سیادت تسلیم کرنا ہے،

رابعاً، مغرب کے مہذب قوانین کو وجود میں آئے آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے، حالانکہ اسلامی قانون ساڑھے تیرہ سو برس سے دنیا میں تہذیب کا علم بلند کئے ہوئے ہے، اتنے بڑے تفاوتِ زمانی کے باوجود، جہاں تک اصول کا تعلق ہے مغربی قانون نے اسلامی قانون پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا ہے، اور فروع میں بھی ان عملی جزئیات کو مستثنیٰ کرکے جن کا تعلق ہر زمانہ کے وقتی حالات سے ہے، اسلامی قانون سے مغربی قانون کسی طرح بڑھا ہوا نہیں ہے، بلکہ اکثر پہلوؤں سے اسلام اب بھی مغربی قانون کے مقابلہ میں فوقیت رکھتا ہے،

خامساً، مغربی تہذیب نے انسان کو چند عملی قوانین کا پابند بنا کر آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اپنی قوت کو جہاں چاہے اور جس غرض کے لئے چاہے، استعمال کرے، وہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتی ہے کہ جب کسی کو مارے تو فلاں طریقوں سے مارے، اور فلاں طریقوں سے نہ مارے باقی رہا یہ سوال کہ کس غرض کے لئے مارے اور کس کے لئے نہ مارے، اس سے وہ کوئی تعرض

نہیں کرتی، اور جہاں تک مہذب قوموں کا عمل بتاتا ہے، اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں
کہ مغربی تہذیب ملک گیری، توسیعِ تجارت، حصولِ مال وجاہ، جہانگیرانہ لوٹ مار، غرض
تمام حیوانی خواہشات کے لئے جنگ کرنا جائز رکھتی ہے، بخلاف اس کے اسلام اپنے
پیروؤں کو صرف لڑنے کے مہذب طریقوں ہی کا پابند نہیں بناتا بلکہ ان کو یہ بھی بتاتا
ہے کہ فلاں فلاں مقاصد کے لئے تم جنگ کر سکتے ہو، اور فلاں مقاصد کے لئے نہیں
لڑ سکتے، اس مسئلہ کو اس نے انسان کی اپنی ذاتی پسند پر نہیں چھوڑا ہے، بلکہ اسکو خصوص
اخلاقی حدود کا پابند بنا دیا ہے، جن سے نکلنے کا اسکو حق نہیں دیا،

یہ وجوہ ہیں جنکی بنا پر اسلام کا قانونِ جنگ، مغرب کے قانون کے مقابلہ میں زیادہ صحیح،
زیادہ مفید، زیادہ معقول، اور زیادہ مضبوط ہے،

(یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ مغرب کے معاملہ میں تو تم مغربی قوموں کے عمل کو دیکھتے ہو مگر اسلام کے
معاملہ میں مسلمانوں کے عمل کو نہیں دیکھتے بلکہ محض اسلامی قانون کو دیکھتے ہو لیکن گذشتہ مباحث کو بغور دیکھنے سے یہ اعتراض خود بخود
رفع ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی قانون اور مسلمانوں کا عمل دو بالکل الگ چیزیں ہیں، اور
قانون سازی میں مسلمانوں کے عمل کو کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے جب قانون کے حسن وقبح
پر بحث ہو تو عمل کا سوال قدرتی طور پر خارج از بحث ہونا چاہیئے، برعکس اس کے مغربی قانون اور
مغربی قوموں کا عمل دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، صرف یہی نہیں کہ قانون سازی میں ان قوموں کے
عمل کو خاص دخل حاصل ہے، بلکہ اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ جہاں تک قانونِ جنگ کا تعلق
ہے، مغربی قوموں کا عمل آگے آگے چلتا ہے، اور قانون کو اسکی پیروی کرنی پڑتی ہے، اس لئے
ہم مغرب کے معاملہ میں عمل کو مقدم رکھنے پر مجبور ہیں)

غلط نامہ

افسوس ہے کہ کتاب کے بعض حصوں میں بکثرت غلطیاں رہ گئی ہیں اس لئے ناظرین پڑھنے سے پہلے اس غلط نامے کے مطابق ان کی اصلاح کر لیں:۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۳	اگرچہ	اگر
۱	۱۱	چین و آرام	عیش و آرام
۲	۹	اگر	مگر
۳	۴	زیادہ سے زیادہ یہ کہ	×
۳	۱۵	گرفتار کیا گیا	گرفتار کیا گیا تھا،
۳	۱۶	منسوب کئے گئے	منسوب کئے گئے تھے
۴	۴	کی گئی ہے،	کی گئی
〃	〃	گاندھی	مہاتما گاندھی
۷	۱۱	ان میں سے ایسے ہیں	ان میں سے بہت ایسے ہیں
۸	۶	تحیہ و سلام	تحیۂ و سلام
۱۵	۴	مجتنب کہنے میں	مجتنب رکھنے میں
۱۶	۲۱	بدویں	بدرویں
۲۵	۱۸	غلامی میں ہی	غلامی میں بھی
۲۶	۱۹	آگے جھکانے پر	آگے سر جھکانے پر
۲۹	۱	اکثر لوگ	مگر اکثر لوگ
۳۰	۷	ضعف	یہ ضعف
۳۱	۹	اور اللہ کے غضب سے	اللہ کے غضب سے
۳۱	۱۳	قبض کریں	قبض کر لیتا ہے
۳۱	۲۱	اگر تم کمزور نہ تھے	اگر تم کمزور ہی تھے
۳۶	۷	ڈگڑ بگڑ	ڈگڈگڑ بگڈگڑ
۴۶	۸	فانظرھم	قاتلوھم
۴۷	۱۲	قتل کے جائینگے	قتل کئے جائینگے
۴۷	۱۶	کوپنا	کوا پنا
۴۹	۳	خار	غار
۴۹	۱۰	احزاب	احزاب
۵۱	۱۱	قاعدہ	باقاعدہ
۵۱	۲۲	پکڑ منگایا	پکڑوا منگایا
۵۲	۵	عزینیوں	عُزینوں
۵۳	۷	بیت کم	بینکم
۵۳	۲۱	لسی حال	کسی حال
۵۶	۵	آعلوا اللہ	بہ علوا اللہ
۵۸	۵	جتلی	جبلی
۶۱	۲۰	تفرط	تفریط
۶۲	۳	یا اسرائیل کے	یا اسمٰعیل کے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۶۶	۱۰	حب وہ	جب وہ
۶۷	۶	مصحون	مصلحون
۶۷	۱۲	اِن بری	اُن بری
۶۷	۳۰	وافقون	منافقون
۸۹	۸	مقرکیا ہے	مقرر کیا ہے
۹۰	۶	جزیہ ایک بڑی رقم	جزیہ کی ایک بڑی رقم
〃	〃	مخلصین	محصلین
۹۲	۱۵	دنیاوی	دنیوی
۹۲	۱۸	فائدے محروم	فائدے سے محروم
۹۴	۵	انگریزی تہذیب	انگریزی سلطنت میں
۹۵	۷	وہ	بلکہ وہ
۱۰۵	۴	ابوموسی شعری	ابوموسیٰ اشعری
〃	۱۲	دنیادی	دنیوی
۱۰۶	۶	باختیار	بااختیار
〃	۱۷	پڑانی	پُرانی
۱۰۹	۹-۱۰	سب اعتراض ہیں جوہر نہیں،	سب اعراض ہیں جوہر نہیں ہیں،
۱۱۲	۲۲	تفضیل	تفصیل
〃	〃	ایڈورڈ گبن	ایڈورڈ گبن
۱۱۳	۱۰	کیجدمت	کی خدمت
۱۱۶	۹	مَن	مِن

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱۹	۱۵	چاہتا ہے	چاہتا
〃	〃	مجبور کردیتا ہے	مجبور کردیتا
۱۲۰	۲۰	والالجاء	والالجاء
۱۲۲	۷	قبو کرے	قبول کرے،
۱۲۸	۸	دیگا	دے
۱۳۱	۱۳	تنقید	تنفیذ
〃	۱۵	قیود کی	قیود کو
〃	۱۹	صرف لیے	صرف اس لئے
〃	۲۱	اخلاقی واعظ اور معلم	معلم محض اخلاقی واعظ
۱۳۲	۶	موعظت سے	موعظت ہی سے
〃	۷	اور اسے	بلکہ اسے
〃	۲۰	برائی	برائی
〃	۵	ہے دلون سے	ہے تو دلوں سے
۱۳۷	۱۱	ایام الحرب	ایام العرب
۱۳۹	۹	بن ذھل	بنی ذھل
۱۴۲	۱۱	جنگ کے محرکات اور غنیمت کا شوق	جنگ کے محرکات اور غنیمت کا شوق
۱۴۳	۴	اعزمن	اعزمن
۱۴۴	۱۹	پہونچ	پہونچ کر
۱۴۵	۸	نہ کی جاوے	نہ کیجائے
〃	۹	وارہے	وررہے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴۵	۱۹	نافرمانی	نافرمانی
۱۴۷	۳	حساس بن مرہ	جساس بن مرہ
〃	۲۳	آغانی	اغانی
۱۴۸	۲۳	ہے	ہے
۱۴۹	۲	ہے بیجان ہوجاتا ہی	وہ بے جان ہوجاتا ہے
〃	۱۴	سموال بن عادیہ	سموأل بن عادیا
〃	۱۶	ہم سے	ہم مین سے
۱۵۰	۱۱	حیرو ا	خیرُدا
۱۵۱	۵	بخطبۃ	بخطۃ
〃	۸	کیشہ بن معدیکرب	کبشہ بنت معدیکرب
〃	〃	بنی زبید	بنی زبید
〃	۲۲	بلندترین	بلندتر
۱۵۲	۲۳	متفطرس	متغطرس
۱۵۳	۱۳-۱۵	خیف الریح	فیف الریح
〃	۱۴	بخیف الریح	بفیف الریح
〃	۲۲	منذر بن امراؤالقیس	منذر بن امرئ القیس
۱۵۵	۱۰	جسمون سے	سینون سے
〃	۲۲	سلیک بن سکہ	سلیک بن سلکہ
۱۵۷	۲	پیش آئے ہین	پیش آئے ہین
۱۵۸	۲۰	لشیب	لثیب
۱۵۹	۱۹	شام کے وقت قدیم	شام کے قدیم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۶۰	۲	[illegible]	[illegible]
۱۶۲	۲۲	[illegible]	[illegible]
۱۶۳	۹	کی خصوصیت	خصوصیت
۱۶۵	۲	کے وحشیانہ	کی وحشیانہ
〃	۸	اپامیا	فامیا
〃	۱۱	کیپیڈوسیا	کیپیڈوسیا
〃	۱۲	میلی تین	ملطیہ
۱۶۶	۱۴	پنجے	پنجرے
۱۶۷	۲۳	[illegible]	[illegible]
۱۶۸	۴	جب سنتے ہیں	جب ہم سنتے ہین
۱۶۹	۲	انسان کے جان	انسان کی جان
۱۷۰	۸	بدی کے	بدی کی
۱۷۸	۲۰	سخی	سختی
〃	۲۱	زمین پر	زمین مین
۱۸۱	۹	دفع	وقع
〃	۲۳	۷ فتوح البلدان	۷ فتوح البلدان
		ص ۴۷	ص ۴۷
۱۸۲	۱۲	انا	انا
۱۸۴	۲۳	پیغمبرتے	پیغمبرنے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۵	۴	لاتعدلوا	لاتعدلوا
۱۸۶	۱۴	چڑھ کر آئے	چڑھ کر آئے
″	۱۹	اٹھاوے	اٹھائے
۱۹۰	۲۰،۲۱	بڑے سا برٹا	بڑے سے بڑا
۱۹۱	۱۳	وقد جعلتم	وقد جعلتم
۱۹۴	۱۳	لم ینقضوکم	لم ینقصوکم
″	″	اور تمہارے	اور نہ تمہارے
″	۱۸	وان استنصروکم	وان استنصروکم
۱۹۵	۱۱	معاہدۂ برابری کو	معاہدہ برابری کو
″	۱۸	کہلا بھیجا	کہلا بھیجا جائے
۱۹۸	۵	کپڑا نہ رہے	کپڑے نہ رہے
۱۹۹	۳	کافروں	کافروں
″	۸	صفحہ ۳۷	صفحہ ۱۹۸
۲۰۰	۱۸	صفحہ ۳۷	صفحہ ۱۹۹
۲۰۲	۱	کے	کی
۲۰۳	۳	رائج تھا	رائج ہو جاتا
″	۸	یہی کہا	یہی کیا
۲۰۴	۲۱	تہایہ	نہایہ
۲۰۸	۲	ابراہیم النخعی	ابراہیم النخعی
۲۱۴	۸	آراضی	اراضی
″	۲۱	قرار دیا گیا ہے	قرار دیا گیا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۵	۲	پڑتی تھی	پڑی تھی
″	۹	آراضی	اراضی
″	۱۶	نے	نے
۲۱۶	۳	Shoiks	Shoiks
۲۱۸	۱	Nationlity	Nationality
″	۹	نہ کیا جائیگا	نہ لیا جائیگا
۲۱۹	۵	علاوکم	علادکم
۲۲۱	۴	تہذیب قوموں	مہذب قوموں
۲۲۲	۱۱	صلحنامہ	صلح نامے
″	۱۹	ان کے	×
۲۲۷	۱۸	نام نشان	نام ونشان
۲۲۸	۵	ان کے املاک	ان کی املاک
۲۲۹	۱	غلام بنائیے	غلام بنائے[1]
″	۳	بدل گئی[2]	بدل گئی
″	۲۲	[2]	[1]
۲۳۰	۱۳	کے حاصل	کے جملہ حقوق حاصل
″	۱۹	تعین	تعیین
″	۲۱	توسط الحال	متوسط الحال
۲۳۰	۲۳	کتاب الخراج	[1] کتاب الخراج
۲۳۱	۲۰	عبداللہ بن عمرؓ	عبیداللہ بن عمرؓ
۲۳۲	۲۳	۲۰۹	۱۰۹

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۳	۱۴	ناقص	ناقض
۲۳۴	۲	والخنزیر	والخنزیر
〃	۱۰	والحدود	والحدود
۲۳۵	۴	اس کو	ان کو
〃	۱۸	رفق	رفق کی تاکید کی گئی ہے
۲۳۷	۴	یوذوا	یوذوا
۲۴۱	۹	شئ	شئ
۲۴۵	۹	جنازہ	جنازے
۲۴۶	۵	ادنی صرار	ادنی ضرر
۲۵۴	۲۰	لہ	لہ
۲۶۳	۹	وہ خود اپنے آپ کو	دوسرے اس کو
〃	۱۱	ماخذ	مآخذ
۲۶۴	۵	بحث کرنے سے	بحث کرنے میں
۲۶۵	۲۳	Gricfeith	Gricfeith
۲۶۹	۱۳	آریہ وروں	آریہ ورن
۲۷۳	۲	حریقوں	حریفوں
۲۷۸	۱۴	سرگرھوں	سوگرھوں
۲۸۱	۲۲	Yhe series	Yhe East series
۲۸۲	۲	نے لگا	ہونے لگا
۲۸۳	۳	یزک	ترک
〃	۹	انسان	انسانون
۲۸۳	۲۰	حرص وجاہ	حرصِ جاہ
۲۸۵	۸	آگیاں	اگیاں
۲۸۷	۲۱	لوگوں	لوگون
۲۸۹	۲	شوؤن	شؤن
۲۹۰	۱	میں دوسرے ذرایع اختیار کرنا چاہئیں	دوسرے ذرایع اختیار کرنے چاہئیں
۲۹۱	۱۵	اسوقت	اس میں
۲۹۲	۱۵	مگر	تاہم
〃	۲۳	India	in India
۲۹۳	۱۹	مقتوح قوموں کے ساتھ	مفتوح قوموں کے ساتھ برتاؤ
۲۹۴	۱۵	شود	شودر
۲۹۵	۵	نورانی	روحانی
۳۰۱	۲۳	۱۱	۱۱ تا ۱۲۷
۳۰۲	۹	کیا سکتا	کیا جاسکتا
۳۰۴	۴	آریہ، دیسیو، دویج، شودر	آریہ۔ دیسیو۔ دویج۔ شودر
۳۰۶	۲۳	ریبوں امریکہ	ریبونِ امریکہ
۳۱۱	۲۲	بنی اسرائیل میں	بنی اسرائیں میں سے
۳۱۳	۱۱	۱ایک	یہ ایک
〃	〃	اسی طرح	اس طرح
۳۱۵	۱۹	سیہ	سیئہ

	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳	P. 476 - ۱ ایضاً	۲ ایضاً ج ۱ ص ۴۷۶	۳۵۲	۷	اپنا گناہ	اپنے گناہ
۳	دھمالی	دھماکی	〃	۲۲	دین مسیحی کو الگ لگ	دین مسیحی کو ایک لگ
۲۱	دوسرے جون	دوسری جون	۳۵۴	۱۱	Pilata	Pilate
۱۷	جھٹ	جھوٹ	〃	۲۳	ابتدائی	ابتداء
۲۲	بھکھاری	بھکاری	۳۵۷	۱۹	فراغ حوصلگی	فراخ حوصلگی
۹	تعریف	تعلیم	۳۶۰	۲۳	Mehman	Milman
۱۸	مبتلا کرنے کیلئے اُو	مبتلا کرنے کے لئے ہیں	۳۶۲	۱۹	البیریا	الیریا
۱۱	مسائل	وسائل	〃	۲۳	Reu	Rev
۷	اس دینا	اس کو دینا	۳۶۵	۲	مقتدین	معتقدین
۹	حمایت	حمایت	۳۶۷	۷	کی جانب	کی خاطر
۵	اخلاق و مادی	اخلاقی و مادی	۳۶۸	۱۶	پڑجائین	پڑ جائے
۱۷	ہم تک پہنچتی	ہم تک پہونچی	۳۶۹	۱۴	جب کہ	جسمیں
۱	کون ہی افکر کرکے	کون ہی جو فکر کرکے	۳۷۱	۱۳	نا جائز ہے	جائز ہے
۶	طیاری کریں	طیاری کرے	۳۷۲	۲۳	(کتاب کا جرمن نام	Yolesand tebendes völkerrec- ht.
۷	قبول کرتی ہے	قبول کرتا ہے			غلط لکھا گیا ہے صحیح	
۱	سمجھتی	سمجھتا			نام یہ ہے:-	
۱	مستحق	متحقق	۳۷۴	۱۱	۱۹۰۸ء	۱۹۰۸ء تک
۱	”محنت“	”لعنت“	۳۷۵	۲۲	۱۹۰۷ء	۱۹۰۷ء تک
۱۱	رہنمائی کرتا ہی	رہنمائی کرنا ہی	۳۷۶	۱۶	فرانس نے	فرانس سے
۱	صہیوں	صہیون	〃	۲۳	سرویا کا	سرویا کو
۱۲	بجھادے	بچھادے	۳۷۷	۱۶	سلطنتوں کا	سلطنتوں کی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۲۷	۲۰	Sixle/Bau r-	Sixle of/Baur-
		lor	lor
۳۲۹	۱۴	اواٹلی	اور اٹلی
〃	۱۸	جس نے	جس میں
۳۳۰	۱۱	میں سے تھے	میں سے بھی
۳۸۲	۱۲	نفت	نفط
۳۸۳	۱۲	مثلاً	عملاً
۳۸۹	۴	گروہ مین	گروہ
۳۹۰	۱۸	تخت آجاتا ہے	تحت آجاتا ہے
۳۹۲	۱۱	الگ الگ کردینے	الگ کردینے
۳۹۵	۸	سلاح کا	سلاح کی
۳۹۶	〃	حملہ آور	حملے اور
۴۰۱	۱۱	یہ وہ	وہ یہ
۴۰۷	۴	ماتحت میں	مقابلہ میں
〃	۳۱	مغربی قومی	مغربی قومیں
۴۰۹	۴	ان سلطنتوں	سلطنتوں
۴۱۱	۴	انفرادی واختیاری	انفرادی اختیار و
		پسند	پسند
۴۱۳	۹	اخلاق فرائض	اخلاقی فرائض
〃	۲۱	جرمن کتاب کا نام	Kriegs brau
		یہاں اور آگے متعدد	Khimland
			Kriege

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
		مقامات پر غلط لکھا ہے	
		اس کی یوں تصحیح کر لیجئے	
۴۱۶	۲۱	ارادہ	ارادہ
۴۲۰	۵	یورپ کے	یورپ کا
〃	۱۷	داخل کرنا ہی	داخل کرنا
۴۲۳	۱۷	ہائیڈبرگ	ہائیڈلبرگ
۴۲۵	۹	explosive	explosive
۴۳۰	۴	ان کی	ان کے
۴۳۴	۱۵	مغربی جنگ کا قانون	مذکورۂ بالا قانون سے
		یہ ہے	یہ جواب دیتا ہے
〃	۱۹	امتیاز کا یہ اصول	امتیاز کا جو اصول قایم کیا گیا وہ
〃	۲۰	موجب ہوگا	موجب ہوگیا
۴۳۵	۱۵	بلکہ	بغیر
۴۳۸	۵	غدر کے وسائل	غذا کے وسائل
۴۳۹	۱۵	موقع پر بھی	موقع پر
۴۴۸	۱۸	کیویا	کیویا
〃	۲۲	(انگریزی کتاب کا نام	War its conduct
		غلط لکھا گیا ہے صحیح	and legal
		نام یہ ہے :-	results
۴۴۹	۱	سنہ ۱۹۴۴ء	سنہ ۱۸۷۲ء

سطر	غلط	صحیح
۲۲	پہنچنے سے پہلے	پہنچنے کے بعد
۴	Soreni	Sovenir
۸	دول	دول نے
۲۲	لیکن سلطنتوں	لیکن نہ تو سلطنتوں
	نے	نے
۱۱	اس نے	اس کی
۲	لا تجھرن	لا تجھرن
۱۱	نہیں دیتیں	نہیں دیتی
۶	مادہ	مادے
۱۷	جائز ہے	ناجائز ہے
۲۱	سیئۃً سیئۃً	سیئۃٍ سیئۃٌ
۱	روپن ہائم	اوپن ہائم
۸	مواصلت	مواصلات
۱۲	تہذیب	مہذب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۶۳	۵	اسی مسئلہ میں	اسی مسئلے میں
۴۶۴	۱۸	کسی قسم کے	کسی قسم کی
۴۶۵	۵	تحزیب	تخریب
۴۶۸	۲۰	معاصر	محاصر
۴۷۲	۱۸	قسطنطنیہ	قسنطینہ
//	۱۹	دلی فتح کیا	دلی فتح کی
//	۲۱	کسی کو	کسی شہر کو
۴۷۵	۹	کے لئے نہیں ہیں	کے نہیں ہیں
۴۸۱	۱۸	No Nosles	Non Hostes
۴۸۴	۹	بین المسلی	بین المسلی قانون
۴۸۵	۱۸	غیر جانبداروں	غیر جانبداری
۴۸۸	۸	آخری فصل	آخری فعل
//	۲۲	Wheaton	Wharton
۴۹۱	۱۲	تسلیم کرنا ہے	تسلیم کرتی ہے

فہرستِ ماخذ

ا۔ عربی

تفاسیر:

(۱) تفسیر ابن کثیر حافظ ابن کثیر،
(۲) تفسیر جامع البیان ابن جریر طبری،
(۳) تفسیر کبیر امام رازی،
(۴) تفسیر کشاف امام زمخشری،
(۵) فتح البیان نواب صدیق حسن خان،

احادیث و شروح:

(۱) جامع صحیح امام بخاری،
(۲) فتح الباری ابن حجر،
(۳) صحیح مسلم،
(۴) جامع ترمذی،
(۵) سنن ابی داؤد،
(۶) سنن نسائی،
(۷) سنن ابن ماجہ،
(۸) موطا امام مالکؒ،

کتبِ فقہ:

(۱) ردالمحتار،
(۲) درالمختار،
(۳) بدائع الصنائع کاشانی،

(۴) کتاب الخراج قاضی ابو یوسف،
(۵) برہان شرح مواہب الرحمٰن،
(۶) عنایہ و فتح القدیر ابن ہمام،

تاریخ و رجال و سیر

(۱) تاریخ الرسل والملوک طبری،
(۲) تاریخ الکامل ابن اثیر،
(۳) فتوح البلدان بلاذری،
(۴) طبقات کبیر ابن سعد،
(۵) اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ ابن اثیر جزری،
(۶) سیرت ابن ہشام،
(۷) تاریخ یعقوبی بغدادی،

۲- اردو

(۱) ترجمۂ تورات،
(۲) ترجمۂ انجیل،
(۳) ینابیع المسیحیت، خواجہ کمال الدین،

انگریزی ماخذ

(1) History of Persia by Sykes.
(2) Decline and fall of the Roman Empire, by Gibbon.
(3) Byzantine Empire, by Foord
(4) Eearly days of Christianity by Ferrar
(5) Constantine the great by Rev. Cutts
(6) Sprit of Islam by Ameer Ali
(7) Introduction to the study of Hinduism by Guru Parsad Sen.
(8) Religious Systems of the world by Lyall
(9) Translation of Rigveda by Griffith
(10) „ Samaveda „
(11) „ Yajurveda „
(12) „ Atharvaveda „
(13) Indo Aryans by Rajendra Lal Mitra
(14) Encyclopaedia of Religions
(15) Gita by B. G. Tilak
(16) „ K. T. Telang (Sacred Books of the East Series
(17) Manu Translated by Sir William Jones
(18) „ „ Burnell
(19) History of Aryan Rule in India by Havel
(20) Cambridge History of India
(21) Vedic Index of names and subjects
(22) Indian Caste System by Wilson
(23) Vedic India by Ragozin
(24) Buddhist suttas by Rhys Davids
(25) Buddhism as a Religion by Hackman
(26) Vinaya Texts by Rhys Davids
(27) Buddhim in Translations by Warren
(28) Dialogues of Buddha by Rhys Davids
(29) Buddha and his Religion by Sant Hilaire
(30) Buddhist India by Rhys Davids
(31) Early History of India by Smith

(32) Commentary on the Holy Bible, by Rev. Dummellow
(33) History of Christianity by milman
(34) Encyclopaedia Biblica
(35) History of the Jews by milman
(36) Encyclopaedia Brittannica
(37) Jewish Encyclopaedia
(38) International Law by Lawrence
(39) „ „ Birkenhead
[40] „ „ Oppenheim
[41] Development of International law after the worlwar by Pro. Nippold
[42] Province of Jurisprudence determined by Austin
[43] Austria's peace offer by Prince Sixte of Buorbon
[44] Russia's Foreign relations by Baron S. A. Korff
[45] Growth of the laws of War by B rnard
[46] Hague Conventions by Scott.
[47] Hostilities without declaration of War by Maurice.
[48] War its conduct and legal results, by Dr. Baty and prof. morgen.
[49] History of Europe by Allison
[50] Laws of war on land, by Holland
[51] International law and the world war, by Garner
[52] International law, by Halleck
[53] „ „ Wheaton
[54] International law of United States by Wharton
[55] Laws of nations, by manning.
[56] Modern Europe by Eyffe.

جرمن ماخذ

(ان کتابوں سے استفادہ کرنے میں مجھے میرے جرمن استاد ہرائرت نے مدد دی ہے جس کا میں شکر گذار ہوں)

[1] Kriegs branch in land Kriege.
[2] Vom Kriege
[3] Prinzipien des see Kriegesrecht.